

نئی لاہری

۵۰

# ٹیڑھی لکیر

ناول

عصمت چغتائی

نیا دارہ

۱۰۰۰

۱۵۵/—

شیڑھی لکیر

ناول

عصمت چشتا

# پیڑھی لکیر

(ناول)

منشیہ اداوہ

۱۵ - سرگودھا - لاہور

جلد حقوق محفوظ

بار اول (پاکستان) ۱۹۶۷ء  
ناشر: ریاض احمد چوہدری  
مطبع: حمایت اسلام پریس لاہور

●



# ان سیتیم بچوں کے نام —

جن کے والدین  
بقید حیات ہیں



پہلی منزل

(۱)

وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چھٹی پہلی سلمہ کی شادی تھی اور وہ بیٹھتی جھپا جھپ سر دئی کر پیپ کے دوپٹے پر لیچکا ٹانگ رہی تھیں۔ اماں اتنے بچے جتنے کے بعد بھی نہ تھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹی جھانوسے سے ایرٹیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایک ایکی گٹا جھوم کر گھرائی اور وہ دمائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی بغیر گلے میں گھانٹی کیے ایسا دماڑی کہ تو بہ بھلی۔

نوجوانوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ! حکم ملا: ننھی سی بہن کے ہنڈانے کے لیے گرم پانی تیار کرو۔ پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتی آپا نے کوسے ہوئے چوٹے پر پتیلی چڑھا دی۔ پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا اور سارا ماتھا ابل کر رہ گیا۔

”خدا غارت کرے اس مٹی سی بہن کو اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی“ حد ہو گئی تھی ابھی بھائی اور بھینس بھائی۔ بس معدوم ہوتا تھا، تنگ منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، اڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو درپے درپے آرہے تھے، کتے بلیوں کی طرح! ازل کے مرچنگے۔ اناج کے گھن ٹوٹے پڑتے ہیں، دو بھینسوں کا دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی ان کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔

اور یہ سب آبا کا قصور تھا گیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں۔ اور صبح پیدا

ہوا۔ اُدھر آگرے سے کوئی بُوالی۔ وہ دودھ پلائے اور بچہ کی پٹی سے پٹی جڑی رہے۔ پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے کائے بیلوں کا بارو؛ کھانا ہے تو بیلوں؛ پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز، پھلنے کو تیار!

ادریہ پیٹ کی کھرچنے والی پیلی، دھینسا سی ناک، چیاں سی آنکھیں، پر جیل سے زیادہ تیز؛ بڑی آپا اور مٹھو دونوں نے کئی دفعہ اُس کے چوہے کے پیچھے پیچھے منہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا، گویا وہ انہیں پھیرنے کو مسکرا رہی ہے۔ دد خوب سمجھتی تھی کہ یہ اُس کی زر خرید لونڈیوں کی طرح خدمت کریں گی؛ اماں کو کیا کم فکر ہو رہی ہوگی؛ آخر یہ اتنی ڈھیر سی لڑکیوں کا قصیدہ کہاں کھلے گا؛ اماں کو روپیہ بھی ہے اور لڑکی دکھانے کا فیشی نہیں، پھر بھی کہاں ٹمک تالے ڈالے جا رہی گئے، کیا ہوگا؟

نہ اُس کا پیٹ بھولا، نہ بیمار ہوئی اور روز بروز پھول کر کپا ہوتی گئی۔ وہ ایک بھائی بہنوں تک تو ذرا چاڈھو بچھے کیے، پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بیزار تھی۔ خیر انا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔ انا بالکل جوان تھی، سولہ سترہ برس کی۔ کبھی تو راتوں کو وہ گھنٹوں غلاظت میں لتھڑی پڑی رہتی اور اُس کی آنکھ بھی نہ کھلتی۔ انا کو جگا ناگو آسان کام نہ تھا مگر دودھ خوب ہوتا تھا۔ دوسرے انا کا عاشق جب اُسے کندھے پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑاتا تو وہ سب دکھ درد بھول کر کلکاریاں مارنے لگتی۔ وہ تینوں گھر والوں کی آنکھ بچا کر ہمیں سوں کے بھٹوسے والی کو سڑایا میں دیکھ رہے تھے۔ انا بھوسے پر لوٹیں لگاتی اور اُس کا عاشق اُس کے پیچھے پیچھے لڑھکتا۔ تب بھی تالیاں بجا کر گھنٹوں دوڑتی، مگر جب وہ انا سے لڑنا شروع کرتا تو وہ بسور کر اپنا پھلا ہونٹ آگے پھلا دیتی۔ اُسے لڑائی سے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ جب مدد کرتے آپا میں بھاؤں بھاؤں کر کے پلٹ جاتے تو اُس کا سارا جسم خون

سے لہزنے لگتا اور وہ بے طرح ببلانے لگتی، یہاں تک کہ کہتے بھی پریشان ہو کر علیحدہ ہو جاتے۔ جب تک وہ جاگتی رہتی اتنا کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ یونہی اگر اُسے چھو رہے کہ اتنا کا عاشق اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا: ”اتنا ہماری ہے، تو وہ نرّا صدا اُسے احتجاج بلند کرتی اور اُسے چھوڑنا پڑتا۔

مگر اُسے اپنی اس سینہ زوری کا جلد ہی خمیازہ سمجھنا پڑا۔ ایک دن جب وہ تینوں حسب معمول خشک پال پہ لوہیں لگا رہے تھے تو بچانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ اپنی تھکی سی دنیا کے مقصوم خوابوں میں کھو گئی، آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اُٹا میں ہی اُٹا میں بھری ہوئی تھیں۔ خوشی سے دیدانی ہو کر ایک گود سے دوسری گود میں ہماں ہماں کر چکے گی۔ مگر پھر اُس نے دیکھا یا ایک ساری اُٹا میں کہیں غار میں ہو گئیں۔ اُس کا جی کھل گیا۔ غنیمت کی لکڑی کی طرح سونگھ سونگھ کر وہ ڈھونڈنے لگی۔ اُس نے پایا۔ پال کے ایک کونے میں اُس کی نرم گرم اُٹا پکے آتم کی طرح گول مول سو رہی تھی۔ کون کون کر کے وہ اُس میں گھسنے لگی۔ اُس کے ہونٹ ہلنے لگے اور حلق کی رگیں پھٹک اُٹھیں، گویا دودھ کے گھونٹ کے گھونٹ حلق میں ہوتے ہوئے پیٹ میں جا رہے ہوں۔ اُسے اچھو سا لگ گیا۔ کچھ بڑھنے کے لیے اُس نے اپنے میرے میرے ہاتھ بڑھائے مگر ایک بھیانک ہلانے اُسے دُور جھٹک کر اتنا کو دلچ لیا اور بھنبھوڑنا شروع کیا۔ حلق چھاڑ کر وہ دھاڑی جیسے اُسے سانپوں نے ڈس لیا ہوا۔ اُس کی معصوم آنکھیں اس گریہ منظر کو دیکھ کر پتھر لگیں۔ اس کی گھل بندھی چنچیں سن کر باہر سے ہستی، جھنگی اور بادری دوڑ پڑے اور مُنزم گرفتار ہو گئے۔

بُور بُور کر وہ اتنا کے پیارے مکھڑے کو کبھی گویا آنکھوں میں آنکھوں میں ملے رہی ہو۔ چوٹ تو نہیں لگی؟ میں نے تمہیں بجا لیا نا؟“ مگر اتنا آج کچھ بے مزہ سی تھی اور اُس کی شرارتوں پر بجائے پیار سے جھٹکنے کے ڈکھائی سے جھٹک رہی تھی۔ اپنے تمام معصوم اور کمزور بے اُس نے اتنا کو منانے کے لیے استعمال کر

## ۱۱ ٹیڑھی لیکر

ڈالے مگر وہ اُسے ہراساں نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیوں روٹھتی ہوئی تھی۔ مگر آج تو اتنے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی دن شام کی گھاڑی سے اُس کی انا کو آگر سے واپس بھیج دیا گیا۔ اُسے لیا معلوم ہوا کہ یتیم ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھائی دے رہی تھیں۔ ساما گھر اُس کے چاروں طرف جمع ہو گیا مگر اسے چہرہ نہ پڑا۔ وہ گرم گرم آٹا، جس کے سینے سے چھٹ کر بالکل ماں کے پیٹ میں سینے کا مزہ آتا تھا، بھلا آب کہاں مل سکتی تھی! اُسے وہ بوتل دیکھ کر ہی حد سے کا دورہ پڑ جاتا جس سے اُسے دودھ پلانے کی کوشش کی گئی۔ بھلا کہاں وہ سانولی سلونی گد گدی انا اور کہاں شیشے کی ذیل بوتل۔ مگر پیٹ کی آگ نے اُسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ منجھوٹی نے جب اسے گود میں لے کر بوتل پلائی اور چند قطرے بھولے سے اس کے حلق میں چلے گئے تو وہ خاموش ہو گئی، پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چھٹ جاتی اور پیٹ کی طرح اُس کے کپڑوں میں اپنی انا کو ڈھونڈنے لگتی۔ منجھو گہرا گرو سے دُور ٹ دیتی اور بڑی آپا سے شکایت کرتی کہ وہ اُس کے بے طرح گد گدیاں کرتی ہے۔

تقریباً نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا اور وہ بالکل جیسے گائے بیل چارہ کھاتے ہیں دودھ زہر مار کر لیتی مگر اُس کے ہاتھ تھکتے ہی رہتے۔ بوتل کی حکمتی چٹنی سطح پر وہ پیار سے اپنی ہتھیلیاں چپکا کر اُسے گلجے سے پیچ لیتی۔ شروع شروع میں تو دودھ پیتے پیتے ایک دم اُسے انا کی آنکھیں، اس کی ناک کی ننھی سی بالی، اور کان کی نوٹھیں یاد آ جاتیں، اُس کا دل بھرتا اور وہ تھوڑی دیر کو چٹنی چھوڑ کر دردناک آواز میں رونے لگتی مگر پھر پیٹ کی ٹپکار سے چونکنا کرتی اور وہ خاموش ہو جاتی۔

جب سے انا چھوٹی تھی منجھو نے اُسے لے لیا تھا۔ پتا نہیں منجھو کو اُس پر کیوں پیار آ گیا۔ شاید جس دن اُس نے کپڑوں میں انا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اسی دن سے منجھو کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بوتل سے دودھ پلا کر منجھو

اے سینے سے چپکالیتی اور پیگڑی پر لپیٹے جاتی ورنہ اُسے نیند ہی نہ آتی۔ منجھو کے پہلو میں اُسے کچھ آنکھ کی گرمی مل جاتی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منجھو کی گردن اور کھال سہلا یا کرتی، جس کا منجھو بالکل بڑا نہ مانتی۔

بہر ایک دلی جب منجھو ہنسا رہی تھی تو وہ اندر کھنٹی چلی گئی۔ ”اے آپا اے پلڑو“ منجھو کی لڑکچہ جلائی۔

”اُدنی وہ کیا سمجھے۔ اتنی ذرا سی تو ہے“ مگر اس نے منجھو کو ایسی بُری طرح گھورا کہ وہ شرمائی گئی۔ وہ کہتے کہ عالم میں اُسے گھورتی رہی۔ ”چل یاں سے“ منجھو نے لوٹنے کی آڑ لے کر اسے ڈانٹا، مگر وہ تو جیسے مقناطیسی طاقت سے اُس کی طرف کھینچنے لگی۔ منجھو نے خوفزدہ ہو کر اُسے پھر دھنکارا اور جب وہ جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر اُسے معنی خیز نظروں سے تاکتی بڑھے ہی چلی گئی تو اُس نے جلو بھر پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔

پانی کی مار سے ٹھٹک کر زور سے رو پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی باہر ریگ آئی۔ اس دلی اُس نے نہ ہی جی بھر کے دُودھ پیا اور نہ ہی ہنسی بولی۔ وہ منجھو کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی گویا اُس نے اس کے ساتھ کوئی زبردست بے ایمانی کی ہے اور چھوٹ کر رو پڑی۔

جب منجھو نے اُسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھ لی تو وہ خلاف معمول خاموش اُسے گھورنے لگی۔

”کیا ہے یہ منجھو نے بار سے پوچھا اور وہ حضرت سے مسکرا پڑی۔ اہمیت سے اس نے اس کی گردن پر انہی آنکھوں سے کجھانا شروع کیا اور آنکھیں گڑو گڑو اس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر جمک رہا تھا۔

”ہمیں، بُری بات“ منجھو نے اُس کا جھٹکنا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا۔ وہ بسور نے ٹی اور ایسی انجیا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسچ گئی، اُس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور کھینچے سے لگا کر سر گئی۔

منجھو نے اس کے لیے چول جیسی فرائیس اور ٹوپیاں سیٹیں۔ گھڑی گھڑی پہلا یا جا رہا ہے، سرسہ کا جل اور سٹی سے لیں۔ وہ اپنی ساری گتیں خاموش بنایا کرتی۔ مگر کیا مجال کہ کوئی اور اُسے ہاتھ بھی لگا جائے۔ منجھو سے تو آنکھوں میں صابنی بھی لگ جاتا تب بھی وہ کچھ یونی سا بسور کر چپ ہو جاتی۔ منجھو آخر کو منجھو ہی تھی۔

مگر جوں جوں بڑھتی گئی وہ منجھو کی صفائی سے عاجز آ گئی۔ وہ اُسے سجا بنا کر نادر شاہی حکم صادر کر دیتی کہ ایک بال بھی ادھر سے اُدھر ہٹا اور موت آئی۔ پر یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ چلتی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو روکنا اس کے قابو میں نہ تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ کلچے پر صبر کی سل رکھ بیٹھی رہتی مگر جونہی منجھو کی آنکھ بکتی وہ باہر کھسک جاتی۔ اور پھر شام کو جو وہ قدم رکھتی تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی دیوانی کیتا کچھار کی کونڈی میں لوٹا کر آئی ہے۔ بغاوت جیسی فراک جالو سڑ سے ہوئے چوسے کی کھان، اور اُس پر باریک باریک دھول کی افشاں چھڑکی ہوئی۔ سر، بال اور آنکھیں دھول میں اٹی ہوئی۔ دونوں ہتھکنے غلاظت سے ایسے ٹھسا ٹھس جیسے سمیٹ سے دروازے چنے ہوئے ہوں۔ جامنوں، امرودوں، بیرون اور آموں کا یا حسب موسم جو پھل موجود ہوتے ان کا پلستر کیا ہوا اور اوپر سے طاعونی چوہے جیسی بو!

سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسلوں، پتھر ٹوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑکتی جھاڑتیں۔ وہ زور زور سے بھینس کے پڑے کی طرح ڈکراتی۔ پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دھل جاتی اور گھار کی وجہ سے دونوں ہتھکنے سڑ سے یکا یک کھل جاتے، جیسے اٹی ہوئی نالی میں تہراب ڈال دیا ہو۔ پھر گھونسلوں اور گرچ وار دھمو کوں کے شادیاں کے ہاتھ غسل میت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیوی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی۔ وہ پختہ فیصلہ کر لیتی کہ اب ٹیچڑ اور مٹی سے کوئی واسطہ نہ رکھے گی، دھول میں لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اُس کے چہرے پر تارک الدنیا سا دھوکا سا استقلال چھا جاتا جو اپنے جسم کے کسی عضو کو مردہ کر لینے کا قصد کر



چکا ہو، چل جیسی سو گئی، آنکھیں کبوتر کی طرح محسوس ہو کر اڑ گئیں۔  
 مگر زمانہ سازگار نہ تھا۔ دوسرے دن جب بھی اُسی وقت، اسی عبرتناک حالت  
 میں ایک بدست شرابی کی طرح جھومتی وھول کی آوازاں میں جھنگاتی نظر آتی تو  
 دلچسپے والوں کو سخت عبرت ہوتی، اور جب وھول جھڑاتی تو زمین و آسمان کانپ  
 اُٹھتے۔

وہ پھر تو بہ کرتی، حلف اُٹھاتی۔ مگر سب بھول جانے کے لیے۔ شیطان  
 اُسے پھر دہرا غلاتا۔ جو نہی وہ سچ دیکھ کر یا ہرنگاتی جملہ عناصر کو اس کے عاف پکڑوں  
 سے ہیر ہو جاتا۔ بکیتوں کی سانولی سانولی ٹیڑھا تال کے کنارے کی سرگوشیاں کرتی  
 ہوئی ریت، اُسے پھیلاتی۔ اصطبل کی جھلی جھلی مگنی ہوئی گھاس آغوش پھیلا کر اُس  
 کے پیچھے دوڑتی۔ ٹرینوں کا مستحق اور غلیظ ڈربہ اُسے پھولوں سے لدی کچھ کی طرح  
 اپنی طرف کھینچتا۔ وہ سب کچھ بھول جاتی: اپنے منیر سے وہ قسم جو بار بار کھائی تھی،  
 مجھ سے وعدہ اور خود اُس کی اپنی خود داری جسے روز روز کی وھول جھڑاتی چکا  
 چور کیہ دیتی تھی۔ وہ ان بے شمار شیطانوں کی رعناؤں سے بچنے کے لئے بہت محنت  
 ہو جاتی مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی تینک کی طرح اس ابدی اور گم  
 کے غار میں جا گرتی جس کی پاداش میں وہ روز و کھ بھٹا کرتی تھی۔

مقوڑی لمبی دیر میں وہ لہو و لعب میں غرق نظر آتی۔ کچھ کے ریشمی لٹور بھڑکی  
 بھڑکی بھٹتی ہوئی سوچی جیسی ریت کی نشی نشی ڈھیریاں، گھوڑے کی گھاس سے بنائی  
 ہوئی چھوٹی سی جھاڑو، ٹرین کی دم کے جھڑے، سوئے پر، اور نیلا۔ اُس کی عزیز  
 ترین سہیلی، بھٹنوں کی لڑکی، مجھ کے بعد دنیا میں یہی پیدا تھی۔ وہ دونوں بھینس کے متعلق  
 کے پیچھے جا کر ایک دوسرے کے گلوں میں ہانڈ ٹھانڈ ٹھانڈ کر رہیں، پھر ریت میں  
 بیٹنوں کی طرح گول گول لڑکیں نکلتیں، مٹھیاں بھر بھر کے ریت پانی کے پلوں کی  
 لڑیم اُچھائی ہیں، یہاں ٹیکس کہ وہ بالکل ٹیڑھی برہنیت مورتیاں معلوم ہونے لگتیں،  
 ان کی رنگ رنگ میں ریت دیکھنے لگتی، پھر بھی اُن کے جی مٹھی سے نہ بھرتے اور وہ جھوٹے

ہوئے پتوں کے چمچے بنا کر ریت پینا شروع کرتیں، خستہ بھر بھری ریت وہ موسمے وار  
پنجری کی طرح کھا جائیں۔ پیٹ والیوں کی طرح انہیں سوندھی سوندھی مٹی بہت ہی  
بھاتی تھی۔ نہ جانے اُن کے پھولے ہوئے کپڑوں جیسے پٹوں میں کون سے پلوت  
پہرہ ان چڑھ رہے تھے۔

ان کی حالت مٹی میں کچے ہالہ عورتوں جیسی۔ چکنی سر می رنگتیں پیلی پرگئی تھیں اور  
زبانوں پر سفید پھمپوندی لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں بھورے بھورے دھندلے دھندلے  
لگے تھے۔ ٹپٹیا کا انداز بند اتنا چھوٹا ہو گیا تھا کہ اُس کی فکریا میں آگے طاقتور کھلا رہتا  
تھا۔ روز بروز سستی بڑھتی جا رہی تھی۔ منہ کا مزہ خراب رہتا تھا۔ لڑائی میں انہوں  
لے دانستوں اور خاموشیوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ کر دیا تھا۔ چن چن وہ ہر  
وقت منہ نہاتی رہا رہتی، جیسے کسی نے نکتی کو ڈبے میں قید کر دیا ہو۔ اس لیے سب  
نے اُس کا نام ”مکتی“ رکھ دیا۔

جب سب اُسے چھڑانے کے لئے ”مکتی، مکتی“ کہتے تو وہ واقعی ٹیڑھوں  
کی طرح آنکھیں نکال کر غراتی۔ بلی کی طرح وہ دشمن پر جھٹا مارتی اور جہاں جہاں اُس  
کا ناخون لگتا کھائی اُترتی چلی آتی۔ جب وہ دانستوں سے کسی کی بوٹی چباتی تو اُس پر کچھ  
کے دانت گوشت میں آ رہا رہ کر آپس میں بچ اُٹھتے۔

وہ سپوت جو اُس کے پیٹ میں پل رہا تھا۔ اس کے سوندھی مٹی کے شوق کو بھاتا  
ہی گیا۔ اس کی زبان پر تنگ جھوٹا گایا، پھر کوئی لگائی مگر کسی موسم سے بھی مٹی کی  
چاٹ نہ لگے۔ کسی نے رائے دی کہ چڑھل کی زبان جلا دو۔ کسی نے ترکیب بتائی  
کہ سوئیوں چھو کر کھینچ کے ”مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ جب وہ مٹی کھاتی پکڑتی  
جاتی تو منہ میں اس قدر مہلے ہوتے تھے کہ مارتی کہ ہونٹ کٹ کر خون نکل آتا مگر وہ کچھ نہیں  
تو کوئلہ ہی چبا جاتی، دیوار سے چوٹا ناخنوں سے کھرت کر کھا لیتا۔

ایکسا دن جب وہ اور ٹپٹیاں زینح حاجت کی غرض سے پاس پاس پہنچیں  
تو وہ ہی چھیں کہ وہ سپوت وار دھو گیا۔ ایک دھڑکنے کے ساتھ وہ منہ کے



اور وہ سوچتی کاش کوئی جاننا کہ خاک میں ملنا اُس کے لیے کتنا نہیں بلکہ دعا تھی یہی تو اُس کی آرزو تھی۔

(۲)

لوگوں کو شاید ہی میرا ہمارا ہوتا ہے، مگر شہر کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارادہ ہو گیا تھا۔ بیٹے بیٹھے اُس کا جی پیر پیر پڑا۔ لگتا کہ وہ کسی کو مارے اپنے دوست سے گھونٹے سے گھیا لقمہ کسی کو کھل کر رکھ دے۔ بارہا ایسا ہوا جہاں سوکھی ہوئی بیٹ کا تنہا سا منقہ اُس کی ہر جنبش پر لرزے لگتا ہے یا اس شہر کی چوہا کی طرف جو صبح سے تین بار سہی ہوئی نظروں سے صندوق کے پیچھے سے جھانک چکی ہے یا وہ کسی اور چیز کو گھور رہی ہے، کہ ایک دم اُسے مارنے کا شوق چراتا۔ گھر میں ایسا دیا لو کو تو تنہا جو اس سے پٹ لیتا۔ منجھو کیا مرے سے جب چاہتی دیکھتے ہیں اُس کی کمر پر گھونسا جما دیتی۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ ایک دن وہ بھی منجھو کی کیٹوں کو پر ایک ٹکڑا سا لٹکھو۔ جھانٹے پھر تخیل میں ہی وہ منجھو کو بیٹھے لگتی۔ وہ نقیض گال پر مار کر اُس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اُسے کہیں سے اپنی بھولی بھری آنا کا دھنلا مارا خاکہ یاد آ جاتا اور اس کا جی بھڑاتا اور غمہ چڑھتا اور وہ منجھو کے ہمر پر بسین والی کر خوب گھٹے لگاتی، اور زور سے بھانوسے سے اُس کی کہنیاں اور گھٹے پھینکتی لگتی، پھر کھر دھرا سا توبہ سے کہ اتنا رگڑا تو کہ منجھو کی کھال اتر جاتی اور ناک لال چھندہ ہو جاتی ایک کان کی نوٹھ کر تو ابھی میں اُچھاتی، پھر وہ اُسے ایک عمدہ سی فراک پہنا کر کہتی ”بزدل جھولی، لٹا نیگیں توڑ دوں گی!“

مگر جب وہ تخیل کی دنیا سے جاگ کر واپس آتی تو دیکھتی کہ کچھ بھی نہیں، اس کے دونوں ہاتھ پتھر کی موڑتی کی طرح گود میں اکڑے ہوئے ہیں، گردن کی رگیں تنے سے دکھائی ہیں۔ وہ ایک استقامت بھرا لپٹا سانس کھینچ کر جسم کو اور تان لیتی اور ایک دم پاگلوں کی طرح زور زور سے لہتر پر گھونسوں کی باتیں کر دیتی۔ جب وہ جی بھر کر کوٹ چکتی تو تنھک جاتی، جسم کو ڈھیلا پھوٹا دیتی اور بڑا ہی سکون لے لے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے اپنی کرپیا کو مارنے کا دورہ اُٹھا۔ چلے تو اُس نے اُس کے ہونے ہوئے دو تین بھی طے کیا۔ مار سے تیرا ایک دم اُس پر بھوت سوار ہو گیا۔ دھڑا دھڑا اُس نے گھونسلوں اور لالائی کی بوجھار کر دی، دانتوں اور ناسوں سے اُس کے پیر سے کر دیے گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑا رہی ہو۔

گڑبیا کا پورا پورا براہ ہو گیا، اُس کے جسم میں بھرا ہوا براہ بکھر گیا اور کچھ دشمن کی زبان پر چپک گیا۔ اُس کے بعد اُس کا پیٹ بکھر گیا اور وہ اٹھنا نہ کا سا اُس سے کر اپنی ہوئی چت پڑ گئی۔ براہ سے کامزہ بڑی دیر تک اُس کی زبان پر بائی خون کی طرح بہا رہا۔ پھر ایک دم اُس پر خوف و ڈار ہی ہو گیا، جیسے اُس نے سچ مچ کسی کو قتل کر ڈالا ہو۔ اور کردہ گھگھائی لگی اور جلدی جلدی گڑبیا سے پیر سے حسد و حق کے نیچے چپا دیے۔ وہ بھوت کی پناہ کی طرف بھاگی۔ منجھو سے بڑھتی اپنا کرتا ہی رہی تھی، اُس کی زبان سے نکس کر لیٹ گئی اور اُس کی گردن پر اپنی سہی ہوئی انگلیاں پیرنے لگی۔

منجھو کی فرمائیں سینا ہی نہیں جانتی تھی بلکہ ایک دن اُس نے ایک الف بے کا قاعدہ منگا کر دشمن سے سی ڈالا۔ دشمن پاس بیٹھی دشمن کے دانتوں کو کت کت کا منڈ جھاتے دیکھتی رہی۔ دانتوں میں ہلکی سی لطیف کھجلی ہوئے لگی۔ اُس نے دانتوں پر انگلی پھر کر عجیب سی ہراسنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ قاعدہ ہی کہ منجھو نے اُسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

”آج سے تم پڑھنا شروع کرو گی، اچھا۔“

”اچھا“ دشمن نے مان لیا اور قاعدہ دیکھنے کے لیے اچکنے لگی۔ یہ پہلی یا شاید دوسری کتاب، اُس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ جسے پڑھتے ہیں پریشان کرنے پر منجھو نے اُسے مار دیا کرتی تھی۔ دیسے گھر میں پڑھنے لکھنے کا سارا دلچسپ سامان اس کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ مارنے کے کام کا تو تھا نہیں یہ قاعدہ اس سے بتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے بالافادہ سا بنا کر پیا رہیں اُس کے سر پر مارا کرتے تھے۔

”دیکھیں، دیکھیں منجھو“ اُس نے کتاب لے کر دیکھنا شروع کی پھر فراک میں اُس کی کھنچا ہی بنا کر منجھو کے سینے پر ماری۔

”اسے گدھی، تمام موڑ کر رکھ دی۔“ منجھو نے اُس سے قاعدہ لے لیا۔

”دیکھو یہ الف ہے، الف“

”کاش؟“ اُسے بالکل یقین نہ آتا۔

”یہ .... یہ الف سے انار“

”ایں ہیں، الف سے انار کاں بنوتا ہے۔ انار تو آتشباری میں چھوٹا ہے فر فر“

”ہیں نا؟“

”سٹ، یہ دیکھ۔ یہ الف ہے۔ الف سے انار .... کہو، الف“

”کہو، الف“

”یوں کہو .... الف ا“

”نہیں، ہم نہیں کہتے۔ پہلے یہ بتاؤ یہ کیا ہے .... یہ۔ یہ“

”یہ جیم ہے۔“

”اور یہ؟“

”یہ ص، ص“

”اوٹوں۔ ص ص نہیں ہیں، یہ تو چائے دانیاں ہیں“

”چل بچکی۔ یہ دیکھ، الف سے انار، کہو“

”کہو۔“ وہ بے وقوفوں کی طرح منجھو کا منہ نہ لگی۔

”ارے میں کہتی ہوں الف کہو“ جبر کا بیہانہ پھیلکا۔

”الف کہو“

”اٹھ چڑھیل“ منجھو نے دھکا دے کر اُسے اپنی گود سے اٹھ لیا اور اٹھ

کر برآمد سے میں چلی گئی، شمن نے قاعدہ اٹھا لیا۔ بالکل سوز کجفت، سوز تھا قاعدہ

کالی کا ٹیڑھی تصویریں اسوائے لوٹے کی شکل کے، ص ص کے اسے کچھ نہ بھایا

اور جیم کو تو وہ دیکھ کر تپتی تھی گئی۔ کس قدر اتراٹی ہوئی ہتھروانی کی شکل کی تھی! تو بہ!

الف سے انار! منجھو، بھلا کیسے؟ یہ ٹکے کی شکل کا انار، نہ لال مال چنگاریاں نہ

کچھ بالکل ردی۔ خیر الف تو وہ پڑھو لے گی مگر "جیم" تو مر جائے جب بھی نہیں پڑھے گی۔ بہت ہوگا منجھو گھونے مارے گی، مگر ہر لح ہی کیا ہے! مارنے دو، اپنا کیا جاتا ہے! کھم سے، جیسے محرم میں ڈھول بجا! اس پر پھر کسی کو محرم کے ڈھول کی طرح میٹ ڈالنے کا جنون سوار ہوا مگر وہ ضبط کر گئی۔ اس نے دھیان بٹانے کے لیے قاعدہ اٹھا لیا۔ کت کت مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے اسپینے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چھنے لگیں۔ یونی جو سر سے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچے زخم کی طرح ٹانجے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مڑا آیا، جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں پر سے اتر رہی ہو۔ قاعدے کے ورق بھر گئے۔

اُسے! منجھو نثریہ برائے گی، اور کیا عجب جو مار بھی بیٹھے! اس نے جلدی سے قاعدے کے ورق سمیٹ کر مشین کے دانتوں کے نیچے رکھ دیے اور منڈل گھماتی رہی۔ کت کت، کت کت۔ وہ ادھر سے ادھر ٹپی متاقی سے چلا ماری، یہاں تک کہ قاعدہ سوزنی کی طرح ٹانگوں سے بھر گیا۔ خیر اچھا ہوا، "ص من" تلخمت چائے دانی کی شکل کے غارت ہو گئے اور "جیم" بھی مٹ گیا۔

مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونٹوں سے نیا وہ وزنی گھونٹا جابایا، اس کے بعد تقیڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سبکیاں بھرتی رہی۔ اگر ہر بار مار پڑنے پر آنسو گرانے لازمی ہوتا تو یقیناً مصیبت ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کے ویلے کبھی بکے نہ گئے ہوتے۔ ادھر منجھو کے تقیڑوں کا خزانہ کم ہوتا نہ نظر آتا، اور جو وہ ہر تقیڑ پر ایک آنسو بھی بہاتی تو سات سمندر کا پانی ہوتا سو بھی خشک ہو جاتا۔ اس لیے وہ اب بس گلے سے رویا کرتی تھی، دماغ بالکل پرسکون اور غیر متاثر رہتا۔

یہ دوسری کتاب تھی جس سے اُسے لاپٹی بغض ہو گیا۔ ایک تو وہ ناول ہی کیا کم تھی جسے پڑھتے وقت منجھوئی اس کی کسی آہ وزاری پر کان نہیں دھرتی تھی، اب دوسری یہ جس کی آمد ہی منجھوئی میں ثابت ہوئی۔

مگر یہ کتاب تو اس کی جان کو چھٹے گئی، ایسی کہ چھٹنا دشوار ہو گیا۔ الف تو خیر دل پر پتھر رکھ کر پڑھ لیا مگر جسم، حتیٰ کہ من و کبھت بھی پڑھنا پڑے۔ حیرت تو اسے جب ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ۔

ابتداءً عشق ہے روتا ہے کیا؟ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

بات یوں ہوئی اس نے ایک دن منجھو سے پوچھا:

”منجھو بی، جب قاعدہ ختم ہو جائے گا تو مٹھائی بیٹے کی نا؟“

”ہاں، اور پھر دوسری کتاب شروع ہوگی۔“

”دوسری؟... پتھر؟“

”پھر پڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کر نا، منجھو نے نہایت معصومیت سے بتایا۔ کس۔۔۔ اور گئی تے وہ اسے آنے والی بلاؤں سے دوچار کر رہی تھی!“

خاموش۔ اپنی گود میں باغی سمیٹ وہ بیٹھی رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹی سی بھیا نک کتاب اس کے سر پر پتھر کی سل کی طرح گر گئی ہے جس میں من و کبھت اور ج سے بھی زیادہ کلمے اور غیر دلچسپ الفاظ موجود ہیں۔ بہت سے بہن بھائیوں اور بھروسے پر سے خاندان میں زندگی کے دان ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے، جیسے کوئی بہت سے کنکروں کو سوپ میں ڈال کر پھٹک رہا ہے اور ہر کنکر سوپ کے دندانوں میں پنبے گاڑے جہاں ہوا ہے۔ سائیں سائیں، لمبے لمبے پینکوں کی طرح زندگی گزر رہی تھی۔

(۳)

منجھو بی مارتی تھی تو کیا تھا، دُلا رہی تو کرتی تھی۔ پیٹ کوٹ کر جب اسے خوب رُلا چلتی تو سینے کی گرمی سے اس کے سارے زخم سلیک دیتی۔ پر اب اس کی زبان چل نکلی تھی۔ باب منجھو مارتی تو وہ کوسنے دینے لگتی جو اس نے نوکرانیوں سے سیکھ



لیے تھے،

”مر جائے، اللہ کرے منجھو بھی مر جائے! اماں اپنی لاڈلی کو کرستے دیکھ کر خوب بگڑیں۔

”دکھو دکے گاڑ دوں گی جو میری لچھی کو کوسا، کلمو ہی کہیں کی یہ وہ خود تو اماں کی بچی تھی نہیں، اس کی بد معاش اتا کے پانے کے بعد سے منجھو بھی اس کی ماں تھی۔ یوں کہو کہ اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے۔“ اماں نے سکھایا۔ اور اس نے یوں ہی کہنا شروع کیا۔

”اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے۔ منجھو بی کا بیاہ ہو جائے۔“ اس کو سنے کا کافی اثر ہوتا۔ پہلے تو منجھو بگڑتی اور زور سے دھمو کے مارتی مگر پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر شرمانے لگتی۔

دعا نہ جانے کیسے غریبے وقت منہ سے نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑ بڑ تھی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر اچھا پھیل ہو گیا۔ منجھو گھیر گھا کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھایاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے، اچھا خاصہ گڑھاٹ بن گیا۔ دنیا بھر کی عورتیں، لال ہرے کپڑوں میں لپیٹ کر دوڑ پڑیں۔ دہوا دھوں باجے بجنے لگے۔ جب عورتیں منجھو کا دولہا دیکھنے دوڑیں تو وہ بھی بلک گئی۔ کسی نے اُسے گرو میں لے کر دولہا دکھانا چاہا مگر وہ نہ دیکھ سکی۔ ”یہ تو آدمی ہے، دولہا۔“ وہ چلائی اور چل گئی۔ پھر کسی نے اُسے دولہا دکھانا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھی اکتا کر بیٹھنے میں بسی ہوئی منجھو سے لپٹ کر سو گئی۔

رسموں کے وقت لوگوں نے چاہا وہ دولہا کے ہندی لگا دے، مگر وہ اس پر بھی بگڑ کھڑی ہوئی کہ اول تو وہ دولہا نہیں سیدھا سادہ آدمی ہے اور آدمی ہندی نہیں لگاتے۔ اس پر اُسے دلوانی کہہ کر دور ڈھکیل دیا گیا۔ منجھو تو بس نئی بیٹی تھی اس لیے وہ بے نتیجے بل کی طرح کھومتی رہی۔ پہلے

تو اُس نے بری کی شکریہ ادا کر خوب غسل خانے سے ٹنگوں میں گھولی جس سے بیویاں استنجہ کر کے باہر جو اس سے ہو گئیں۔ اس کے بعد باہر چلی خانے کی طرف متوجہ ہوئی اور وہاں خوب ہانڈیوں میں نمک، کوئلے اور راکھ بھونکی۔ باہر چلی کسی دوسری طرف گئے ہوئے تھے وہ کپڑے پیالے گھسنے لگی۔ چاندی کے ورق اور لپستوں کی ہوائیاں لگے ہوئے پیالے کا مدار شطرنج کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ بڑے ہی بھلے معلوم ہوئے۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا ان کے پیچ میں جو خالی جگہ ہے وہاں پر رکھ رکھ کر چلے۔ وہ تول تول کر قدم اٹھانے لگی۔ ایک... دو... تین... کسی نے دیکھ لیا اور وہ گر پڑا کہ جو بھاگی تو دھڑام سے گھیر کر کیڑی میں سر سے پیر تک لت پٹ نہ جانے کس نے اُسے نہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو منجھو کے نہلانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یوں رساں رساں نہلانے سے وہ چڑھ گئی اور خوب خندیں کہیں، پانی کے چھینٹے اڑا۔ وہ عورت تو کمر بند کی لکڑی ڈھونڈنے لگی اور اس نے تیرہ باندھ کر ٹھلنا شروع کیا۔ منجھو کی بھاری بھاری ہین کے جوڑ سے نہلانے کے لیے ایک کمرے میں سجا دیے گئے تھے۔ اُس نے سارے نو رچ کر تھوکر سے، ہاتھ پر چپکا دیے، سلیہ کے تار کھینچ کر اُن کے چھینے بنائے، ڈوپیٹوں کی تھیں کھول کر خوب پھیلا دیے۔ اتنے میں اس کی نظر گوٹ لگی، ہونٹوں پر بڑی جھلمل کر تی نہر کا ڈور یا اُسے انہیں پینے کا کتنا ارمان تھا مگر اسے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھی۔ اماں تو غسل خانے میں ایسے چھپ کر بہنیں جلیے موٹی سی گالی ہو، اور پیلے کپڑوں کے ڈبے میں اُس کا ہاتھ بھی تو نہ جاتا تھا۔ جلدی جلدی اُس نے چاروں طرف دیکھ کر اُسے طے سیدھے سو رانوں میں ہاتھ ڈالی کر ڈوریاں پھلے میں کس میں، پھر اُس نے بھاری کریم کا ڈوپیٹہ نکال کر اوڑھ لیا اور اگلے کا پا جامہ دیکھ کر اُس کے دل میں ہرکین سی اُٹھنے لگی۔ جانچنے پہنچنے پہنچنے اُس کا جی متلا گیا تھا۔ جہاں جھنکار پھولوں کا ڈھیر اُس نے گھسیٹ کر ٹانگوں میں چھپسا لیا۔ پھر کمرے کے ڈوپیٹے کا گھونگٹ نکال کر وہ چاروں طرف فرضی مہانوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔

”جیتی رہو بیٹی، دو دھوں نہاؤ پوتوں بھیلو“ اُس نے انہیں کہتے سنا۔ اور پھر ٹوٹوڑی اپنی متیلی پر نکلا کر گھر والیوں کی طرح :  
 ”ہاری رسین، اور رسین ! کہاں کر گئی ماڑی ! جابعلی بخش سے کہہ کہ سودا  
 نہیں لائے اماں جلدی سے لائیں مونگ کی دال اور . . . اور بھنی ہوئی گرم  
 گرم مونگ پھلیاں۔ ہاں، شمن کی کے لیے شکر کی گولیاں بھی۔“  
 وہ خیالِ اماں کو ڈانٹنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اُسے یاد آیا کہ ارے، ننھا تو  
 گھٹنے پر سوراخ ہے ! جاگ گیا۔ اُس نے پھرتی سے گھٹنا ہلانا شروع کیا جیسے بچے کو  
 ہانک رہے دسے رہی ہے :

”وہاں میرا جاندا، میرا کلیجے کا طپیلہ اسے بھوکا ہے دو پٹے گا ! اُوں اُوں“  
 کرتا کرتا کہ وہ نقل میں گھٹنے کو دو بوجھنے لگی، مگر فوراً ہی کسی ادارہ پھر کے کاسٹ  
 ہوئے نشان نے اُس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ پتہ چھوٹا کدو ہو نہٹ لگا کر دوڑا  
 دیکھنے لگی :-

”کاٹ کھا یا مری پیٹے نے !“ وہ اپنے گھٹنے پر چپٹیں لگا نے لگی۔ اور پھر  
 اسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا۔ دھما دھم اُس کے چیر کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں  
 سے گھٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کیلین کر کے رکھ دیا۔ لوگ آگئے اور  
 اُسے بوڑھی گھسیٹ کر باہر نکال دیا گیا۔ اتنی فرصت کسے تھی جو اُس کا پا جامہ ڈھونڈ  
 کر پناہا ! لہذا اشام تک وہ تولیہ لپیٹے ادھر ادھر گھومتی رہی ۔

مگر اُسے ایک تجربہ ضرور ہوا کہ تولیہ پا جامے سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید  
 ہوتا ہے : ایک تو گھڑی گھڑی کرینڈھیلانگ کالنے کی ضرورت نہیں پڑتی ،  
 دوسرے اس عجیب و غریب ہیئت میں دیکھ کر بہت سے بچے تو آتشِ رشک سے  
 جھنجھے جا رہے تھے۔ دو چار اسم تاک میں لگے تھے کہ تولیہ مٹ جائے تو اسے نہ لگا  
 دیکھ لیں، مگر وہ انہیں جوتیوں سے مار مار کر ہنگامہ ہی تھی۔ اسے اس کیل میں بڑا  
 نرا آرام تھا ۔

”ہم سب سے ہیں، ہمیں جگہ نامستی!، وہ بن کر سو جاتی اور بد ذات بچے اس کا توبہ پھینکے گئے۔ پھر وہ جاگ جاتی اور خوب ناخونوں اور دانتوں سے ان کی تواضع کرتی۔“

جدھر وہ نکل جاتی سب اس سے ڈانٹتے۔ بہنیں حدیثیں لگا کر دھتکار دیتیں مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ تالہ کھول کر اس کا پیغام نہ نکالے۔ خدا خدا کر کے شام کو جب دولہا کے انچل یا کسی دوسری ضروری رسم کا وقت آیا تو اس کی تلاش ہوئی اور وہ پچھلے والا ان میں عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہوئی پھوٹ کر ماری گئی۔

دولہا آیا، غل جھا، کسی نے اسے جوتا چھپا لے کر دیا۔ بڑی دیر تک تو وہ اس جوتے سے کھیلتی رہی، پھر سو گئی۔ رات کو جب دولہا باہر لے لگا تو سیرتے کی ڈھنگی پڑی، لوگوں نے اسے جگایا تو وہ بوکھا کر ان سے لپٹے گئی۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھی، بے تماشہ چلائی: ”دونی... اس سے میری دونی!“

کہتے ہیں دولہا شوڑا ننگے پیر گیا۔ مگر کو جوتا پہنے کسے پانی میں لاش کی طرح پھولا ہوا۔ خوب سمیٹنوں نے اس کا شربت پیاد۔ لاکھ لوگوں نے چاہا کہ وہ تباہ کر اس نے جوتا ٹٹکے میں کس غرض سے ڈالا تھا، مگر وہ کچھ بھی نہ بنا سکی۔

”جوتا ٹٹکا“ وہ یہی پوچھتی رہی، مگر پھولا ہوا جوتا دیکھ کر اس کے دل میں گدگد سی ہونے لگی اور وہ ہنستے ہنستے بے حالی ہو گئی۔

(۴)

جب مجھو بیاہ کر جانے لگی تو شمن ذرا بھی نہ روئی بلکہ چپکے سے پاکی میں جا کر بیٹھ گئی۔ مجھو جانے سے پہلے اسے یاد کرتی رہی مگر وہ نہ ملی۔ جب وہیں اور اس کی ساتھ ایلائی پاکی میں بیٹھیں تو ان میں سے سب سے موٹی عورت شمن کی گود میں چرطو بیٹھی۔ وہ زور سے چلاتی مگر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئی اور موٹی عورت کے کولہوں میں پچکچا کر دانت گاڑ دیے۔ ایک غدر میچ گیا، پاکی لوٹتے لوٹتے بچی، مگر شمن پڑا ہی گئی۔ لوگوں نے اسے گھسیٹ کر اتار لیا۔ ہزار لائیں چاٹیں

کو سا، گائیاں بکریں مگر کوئی سنوائی نہیں، موٹی۔  
 منجھوٹی چلا گئی، گھر میں جیسے موت ہو گئی! سارا گھر سو گیا مگر شمع کے جیسے کی نیند  
 غائب تھی۔ کئی دفعہ وہ منجھو کو پرنا پرکار روئی، پتکیاں لیتے لیتے حلقی دکھ گیا، آواز  
 پڑ گئی، مگر کون سنتا؟

”منجھوٹی... منجھوٹی... ہائے منجھوٹی؟“ وہ رات بھر سسکیوں سے چارتی  
 رہی۔ شادی کے تنکے بار سے مہمان اور میزبان دنیا سے بے خبر سو رہے تھے اور  
 وہ ایک ہی ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

منجھو کے جاتے ہی اُس کی گت بن گئی۔ کئی دن تک تو کسی کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ  
 بھی گھر میں رہے یا نہیں، نہ مانے اور کنگھی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ جب بہت ہی  
 اس میں سے بے بس پوچھنے لگی تو سڑتی ہوئی نالی کی طرح لوگ اس سے دُور دُور رہنے  
 لگے۔ میل اور کھلی سے بے قرار ہو کر وہ راتوں کو چلاتی اور دن بھر کونوں کھڑوں  
 میں ٹھیکتی پھرتی۔ تب اماں کو نہاد سے کا خیال آیا۔

سر کے بال چمک کر چٹائی بن گئے تھے اور بدن پہیلی کی پٹیاں بندھ بندھ  
 کر اکھڑ رہی تھیں۔ ناخن کے پس کی کہاں تھی! سبب اُس نے نہلا ناچا تو اُسے مارنے  
 لگی۔ بال بچھڑ تو اُسے پھاڑ کر تنگی بوجھ بھاگی۔ دونوں میں بڑی دیر تک برا آمد سے  
 میں رہیں ہوتی رہی۔ شمع تگے آگے اور ناٹھی پیچھے تھیں۔ آخر کو موری کے پاس  
 پھسل کر گر پڑی۔ ناٹھی نے پکڑ دھکیلا کہ نہلا تو دیا، مگر کیسا ایسا، وہ خود ہی جانتی  
 تھی! اُلجھے بال ویسے ہی میل اور چمکے، کاجو ناٹھ رہے۔ میل ذرا پانی ڈالنے  
 سے پھول گیا اور میلے کپڑے کی رگڑ سے نئی دُور ہو گئی، پستہ ویسا ہی ہمارا اور  
 اس نے کپڑے پہن لیے۔ پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن وہ نہانی اماں موٹی سی مچھی لے  
 کر بیٹھ جائیں اور بچے مچ کی لاش نہلائی جاتی، کیونکہ ایسی ویسی مار کو رد خاطر ہی میں  
 کب لاتی تھی۔  
 دن بھر وہ منجھو کو بھڑکے رہتی مگر رات کو وہی منجھوٹی کی رٹ لگاتی۔ تنکے آگے

اماں نے بوڑھی دوا سے کہا کہ رو بوا تم ہی سالا لوالہ داری کو یہ مگر شمن نے سوتے میں انہیں اپنے پاس لیٹا دیکھ کر اُن کے بال کھسکے ڈالے اور ڈھکیل دیا۔ اکیلی پڑی اپنی ہتھیلیوں کو چبایا کرتی۔ جب سب سو جاتے وہ جاگا کرتی، اُس کے ہاتھ منجھو کی گردن کی تلاش میں کھڑی پیوں پر رینگا کرتے۔ اُس کا ہی چاہتا بس ایک دفعہ وہ نرم نرم گردن اس کی گرفت میں آجائے، پھر تو وہ مر جائے گی پرنہیں چھوڑے گی۔ پڑی پڑی وہ منجھو کے کہنے دو لہا کو کوسا کرتی سو اُسے چل کی طرح جھٹکا مار کر چھپیں لے گیا۔ وہ منجھو کے اس نابکار دو لہا کو کوسنا بھی شاید خدا لے۔ سو آیا اور ایک دن تار آیا اور گھر میں ماتم ہونے لگا۔

”تمہارے دو لہا بھائی مر گئے، تم روتی نہیں؟“ تحفیدارنی کے لڑکے نے اس سے کہا۔

”کون، منجھو بی کا دولہا؟“ وہ خوشی سے پوچھی۔

”نہیں، بڑی آپا کے دولہا،“ شاک پر دے بڑی آپا کے دولہا کے مرنے کا کہے ارمان تھا! بد مزاج کہیں کہے بچپنی دفعہ گئے لائے تو سارے اماں کو بھجوا دیے، ایک پوری بھی نہ چھوٹے دی۔ اسے سخت نا ائید ہی ہوئی اور وہ در پڑی۔ سب سمجھے وہ غم میں شریک ہو رہی ہے۔ اس لیے ادھر بچوں کے ساتھ ہمارے کو اُسے تحفیدارنی کے یہاں بھجوا دیا گیا جہاں اُسے بچنے ہوئے بیٹھے انڈے کھا رہے تھے۔

”جب منجھو بی کا دولہا مرے گا تو اس سے بھی مزید ادا لے لیں گے اگے انڈوں کا مزہ دینے تک منہ نہیں فائدہ کرنے کی کوشش کر کے سوچتی رہی۔“

بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے میں آئی رہی۔ اُس کے دونوں بچے بھی آگے جنہیں چھوٹے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کدورتی کے گھبرائے میں ہاتھ ڈالو تو کس زور کی ٹھونگ مارتی ہے، ایسے ہی جب بڑی آپا کے بچوں کو کوئی چھتا جھٹکا رٹتی ہوئی پکیتی۔

جب خدا خدا کر کے منجھو سسرال آئی تو شمن کا بار سے غصہ کے بڑا حال ہو گیا۔ وہ تو سمجھی تھی جیسے وہ اُس کے انیر دیوانی کتیا بن گئی ہے منجھو بھی میل کچلی چوہیا روتی بسورتی اُس سے گی، مگر اُسے پہلے سے بھی موٹا اور زیادہ لال دکھ کر اُسے اپنی سخت ہنسک محسوس ہوئی۔ جھوٹی کہیں کی! اماں کو نکالنا کرتی تھی، دو تھپے اپنی شمن بہت یاد آتی ہے، "خاک یاد آتی ہوتی تو یوں طباق سا چہرہ نہ رہتا۔ سر سے پر ہلک ریشمی کپڑوں میں غرق۔ بختے زلیور، کانوں میں لمبے لمبے تھمکے، جنھیں بات کرتے ہیں وہ قصداً جھلاتی، اندر ناک میں جھپکتی ہوئی کیل۔ شرما کر بات کرتے ہیں وہ ہمیشہ اس کیل کو نزاکت سے آنکھ نمچی کر کے دیکھنے کا انداز، اور وہ باریک ریشم کی جالی کا کرتاجس کے اندر سے گوشتے کی چوٹی بادلوں میں چھپے چاند کی طرح جھللا اٹھتی۔ آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح سب کے گلوں سے ٹٹنے لگی مگر اُس نے شمن کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ ساری پھولی جیسی فراکیں مرجھا گئی تھیں اور جائیگوں کے بجائے اُونٹنکے بد وضع پا جا مے پہننے لگی تھیں۔ بڑی دیر بعد نہ جانے کیسے وہ اُسے یاد آ ہی گئی،

"شمن کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا اور اُس کے دل کو بڑی طرح ٹھیس لگی۔ اُدھو تو اب بی منجھو اُسے پہچانیں گی بھی نہیں۔ یہ گھنٹہ بھر سے دروازے سے لگا کون ٹٹکلی باندھے اُسے دیکھے جا رہا ہے؟ کس نے کئی بار اُس کا ریشمی دوپٹہ چھو کر متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کیں؟ اور یہ کون مبر کیے دیوار سے خاموش لگا کھڑا ہے! شمن نہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر اُسے ماں، بہنوں کے گلے سے فرصت ملے تو کسی اور کا بھی دھڑکتا ہوا دل ذرا سکون پاٹے۔ آپا کی لڑکی نورسی کو تو آتے ہی گلچے سے لگا لیا اور شمن جیسے پھل پیری چڑیل بھی کہ لوگوں کو نظر بھی نہ آئی!

مگر پھر بھی جب منجھو نے اُسے اپنے ہنکتے ہوئے سینے سے لگا لیا تو اُس کے دل میں ہزاروں سوتے پھوٹ نکلے اور سونکھی سونکھی ہچکیاں لیتی وہ اُس کے شالے

سے ٹھک گئی۔

”جو بیٹیں، جو بیٹیں، اُسے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جو بیٹیں بھری پڑی ہیں۔“  
آپا اور اماں چٹائیوں اور منجھو نے ڈر کر اسے دور دھکیل دیا۔

”گناہی ہیں یہ بھنگن کی لونڈیا۔“ نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔  
منجھو پھر باتوں کے ریلے میں بہہ گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ شمن دھکا کھا کر باہر چل  
دی اور چپکے سے سڑک کر میلے کپڑوں کے گھٹڑ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے  
لگی۔ کچھ وہ دل اور دماغ دونوں سے رو رہی تھی۔ کھارے کھارے آنسو میٹے  
بدبو دار کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ نہ جانے کب تک وہ پڑی روتی رہی  
کسی کو یاد بھی نہ آئی۔ کچھ دیر گزر کر منجھو کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے تھے، اُسی  
اب بھی اُس کی گود میں ڈٹی اس کی چپا کلی سے کھیل رہی تھی۔ منجھو نے گڑیا نکال کر اُسے  
دی اور دوسری نکال کر شمن کو پکارا:

”نہیں ہم دونوں لیس گئے اے، نوری چل گئی۔ ویسے شمن اتنی ذلیل نہ تھی جو منجھو  
کی گڑیا پر اُس کی نیت بھجکتی مگر جب دونوں گڑیاں نوری داب بیٹھی تو وہ ضبط  
نہ کر سکی، اُس نے منہ پھیر لیا اور چھت نہیں اٹکے ہوئے جالوں کو دیکھتی رہی جس میں  
نیلم مردہ مکھیاں جھول رہی تھیں۔ اُس پر پھر دورہ سا پڑ گیا، وہ دانٹوں سے  
میلے کپڑے کھسکاتے لگی۔ بدبو دار پاجامے، سٹری ہوئی بنیائیں اور لبساند سے  
کرتے۔ وہ غصے میں اُن سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔

تھک کر وہ باہر برآمدے میں آکر کونے میں بیٹھ گئی۔ آج اُسے ایسا معلوم  
ہوتا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہے۔ آزمانے کے  
لئے وہ کئی بار سامنے سے گزری مگر نہ منجھو نے اُسے دیکھا اور نہ نوری نے، جو  
دونوں گڑیاں میٹے منجھو کے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔

منجھو کے پلنگ میں ابھی تک دھنناپے کے دھندلے سے نشانات موجود  
تھے جیسے وہی سرخ ساٹن کے جن پر جھاگ چھپ کر چلے ہوئے غلاف چڑھے



تھے اور وہی کارچونی گوٹ کی رہنمائی۔ نورسی اُس کے تکیوں پر سراوندھا سٹے  
تلا بازیاں کھا رہی تھی۔ شمن کا کتنا جی چاہا کہ جاکہ نورسی کو اتنی زور سے دھکیلے کہ  
کہ وہ اندھے کو اُٹھ میں جاگرے اور پھر دونوں گڑیاں تپیں لے۔

دیر تک بدبختی منجھو کے مہندی لگے پیروں کو پانگ سے نیچے سے جھانک کر  
دیکھتی رہی۔ لال لالی پیر خبی میں گھنگرودار پانڈیب، اُس کا گلا رقت سے بھنچ گیا۔  
کاش وہ سب کی آنکھ بجا کر کسی طرح پانگ کے نیچے رنگ کر پہنچ جاتی اور اُن در  
گھنگرودوں کو آہستہ سے اُٹھائی سے بجا کر دیکھتی جو اُس کی جنا آلود اپڑی پر ہلکی ہلکی  
جنبشوں سے ناچ اُٹھتے تھے۔ اتنے میں اُسے نورسی نے دیکھ لیا۔

”خاکہ جان شمن سہترانی کی لڑکی ہیں۔ یہ انہیں نانی نے مہنگن سے دو پیسے  
کو لیا تھا۔ وہ تنلا کر بولی اور برٹسی آپا لے پیار سے اُس کے تھپڑ لگایا۔ منجھو نے  
مڑ کر اُسے دیکھ لیا، مگر وہ دماں سے بھاگ آئی۔ پھر منجھو کا دولہا بھی گھر میں آ گیا۔  
منجھو کچھ شرمائی کچھ اترائی باتیں کرتی رہی۔ دولہا کی آنکھیں شاید تیز تھیں، اُس نے  
شمن کا بھوت دیکھ لیا۔

”ارے بھئی یہ تہاری بہن شمن کیوں انک کھڑی ہے؟“

”ان کے جوئیں ہیں۔“ نورسی نے جلدی سے اطلاع دی۔

”اُسے بے جوئیں! یہ تو بڑی بات ہے، چہ چہ۔“ شمن اور جل گئی، یہ

کجخت کون ہوتا ہے چہ چہ کر لے والا۔

”بھئی یہاں آؤ۔“ اُس نے پھر بلایا۔

”انہیں منت بلائیے۔ یہ بُری ہیں، ان سے کوئی بھی نہیں بولتا۔“ نورسی دولہا

کی گود میں جی پیڑھ لگئی اور پھر دولہا نے منجھو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔

اُس نے چونک کر شمن کی طرف دیکھا، شمن سمجھ گئی اور پھر گرتی پرتی بھاگی لڑا ب

اُس کے ساتھ ہمدردی جتانے کی سازش ہو رہی ہے۔

پھر اندھیری کو کھڑی میں جا کر اُس نے ”منجھو، منجھو، بی“ پکارنا شروع کیا

مگر بیکار جیسے وہ کسی مرد سے کو قبر سے کھینچ بلاسنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ منہ  
 اوندھا سٹے وہ پڑی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ جھٹک کر اسے چونکا دیا۔  
 "خبردار جو یوں میل کچیل بھٹو کے کمرے میں گئی، مردار کہیں کی بڑی آپا نے  
 بے رحمی سے اسے جھجھوڑیاں دیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ کچکیا کر لپٹ ہی  
 جاتی اور ان کی لڑکیاں اڑا دیتی مگر اس وقت تو کسی نے اس کے سارے احساسات  
 پر چوٹیں مار مار کر سن کر دیا تھا وہ سم کر دوسری طرف جانے لگی، اتنے میں بھٹو باہر  
 نکل آئی۔"

"شمن" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شمن کہ بڑی بہادری سے کام  
 لینا پڑا۔ ورنہ اس کے ہسم کا روال روال کچھ کر بھٹو میں جذب ہو جانے کے لیے  
 ترپ اٹھتا۔

بد چل آدمی بکھنت، کیا گت بنالی ہے، ذرا سے دنوں میں بھٹو نے کس  
 کے دو گھونٹے جھائے۔ شمن پھوٹ پڑی۔ نوکھ سے نہیں، ان توجہ بھر سے گھونسوں  
 کی لذت سے اس کا جی دکھ اٹھا۔ ٹھیسٹی ہوئی اسے غسل خانہ میں لے گئی۔ شمن کا دل  
 زور سے دھڑکنے لگا، آفسویے تاب ہو کر بنکے، گٹھے ہوئے بخار اٹھ پڑے  
 بھٹو کے گھونٹے کی شیرینی، جس کے لیے وہ ترس گئی تھی، اس کی رگ رگ میں  
 تیر گئی اور پھر گھسٹوں، پھپھڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح  
 پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا اور اس لاش کو دوبارہ جگا دیا جو بالکل اس کے  
 اندر مڑ گئی تھی۔ خون سرعت سے دوڑنے لگا، مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور ذرا  
 سی دیر میں وہ پُرانی شمن کی طرح فادلا جانے لگی۔

بھٹو کو بھی جیسے بہت دن کی چھوٹی شراب ماٹھ آئی، بس ٹوٹ ہی تو پڑی۔ پھر  
 بال توجہ توجہ کر لنگھی کی اور سامان کھانا پینا چھوڑ کر اس کی جو بے تکلیف سب  
 نے بہتر منع کیا مگر اسے تو جیسے گرتے ہوئے مکان کی مرمت کرنا تھی۔ وہ بھی  
 برسات سے پہلے پہلے۔ شام کو شمن کے پیر زمین پر نہ پڑے تھے۔ بدن تو ہلکا ہوا

ہی تھا، جی ایسا ہلکا ہو گیا کہ وہ دھما دھم منجھو کے پلنگ پر فلا بازیاں کھانے لگی، دھواں دھواں تکیوں کو پیٹ ڈالا اور رکھائی کا تبتوتان کر لائیں چلائے لگی۔  
 وہ ہیں، ہیں، پھٹ جائے گی رضائی؛ ”آ جا چائیں یہ بس ذرا ڈھیل دی اور اتارنے لگیں۔ کجخت بات کرنے کے لائق نہیں۔ نوری بھی تو ہے، مگر یہ دیوانی حرکتیں نہیں کرتی۔“

شمن نے دیکھا نوری منجھو کے در لھا کی گود میں بیٹھی بیٹا کی طرح چمک رہی ہے۔ اُس کا جی سلگ اٹھا۔ بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینہ کہیں کی اہرات میں اماں بیٹیاں ذلیل کرنے آن مرنی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک، وہ بھدی، نوری منس مٹھ شریلی، باقیڑا اور پڑھنے میں تیز وہ بدر مزاج، بد تمیز اور پھو پڑھنے سے دم چراتی، نوری روز کا سبق قرآن شریف کا، جھڈ پٹے یاد کر، سنا دیتی شمن اس بات پر ہزاروں ٹھکرا رہی پڑتیں، وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی، نوری ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر پکڑی ہو کر نماز پڑھتی لوگ واہ واہ کرتے مگر شمن خوب جانتی تھی کہ اُسے نماز خاک بھی نہیں آتی کھڑی بڑبڑ ہونٹ بلالید کرتی ہے۔ اُسے نماز کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھی، ویسے گھر میں پڑھتا بھی کوئی نہ تھا بڑی آپا نے تو بیوہ ہونے کے بعد زوروں شوروں سے نماز پکڑی، دوسرے وہ عموماً نجس رہا کرتی تھی اس لئے کوئی نماز سکھاتا بھی تو نہ تھا۔

اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس واپس پائی، مونی منجھو کا کیا کرے؛ اُس سے پلٹے پلٹے تو وہ ٹھنک گئی تھی، چھوٹے چھوٹے دل اکتا گیا تھا مگر پھر بھی جھوک باقی تھی۔

رات کو کھانے پر وہ ٹھنک ٹھنک کر منجھو ہی سے سب کچھ مانگتی رہی؛  
 ”ٹھنک، بوٹی۔ سالن۔ گروہ۔ بینگ کی ہڈی لیں گے۔ نہیں منٹھائی، ہمارے مچھیں لگ رہی ہیں چھچھے سے کھائیں گے۔“ منجھو باتوں میں مشغول اُس کی

فرائشیں ٹھیک طرح پوری نہیں کر رہی تھی اور جب شمن نے سالن کا ڈونگا اُچلے  
 دسترخوان پر اوندھا دیا تو اماں اور آپائیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں موبائیں۔  
 ”چلو اُٹھو“ منجھو روکتی ہی رہی مگر بڑی آپا اُسے گھسیٹ کر برآمدے میں کھینچ  
 آئیں۔

”آواز نکالی تو دم گھونٹ دوں گی۔“ اگر کوئی اور ہوتا تو شمن اُس سے لپٹ  
 کر گھسٹنے لگتی، مگر آپا سے وہ دوڑتی تھی کیونکہ انہوں نے ایک دن ایسی بے دردی  
 سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس بے رحمی میں شمن کو ایسی کبرہ  
 نفرت پوشیدہ نظر آئی تھی کہ وہ سمجھتی تھی۔ اس دن سے بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر  
 بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر ان کی گھر کی سے شمن کا منبہ اٹھتی ہے اور فوراً کہنا مان لیتی  
 ہے۔ مگر انہوں نے یہ کہیں نہ دیکھا کہ یوں کہنا مانتے وقت شمن کی آنکھیں کسی خوفناک  
 نفرت سے دھک اٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پھر سے میں بنا شیر سدھانے والے کے  
 چابک سے ڈرتا ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں جو خوفی نفرت نظر آتی ہے اُسے کچھ  
 سدھانے والے کا جی ہی جانتا ہے۔ ایک ذرا دیر کو جو یہ منبر ہاتھ سے چھوٹ پڑے  
 تو کیا ہوا جب وہ اُسے ڈانٹتی تو شمن خاموشی سے انہیں ایسے دیکھتی کہ اُس کا غصہ  
 پیوگتا ہو جاتا اور وہ اُسے چبا ڈالنا چاہتیں۔

شمن کھانے پر سے تو ہٹا دی گئی تھی مگر منجھو کے پلنگ پر لیٹنے کا تو پورا پورا  
 حق رکھتی تھی۔ وہ خاموش ضبط کیے لیٹی رہی کہ کہیں آپا کوئی بہانا بنا کر اس کی جگہ توڑی  
 کہ منجھو کے پلنگ پر نہ سلا دے، اس کی یہ عادت تھی کہ ہر جگہ اپنی بیٹی کو ٹھونسے جاتی  
 تھی۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ جا کر اپنے پلنگ پر سے اُٹھو تو وہ بچھری گئی: ”نیں ہم  
 تو منجھو کے پاس سوئیں گے۔“

”رہنے دو کیا، یہیں سو رہنے دو، کیا ہے؟“ منجھو شرما کر اپنی کیبل دیکھنے  
 لگی۔ شمن نے سوچا کوئی اُٹھانہ دے، وہ جلدی سے سوئی بن گئی مگر وہ اتنی اُسے نیند  
 آگئی اور وہ منجھو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ سوئی رہی۔

رات کو جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے جلدی جلدی منہ کی گڑبڑ سٹونے کے لیے ہاتھ پھیلائے مگر ایک دم وہ رنج و عنایت سے رو پڑی کیونکہ اُس کا ہاتھ بچا منجھو کی گرم گرم گردن کے پٹی پر بیسی سے پڑا ہوا تھا۔ یہ تو اُس کا اپنا پلنگ تھا جس سے اسے قبر سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور گھسی گھسی آدنیہ منجھو کو بکارنے لگی۔

وچپ چڑیل، خردوار جو آواز نکالی "پاس کے پلنگ سے بڑی آباغرائی۔ اوہ، اب وہ سمجھ گئی! موتے میں ظالموں نے اُسے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا۔ وہ جلدی سے منجھو کے کمرے کے پاس گئی، دروازے بند تھے اور اندھیرا گھپ تھا مگر منجھو کے منہ سے اور دو لہا کی کھسک بھری آوازیں آرہی تھیں۔ "منجھو، منجھو بی بی میں ہوں، تمہاری شمن... دروازہ کھولو" منجھو بی کی ہنسی ایک دم رُک گئی مگر دروازہ نہ کھلا۔

رومنجھو بی، شمن ہوں... دروازہ کھولو" وہ التجائیں کرنے لگی۔

"اے سے چڑیل جان کو آگئی ہے اُس کی، ادھر چل۔ اگر اب کے پلنگ سے اٹھی تو بس کالی کو بھڑی میں بند کر دوں گی" بڑی آپا نے گھسیٹ کر اُس کی بازو پکڑی اور بھگاتی ہوئی لا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

شمن کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ خوف کی وجہ سے وہ دم گھوٹے سسکیوں سے روتی رہ سب سو رہے تھے مگر اُسے نیند نہ آئی۔ بڑی دیر تک رونے کے بعد چپ ہو گئی مگر سسکیاں نہ رکیں۔ اُسے پلنگ پر لیٹنا دو بھر ہو گیا اور اٹھ کر صحن میں چلی آئی باڑے خالے اچھے تھے مگر اُسے بالکل سردی نہ لگی۔ آنکھ میں نیم کا درخت بھوت کی طرح پڑ پھیلانے لگا تھا وہ تھوڑی دیر اُس کے کھڑور سے منہ سے لگی اپنی ہتیلیاں رگڑتی رہی۔ پھر بغیر کسی ارادے کے مرغیوں کے ڈربے پر بیٹھ گئی یہاں پھر آنسوؤں نے حملہ کر دیا اور گہری گہری سانسوں سے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہ سنان رات میں جب ہر چیز سوئی پڑی تھی اور سوائے مرغیوں کی کڑکڑ کے بال

سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلی دیوار پر سے کودی، ڈربے میں مرغیاں چوکتی ہو کر کڑکڑائیں، وہ اُٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی۔ راستے میں ایک دم اس کی نظر کیاریوں پر پڑی جہاں دھنید اور ساگ بویا ہوا تھا، اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کالا کالا اُون اُلجھا ہوا پڑا ہے۔ برٹی آپا کی کیاریاں!

آنا نانا میں وہ بھوکے شیرنی کی طرح ہری مہری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے کھسٹنا شروع کیا جیسے وہ اپنے کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو، اور پھر مٹھیوں میں لے کر اُس نے زمین پر رگڑا ڈالا۔ مرجوں کے پیر، لوکی کی میل، چھیلی اور سوگرہ کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آ جا جڑے میں لگا کر تھیں توڑ سوڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اُسے ہنسی آنے لگی، جیسے کسی نے پچکاروں سے تازہ تازہ خون اُس کے جسم میں بھر دیا۔ اُسکو بھری پھی پھی آنکھیں وحشت سے جھٹکی ہو گئیں، گھنے بال ہوا میں سنپولیوں کی طرح ہل رہے تھے اور وہ بالکل ایک چھوٹی سی مرگھٹ کی ڈانہیں معلوم ہوتی تھی جو قبر کو دے کر مرنے کے ٹھیکے میں ناخون گڑا کر اُسے دانتوں سے چبانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ تنک کرشل ہو گئی اور اُس کا جی بھر گیا اُسے اب بھی برٹی طرح ہنسی آرہی تھی: سُوکھے سُوکھے پاگل کتیا کے۔ بے بھانک تھقے لگا رہی تھی۔

”بس، بس، اب ٹھیک ہوئیں،“ اُس نے تجل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہ دس زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اُسے نہ لایا تھا، بال سنوارے تھے تو بس اب اُس کی یہی سزا ہے! اُس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں ڈالیں خوب کیاری کی کچھڑ میں قلا بازیاں لگائیں، زمین پر تھوک کر مٹھیوں سے رگڑا اور پھر نہ ہی بتیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھر لیں۔ اُس کا بس نہ تھا جو اپنے جسم کو آگ لگا کر بھس کر دیتی، تب تو منجھو کو تپہ چلتا! تھوڑی دیر میں اُس کا جی ٹھیک رہا۔ تھکن اور غصے کا آیا ہوا پسینہ خشک ہو رہا تھا اور ہوا اُس کے جسم میں سیوڑی

طرح چھو رہی تھی۔

صبح جب نوکودوں نے اُسے کچھ میں ستھر ہوا کیا ریلوں کے پاس بیہوش پایا تو خوف سے اُن کی چیخ نکل گئی۔ ماما سمجھی اُسے کسی نے قتل کر دیا کیونکہ اُس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ناک سے نکسیر پھوٹ کر ساری ٹھوڑی اور گردن پر خون جما ہوا تھا۔

چار پانچ روز تک اُسے بخار کی وجہ سے ہوش نہ آیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس کے سینے پر پلاسٹر جکڑا ہوا تھا اور منجھو بڑی پریشانی بیٹھی تھی۔ اُس کا جی خوش ہو گیا۔ بڑی آپاتک نکر مند نظر آ رہی تھی اور رات رات بھر اُس کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھی۔

پھر تو اُسے ایسا معلوم ہوا دوبارہ کسی کے یہاں اکلوتی پیدا ہو گئی۔ خوب خوب فطرت کرتی اور منجھو تو اسے اچھا ہونے پر اپنے ساتھ سلا لے کا پکا قول دے چکی تھی۔ اُس کا دل لھا چلا گیا تھا اور وہ اس کے قریب ہی سوتی تھی۔ بیماری میں خوب لاڈ ہوئے مگر دوائے قسمت وہ بڑی تیزی سے اچھی ہونے لگی۔ بخار بالکل خائب اور کمزوری نام کو نہیں۔ بڑی آپانے پھر نظر ٹیڑھی کر لی۔ انار اور انگور لینے بند اور ساگودانہ بھی ختم۔ مگر اُسے تندرست ہو کر سخت غصہ آیا۔ پڑوس میں چا کی ماں رہتی تھی، کیا مزے سے ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ کیا اللہ میاں کو اُسے مرض دینے بھی کبھی سوچتی تھی! اُسے اچھا ہونا پڑا۔

(۵)

جب منجھو سسرال جانے لگی تو شمن کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت نوری کی خوب کڑک رہی ہوئی، بڑی طرح بلی اور پچھاڑس کھائی۔ سب نے اُسے مزے دار دے دیا۔ پہلے تو سب نے کہا کہ ہاں بھٹی نوری بھی جائے گی، مگر منجھو نے چپ سے اُسے بتایا کہ نوری کو بھیسلا رہے ہیں۔ شمن کو بڑا ہی مزا آیا۔ منجھو جانے لگا تو نوری پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈری کہ بہلانے کے بجائے سچ چلے

جیادہ سے ہیں۔ مگر گاڑی چلنے سے ذرا پہلے برطے چپانے نوئی سے کہا:-

”آؤ بیٹی نورسی، تمہیں مٹھائی دلاؤں گی۔“

”نہیں، نہیں، ہم مٹھائی نہیں لیتے۔“ نورسی ایسے بہت چکے سہہ چکی تھی۔

”بیٹی ہمارے لیے آؤ، سنگ لے چلیں گے۔“ منجھو بی بولی۔

”ٹوکری میں لے چلو گی خالہ جان؟“ نورسی چکی اور شمن مسکرائی کہ آئی اب

کبجنتی بیماری کی۔ جو نہیں نورسی چچا کی گود میں گئی بھاری نے سیٹی دے دی، نورسی

بھاڑیں مارتی رہ گئی، شمن کا ہنسی کے مارے بڑا حال ہو گیا، مگر بھوڑی دیر بعد

اُسے بے اختیار نورسی یاد آنے لگی۔ بیماری نورسی؛ دونوں چلتیں تو مزہ آتا۔

منجھو کا گھرا سے بالکل پسند نہ آیا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور چھوٹا سا

مکھن۔ منجھو کا دو لہا اور منجھو کی ساس، جسے دیکھتے ہی شمن نے بھانپ لیا کہ یہ ہے شمن

کا مورچہ، بڑھیا اُسے شروع ہی سے بُری لگی۔ اس کے علاوہ منجھو کی ساس کا پوتا

کدن بھی اُسے قطعی پسند نہ آیا۔ لال چندر رنگ اور نیلی نیلی بالے جیسی نکھیں، کیا

کمال! ایک کمرے میں منجھو اور اُس کا دولہا، دوسرے میں منجھو کی ساس اور کدن

سووتے تھے۔ دہشمن کا پانگ بچا دیا گیا۔ وہ اب کچھ سمجھ چکی تھی کہ منجھو کے

دولہا کی موجودگی میں تو وہ کمرے میں سو نہیں سکتی۔ تبھی کبھی اُسے تشویش ہوتی کہ

آخر کیوں؟ مگر کبھی کسی نے اُسے اطمینان بخش جواب نہ دیا؛

”نہیں منجھو کے پاس نہیں سوتے!“

”کیوں؟“ وہ پوچھتی۔

”بس بک بک نہ کرو۔ جواب ملتا، اور وہ بک بک نہ کرتی۔

منجھو سے پوچھنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔ وہ کچھ بدل سی گئی تھی، اگر پاس بھی

لگاتی تو پہلے ہی سے کہہ دیتی:

”دیکھ شمن ہٹ کے لیٹو۔ ہاں بھی مجھے گرمی لگتی ہے۔“ وہ ویسے یوں بھی دکھاؤ

کو چٹا بھی لیتی مگر وہاں اب اُسے گرمی نہ ملتی تھی جس کی کبھی وہ عادی تھی اس لیے



منجھو سے کبھی لاڈ نہ کرتی، کچھ کھینچی کھینچی سی رہتی مگر منجھو نے کبھی دھیان نہ دیا۔  
منجھو کو تا دیر عرف کدّٰن سے بھی اس لیے نفرت تھی کہ اس سے بڑا، سوکر پیٹ  
لیٹا تھا کیونکہ اُسے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کبھی مذاق ہی میں شمن  
اُس سے کشتی لڑنے کو کہتی تو دیک جاتا۔ بس ہر وقت دادی بیوی کے پاس بیٹھا  
پان چیا یا کرتا، کبھی سروتے سے کھیل لیتا اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا۔

بڑھیا کو تو شمن نے شروع ہی سے ڈھیل نہ دی۔ باوجود منجھو کی دھمکیوں  
کے اُس نے اُنہیں دادی بھی نہ کہا بلکہ ہمیشہ ”منجھو کی ساس“ ہی کہتی رہی جس  
پر بڑھیا جل اُٹھتی اور منجھو سے اُس پر ڈانٹ پڑواتی۔ پھر تو وہ اور ضد باندھنے  
لگی اور سوائے ”اے“ یا ”وہ“ کے کچھ نہ کہہ کر مخاطب کرتی۔

کدّٰن دادی کے ساتھ ساتھ چولھے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ دفع  
حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا۔ شمن سے تو وہ پہلے  
ہی دن ڈر گیا تھا جب اُس نے اُس کی چھوٹی سی مراچی چھوٹی تو وہ خونخوار بلی  
کی طرح جھپٹی اور گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ایک دم بھجک کر  
بھاگ گیا تھا اور دادی بی کے کندھے سے لگ کر خوب رو دیا تھا۔

کدّٰن کی بھی ایک کیاری تھی جس میں اُس نے پودنیہ اور کپاس بون رکھی تھی اور  
شمن کی کیاری میں سمیں بون ہوئی تھیں۔ کدّٰن کی کیاری پر بڑھیا دولت کا سانپ  
بن کر ہر ادیتی، کیا مجال جو کوئی چھو بھی جائے۔ ایک دن بڑھیا نے جان بوجھ  
کر شمن کی کیاری سے دھنیہ توڑ لینا چاہا۔

”کدّٰن کی کیاری میں سے توڑو، ہماری کیاری میں سے نہیں“ وہ دونوں  
ہاتھ پھیلا کر کیاری کے آگے کھڑی ہو گئی۔

”اے بیٹی ذرا سا لو لگی، کدّٰن تو روئے گا۔“

”کدّٰن تو روئے گا!“ شمن کے آگ ہی تو لگ گئی۔

”نہیں“ اُس نے ایسے زور سے بڑھیا کو ڈانٹا کہ وہ ڈر کے بڑبڑاتی ہوئی

چلی گئی۔

کچھ ہی دن میں وہ منجھو کے گھر سے نکھک گئی۔ اُسے رہ رہ کے اپنا گھر یاد آتا، نورسی، بڑے بھائی اور منجھلے بھائی۔ وہ تو اسے اتنا مارتے بھی نہ تھے پراس کے موٹے موٹے گال خوب نوچتے تھے۔ بڑی آبا البتہ طرہی کھیر تھیں، لیکن اُن سے خاطر رکھنے کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی! مگر یہاں تو بڑھیا اور کدنی، دو بھانیں، جن سے اُسے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔

منجھو تو دو دہر کو گرہ بند کر کے سو جاتی اور اس کی ساس والان میں منبھی والیں وغیرہ چُنا کرتی۔ شمن پاگلوں کی طرح کیا رلیوں کے پاس ٹہلتی یا مرغیوں کو انگن میں دوڑاتی، کبھی باورچی خانے میں جا کر آلو منجھو نے گنتی، پھر ان سب باتوں سے بھی دل گھرا جاتا تو وہ خاموش منڈیر پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی اور سسناں سڑک پر سُر کھے ہوئے تمپوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا کرتی۔ پاس ہی درختوں پر بندرا اچھل کود میں مشغول ہوتے، اس ڈال سے پٹنگ لے کر اُس ڈال پر، جیسے سرکس میں منٹ جھولتے ہیں۔ ایک دم سے کسی بندر کا ماتھ چوک جاتا اور وہ بھد سے دیوار پر آں گزرتا تو شمن ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی۔ کاش وہ بھی بندر ہوتی! اُن میں منجھو کی ساس اور کدنی سے تو زیادہ انسانیت ہوگی، یہ نہیں کہ ہر وقت بس وال میں رہے ہیں یا گیموں پھٹک رہے ہیں اور وقت ملا تو لال پیلے چلتی ٹروں کو چوڑ کر چھار چھنکار بلانیں سی جا رہی ہیں۔

ایک دن کدنی نے اپنی رنگین شیشے کی گولیوں کا ڈبہ نکالا اور بولا: ”اؤ شمن کھیلیں“

شمن اُسے منہ نہ لگاتی مگر لال ہری گولیوں کو دیکھ کر اتر آئی۔ بڑی دترنگ وہ ایک ایک گولی آنکھ سے لٹکا کر اس میں دوڑتے ہوئے رنگ دیکھتی رہی، جیسے تو س قزح کی جھاڑو سے اُن کے اندر کسی نے دائرے کھینچ دیے ہوں۔ ایک تو بالکل ایسی تھی جیسے ریشم کا پھندا شیشے میں بند کر دیا ہو، اور دیکھتے دیکھتے وہ پھندا

زندہ کیڑے کی طرح رہینگے لگتا۔

”کدّان آؤ ان گولیوں کو کیاری میں بومیں“

”کیاری میں؟“

”ہاں، پھر سڑاگیں گے تو ہزاروں گولیاں بیروں کی طرح لگیں گی، اور جناب

بس پھر اپنی لٹوڑ توڑ کو جمع کر لیں گے، ہاں“

”پر دادی بی ماریں گی جو!“

”ہونہ، دادی بی کو کیا پتا چلے گا! مگر ہاں جب پیڑاگیں گے تو بس خوشی

کے مارے وہ مرجائیں گی، دیکھ لینا، ہاں“

”تو چلو“ کدّان آج بنا دادی بی کے ہی کچھ کرنے کو تیار ہو گیا۔ شمن کو اُس پر

کچھ یوہی سا پیار آنے لگا۔ گولیاں بول کر انہوں نے خوب سا پانی ڈالا اور گھٹنوں پر گولیاں رکھ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔

شمن کو گولیاں اُگتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب اُس نے دھینا بویا تھا تو

صبح صبح کیا رلیوں کو دیکھنے لگی تھی مگر کڑاچی نہ بھوٹا تھا، اُسے ڈر لگا کہ کہیں دھینہ خرا

تو نہیں تھا، لیکن تیسرے چوتھے دن اُس نے دیکھا بار ایک بار ایک کپاسی رنگ کے

ٹانکے زمین پر اُٹھے ہوئے تھے، ننھے ننھے کندھے زمین کا سینہ چر کر باہر نکل آئے

تھے، اُن میں سے دو چار تو بالکل جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی ان کی گردنیں پھنسا

ہوئے کھینچ رہا ہو، اُن کی گردنوں پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ شمن نے چاہا تنکے سے اُنہیں

سہارا دے کر اُن کے سر تھپا دے مگر وہ کُٹ سے سیج میں سے ٹوٹ گئے۔ اُس کا

دل اُس روز کسی کام میں نہ لگا اور وہ کیا رلیوں کے پاس بیٹھی اُن ٹکڑوں کے زمین سے

اُبھرنے کی کشمکش دیکھتی رہی۔ کچھ توجہ نہ ناشتہ کرنے لگی نکل آئے اور کچھ ابھی گشتی لپٹ

رہے تھے۔ اُن میں سے ایک تو بالکل زندہ کیڑے کی طرح باہر کو اپنا نازک جسم کھینچ

رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بل میں سے سینو لپے کی طرح نکل آیا۔ شمن نے ٹھنڈی سانس

لی، جیسے ٹکڑے کا سارا زور رہی لگا رہی تھی۔ ٹکڑے کی ناک میں دھینے کے پھلکے کا بلاق

## الم ٹیڑھی لکیر

ٹنگ رہا تھا جو تھوڑی دیر میں اُس نے جھٹک کر پھینک دیا اور دوسرا تنک تنک  
کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ تنک تنک سپاہی کی طرح پھیلا دیے۔

آج وہ گولیوں کے گلوں کو چھوٹا دیکھے گی۔ چکنے چکنے کا پرخ کئے پرخ کئے حلقے  
جیسے چوڑی موڑ کر کھڑا بنا دیا ہو۔ وہ ان کندوں کو پرو کر مار بنائے گی۔ نہیں نہیں،  
پھر پٹ کیسے بڑھیں گے! اور پھر جامنوں کی طرح رنگ بزرگی گولیوں کے کچھے اس  
کی آنکھوں کے سامنے چھوٹے ہو گئے۔

تیسرے پرنک تو کتے چھوٹے نہیں، پھر اُسے نیند آگئی۔ جب شام کو وہ اُٹھی  
تو اُس کا کبوتر بچھڑ گیا۔ منجھو کی ساس مرہالہ پینے کے پیالے میں بیٹھی گولیاں دھو  
رہی تھی۔ ہیں! شاید چڑھائی انہیں گوشت میں گھجھارنے جا رہی ہے! شمش اُس پر پل پڑی۔  
اس کے بعد نہایت ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اُس نے منجھو کی ساس کی  
کلائی چاٹوالی اور منجھو نے اُس کا منہ چانٹوں سے توڑ کر رکھ دیا۔

آج اس کا دل و دماغ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہونہ، گولیاں  
نہیں بوٹی جاتیں! اُس کا بس چلے تو منجھو کی ساس کو اٹھا کر بودے۔ اور پھر وہ  
سوچنے لگی: اُس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بودا ہے۔ دوسرے دن گاڑ  
پھوٹ رہا ہے، بھورا بھورا چیتوں دار۔ پیر سے گوکری میں اڑوایا ہے پھرتے  
میں نا، بالکل دلیا۔ شمع خوشی سے دیوانی، دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے۔ پھر وہ بڑھتا  
بڑھتا نیم کے پیر سے بھی اونچا ہو گیا اور غولیوں کی طرح کچھے کے کچھے مڑھکی مڑھی  
ہوئی گڑھی بڑھیوں کے ٹکٹے لگے۔ ایک لمبا سا سانس لے کر وہ انہیں جھاڑنے  
لگی جیسے کئی کئی اطمینان۔ سارا آگئی بڑھیوں سے پٹ گیا۔ ہزاروں، لاکھوں کھانسی  
چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پانڈا ان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی  
پہنچتی چھایا کتر رہی ہے، آٹھ دس باورچی خانے میں ہنسی منڈلیوں کا ناس مار رہی  
میں، دوچارہ اچارہ کی ٹیکوں کے پاس پیرک رہی ہیں، مننی مننی ملٹیوں کے  
برابر بڑھیاں سارے گھر میں اودھم مچاتے رہی ہیں اور وہ ایک دم ان بڑھیوں

سے گھبرا اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں دور دور کرنے لگی۔  
شکر ہے جو اس نے بڑھیا کو بونے کا خیال جلد ہی پرے کر دیا ورنہ غضب ہو  
گیا تھا۔ ایک ہی بڑھیا نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اسے کدّن پر بھی بہت  
غصّہ آیا کہ اس نے اپنی چہلیتی کو تباہیوں دیا۔ جی چاہا ناخنوں سے اس کی کنبھے بلوٹے  
جیسی آنکھیں نکال کر گولیوں کی جگہ بوندے۔

(۱۶)

اسے آہستہ آہستہ منجھو سے اور نفرت ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اس کا کھانا  
پینا اٹھنا بیٹھنا سب اسے قابل اعتراض لگنے لگا۔ وہ روز بروز موٹی اور کاہل  
ہوتی جاتی۔ بڑھیا ساس ماما کی طرح اس کے آگے پیچھے لگی رہتی مگر وہیں کا منہ کسی  
وقت سیدھا نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ منجھو پیلی پیلی مٹی کا ٹکڑا چبا رہی ہے۔ شمن کا دل ہل  
گیا۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ خود مٹی کھایا کرتی تھی تو سانپ پیدا ہو گیا تھا اور اب  
منجھو مٹی کھا رہی تھی۔

”منجھو بی مٹی کھاتی ہے؟“ اس نے چپکے سے کدّن سے کہا۔  
”کوئی، میری چچی؟“

”وہاں، اور جہی تو اس کا پیٹ پھول گیا ہے، دیکھ لینا اس کے پیٹ میں سے  
ایک دن یہ بڑا سا سانپ نکلے گا“ کدّن نے دادی بی سے جھڑویا۔  
”دادی بی، شمن کہتی ہے چچی کے پیٹ میں سے سانپ نکلے گا۔“

”خاک پڑے شمن کے منہ پر۔ کیوں رے، منع کیا کہ اس دیوانی سے مت بولا  
کرے مگر سنا نہیں تو نے۔“ لو بھلا بہن کے لیے مراثی ایسی باتیں منہ سے نکالتی  
ہے ”بڑھیا گھنٹوں بیٹھی بڑبڑاتی رہی مگر شمن کی فکر نہ گئی۔ وہ چھپ چھپ کر  
منجھو کا پیلا اُترا ہوا چہرہ اور میل جسم دیکھا کرتی۔ اسے اس کے پیٹ میں موٹے  
موٹے پھٹکائیں مارتے ہوئے سانپ بل کھاتے نظر آتے۔ پھر اسے منجھو سے اور

بھی نفرت ہو گئی مگر کسی کو اس کے متعلق فکر نہ تھی، بلکہ بڑھیا تو اور خوش نظر آتی تھی کہ مزے سے سارے گھر میں اسی کا راج ہے۔ وہ جان بوجھ کر اس کے لئے سڑی سڑی مرچوں دار نقصان دہ چیزیں پکاتی اور خود بھی شکر چرا کر کھاتی ہوگی۔ اس کی اماں آئیں اور منجھو ایک دن بہت زور سے بیمار پڑی۔

”کدن آج دیکھ لینا تمہاری دادی بی سچ کہتی تھی یا ہم اتنا بڑا سانپ ہے کہ کیا بتائیے۔ جی تو منجھو بی رو رہی ہے بچاری۔“  
”دچھا تو دور سے پر گئے ہیں، کون مارے گا سانپ کو؟“

”تھانے میں سپاہی جو موجود ہیں جناب۔“ اس نے نہایت اطمینان سے کہا اور وہ سپاہیوں سے نہایت راز دارانہ انداز میں بولی، ”تم اپنی بند دقتیں سے چلنا، اچھا۔“

”کیوں؟“ داروغہ جی نے اس سے پوچھا۔  
”سانپ مارنے کے لیے“ ہماری بہن جو ہیں نا، منجھو بی، ان کے پیٹ میں سانپ ہے، اب نکلنے ہی والا ہے۔“  
داروغہ جی نے سوڑ کی طرح تھو تھنی اٹھا کر کھوں کھوں ہنسا شروع کر دیا۔  
دو چار سپاہی بھی ہنسنے لگے۔

رات کو ایک دم جو شبنم کی آنکھ کھلی تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آرہی تھی اور منجھو کے کمرے میں غدر مچا ہوا تھا۔ وہ چنچن مارتی ہوئی اُس کے کمرے کی طرف بھاگی، دو چار عورتوں نے اسے پکڑ کر دبوچ لیا، مگر وہ ”منجھو بی“ کی رٹ لگائے رہی۔ معلوم ہوتا تھا باہر بھی سارے سپاہی ایک دم جاگ اٹھے اور ٹھائیں ٹھائیں بند دقتیں چلنے لگیں۔ وہ ہسم کر چپ ہو گئی۔  
”کیا مر گیا؟“ اس نے ایک عورت سے پوچھا۔

”کیا؟ کون؟“  
”سانپ۔“ اس لئے آہستہ سے کہا۔

”اری بیٹی، اس سے کیا سہارا رہی ہے، یہ دہن کی بہن ہے، موٹی دیوانی“  
 منجھو کی ساس نے کہا اور بھائی کسی کام کو۔ آج وہ بڑی اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔  
 اتنے میں اس کی اماں باہر نکلیں، وہ بھی سٹپائی ہوئی تھیں۔ ”اماں، منجھو بی“  
 اس نے بکی روک کر پوچھا۔

”اچھی سے منجھو بی، چل منسا بھانجہ تو دیکھ“ آج اماں خوشی سے پھولی نہ  
 سماتی تھیں؟ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔  
 ”اُف! حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ننھا ننھا سا چہرہ  
 جیسا ہوا ایک عورت کی گود میں رکھا تھا۔ منجھو چپکے پڑی تھی۔  
 ”اور سانپ“ اس نے ڈرتے ڈرتے اماں سے پوچھا۔  
 ”چل بگی“

”یہ منسا کہاں سے آیا؟“ اس نے دوسرے دن پوچھا۔  
 ”یہ وہ جو میم صاحب بھینس نا، وہ منجھو بی کے لیے لائی تھیں“  
 ”اچھا۔ تو اماں ایک ہمیں بھی ملگا دو۔ منجھو کی ساس تو اسے چھونے نہیں  
 دیتی“

”اچھا، منگا دوں گی“ اماں نے کہا اور دو چار عورتیں ہنس پڑیں۔  
 ”تو پھر سانپ یقیناً سپاہیوں نے مار ڈالا، جی بھی ٹھائیں ٹھائیں بند و تیں  
 چلی تھیں۔ اچھا!“

مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی کلوٹی میم صاحب اتنا سفید بچہ کہاں سے اڑا  
 لائیں، دوسرے منجھو بی تو بالکل پچکے کو رہ گئی تھی۔  
 ”دو اور دو چار“ اس نے حساب لگا لیا، مگر ہے منور کچھ گڑ بڑا!  
 اب منجھو بی کے یہاں اس کا قطعی دل نہ لگا اور وہ اماں کے ساتھ گھر چلی آئی۔

(۷)

منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ کے لیے دفن

کر آئی، مگر تعجب ہے اسے ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ رہا کھٹکانہ چوری کا دعویٰ تھا ہوں رہن کو۔ اتنا چھینا کہ بالکل ہی کنگال کر دیا۔ اچھا ہی ہوا ایک روگ سا فُور ہو گیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب مجھ کو اسے نہیں مل سکتی، اس کے حصول کے لیے جاں نثنا اتنا ہی فضول ہے جتنی تمہیں جو تک لگانے کی کوشش۔

بیوہ ہو کر بڑی آپا مستقل طور سے میکے آن رہی تھیں، وہ شمن کی نگران بن گئیں۔ اماں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا۔ بچے پیدا کرنا۔ اس کے آگے نہ انہیں کچھ معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ آبا جان کو بچوں سے زیادہ بیوی کی ضرورت لاحق تھی۔

شمن کو بڑی آپا پر کبھی بھروسہ نہ ہوا۔ ویسے تو برابر یہی جانتیں کہ انہیں شمن کی بہتری مقصود ہے اور اس کی عاقبت سدھارنا چاہتی ہیں لیکن اصل میں اسے لوری کے لیے درس عبرت دینے کا بہترین آلہ بنا رکھا تھا:

”دیکھنا نہیں مانو گی تو شمن کی طرح پھٹکا رہیں گے سب“

”نہاؤ گی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی“

”پڑاؤ نہ نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤ گی“

”پھر تم نے شمن کی طرح ہند کی“

”شمن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے“ اور

”یہ شمن ہی نہیں بگاڑتی ہے، خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں“

یہی نہیں، وہ اور آگے بھی نہ چوکتی، اماں جان پر طعنے کسے جاتے:

”بھئی میں اماں تو ہوں نہیں جو تمہیں بھی...“

”مجھے اماں جیسے چو بچلے تو آتے نہیں۔“ وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچوں کو تختی

آدم کی طرح ہر وقت چروا چاٹا کرتیں۔

اس پر شمن کی اماں شرمندہ اور کھسیانی ہو کر اس کی موت کی دعائیں مانگتیں۔ خیران کی زندگی کا سہارا یہ فخر تو تھا کہ اتنی الابلا کے ساتھ انہوں نے بڑی آپا جیسی



میسر اسی بیٹی بھی تو جینی۔

مگر یہ سیر اسی بیٹی اٹھی جوانی میں رانڈ ہو گئی۔ دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنہیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی۔ بچے کیا تھے تہذیب اور فرمانبرداری کے دو چرخے تھے، سوت پر سوت کات لو گیا مجال جو کلا ٹیڑھا ہو جائے۔ روز صبح اٹھ کر کھٹا کھٹ سب کو سلام کرنا، کوئی مہمان آئے تو فوراً اسے خالہ، ممانی، چچی، دادی حسب حیثیت دیر خطاب دینا۔ جھٹ پٹ۔ آتا ہے یا دیکھ کو گذرا ہوا زمانہ، اور ”لب پہ آتی ہے دعا“ شنانا اور پھر ”لوہری ناک کو کیا کہتے ہیں؟“ ”نوز“ ”کان کو؟“ ”ایر“ ”دانت کو؟“ ”چیک“ ”ہیں بھی چیک تو گال کو کہتے ہیں، دانت کو؟“ ”ٹیٹ“ ”منو“

جلدی سے بولنا۔

”شاباش، بھٹی واہ“ مہمان مست ہو کر جھوم اٹھتے۔  
”اچھا چلو اب ٹونکل ٹونکل سناؤ۔ کرسی پر کھڑے ہو کے اور بھٹی اشارے کرتی جانا“

پھر نوہری کرسی پر بندریا کی طرح پھدک پھدک کر انگریزی گانے سناتی اور منو جسم کے مختلف حصوں کی انگریزی بتاتا حالانکہ اس وقت اس کی تمام تر توجہ ان لڈوؤں پر ہوتی جو مہمان کے سامنے رکھے ہوتے اور اس کا ہاتھ مگر بند سے کھیلتا ہوتا۔

لیکن عموماً مہمانوں کے آنے کے وقت شمن کہیں کھڑ جاتی اور بلی کچلی گھومتی ہوئی اگر آتھی نکلتی تو کوئی اس کا تعارف ہی نہ کرتا۔ بہت سی بڑی آپا کی سیلیاں اسے پڑوسن کی لڑکی سمجھ کر کبھی بسکٹ وغیرہ دے دیتیں تو فوراً بڑی آپا یاد دلاتیں:

”بس جاؤ اب کھیلو“ اور وہ کھیلنے چلی جاتی۔

بڑی آپا غریب کی زندگی کا سہارا یہ دینے کی بجائے ہی تو تھیں اور اس کا

زندگی میں رہ رہی کیا کیا تنہا سوائے آدمیوں اور سسکیوں کے اب یہ عمر اور نڈا باگروہ اب پہلے سے بھی زیادہ وہ بد مزاج ہو گئی تھی، گویا میوہ ہو کر وہ بڑا تیرا کر آئی تھی چوڑیاں اور نگین ڈوڑھے نہیں اڑھتی تو یہ سب لوگوں کے اوپر احسان نہیں تھا تو کیا تھا! انڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مر رہی ہوئے میاں کیساتھ ساتھ جلیے جاتے تھے سسے اور ماں باپ کا بھی سوگ کر رہی تھی۔ جب کوئی خوشی کا تہوار آتا تو اپنا ناٹک شروع کر دیتی، ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور پیش شروع کر دیتی۔ جلدی سے کھل ہوئی مہندی پھکوا دی جاتی، چوڑی والی کو مش ہنسی کر کے طال دیا جاتا، سوتیوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا، عید کی چوٹی ایسے مل جاتی گویا لالہ پر قرض آئی تھی یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور ہیں۔

مگر بن باپ کی معصوم بچی نوری کے خوب لاڈ ہوتے۔ اس کے بہانے خوب مہندی گھلتی اور اس کے ماتھوں پر سیل بوٹے بنائے جاتے مگر شمن کے مہندی لگانے کے خیال کو اس قدر فضول اور حقیر سمجھا جاتا کہ وہ خود لگوانے سے انکار کر دیتی۔

”بڑی لگتی ہے ہمیں کیچڑ جیسی مہندی“ وہ نفرت سے کہتی۔  
 ”وہ بھئی جب ماتھہ دھو ڈالو تو کیسے پیارے لگتے ہیں“ نوری اپنے لالہ ماتھوں کو دیکھ کر کہتی۔

”ہو نہ، گنوار لیں جیسے لال ماتھہ، جیسے پان کی پیک لیتھڑی ہو، ہی۔ ہمارے تو میوں جیسے صفا ماتھہ“ گو وہ خوب جانتی تھی کہ میوں کے ماتھہ قطعی اتنے گندے اور کالے نہیں ہوتے، لیکن جب وہ ایسی باتیں کرتی تو بیچاری نوری کی مہندی کا مزہ بھی کہہ کر ہو جاتا اور لیں اُس کا جی کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوڑیہ نہیں اڑھتی تھی تو اُس نے بالکل سنیا اس ہی لے لیا تھا، اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ کھل اٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دولہن کا سہاگ کا جوڑہ بھی مانڈ پڑ جاتا۔ سفید کریم یا شفقون کا ڈوڑھے جس پر بیچاری بیوہ نازک سی مٹی کی بیل چپکا لیتی، سفید چکر، کالے کاکرتا، سارے اگلا مہین مہین بیلوں اور لکشی ڈوڑیوں سے آراستہ، قدم قدم پر تار

کے جاں اور موتیوں کے پھندے۔ ماں پیسے پر رنڈا پاتا مارنے کی ضرورت نہیں۔ سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھولدار پچامہ۔ ہاتھوں میں دہری رنڈا پاتا رتے وقت جو باموں نے دو دو نازک سی ہانکیں ڈال دی تھیں پڑی بہتی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرہ کی انگشتری اور بس۔ ماں سنبھلی بوا کبھی اگر نہ بردستی آویز سے پھندا دیتی تو خیر ورنہ وہی اپنی موتیوں کی لوٹکیں پڑی رہتیں۔ بیاہ کر گلابی اور سفید پھولدار موزے۔ لیشی ہوئے تو لیشی ورنہ سوتی ہی سہی۔ مانگ کی تو بچاری کو اجازت نہ تھی۔ دیسے کون بدکتا تھا۔ پر اس کا اپنا ہی دل مردہ ہو گیا تھا اس لیے بال اور چوڑھا کر پھولے پھولے کھٹے کانوں پر چھوڑ دیتی۔ بس اتنے نیچے کہ کانوں کی لوہی جھانکتی رہیں۔ روتے روتے آنکھیں خیراب ہو گئی تھیں اس لیے کہیں آتے جاتے وقت سنہری رنجیر والی عینک لگا لیتی تھی۔

پر جب بڑی آپا رنڈا ہے میں ایوں سیج دھج کر کھتی تو لوگ دانتوں تلے اٹکی دبا لیتے۔ ”ارے وہ تو سا دسے خپتھڑوں میں پھٹی نکلتی ہے“ ایک دن وہ سنبھلی بوا کا پیغام لائیں تو بیویاں بڑی آپا کو دیکھ کر اسی پر پھیل پڑیں۔ اماں نے کہا، ”اور سنو، وہ ٹوٹتی تو بیوہ ہے“ بڑی آپا فخر یہ اس غلط فہمی کا ذکر کیا کرتی کہ لوگ اسے دو بچوں کی ماں کو کنواری سمجھ لیتے تھے۔ اس کا منہ تھا بھی تو چپا گیا کنہاریوں جیسا۔

جو نہی کوئی آپا کے دلھا کا ذکر کرتا اماں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں اور اسی سیدھی مرنے والے کی تو لڑھیں شروع کر دیتیں۔ ”زبان تو ٹوٹوڑے کے تھی ہی نہیں، اور سینہ یہ چوڑا، منہ یہ طباق سا۔“

اماں سدا کی گپیں تھیں اور ہمیشہ بات میں کلی پھندے لگا دیتیں۔ دو انگلی کی چیز کو گز بھر کی بتا دینا تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی، ”فلانی جیسے اٹا ہو، اگلی جیسے میدہ شہاب“ حالانکہ وہ فلانی بچاری اٹے تو سے جیسی اور ذائقہ میدہ شہاب، مگر پھر بھی لوگ ان کی باتوں کا یقین کر لیتے تھے اور وہ شریف

بزرگوں میں گئی جاتی تھیں۔

کپڑوں کے معاملے میں تو اماں نے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا : ” یہ تین روپے گزہ ہے ، دلی سے منگایا ہے “ حالانکہ سب جانتے تھے کہ کٹ پیس نیچے والی چنڈھی بڑھیا چار روپے سیر کے حساب سے دے گئی ہوگی۔ اماں کا ایک جھوٹ ہوتا تو بتایا جاتا۔

آپا بڑی تو خیر میاں کے فراق میں گھل گھل کر بد مزاج ہو گئی تھی مگر یہ نوری اور متھوہ کون سا رنڈا پاٹوٹا تھا جو وہ چنگیز دوران بن کے سینوں پر کھڑے مونگ دلتے تھے جس کی چیز جب جی چاہتا چل کر مانگ لیتے اور وہ مل جاتی۔ بات یہ تھی ان کا باپ جو مر گیا تھا۔ پر یہ مردہ باپ سو بالوں پر بھاری تھا۔ سارا گھر بلکہ سارا کنبہ مرنے والے کے بھوت سے لرزتا تھا کبھی تو شمن بلبل کر دعا مانگتی کہ کاش وہ بھی بیوہ ہو جائے یا کم از کم ماں باپ ہی مرجائیں پھر ذرا وہ خبر لے لوگوں کی۔

بڑی آپا ماں باپ کی عورت سیٹھ بیٹھی جیسے سارے گھر کی جان پر احسان کر رہی تھی۔ نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں وہ باپ کی عورت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی مگر شمن اس کی ذرا بھی احسان مند نہ تھی۔ شوق سے وہ کوٹھے پر جا بیٹھی تو بھی شمن کو پروا نہ ہوتی ، اس کی بلا سے۔ اور پھر بڑی آپا کے بچوں سے ریا وہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہوگا آہ ! بیوہ اور یتیم !

(۸)

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آتی تھی طوفان کی طرح آتی۔ یکایک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ دیا۔ بھی تو اس کے پیچھے ” پلھو “ کا ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ بڑی آپا تو پڑھاتی کم ، نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل و حقیر زیادہ کرتیں۔ مولوی اور ماسٹر بھی آکر اپنے حانت

## طرطھی لکیر ۵۰

اس پر تیز کرتے۔

”پل پر جا۔ کیوں؟“ وہ معلوم کرنا چاہتی۔

”یہ اس کا دیور ہے“ ہوا کرے، شمن کو کیا، اس کا دیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی، اسے کسی کے دیور سے کیا ناٹہ جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

”دس تنگ گن“ بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا ایک تھوڑی بے کرکھٹاک کھٹاک ماسٹر صاحب کی کھوڑی پر سوتک گن دے اور پانچ چھکے تیس۔ یہ لیجیے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سولہ گنوں نہیں؟ پھر جوڑنا، گھانا، ضرب، تقسیم۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا خون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دلچسپی لینے لگتی۔ مگر محسوس نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ عموماً تو وہ کسی کا سوال آنکھ ٹرطھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی، مگر بعض وقت ماسٹر صاحب کچھ بناڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پرٹ جاتے۔ اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا گھبرا کر تھلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ پر تھوپنے لگتی۔ ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر وہ جھلا کر سپیٹ میں دو دیا اور کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی۔ لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھو منتر ہو جاتی۔ ایک نوکر کے لڑکے کا نام تو اتنا تھا جو دن کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے پیچھے پر ماتم کیا کرتا تھا، بس عباتی سوال تو اس کی جان کو لو ابن کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو بھنچوڑیاں دیتے۔

حکم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم۔

مگر یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں فرق کتنا ہے۔

ایک پسیہ کی دو نانہ گیلیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟

اجلی تو سرے سے یہ گلیچرے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے کہ وہ ایک پے

کی دو نازنگیاں خرید سکے، دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نازنگیاں کافی ہوئیں، بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھر گاڑی نازنگیاں خریدے گا؟ سڑا نہیں جائیں گی ساری کی ساری اچھلی گرمیوں میں آگرہ والی خالہ نے دو ٹوکے خرچہ سے بھیجے، سارے سڑے سڑے کمرے تو بھلے۔ مگر فوراً ہی اُسے آگرہ والی خالہ کا چھدری داڑھی والا میاں یاد آجاتا جس کی تنیم کی نئی کی اس نے اور نوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اس نے خرچہ سے بھیجنے بند کر دیے۔ اچھے ہوتے تھے پچارے خرچہ سے، زمین پر لیس لیس کر چھلنیوں میں دھوئے جاتے تھے اور پھر....

ترے ایک چٹا پڑتا اور وہ خرچہ سے کسے بچوں پر سے پھلتی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سیٹ کی ٹوک جوتاں میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی اس کی ناک میں آگتی۔

”سن، اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو تو کتنی نازنگیاں خریدے گی؟“ ناگہ خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی چونا نازنگیاں لیتی۔ اور کیا، سچ تو ہے، بھلا پیسہ کی دو والی نازنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی! ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑے تھے، خواہ وہ کھٹی نازنگیاں خرید دئے دیتے تھے۔ پیسہ ملتا تو کبھی سے فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پتے لگی گوک خریدے گی اور چکنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔

”ارے بول۔ کتنی نازنگیاں آئیں گی؟“

”نازنگیاں؟ آں۔ وہ۔“ ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر چکی کہ نازنگیاں بے بی ڈائے یا گزک کے لیے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے: ”کوڑ مغو کہیں کی۔ ارے ہاں نازنگیاں۔ ایک پیسہ کی دو تو ڈیڑھ روپے کی؟“

”ڈیڑھ؟ ڈیڑھ روپے کی!“ ذرا سوچیں۔

”ہاں ٹیڑھ روپے کی۔ روپے کے آنے بنانے آتے ہیں؟“  
ماسٹر صاحب کے سامنے ”نہیں“ میں سر ہلانے کی اجازت نہ تھی لہذا  
”ہاں۔“ ”تو پھر بنا۔“

اور وہ آنے بنانا شروع کرتی۔ کافی تو ہونگے ٹیڑھ روپے کے آنے۔ غاصہ  
ڈھیر سے، اور کیا عید پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے تو واسکٹ کی جیب  
ٹٹک گئی تھی۔ اماں نے نہ جانے کس کام کے لیے تین آنے قرض مانگے تھے تو  
اس کی جان نکل گئی تھی۔ اماں یقین بھی چھٹی ہوئی ناوہند۔ جہاں کسی کے پاس  
چار پیسے دیکھے اور ان پر غریبی چھائی۔ پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آئی، کون  
تھا جو تقاضہ کر سکتا!

”اری بول ٹیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟“

”ٹیڑھ روپے کے پیسے؟“

”ہاں بھجوت۔“

”سولہ۔“ وہ اُسے ٹھوٹے پتھر سے بچ کر کہہ دیتی۔

”سولہ، سولہ پیسے ہیں!“ اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا، جیسے  
سولہ پیسے دے کر کوئی انہیں ٹھکے لے رہا تھا۔ وہ جی بھر کر مار چکے تھے بھٹہ دہی پیسے  
بنا لیتے۔

”چھیا نوے مخوس۔ اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں۔“ وہ پیسے  
بنوائی کا چانٹا وصول کر لیتے۔

”ہاں۔“

”اب تو بازار جاتی ہے۔“

”ہاں۔“ گوارے یقین تھا کہ کوئی اسے بازار نہ جانے دے گا اور نہ ہی  
اتنی کٹائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی، دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے  
ہیں اسے اُٹو بنانے کے لیے، مگر اسے فرض کرنا ہی پڑتا کیونکہ فضا میں چانٹا منڈلاتا نظر آتا

”اب تو وہاں ایک پیسے کی دود کے حساب سے نازنگیاں خریدتی ہے۔“

چہ! پھر وہی کھٹی نازنگیاں! خیر وہ مجبوراً خریدتی۔

”کتنی ہوئیں؟“

”ایں؟“ وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا رہی تو دے گی۔

”نازنگیاں؟“

”ارے بتا کتنی ہوئیں تین نازنگیوں کے حساب سے؟“ بولائے ماسٹر صاحب۔

”تین؟“ وہ ہچکچا کر سوچتی۔ ”تین نازنگیاں، ہاں“ وہ وثوق سے کہتی۔

”تین! ڈیڑھ روپے کی تین نازنگیاں؟“

”نہیں، نہیں“ وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے وارکھنیوں پر رد کرتی۔

”تو پھر — بتا۔ بتا۔ فوراً۔“

اسی طرح شام ہو جاتی، ماسٹر صاحب پسینے میں ڈوب کر ٹڈھال ہو جاتے، جیسے کسی کے گھن چکر میں باندھ کر گھاٹا الا ہو۔ اُن کے اعضاء بے قابو ہو کر اٹھے سیدھے پٹنے لگتے، معلوم ہونا اتنی دیر وہ بچوں کو پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنا نوشتہ و تقدیر پڑھ رہے تھے۔ لپٹ ہو کر وہ دوسرے دن نازنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے۔

جہلم، چناب، رادوی، بیاس، ستلج۔ جہلم، چناب، رادوی۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، جیسے تسلیع کے گول گول دانے۔ جہلم، جہلم کے بعد چناب۔ گول دارے میں ایک دوسرے کے کرتے کا پھچلا دامن پکڑے جیسے پچے ریل ریل کھیلتے ہیں، جہلم، پھر چناب، پھر اس کے پیچھے رادوی چلی جا رہی ہے، پھر۔

”یاد ہو گیا؟“ ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوتے۔

”جی۔ جہلم، چناب...“

”ٹھیک کے پیٹھ بے مٹو کے پچھے، ہاں آگے۔“



”جہلم، چناب، راہ۔“

”نہیں مانے مارے اچھو! اسے، کیا ہوئی تیری سلیٹ! نکال، بستے میں کیا انڈے دے رہی ہے؟“

ماسٹر صاحب نہایت چابکدستی سے چومکھے چانٹے بانٹتے جاتے، کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے۔

”ہاں ہاں، کہاں سے نکلتا ہے؟ نکال نسل — ہاں — ارے بول، تو کیوں چپکی بیٹھی ہے؟“

”جہلم — ام — وہ بھولنے لگتی۔“

”ارے آگے بھی تو بڑھ، ایک جگہ کیوں مر کے رہ گئی۔ ہاں بتا۔“

”چناب“ قریب قریب بالکل بھول کر وہ مانگتی۔

”ہاں، ہاں، ہاں، کہاں سے نکلتا ہے؟ دیکھ رہا ہوں، ستو، بدذات؟“

ارے مارا بتا، ایسا معلوم ہوتا ماسٹر صاحب پھلی پھلی کھیل رہے ہیں۔ ادھر ادھر وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر پڑھاتے اور کسی کو بھی نہ پڑھا پاتے۔

”بول مراد کہاں بہتی ہے؟“

”جی، زمین پر۔“

”این زمین پر؟“ ماسٹر صاحب برا مان جاتے، گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے ان کی تنک کر ڈالی، پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

”مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے اور کون سے خطے کو سیراب کرتا ہے؟“

”جی، خطے؟“

”ارے ہاں، نہیں تو کیا تیرے سر کو سیراب کرے گا۔“

”جی، سیراب — تو . . . . .“ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

”ہاں، نہیں یاد۔ اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں —“

”اسی خطے میں۔“



تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے منڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں پھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔ اس نالے میں کبھی کبھی نہیں سے پھیلیاں بھی بہہ آتیں، تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آن ڈٹتے، بڑا امر آتا۔ مگر جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج، انہیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

(۹)

نوری تھی تو بڑی کی لڑکی، سانپ کا بچہ سینو لیا، شمن نے اس سے دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری، باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ بھتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے، مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی، سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گرٹا یا بھی چرڈا لاکرتے تھے، اور نوری کے پاس تو گرٹا یاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کیا کرتیں۔ گھنٹوں اسباب کے کمرے میں کھڑکی پر چڑھی سر جوڑے گودڑے کھیلا کرتیں۔ جی گھرا جاتا تو گلی میں کھیلے ہوئے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی، تھیلڑکی اسٹینج تھی، وہ گئی چندھی بڑھیا کی نوجوان بہو۔ کھڑکی میں سے صدیق نے پکارا لگاؤ۔ دولڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوتے گالیاں دیتے گرد گئے۔ ”بیرونیڑ بیٹھے بیر“ ”گردے کلیجی“۔ ”بیل، صابن، ہوتی“۔ اور پھر چھپرے پر بیٹھی سکھڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملاجی، جن کے آتے ہی ڈر کر دونوں کھڑکی سے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آ جاتے۔ مگر پھر ان کے دلوں میں کھدبہ ہوتی، وہ کہہ جھانکنے کو جی چاہتا، وہ ڈری ہوئی چوہوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں۔ ملاجی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیاناک حرکتیں کیا کرتے۔ پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے بچانے کیا کہنے لگے۔ پہلے تو ان کو سائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں، مگر جب وہ ذرا اگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں

جسم کردہ گیٹ، جیسے اڑ رہے کو دیکھ کر بندر محو ہو جاتے ہیں اسی طرح سانپس روکے،  
مٹھیوں سے جھٹک پکڑے وہ ٹکلی گھورا کہیں۔ پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی طاقت  
سے جھٹکا کھا کر زخمی چوڑیوں کی طرح پھٹے گریں اور اٹھ کر لمبی سبے تماشہ بھاگیں جیسے ملاجی  
چھلانگ مار کر جھگے میں سے ان کی گردنیں پکڑا ہی تو لیتے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس  
خامب رہے حلق خشک اور ماتھ میرے قابو۔

پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انہیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے  
کی محبت ہوئی، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں۔ ”کہو بھی مزاج تو اچھے ہیں؟“  
اس کے بعد ایک دم سے کھوکھلے قہقہے لگا کر بے دم ہونے لگیں اور کن آنکھوں  
سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں، گویا ان کے سینوں میں بڑے ہی اہم  
راز و فن خاموش اور دم چارے ہیں۔ انہوں نے آپس میں کوئی تبادلہ خیالات نہ  
کیا، جیسے وہ بڑی جہاں دیدہ میں حالانکہ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے  
تھے اور ایسی سوتج میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھولی بھول جاتی تھیں۔

کھانے کے وقت شمن کا بھی متلانے لگا، بار بار بھیانک زخم کے غار کی طرح  
اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پیٹوں میں کسی انسان کو پتا ہوا  
دیکھتی تب بھی ایسی دہشت اس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے  
اوپنائی سے بھاری پتھر ٹپچ دیا ہو جس کے نیچے وہ زخمی کپڑوں کی طرح دبے ہوئے تلملا  
رہے تھے۔

کئی دن تک وہ اس دلچسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں، جیسے  
وہ کوئی قتل کر کے بھاگ آئی تھیں اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی۔ پھر دوبارہ ہی دور  
سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گزر جاتیں، ان کا تخیل کھڑکی سے باہر کو دجاتا اور پھر  
وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا، مگر رفتہ رفتہ ان کی ہمت کم ہو گئی اور وہ صرف  
ان اوقات میں بھاگ آتیں جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہوتے اور گلی قبرستان  
کی طرح سنسان ہو جاتی۔ پھر تو وہ اور دلیر ہوتی گئیں اور اب یہ حال تھا کہ جان

بوجھ کر بلا جی کو آتے دیکھ کر دایک جاتیں اور اچک اچک کر جھانکا کرتیں۔ ہر بار ان کے جی متلاتے، سوکھی سوکھی تے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہو جاتیں مجروح و مایوس بل بل جانے۔

لوری کی کرٹیا سن کا کڈا جلا تاغہ بیا ہے جاتے اور پرانے جوتے کے ڈبے کی پاکی میں دلہن لاٹھائی جاتی۔ موتیوں کے کنگن سے آراستہ ہاتھ سے دلہن سب کو سلام کرتی اور مسہری پر سو جاتی۔ پھر گڈا دھول ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور کرسی پر کھڑا ہو جاتا۔۔۔۔۔ کھیل ختم!

پڑاوس میں معدلیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈ پر پر سے کہا گھمی دیکھنے کے انہوں نے بہت سی رسمیں سیکھ لیں۔ دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا اور دوہانے۔۔۔۔۔ اس کا منہ دلیجا۔

”بیوی میں تیرا غلام۔ منہ کھدو“ گھسیانے دوہا کو کہنا پڑا تھا اور پھر کھیر چٹائی گئی تھی۔ دولہانے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے ہندی لگے شرماٹے ہوئے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے، جیسے کسی نے ان کی ننگوں میں گدگدیاں کر دی ہوں۔ دولہا دلہن کی ہر پیاری سی لگاؤ والی رسم پر بیویاں چہک چہک کر قہقہے لگاتی تھیں۔ شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور لوری تو لبضہ تھی کہ جلواند بھیری کو بھڑکی میں دلہن دلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیر چھیر کر مزے لے رہی تھیں، گویا وہ کوئی میٹھا سالڈو تھا جسے چکھ چکھ کر چٹھا رہے ہوں۔ پھر رات کو خوب دولہا کو کھسیانہ کیا گیا جس میں چند نوجوان شوقین بیویاں حصہ لے رہی تھیں اور کنواری لڑکیوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر بھگایا جا رہا تھا۔ نجانے کیا ہو رہا تھا، دروازوں کی درزدوں اور روشندانوں پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں۔ جب کہ ان کے بچے اور خاندان گھروں میں پڑے دادیلا مچا رہے تھے۔

گڈے کرٹیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی۔ نکاح کے چھوڑوں

کے بجائے ٹرمرہ اٹھائے گئے اور دولہا نے وہیں کی مستقبل پر سے کھیر چاٹی۔ نوری اندھی نے سارا گڑیا کا دوپٹہ کھیر میں لپیٹ دیا۔ اس لیے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر سونچ دیا جس پر نوری اور وہ خوب ہنسنے لگیں اور ایک دوسرے کے بال بھر بھرے تھے فوج پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہو گئی تھی۔ گھوڑے کا سامنہ، اس نے جب نئی گڑیا بڑی آپانے بنا کر دی تو انہوں نے اس کی ناک ڈور سے کے بجائے کپڑے کی بنوائی اور چٹا بھی کالا موزہ اندھیر کر لگائی۔ لمبا سامو بان ڈالا، پھر بھی انہیں اطمینان نہ ہوا تو ماتھوں میں ڈور سے کی انگلیاں لگوا لیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انہوں نے نہایت ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روٹی کی دو گولیاں رکھ دیں، مگر اس سے انہیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ مہین کریم کا دوپٹہ اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈور سے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جتنی جتنی عورت لگنے لگی۔ تو بہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگا اور وہ دن بھر اس کا بیاہ کرتی رہیں۔ لیکن ایک دن گودڑ کی تلاش میں جو بڑی آپانے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری پکڑی گئی، اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انہوں نے ایک سرے سے گرایا کی صدی ہی چھین لی۔ اور کرتے میں کر پٹانکے لگا دیے۔ اس دن سے ان کا جی گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہو گیا، وہ انہیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آئے لیکن جن کی ناک کی جگہ تکونی ملی گئی تھی اور انگلیوں کی جگہ ڈور سے لٹک رہے تھے۔

(۱۰)

ہاں شمن سے عاجز تھیں سارے دن بھائیوں کو کوسنا پٹنا، لوگوں سے بڑا نہ ان کے کام میں حارج ہونا، بھادوں کی زندگی اجیرن اور ہتھیوں کے لیے قہر کا سامان، ماسٹر صاحب نے تو بہ کر لی اور قرآن پڑھانے والی ملائی بی نے کان

انیٹھ ایسے کہ ”توبہ، فوج کسی کی اولادیلوں ماتھے سے نکل جائے“

اور سب سے زیادہ تودہ نوری کو خراب کیے دیتی تھی۔ وہی ہوا جس کا بڑی پاپا کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ شمن نے نوری کو کوڑی کام کا نہ دکھا اور وہ روز بروز گئی گزری ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت اسے مرنے والا اور بھی یاد آ رہا تھا کیونکہ ایک تو نوری ماتھے سے نکلی جا رہی تھی۔ دوسرے اس کی اپنی صحت رفتہ رفتہ گر رہی تھی۔ لکھنا تو کسی دن ہی ختم ہو جاتا ہو گا اور نیند تو اس کے حصے کی اللہ میاں کے یہاں ختم ہی ہو گئی تھی۔ اس کا ایک رشتہ کا دیور حال ہی میں ڈاکرٹی پاس کر کے آیا تھا، وہی بچہ ا سہابی جان میں جان ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے دوروں کا علاج دنیا جہاں کے حکیم ڈاکرٹا رہ گئے، نہ ہو سکا، اگر تھوڑا بہت کیا تو رشید ہی نے کیا۔

ویسے دوروں کا کیا ٹھیک، کہہ سن کر تھوڑی پڑتے ہیں۔ بس اتنا اتفاق یا خدا کی مہربانی کہو کہ دوسرے کے وقت رشید کہیں آس پاس ضرور پہل جاتا، ورنہ بچانے کیا ہوتا۔ ہزار سی دوا بیس پی ڈالیں مگر دوروں سے بچانہ چھوٹا۔ لوگوں نے بہت چلانا کہ وہ بھٹی کے ہاسوں کا علاج کر دے مگر وہ ٹال ہی گیا۔ آخر کو بچاری منجھو کی شادی ایک وکیل صاحب ہی سے ہو گئی۔ منجھو بچاری الہ جالوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں، شریفیوں کی طرح گھر میں رہیں، پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ یا مالے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے، پالے، پوسے، پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی جو نیر کوئی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، واہ، کیا جنتی ہوئی تھی!

پر منجھو ابھی مری نہیں تھی، اس کی تواب زندگی شروع ہو رہی تھی۔ ادھر وہ بیاہ کہ گئی ادھر بڑی کو دوروں نے آدلوچا، اور اس بڑی طرح کہ توبہ بھلی۔ طبیعت نڈھال اور جی کھویا کھویا سا رہتا۔ دل بہلانے کو اس نے مار مومیم بھی سیکھنا شروع کیا۔ ”ابن مریم ہوا کر سے کوئی“ گھنٹوں بے تال سر مار مومیم کی پی پی میں سے ساتھ چلتا، مگر دل اور بھی بے قابو ہوتا گیا۔ رشید اگر گھنٹوں بیٹھا اسے مرض کے متعلق

بدایتیں دیا کرتا، کبھی ایک آدھ سوئی بھی اس کے بازو میں لگا دیتا۔ بازو میں سوئی لگواتے وقت اس کے بڑی گدگدی ہوتی اور وہ لوٹ لوٹ ہو جاتی، پردو چار دن کو دور سے ختم جاتے۔

مگر بڑے بھیا کو رشید سے خواہ مخواہ کا برپا گیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان کی دھن، جو سدا کی بہانے باز ہتی، ہمیشہ کا نسخہ لکھوانے کا اتفاق کیا جاتی تھی اور رشید پچارا بھول بھول جاتا تھا۔ پران کا کہنا تھا وہ جان بوجھ کر کسی کے بہکانے کی دیر سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ اور بڑی آپاچینے دونوں بچوں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ بڑے بھیا کا لو کر سی ایسا لکرایا تھا کہ نسخہ لکھنے کو کئی دفعہ رشید میاں نے کاغذ اٹھا، سنی ان سنی کر گیا۔

”وہ بچارے تو سبھی کو بھگتنے کو تیار ہیں یہ وہ کہتی۔ پھر بھیا نے جو شکایت کی تو بڑی آپا بکڑ کھڑی ہوئی کہ وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں، میری وجہ سے آجاتے ہیں تو سارے گھر کو مرض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔“

اور سب بات بھی تھی۔ بڑی کی شسرال دالوں پر اسی کا حق تھا۔ میاں مر گیا تھا تو کیا تھا، اس کا کنبہ تو موجود تھا۔ وہ آج چلی جاتی تو کون اس کا ہاتھ پکڑ لیتا؟ یہ تو اس کا ہی جی تھا جسے مارے بیٹھی تھی۔

کہتے ہیں کہ بڑے بھیا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ان بچارے کے دل میں کہاں سے بیٹھتی، یہ ان کی لاٹلی بیگم ہی کے کر تو تھے۔ سو بس وہ پیچھے ناک گئے۔ جہاں رشید آتا وہ آن بیٹھتے اور وہ پچارا جلدی سے چلا جاتا۔ ارے کہیں یوں لستم لستم بھی ہو کر ٹھیک ہوتے ہیں۔

غضب تو جب ہوا جب انہوں نے اس کے خط پکڑ لیے اور صاف بڑی سے کہلوا دیا کہ اگر یہ پتے بازی بند نہ ہوئی تو اب جان تک نوبت پہنچ جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو نکاح کر لو، مگر شرافت سے۔ بڑی آپا کی ماس کے کان میں بھی جھک پہنچی اور بڑھیا صلواتیں سناتی، دہائی دیتی چوڑھ دوڑھی۔ وہ لے لے چکی کہ رشید



پیارے کا آنا بند۔ اس دن سے دور سے بھی پھیلے پڑ گئے۔ کس کے بوتے پر پڑتے؟  
مگر بڑی کا غضب تین تاؤ کھا گیا اور بس اسے تو پھر اپنے بچوں کی مامتا نے بے چین  
کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے نوری کی بربادی دشمن کے ہاتھوں نہ دیکھی گئی، بخیر  
اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

(۱۱)

دشمن نے جب اسکول میں قدم رکھا تو پہلے اس نے چاروں طرف سے اطمینان کر لیا  
کہ کدھر کدھر سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے میڑن کو سمجھا  
دیا کہ مہربانی کر کے نہ تو اس کے۔۔۔۔۔ سرپرستہقت سے نامتو پھرے جائیں اور نہ  
اسے گھر کی یاد نہ آنے کے لیے پار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس قسم کے دکھاو  
سے بخوبی واقف تھی اور منجھو کو پرکھ چکنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی سے خبت  
کرنا یا کر دانا حد سے زیادہ مکاری ہے۔ پیار سے وہ ایسی بھڑکتی جیسی می چڑیا بھٹکا  
سے۔ وہ ان باتوں کی عادی ہی نہ رہی تھی۔ بچانے کتنے دن سے نرم اور اخلاص سے  
الفاظ اس کے کانوں کے پاس بھی نہ پھٹکے تھے، مہربانیاں کے جواب میں گھر کی سننے  
کی عادت پڑ چکی تھی، لہذا وہ کوئی کام شا باشی سننے کے لیے کرنا ہی نہ جانتی تھی، بلکہ  
جب تک ہر قدم پر اسے ڈانٹ نہ ملے وہ کچھ ناامید ہی ہو جاتی۔

جماعت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے ایک بے اعتباری کی نگاہ سب  
چہروں پر ڈالی۔ اسے ان کا گھورنا اور مسکرا کر آپس میں کانا پھوس کرنا بہت ناگوار  
ہوا۔ جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہو گئیں مگر وہ اوڑوں کی طرح بیٹھی رہی  
اس پر لڑکیوں کے ہنسنے نکل گئے اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اس  
بے عنوانی پر رائے زنی کرنے لگیں۔

”کیا آپ کی بیٹی میں درد ہے جو آپ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا؟“ رعب دا  
مس ممتاز نے کٹے ہوئے لہجے میں معلوم کرنا چاہا۔

”ایں!“ اس نے منہ پھاڑ دیا۔

لڑکیاں ہنسی سے لوٹ گئیں اور خفت کی وجہ سے شمن کے کان لال ہو گئے۔  
اسے مس ممتاز شروع ہی سے ”نفرت“ لگیں۔ وہ اس سے آپ کر کے بول رہی تھیں،  
جس میں علاوہ انتہائی تکلف کے ذرا طنز کی چاشنی بھی موجود تھی۔ مس ممتاز نے کوئی  
اور بات نہیں کی۔ اس دن کیا پڑھایا گیا، یہ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا کیونکہ گھر اہٹ  
اور پریشانی پر قابو پانے میں اسے اس قدر کشمکش سے سامنا کرنا پڑا تھا کہ وہ کچھ  
نہ سن سکی۔

تین چار دن وہ جماعت میں خاموش بیٹھی رہی اور اب اس میں اتنی سمجھ آ  
گئی تھی کہ سب لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی، بیٹھ جاتی، اندر باہر جاتی اور  
حاضری کے وقت بجائے ”کیا ہے“ کے اب وہ ”جی حاضر“ بولنے لگی تھی۔ مگر بولنے  
کے بعد بڑی دیر تک اس کے کان متمایا کرتے کیونکہ جب پہلے روز اس نے حاضری  
دی تھی تو لڑکیوں کا ہفتے ہفتے تپلا حال ہو گیا تھا، یہاں تک کہ مس ممتاز کے وجہ  
دار سنجیدہ چہرے پر بھی دیر تک مسکراہٹ منڈلاتی رہی تھی۔

بہشت بھر بعد اسے نجی جماعت میں اتار دیا گیا۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات  
نہ تھی مگر لڑکیوں نے اس معاملے کو ساخنہ بنا دیا۔ حد ہر وہ جاتی اشارے ہونے  
لگتے۔ لڑکیاں اس کی بے وقوفی کے چرچے کرتے ٹھٹھے لگاتیں اور اب ہر ایک کی  
زبان پر یہ تھا کہ وہ اتار دی گئی۔ مس ممتاز نے رپورٹ دی کہ وہ بہت کمزور ہے  
اور اس درجہ میں کام نہیں چلا سکتی۔

اس نئی چھوٹی جماعت میں چھوٹی لڑکیوں کے درمیان وہ ان سب کی اماں  
معلوم ہوتی کیونکہ یہ لڑکیاں اس سے ڈرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے  
معلوم ہو گیا کہ وہ ان سب کے عقل، عمر اور علم میں بہت آگے ہے، اس کو سبق  
وغیرہ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے تیزی سے لڑکیوں پر رعب گانٹ لیا۔  
دو مہینے بعد جب وہ گھر واپس گئی تو پہلے سے چوگنی بد زبانی، خود مراد و دھیت

ہو گئی تھی۔ اب اسے مار لینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ نہایت گستاخ نگاہوں سے گھور کر ترط سے جواب دیتی۔ اس کے علاوہ اسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی عادت ہو گئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ تھبٹ نعمت خانہ میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوٹا سا چرا کر بغل میں دبالتی کہ خوب ماتھ بلا بلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور منہ میں لقمہ لے کر وہ گنگناتی ہوئی نکلی چلی جاتی تاکہ کوئی سوچے اس کا منہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ چوری کی چیز وہ نہایت تندہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈھتی، یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔ لڑکیوں سے اور بھی اس نے غلیظ غلیظ باتیں سیکھ لی تھیں جو وہ نہایت فخر سے زور دے کر سنا کرتی۔ پھر جو وہ اسکول آئی تو اسے ایک نئی ٹیڑھی سے پالا پڑا۔ یہ ٹیڑھی بہت کم عمری معلوم ہوتی تھیں لہذا آتے ہی اس نے انہیں دق کرنا شروع کیا۔ کچھ دن اس کی شرارت بھری جنگ جازی رہی لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ مادر ہی ہے۔ انہوں نے اس کی شرارتوں پر کونے میں یا بچ پر کھڑا کر دینے کے بجائے بالکل توجہ نہ دی، اور جیسے ہر بات کو ٹال جاتیں۔ کونے میں کھڑے ہو کر تو وہ مزے سے لڑکیوں کا منہ چوڑھا چوڑھا کر منہسایا کرتی تھی جس پر استثنائی جل کر اسے بچ پر کھڑا کر دیتیں، بچے پر کھڑے ہو کر وہ لڑکیوں پر بن بن کر گرتی اور خوب منہی پڑتی۔

مگر چند ہی دن میں اس نے اپنے آپ کو ہزاروں ذمہ داریوں میں جکڑا یا یا۔ کلاس کی مانیٹر وہ، بورڈ وہ صاف کرے، چاک کی فکر رکھنی پڑے، نقشہ مانتے کی کیل مضبوط ہے کہ نہیں، لڑکیاں غل جھپٹیں تو اس کی مصیبت، اس کے علاوہ مس چرن، یعنی اسی نئی ٹیڑھی کتابیں اور چھتری وہ اپنے ڈیسک میں وقتاً فوقتاً رکھے اور کبھی کبھی ان کے کمرے پر امتحان کی کاپیاں منہانے جائے۔ کمرے میں مس چرن بالکل استثنائی نہیں لگتی تھیں بلکہ بڑی بے تکلفی سے اس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہتیں:

”اچھا بھئی چائے پیو گی یا نیلیو کا شربت؟“ وہ پوچھتیں، اور اسے شرم آنے لگتی۔ کبھی کسی نے اس سے ایسی عجیب باتیں نہ کی تھیں۔ بھنور ٹی سی دیر میں وہ دونوں سہیلیوں کی طرح منہ منہ کر باتیں کرنے لگتیں۔ اس نے انہیں تمام گھر کے قصے سنائے۔ بڑی آپا سے وہ بڑی مخلصانہ اور شاد و سرور کی شرارتوں پر تو ان کے اچھو لگ لگ گئے۔

نوری انہیں کچھ کیچھ پسند تھی۔

میں پرانے سے اسے گھر کا کام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا۔ شمع کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اسے بڑا رنج ہوتا۔ میں پرانے نے اسے اسکول کے علاوہ کام دینا شروع کیا اور دوسرے امتحان پر اسے ڈبل درجہ چڑھا دیا گیا۔ خوشی تو اسے اس بات کی ہوئی کہ میں ممتاز جس درجے کو پڑھاتی تھیں وہ اس سے بھی آگے ہو گئی۔

مس چرن اب بھی اسے اپنے کمرے میں پڑھاتی رہیں اور منجھور کے بعد اسے پہلے انسان نے متاثر کر کے اپنے قابو میں کر لیا۔ اگر مس چرن کہتیں تو وہ مشکل سے مشکل کام انجام دے لیتی؟ ان کے لیے اسے کسی کو قتل کرنے میں سبھی دروغ نہ ہوتا۔

اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اسے چھیرنے کی کوشش کی جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھپانے لگا۔ مس چرن کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھینچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اسے ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا، اپنی رگ ویسے میں سرایت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو وہ جو کام کرتی ہوتی اسے گڑبڑ دیتی بات کرتی ہوتی تو زبان پر ایک طعنازدار جھگڑہ کسی اور دور کوئی کبیل کھلاتی ہو تیں تو اس کے لیے

پڑھنا دشوار ہو جاتا، رہ رہ کر ان کے قہقہے اس سے پتہ چل جاتے۔ سب کا خیال تھا مس چرن سیاه نام اور بہت ہی کم رُوحانی، لیکن شمن کی آنکھیں کچھ اور سی دیکھا کرتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مس چرن سے بھی حسین کوئی شے ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے رشتہ داروں سے شکاوت تھا، کچھ یونہی سا، خدا سے ڈرتی تھی۔ مگر اس سے خیال میں غرق کبھی نہ ہو سکا،

لیکن مس چرن اس کے لیے اپنے خون اور ایمان سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ عموماً ان کی تخیلی صورت کو عقیدت اور انتہائی جوشیلے محبت بھرے جذبات میں ڈوبی ہو جا کرتی۔ وہ آئین مس چرن، وہ گیسٹ۔ وہ ان کی ساڑی ہلی اور بلاؤز چمکا۔

اس کا پڑھنے میں بھی زیادہ دل نہ لگتا، مارے باندھے سے حرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی؛ گویا گھر کا کام مستعدی سے کر کے وہ مس چرن کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھا دیتی تھی۔ اور تخیل کے ساتھ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بھی مس چرن کے قریب میں رہنے لگا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو ان کے پاس محسوس کرتی؛ وہ کھڑی ہے۔ مس چرن کا خیالی بیوی پاس سے گزر گیا ہے۔ وہ خود سو رہی ہے مس چرن اسے تھپک رہی ہیں۔ وہ پیاسی ہے، حق چٹخا جا رہا ہے اور مس چرن اس کے منہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار عرق پھوڑ رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ اس کے ماتھے پر ہے، وہ ہر طرف کی بخی ہوئی، میں اور اس احساس سے وہ بغیر نیند کے اذگھنے لگتی۔ وہ دلچسپی رات کو اندھیرے میں روتی ہوئی ٹھٹھکتی پھر رہی ہے، ٹھنڈی گھاس پر پڑی سردی سے کانپ رہی ہے، مس چرن اسے اپنے پیروں بھر سے دانتیکہ پر لٹائے ہوئے ہیں۔ وہاں وہ ڈر کے مارے مگر سادھے پڑی ہے کہ اگر ہوش میں آئی تو سارا خواب بھر جائے گا۔

مس چرن کا خیال اس کی جان کو مرض کی طرح لگ گیا۔ کچھ اُن دنوں بورڈنگ میں آلو کھاتے کھاتے لڑکیوں کے ہاتھ بھی بڑھ چلے تھے اور شمن تو ہر الا بلا ڈٹ کر کھا جاتی تھی۔ اس کی نیند بہت خراب ہو گئی تھی، راتوں کو اٹھ کر بڑبڑاتی تھی اور جیسے ہی آنکھ کھلتی اسے محسوس ہوتا کہ مس چرن کھڑی ہیں، اگر وہ ہلی تو غائب ہو جائیں گی۔ اندھیرے میں اُن کے وجود کو گھور گھور کر وہ سوئے کی کوشش کرتی۔

ایک رات کو اس نے اپنے آپ کو برآمدے میں مس چرن کے کمرے کے آگے کچھ ٹٹولتے ہوئے پایا۔ وہ ایک دم ڈر گئی۔ وہ کیسے اتنی دودھک سوتی ہوئی چلی آئی۔ جلدی جلدی کمرے میں آکر گھپوٹے میں دبک گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ خود تھی یا اس کا بھوت جو راتوں کو اسے گیسٹ پتر تھا۔

دو تین دن بعد پھر اُس نے مس چرن کے کمرے کے آگے خود کو ہچکیوں سے دوتے ہوئے پایا۔ خوف سے اُس کی گھٹکی بندھ گئی۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ یہ اُسے نہیں معلوم ہوا۔ اُسے واپس اپنے کمرے تک آتے میں بہت ڈر لگا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا اور جاڑوں کی وجہ سے سب کمرے بند تھے۔ وہ ڈر لوک نہ تھی اور بلی وغیرہ سے اُسے خوف نہ آتا تھا مگر لڑتے وقت وہ نیز تیز بھاگنے لگی گویا بہت سی غیر مرئی چیزیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب وہ میڑن کے کمرے کے پاس پہنچی تو ٹانگی سی لالٹین جل رہی تھی۔ موڑ پر ایک بھیانک سایہ زور سے اُس کے آگے چھپتا چلا گیا، اُس کی چیخ نکل گئی اور آنکھیں ہلپیت سے پھٹ گئیں۔ میڑن جاگ گئی اور نکل کر اُس سے آواز دی: ”کون ہے؟“ شمن دوڑ کر اُس سے چمٹ گئی۔ میڑن بھی بوکھلا گئی کہ یہ کیا بلا ہے اور اُس نے زور سے اُسے پر سے دھکیل دیا۔

”یہ میں ہوں نہ شاد شمن؟“ اُس نے جلدی جلدی زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں بھوت دوڑا میرے پیچھے ابھی؟“ وہ بڑی طرح ہنسی ہوئی تھی۔ ”بھوت؟ کہاں ہے بھوت؟ چلا اپنے کمرے میں“ میڑن اُسے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ خود ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

”رات کو بھی دنگا مچاتی ہیں یہ وہ بڑا بڑا“ اُس کے کمرے میں آکر میڑن نے بجلی جلائی تو وہی بھوت بالکل شمن کے پاس کھڑا تھا، وہ پھر بچتی، ”بھوت؟“ ”کہاں ہے؟“ اُسے یہ تو تنہا ہی اپنی پرچھا میں ہے، پگلی لڑکی، شمن کو بہت شرم آئی اور وہ چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میڑن بجلی بچھا کر بڑا بڑا قہقہے مچاتی گئی مگر اُسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی، اُس کا دل برابر دھڑک رہا تھا اور تمام جسم تنہا ہوا تھا۔ اُس نے رات کی بات کسی سے نہ کہی۔ تو یہ! اُس چرن کو معلوم ہو گیا تھا۔

وہ رات کو بھوت بن کر اُن کے دروازے پر دوڑیا کرتی ہے تو وہ غرور اُس سے نفرت کرنے لگتیں۔ وہ تو انہیں اتنا بھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے دماغ پر اس بڑی طرح چھائی ہوئی ہیں۔ مگر یہ بات ادروں سے زیادہ وہ نہ چھپی رہی اور پہلے پہل صوابہ

نے ایک دن مس چرن سے کہہ دیا کہ وہ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو خواب کر رہی ہیں۔ بات یہ تھی کہ مس ممتاز اُن کی چھوٹی بہن تھیں اور جب سے مس چرن آئی تھیں اُن کی قیمت بہت گر گئی تھی، علاوہ شمن جیسی مرنے والی لڑکیوں کے اور قریب قریب ساری لڑکیاں انہیں بہت پسند کرتی تھیں۔

مس ممتاز بیڈ منٹن کھلاتی تھیں اور مس چرن باسکٹ بال۔ زیادہ تر لڑکیوں کو باسکٹ پسند نہ تھی اور مس ممتاز کا کہنا تھا کہ مس چرن لڑکیوں سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد کم کیے دینی تھیں، انہیں کے بھڑکانے سے لڑکیاں بیڈ منٹن کی بجائے باسکٹ بال کھیلنے لگی تھیں۔ یہ مس ممتاز کی شہرت تھی اور ساتھ ساتھ اُن کی بہن پرنسپل کی۔ شمن کو بیڈ منٹن سے نفرت تھی کیونکہ مس ممتاز اُن لڑکیوں کو بہت ذلیل کرتی تھیں جو ذرا کمزور تھیں۔ انہوں نے ٹیم بنالی تھی، سب سے اچھا کھیلنے والی لڑکیاں ایک طرف اور پھر سب سے بُرا کھیلنے والی، جس میں شمن بھی تھی، دوسری طرف۔ روز اچھی لڑکیاں جیتتیں اور یہ ماریں، لہذا اس ذلت سے بچنے کے لیے جس دن بیڈ منٹن کی باری ہوتی شمن دوسری کوئی اور بہانہ کر کے مس چرن کو کھلاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اُن کی ہر حرکت کا عکس وہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لینا چاہتی۔ لیکن انہوں نے گیند اچھالی، یوں اپنے تیلے سے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے جنبش دی۔ وہ گئی گیند۔ لڑکیاں کہتی تھیں کہ اُن کے ہاتھ سوکھے اور کاسے ہیں مگر شمن کو وہ شگ مر مر کے سے نظر آتے تھے۔

اتوار کو وہ اپنی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بٹھکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو اُس کی آنکھ کھلی تو بٹھکا بٹھا رہ گئی۔ پرنسپل مارچ یے مس چرن کے کمرے میں لباسا چو غا پہنے کہ طی تھیں اور مس چرن پریشان شمن کو سیدھا بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم سے وہ چُپ ہو گئی اور نہ پھاڑے مس چرن کو نہ جھتی رہی۔ وہ مس چرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی، چیخ کا پلنگ اُدھ خواب والا دامہ نہیں بلکہ سبز پھول لڑھا ہوا تیکہ، بھوڑا بیل

جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔

اُسے گھسیٹ کر اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح پرنسپل نے اُس سے بہت سے سوال کیے مگر اُس نے منہ پھلایا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے اتنی بہت سی باتیں بتا دیتی جو وہ سوچا، دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔

تیسرے دن مس چرن اسکول چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ کسی لڑکی سے ملنے بھی نہ آئیں۔ بس ایک دم چوکیدار اُن کا سامان لے گیا اور اُس کے بعد وہ بٹوہ ہاتھ میں لیے نکلیں اور سیدھی پھاٹک سے باہر چلی گئیں۔ اسکول میں کھلبلی مچ گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگیں۔ کچھ نہ معلوم نہ ہو سکا بس اتنا پتہ چلا کہ کچھ شمن پر بات اُٹھی تھی جس پر پرنسپل اور مس چرن میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ لڑکیوں نے شمن کو چاروں طرف سے گیر کر سوالوں کی بارش کر دی مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ جب مس چرن کے جانے کی خبر پئی ہو گئی تو اُن کی ساری چاہنے والیوں نے رونا شروع کیا، اس پر پرنسپل صاحبہ اور مس ممتاز نے آکر سب کو خوب ڈانٹا۔ لڑکیاں بڑبڑا کر چپ ہو گئیں۔

مگر شمن نے ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ وہ خاموش چور بنی سب سے الگ الگ پھرتی رہی۔ مگر سارے وقت تول تول کر قدم رکھتی تھی، جیسے کوئی سچھی ہوئی چیز اُٹھائے پھر رہی ہے جس میں ٹھیس لگ گئی تو جھپکا چور ہو کر بکھر جائے گی۔

مس چرن کے جانے کے بعد وہ بہت سخت دل ہو گئی۔ اسے اتنا تجربہ ہو گیا کہ منہ بولی کا کوئی تصور نہیں تھا، تصور خود اس میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اور یہ ماننے کے لئے وہ قطعی تیار تھی۔ اُسے اپنے دماغ کے اُس حصے سے سخت نفرت تھی جو ہمیشہ سارا الزام اُسی پر تھوپ دیا کرتا تھا۔ اُس نے مس چرن کے متعلق سوچنا بہت کم کر دیا۔ اُن کا خیال اس کے دماغ میں چھپے ہوئے زخم پر پڑھو کے لگتا تھا جس سے اُسے رُوحانی اذیت ہوتی۔



وہ اُس سال ذیل ہو گئی لہذا اُسے مقامی مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا، یہاں  
 نوری بھی اُس کے ساتھ جاتی مشن میں مس چرن سے بھی زیادہ مباح نام پھر تھیں مگر  
 شمن کو اُن میں سے ایک بھی پسند نہ آئی۔ نوری بڑی تیز تھی اور بڑی کیا تھی اُسے  
 برابر مار مار کر پڑھاتی رہتی تھیں اس لیے وہ بہت جلد اسکول میں جمع گئی۔ مگر شمن  
 سے نہ جانے لوگوں کو کہاں کا برتن تھا کہ وہ مستعدی سے کام کر کے بھی لے جاتی تو وہ  
 اُس سے اور بہتر کام کی توقع رکھتے۔ اُسے کامل یقین تھا کہ وہ کندہ بن تھی اور یاد  
 داشت تو اُس کی بہت خراب تھی۔ سب کہتے تھے کہ وہ بہت جلد سب بھول جائیگا  
 کہتی تھی۔ مس چرن کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اُسے غور کرنے پر بھی اُن کا ناک نقشہ  
 لباس، ہنسی، اُن کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ آتا۔ جب شمن اُن کے کمرے میں  
 پڑھتی تو وہ اُن کا ہلکے ہلکے گنگنائے جانا، ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک  
 طرح کی مدد سی ملتی جاتی تھی، فضا کو کچھ اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا۔ بہت دفعہ  
 ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر ہلکا گئی رہے کہ مس چرن کے گنگنائے کی چھوٹی  
 چھوٹی لہریں اُس کے سوال کی گتھی سے ٹکرائیں اور وہ ڈھیلی ہو کر گھل جاتی۔ مگر  
 نہیں، وہ یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

دو برس اُس نے مشن میں پڑھا، اُسے ایک دفعہ بڑا درجہ ملا اور دو چار انعام  
 بھی ملے مگر اُس نے وہ سب لاپرواہی سے پھینک دیے۔ اُسے کسی چیز کی قدر  
 کرتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا، وہی زخم سا اُس کے دماغ میں بیسیں مارنے لگتا جو  
 مس چرن کے خیال سے دکھا کرتا تھا۔ دو برس اُس نے بائبل پڑھی اور لیسوع مسیح  
 کی تعریف میں بہت سی ٹعیں سیکھ گئی مگر اُسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ گرجے  
 میں گھٹنے ٹیکنے کے لئے مونچھ کے گدے تھے جن میں سوئیاں سی لگی تھیں جو بہت  
 چبھتی تھیں۔

کئی دفعہ اُس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چلے سے لیسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر  
 اماں کے ڈر کے مارے ہمت نہ پڑی۔ اُسے یہ بات معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی

۱۷۔ بیڑھی بکیر

کہ کیسے وہ خدا کے بیٹے تھے مگر پھر بھی لوگوں نے ان کو چہین سے نہ چھوڑا، آخر یہ دنیا اس قدر گناہگار کیوں ہے؟ لوگ جھٹ پٹ اچھی باتیں سیکھ کر مزے سے جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

مقدس ماں کنواری مہدی! یہ سوچ کر ذرا اُسے ہنسی آتی۔ وہ خود بھی تو کنواری تھی، اگر خدا نہ کرے بیٹھے بٹھائے خدا باپ اُس کے یہاں بھی ایسا ہی محبوب لا مٹا سا بیسرو پیدا کر دے تو وہ کیا کرے! یقیناً اماں تو اس کے لئے دودھ دیں گی نہیں، اور کپڑے تو خیر وہ پڑانے کر توں کے بنائے گی، مگر پھر اُسے یاد آتا کہ جب اُس کے دھڑکی کی لڑائی کے ایسا ہی متا پیدا ہو گیا تھا تو سب نے کیسی تھڑی تھڑی مٹی میں شبنم نے اُس کو بہت سمجھایا کہ بڑہ ہے تو کیا، "خدا باپ" کی قدرت میں کسی کو کیا دخل ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر وہ یہی کہتی تھی کہ "نہیں بی بی، میں نے تو باپ کیا ہے اور لوگ کیوں کرتے ہیں۔ گھر آ کر اُس نے اماں وغیرہ کو جب بیسرو کی تعریف میں نعمتیں سنائیں تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اُسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ جیسا ہی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے، لہذا مجبوراً اُسے واپس اُسی پرانی درس گاہ میں بھیج دیا گیا جہاں پہنچ کر مہس چرن کا داغ پھر مرا ہو گیا اور مہس ممتاز سے نفرت چوکنی بڑھ گئی۔

(14)

اس بار اسکول کی نئی زندگی نئی بلاؤں سے شروع ہوئی سب اس پر ایک ٹوٹ پڑے۔  
 نہایت گندی، شرمناک اور نفرت انگیز مصیبتیں۔ کئی دن تو وہ خودکشی کے منصوبے  
 باندھتی رہی کیونکہ لپوں و بچہ رنجہ کرنے سے تو ایک دفعہ زہر نکل لینا ہزار درجے  
 آسان تھا۔ مگر گھر میں کسی قسم کا زہر دستیاب ہونا بھی تو مشکل تھا۔ جسمانی تبدیلیوں  
 سے تو وہ اور بھی بدحواس ہونے لگی اور گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہا یا کرتی۔ اُسے پہلی  
 جماعت کی وہ بھیانک اُستانی یاد آ جاتیں جو بالکل گوشت کا بے متنگم لودھڑا تھا۔  
 ویسے ہاتھ پر تو ان کے سوکھے مارے تھے مگر میٹ اور کلیجے پر گوشت کے پلندے

لدے ہوئے تھے۔ لڑکیاں اُن کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب یہودہ  
لطیفے اُن سے وابستہ کر لیے تھے۔ اُن کی نفرت محض نفرت ہی نہ تھی بلکہ اُس میں ایک  
طرح کا خوف اور کراہت پوشیدہ تھی۔ اصلی گھین تو سنسن کو اُن سے اُس دن سے ہو گئی  
تھی جس دن وہ مکتوب سے اُن کے غسل خانے میں گھسی چلی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نہاتے  
وقت دروازے میں کندھی چڑھانا مقبول جایا کرتی تھیں۔ ملاجی کے جدیہ دوسری  
ہستی تھی جسے دیکھ کر اُس پر فحاش کی سی حالت ماری ہو گئی تھی۔

وہ خاموش تنہائیوں میں پڑی بچانے کیا کیا سوچا کرتی۔ مستقبل بھیانک خوابوں  
کے نئے نئے چوے بدل کر اُس کے سامنے ناچا کرتا۔ کاش کوئی ایسی دوا ہوتی جسے  
کھا کر وہ چوبیا برابر ہو جاتی۔ وہ بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جسم کے مختلف  
حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے۔ پہلے تو جیسے اُس کی ٹانگوں کو جسم سے نفرت  
ہو گئی اور وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں۔ رات کو وہ محسوس کرتی اُس کی ٹانگیں بڑھ  
رہی ہیں، لمبی لکیروں کی طرح ہراتی، پلنگ پر سے اتر کر دیوار سے رینگتی ہوئی نامعلوم  
منزل کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے لیا ٹانگوں کو دیکھتی تو وہ جھٹ  
سے کہنے سے کی طرح سکڑ جاتیں، گویا اُس نے انہیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ بھاگ  
ہی گئی ہوتیں۔ وہ کنکھوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کیا کر رہی ہیں اُس کی ٹانگیں، مگر  
وہ ہوشیار سانپوں کی طرح مکر کیے پڑی رہتیں۔ یہی نہیں اُس کے جسم کا ہر حصہ خیر سا  
ہو چلا تھا۔ ناک ایک دم چہرے سے روٹ کر اپنے راستے پر چلنے لگی۔ اُس نے ایک  
کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شہزادے کی ناک تین فٹ لمبی ہو گئی تھی۔ بیچارہ شہزادہ!  
کوئی اُس سے بات بھی نہ کرتا، اُس کی چوٹی بھی کچھ عجیب بے تکی سی ہو گئی تھی، جیسے چائے  
دانی کا گنڈا۔ اینٹھی ہوئی چھوٹی سی دم جو اس کی لمبوتری گردن پر کسی طرح نہ چھتی۔ ایک  
مرض کا علاج تو اتفاق سے اُس کے ہاتھ لگ گیا۔ اُس نے اماں کی بیماری کو بھانپ  
لیا تھا گو اس نے چھپائی گئی تھی مگر اس کی تیز نگاہوں نے اُس شیشی کو دیکھ لیا تھا۔  
جس نے اُن کی جان بچائی تھی۔ موقع پا کر اُس نے وہ دوا چڑھا لی۔ اثر فوراً ہوا اور

وہ قطعی اچھی ہو گئی۔ بھلا اگر وہ کسی کو اپنا مرض بتا دیتی تو اتنی جلدی کوئی دوا تھوڑی کر دیتا۔ اُس کی تو ہر بات کو ٹالاجاتا تھا۔ دوسرے بھلی بہن نے اُسے ایک دفعہ اس قسم کی بات کہنے پر بہت بے شرم کہہ کر ڈانٹ دیا تھا۔ اور غضب تو یہ تھا کہ نوری اُس کے تمام شرمناک بازوؤں کی ٹوہ میں لگی رہتی مگر وہ ہمیشہ اس سے دور رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ نوری حقارت سے مسکرائے گی اور سب سے جا کر شکایت کر دے گی۔ اپنے دکھوں میں وہ آپ ہی گھلا کرتی۔ مگر خاک گھلا کرتی تھی اگر شست تو جبکہ بے جگہ تھپا چلا جا رہا تھا۔

اُس نے بھاگنا دوڑنا کم کر دیا تھا۔ پیسے ہو اسے بھی طبعی سی چھتی تھیں۔ جسم پکا پھوڑا ہو گیا تھا اور پنڈلیوں میں اٹھن ہوتی تھی۔ بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اُسے بہت نفرت تھی اور وہ ان کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی۔ دھچا دھچبب وہ اتنی کوتاہ وقت زمین پر پریشیتیں تو اُن کے کہ توں میں بقیاں سی لڑاتی معلوم ہوتیں مگر شتمن کسی نہ کسی طرح کھیل میں شرکت کرنے سے بچ جاتی۔ اُسے ہر روز مزاحیہ طعنے لیکن وہ سب برداشت کرتی، یہاں تک کہ ایک دن اُس نے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو کچھ سے اُس ترے سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی۔

ایک دم اُس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ کھڑے کھڑے چکر آجاتے، ہانہ خراب رہتا، منہ پر کالے اور سفید سفید چٹے پڑ گئے، ماتھا پھنسیوں سے لڑ گیا اور سارے جسم میں بھلی جھتی رہتی، خون جیسے کھولتے ہوئے تیل کی طرح بھاری بھاری اُسے جسم میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

اُسے سُست دیکھ کر کسی نے پر دانہ کی ریس مزاحیہ بڑھتی گلیں، یہاں تک کہ اماں آبا کے پاس بھی بہت بڑی شکایت گئی۔

اُسی زمانے میں سالانہ ڈاکڑی کا وقت آیا تو اسے ہزاروں فکر وں نے گیر لیا۔ وہ کئی دن پہلے سے سہمی ہوئی رہنے لگی۔ یہ اسکول میں اُس کا پہلا معاملہ تھا وہ ہزاروں

## ٹیرٹھی لکیر ۴

یہاں تلاش کرنے لگی، مگر جب جلاؤ تلوار اٹھا لیتا ہے تو پھر بچاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔

جب میرٹن نے اس سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اُس نے اُسے ”گدھی“ کہہ دیا، جس پر میرٹن کو روتے روتے دورہ پڑ گیا۔ شکوہی ماری بڑھیا میرٹن بھلا اُس کے دکھوں کو کیا سمجھ سکتی!

لیڈی ڈاکرٹ نے اُس کے دو طمانچے لگائے مگر وہ اُس سے بھی کشتی لڑاتی رہی۔ ڈاکرٹ نے اُس سے بہت سے یہودہ سوال کیے جس کا اُس نے ”نہیں“ میں ہی جواب دیا۔ جان بوجھ کر وہ اُس کے پیچھے ہی پڑا گئی۔

اس کے بعد اُس کا دوبارہ جو معاملہ ہوا تو اُس نے بہت ہی فیمل چائے۔ اُس مردار ڈاکرٹ کی کوئی گول کوٹھڑنے کا وہ شوق تھا کہ حد نہیں بھلا کی طرح چمٹ گئی۔ اُسے زبردستی دیا پلائی اور چند ہی دن میں اُس کا خوفناک مرض پھر سے پھوٹ نکلا اور غضب یہ کہ سارے اسکول میں دھوم مچ گئی۔ لڑکیاں مارے تجسس کے نجانے کیا سوچنے لگیں، نوری اُسے دیکھنے کے یہاں بھید لینے کی دفعہ آئی مگر شمس نے اُسے ڈانٹ ہی بتائی۔

”سچی بتاؤ شمس“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”یہی — کیا — کہ برجیس کہتی ہے کہ تمہارے بچے پیدا ہوئے ہیں۔“  
ہیبت کے مارے وہ جنہیں مارے لگی۔ اچھا، تو یہ بات سچی۔ مگر ڈاکرٹ نے تو کچھ نہ بتایا۔ حد ہو گئی زیادتی کی۔ کسی نے اگر تابا کو لکھ دیا تو موت سمجھ لو۔  
گینڈا کی جو گت بنی تھی وہ یاد تھی مگر پھر اُس کا ہنسا منا بچہ اُسے بے طرح یاد آنے لگا۔

”تو پھر کیا کہاں؟“ اُس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا۔ شاید چھپا دیا گیا ہو۔ لیکن وہ پاتی بھی کیسے! اسکول کا کام، امتحان سر پر، بھلا بچے کو کون پالتا؟

لیکن یہ اُن لوگوں کی زیادتی تھی کہ اُسے دکھایا بھی نہیں گیا۔ وہ دیکھتی شکل کی صورت کس کی سی ہوگی، بہت ہی ذرا سا ہوگا اور پریشانی دور ہو کر اُسے ایک طرح کی فکر سی لگے گی۔

اُس کا بخارا اُترا اور وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ جب بھی کسی نے بچہ وچہ نہیں دکھایا ایک دن اُس نے باتوں باتوں میں سعادت سے ذکر بھی کیا، سعادت آنکھیں پھاڑ اُسے دیکھتی رہی اور پھر بولی: ”مگر تمہاری شادی تو ہوئی نہیں؟“

”ہیں؟ شادی نہیں ہوئی تو پھر سعادت۔۔۔۔۔؟“ وہ چپ رہ گئی۔ اس نے جو تحنیل میں نہ تھا ”مٹا“ چوہے سے برا بڑ بچہ بنا رکھا تھا آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا۔

”مگر نورمی جو کہتی تھی“

”نورمی کو کیا معلوم؟“ سعادت بزرگانہ انداز سے بولی، ”کسی سے کہنا بھی مت، بچل کہیں کی۔“

پھر سعادت نے اُسے بہت سی باتیں بنائیں اور وہ ہنسنے ہنسنے بیدم ہو گئی، شمن کو بھی ہنسی آگئی۔

جب وہ تنہا پلنگ پر لیٹی تو اُسے اس خیالی بچے کے کھو جانے کا بہت دکھ ہوا۔ نورمی کی اطلاع کے بعد وہ سچ مچ کا ایک ننھا مٹا سا لکھلا تا ہوا بچہ کہیں اپنے سے قریب ہی محسوس کر لے گی تھی، بعض وقت تو اُسے یہ بھی شہ ہونے لگتا کہ وہ اُس کے پہلو میں پڑا سو رہا ہے اور اگر ذرا بھی ہلے تو جاگ جائے گا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اُس کے اعضاء اکڑنے لگتے اور وہ سانس روکے دیر تک پلنگ پر ہلے چلے بغیر رہا ہی رہتی۔ اکثر سوتے سوتے اُسے بچے کے رونے کی آواز آتی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رات کے اندھیرے میں اُس واپس کو تلاش کرتی رہتی، حتیٰ کہ پھر اس کی آنکھ نکل جاتی۔ وہ اُس ننھی سی جان کے ساتھ بچانے کب تک اسی طرح آنکھ پھولی کھیلتی رہتی اگر سعادت اُس پر حقیقت کا

انکشاف نہ کر دیتی اور اب؟ اب بچانے کیوں بچے کے خیال سے ہی اُسے شرم آنے لگتی۔ تو یہ کیسی بُری بات تھی۔

زندگی جیسے دھند لکوں میں سے نکل کر روشنی میں آتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کے سب دکھ دور ہونے لگے، گو اُس کی سانس ٹھٹھکی مگر وہ سب باتوں کی عادی ہو گئی۔ زندگی نے رکھ رکھاؤ خود ہی سکھایا۔

(۱۳۷)

بات ختم ہو گئی تھی مگر اس واقعہ کی نوری نے وہ مقبضی پٹی کہ ایک دن پھڑپھڑ کر اُسے مٹھوک دیا۔ گھر میں وہ نوری کو بڑی آپا سے چھپا کر چار چوٹ کی مار دیا کرتی تھی مگر مجال تھی جو وہ شکایت نہ جاتی۔ بڑی آپا تو خیر اُسے ہار لیتی مگر پھر وہ نوری کو زندگی کا مزہ چکھا دیتی۔ یہاں آکر تو نوری بڑی مہذب بننے لگی تھی۔ چروٹیا کی بیٹ تک کو وہ باندھ روم پہنے لگی تھی اور بڑی اترا کر دیکھیے، دیکھیے کہہ کر بوٹی تھی۔ پھر اُسے شمن نے اُس کی سہیلیوں کے سامنے مارا۔ نوری جو ان عورتوں کی طرح ماتم کر کر کے روئے لگی اور شام تک اپنا بستر بویا اٹھا کر اپنی سہیلی مجلس کے یہاں جا بیٹھی۔ بڑی آپا کو ایک ہنایت ہی دردناک خط لکھا جس پر وہ اُس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے خوب روئی اور پر لپیل کو ایک منت بھرا خط لکھا کہ یتیم بچی کو نوری کو شمن کے بچے سے نجات دلائیں۔ نوری ہنسی خوشی مجلس کے کمرے میں رہنے لگی اور شمن کے کمرے میں بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ آگئی۔

رسول فاطمہ سے شمن کو جو نفرت تھی وہ جنوں کی حدوں سے بھی آگے بڑھ ہی ہوئی تھی۔ اُس کی باہر کو اٹا ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے وقت تھیں، جیسے چوٹی متالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔ باریک سیدھی سیدھی تنکوں جیسی پلکیں اور کھردرے چورے رنگ کے پوٹے، ہر وقت ان میں بے کسی، غرت اور بے وقوفی جھلکتی رہتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے شمن کو ایک دم ان آنکھوں پر غصہ آنے

لگتا اور جی چاہتا اُن میں گرم لوبہ کی کیلیں ٹھونک دے۔  
وہ بات۔ بے بات اُسے جو پاک دیتی۔ اگر بھروسے سے اُس کا میلادو ٹیڑھا یا بوسیدہ  
کتاب شمع کی میز یا لیٹر پر رکھتی رہ جاتی تو اُس کا ماعنی تو اُن بگڑ جاتا اور وہ جھلکا کر اُسے  
دور پھینک دیتی۔ یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی جب کہ اُس کے ہر ظلم کے جواب میں رسول  
فاطمہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے سکرطے ہوئے ہونٹوں میں سے ٹیڑھے میرٹھے  
دانت نکال کر کھگیا نے تھتی، اور کبھی تو وہ چیزوں کو بے رحمی سے ایسے پھینکتی کہ وہ اُس  
کے منہ پر جا لگتیں۔

”اُوں، بھی نہیں یہ مذاق نہیں اچھا لگتا“ وہ اسے مذاق سمجھتی تھی گویا شمع اتنی  
گرمی پڑی تھی کہ رسول فاطمہ سے مذاق کرے گی۔ وہ چھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھٹتا  
جاتی مگر رسول فاطمہ اُس کی طرف پیاسے دیکھ کر اپنی سر جھائی ہوئی آنکھوں میں ٹھاس  
پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

اسکول میں سامنے سونے کی سخت ممانعت تھی مگر رسول فاطمہ کو اس قدر ڈر لگتا تھا  
کہ وہ آخری گھنٹی بج جانے کے بعد شمع کے پلنگ کے قریب پلنگ سے آتی۔ شمع نے  
کئی دفعہ حقارت سے اُسے دھٹکا مارا بھی لیکن وہ سچ مح اس کے پیر چھونے لگی۔ اُس نے  
بتایا کہ جب سے اُس کی ماں طاعون میں مری ہوئی دو دن تک گھر میں پڑی رہی تھی تب  
سے اُسے مڑوں سے بہت ڈر لگنے لگا تھا اور اندھیرا ہوتے ہی اُسے چاروں طرف سے  
روحیں گھیرنا شروع کر دیتیں۔

”اچھا چپ رہو“ نفرت سے شمع اُس کی ہر بات پر ڈانٹتی اور وہ خاموش ہو  
کر ہولے ہوئے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر چاروں طرف بھونکتی۔ مگر جب اُس نے  
اُن مقدس آیتوں کی برکت شمع پر بھونکنا چاہی تو اُس نے ایک چانٹا اُس کے منہ  
پر دیا۔

”سوہریا، ہمارے منہ پر متوک دیا یہ اُس نے دانت پیس کر رسول فاطمہ کو اُس کے  
پلنگ پر گرا دیا۔ رسول فاطمہ بہت ہی شوکھی ماری تھی، ذرا سے ٹھوکے سے بیدم ہو جاتی۔



ایک دفعہ رات کو شش کو اپنی گردن پر چڑھا سا چمکتا معلوم ہوا۔ اندھیرے میں وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا، وہ پھر لیٹ گئی۔ نیم غنودگی کی حالت میں اُسے پھر چوہا پٹی پر رنگتا معلوم ہوا۔ دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بلکہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا، وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

جیسے اُس نے خواب میں دیکھا کہ چوہا پھر رنگا، اور قبل اس کے کہ وہ اُسے جھٹک سکے وہ اُسے پچھا کر اُس پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ اُس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ کر نانت کی طرح تھن گئیں، ساری قوت ایک دم سن سے اُس کے جسم سے نکل گئی۔ اب وہ کبھی جنبش نہ کر سکے گی۔ رسول فاطمہ کی سونپی ہوئی انگلیوں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں مگر وہ اُسے نہ روک سکی، جیسے شیر اپنے شکار کو جھنجھوڑ بھنجھوڑ کر نکلتا ہے بالکل اسی طرح۔ وہ سہمی ہوئی خاموش لیٹی رہی اور چوہے دوڑتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کی ڈوٹی ہوئی طاقت اُبھرنے لگی، ایک ہی دفعہ اُس کا سارا جسم بناوت پر نل گیا اور اُس نے چاہا ایک ہی جھبٹ میں وہ رسول فاطمہ کو پچھا کر اٹھ بھاگے مگر وہ ہل بھی نہیں۔ احساسِ ذلت نے اُس کی ساری طاقت سلب کر لی۔ اُف! اس کی گت اور وہ بھی رسول فاطمہ کے ہاتھوں! اگر وہ اپنے جاگنے کا اعلان کرتی ہے تو پھر تو اُسے رسول فاطمہ کو مار ڈالنا چاہیے۔ اُس نے سوچا، وہ ایسے چلے گویا سوراہی ہے، مگر کچھ دیر میں جاگ جائے گی تو شاید رسول فاطمہ ڈر کر اُسے چھوڑ دے گی۔ مگر جھلا، وہ ایک جھننی تھی اور فیصلہ جلدی چاہتا تھا لہذا ایک دم اُس نے جھٹکا کر اتنی زور سے کروٹ لی کہ اُس کی کہنی رسول فاطمہ کی اُبل ہوئی آنکھ میں لگی مگر ڈرا اوجھی، کروٹ لے کر اُس نے اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا: ”کون ہے؟“

”ہیں — میں ہوں، تمہاری رسول فاطمہ“

کیا! اُس کی رسول فاطمہ؟ اگر وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی تو اُسے اس گستاخی کا اُسی دم مزہ چکھاتی مگر موقع نہ تھا۔ اُس نے بڑبڑاتاے ہوئے زور سے اپنی چارپائی

دور دھکیلی، ایسے کہ رسولِ فاطمہ کا پیرانا پچکا ہوا حسد و رق چور ہو گیا۔  
 سبج اٹھ کر اُسے رسولِ فاطمہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پرطقی تھی مگر وہ بھری  
 بیٹھی تھی کہ وہ بولے تو بس اُس کی جان کو ہی آجائے لیکن رسولِ فاطمہ بھیگی پتی بنی  
 شمن کا تازہ رنگا ہوا دوپٹہ چٹ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ جل گئی اور ایسے زور سے  
 جھٹکا دے کر دوپٹہ چھینا کہ رسولِ فاطمہ گر پڑی ہوئی۔ ساری اُس کی ماتحتوں کی  
 گھاٹیاں پھل گئیں مگر وہ برا نہ مانی بلکہ رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی، جیسے  
 یہ چنگیزی مظالم اُسے بہت ہی بھاتے ہیں۔ شمن نے بھٹا کر جو دوپٹے کی چٹ کھولی  
 تو کئی شوب کھایا ہوا دوپٹہ مسک گیا۔ اب تو اُس نے واقعی اُسے ایسے دھکیلا کہ  
 بچاری کی نئی تین پیسے کی صراحی چکنا چور ہو گئی، اُس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں  
 زخمی مینڈکوں کی طرح پھول کر اور ابھرائیں اور ان میں غلیظ نمی پھلنے لگی۔  
 فدا ذرا سی بات پر شمن اُسے دھتکارتی رہی لیکن وہ یا تو چپکی بہتی رہی یا ہیں ہیں  
 کر کے بے جان ہنسی ہنسنے لگی، گویا اُس کی مٹھ کروں میں جفا کی چاشنی بھری تھی۔  
 ”بھئی ایسا بھی مذاق کس کام کالے کے ساری جوڑیاں توڑ دوں، نظام کہیں  
 کی اُدھ اُسے اس قدر پیار سے دیکھنے لگی کہ شمن گہرا کے کرے سے بھاگتی۔ اُس کا جی  
 چاہا سب کچھ جا کر میرٹوں سے کہہ دے مگر اُس کے پیر بڑک گئے۔ کیا کہے گی وہ اُس  
 سے جا کر؟ ابھی گزشتہ چھینے چھوٹی کلاسوں کی بیٹیوں کو یہ وہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی  
 تھی وہ محافوں میں دبی ہوئی ایک دوسرے کو بچے جنوار ہی نہیں۔ توبہ!  
 رسولِ فاطمہ کی صورت دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ شام کو  
 وہ سعادت کے ساتھ بیٹھی گھر کا کام کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی بچی نے دروازے کی  
 آڑ سے اُسے بلایا: ”یاں آئیے شمن بابھی“ یہ چھوٹی بچیاں بوڑھنگ میں بڑی  
 لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں، چھوٹے موٹے کام، رقعہ پیغام لے جانا،  
 چمن میں سے پھول چرا کر لانا، کتابیں لا کر ادھر سے ادھر لے جانا اور اُس کے  
 بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر پر پیر دبانے کی عزت حاصل کرنا جتنی زیادہ

ہر دعوینہ لڑکی ہوگی اتنی ہی زیادہ چھوٹی لڑکیاں اُس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔  
شتمن ان چھوٹی لڑکیوں میں زیادہ عزیز نہ تھی وہ خود نہایت چھوڑی سی تھی۔  
”کیا ہے؟“ اُس نے رُکھائی اُسے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

”یہ رسولِ فاطمہ آپا نے دیا ہے۔“ ایک پرچہ دے کر وہ لڑکی شرمائی ہوئی  
بھاگ گئی۔ رسولِ فاطمہ نے نہ جانے کن خوشامدوں اور رشوت ستانی کے بعد لڑکی  
کو پیغامبری کے لیے راضی کیا ہوگا کیونکہ عام لڑکیاں، غصہ صا چھوٹی لڑکیاں،  
اُس سے بہت لڑت کرتی تھیں۔

پرچہ نے شتمن کے ہاتھ کاپنے لگے۔ اُس نے سعادت کی نظر بچا کر جلدی سے  
سویرا کے گریبان میں چھپا لیا اور واپس پڑھنے آ بیٹھی لیکن پریشانی کی وجہ سے  
اُس سے خاک بھی نہ پڑھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُسے اغوا کرنے  
کا خط لکھا ہے اور وہ واقعی خطرے میں ہے۔

اُس نے چاہا کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جائے۔ خط پڑھنے کے لئے وہ بے چین  
ہونے لگی، لہذا وہ غسل خانے کا بہانہ کر کے اُٹھی۔ خط میں لکھا تھا:

”میرے من مندر کی دیوی!

آہ، اپنی عاشق سے کیوں ناراض ہو؟ کب تک خفا رہوگی؟ اگر

ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیار سے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔ یہ تم نے  
کیا جا دو کر دیا ہے۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لینے دو۔

تمہارے حسن کی پروانہ

رسولِ فاطمہ

ہیبت کے ماتھے وہ شل ہو گئی۔ کس قدر بد معاشی کا خط لکھا گیا تھا۔ اب؟  
کمرے میں واپس جانے کے خیال سے اُس کا دم نکلنے لگا۔ وہ کوئی ایسا بہانہ کرے  
کہ سعادت اُسے اپنے کمرے میں پناہ دے دے۔ سونے کی گھنٹی بج تھی اور وہ کوئی  
عذر نہ تراش سکی۔ گھنٹی کی ضربوں کے ساتھ اُس کا دل بھی اُدھی آواز سے دھڑکنے

لگا اور وہ ڈری کہ سعادت نہ سن لے۔

غیر ارادی طور پر قدم رکھتی ہوئی وہ کمرے میں آئی۔ اُس سے رات کے کپڑے نہیں بدلے، پیرٹکائے پلنگ، پر بیٹھی رہی۔ بیم وحشی خیالات اُسے پر دنیاں کرنے لگے۔ ایک لمبی آہ کمرے میں سرسرائی اور رسول فاطمہ نے کمرہ کی شمع ہمیشہ سے تیکے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اب اندھیرے میں اُس نے محسوس کیا کہ رسول فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اُس کے جسم میں چھ رہی ہیں۔ اُس پر ایک دم سے نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور سچی چاہا کہ کسی کی آغوش میں یوں چھپ جائے جیسے چلی چھپتا مارتی ہے تو چوڑے دوڑ کر مرغی کے پردوں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ پھر اُس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ باہر نکلی آئی اور برآمدے میں کھجے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

دیہاں کیوں کھڑی ہو، سر دی لگ جائے گی؟ رسول فاطمہ اُس کے ساتھ ساتھ رنگ آئی تھی، مگر اُس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غسل خانوں کی طرف چل دی۔ جب وہ وہاں سے نکلی تو رسول فاطمہ سکرطی کھڑی تھی، وہ کچھ نہیں اوڑھے تھی۔ اُس کے بد وضع رات کے کپڑوں سے اُس کا حقیر مزلی جسم ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اُسے دھکا دیتی ہوئی ہاتھ دھونے کے بل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غیر ارادی طور پر پانی کی دھارا اپنی آنکھوں میں سے چھانٹنے لگی۔

”چلو گی نہیں شمع؟“ رسول فاطمہ منمنائی شمع نے کچھ جواب نہ دیا۔ بل بند کر کے وہ اپنے حلق میں گیلی اٹھکیں ڈالنے لگی۔ حلق میں گدگد سی ہوئی، کو آتیٹھا ”او“ اوتق“ وہ قے کرنے لگی۔ باوجود چیلنے کے رسول فاطمہ اُس پر چڑھ چلی آئی اور گہرا گہرا اُس کی پیٹ سہلانے لگی۔ واقعی اُسے قے ہونے لگی۔ ہر جھکے پر اُس کے گھر کی تسین پھٹنے لگیں اور معلوم ہوتا زبان ٹوٹ آئے گی۔ جب ذرا جی ٹھیرا تو رسول فاطمہ دیوانوں کی طرح روتی ہوئی میڑن کو بلا کر لائی۔ میڑن نے باورچی کو برو بھلا کہنا شروع کیا اور اسے الاچی چبانے کو دی۔

”دیکھو! وضوں کے کمرے میں پہنچا دیکھو! نہ جانے جو پھر قے ہوئی تو...“

رسول فاطمہ ابو رڈنگ کے اصول سے واقف ہو کر بھی اُس کے ساتھ جانے کو  
خدا کر نے لگی مگر میڑان نے اُسے ڈانٹ بتائی: کیا عجب کوئی چھوت کی بیماری ہو  
دیر تک وہ بدبو دار رضائی اوڑھے بیمار بنی مسکراتی رہی۔ اُس کا حلق بڑی  
طرح جکڑا رہا تھا اور کنپٹیاں دکھ رہی تھیں مگر اُسے معلوم ہوتا تھا کہ چپل سے بچ کر  
وہ مرنے کے پروں میں ڈبکی ہوئی ہے۔

ایک تو رات کو کھانا نکل گیا، دوسرے صبح جو بدبو دار بسکٹ ملتے تھے وہ  
بھی بند کر دیے گئے تو مجبوراً اُسے دیر تک تندرست ہونا پڑا۔ کھانے پر وہ حسب  
معمول رسول فاطمہ کے پاس نہیں بیٹھی۔ چونکہ دعا ہو گئی تھی اس لیے رسول فاطمہ اٹھ  
کر اُسے بلانے نہ آسکی۔ کھانا کھاتے میں جو ایک دفعہ اُس کی نظر میز کے دوسرے سرے  
پر لگی تو اُس نے دیکھا کہ وہ کچھ کھا نہیں رہی ہے اور اُس کے لیے حسب معمول کھانا  
نکل کر لٹکا دیا گیا ہے۔ اُس کی مسکین صورت اور پھیلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر شمع کا  
دل پھرتے کہنے کو چاہتے لگا۔ اُس نے اسی دن میڑان سے کہہ دیا کہ وہ کھانے پر اپنی  
جگہ بدلنا چاہتی ہے۔ سعادت کے پاس ایک جگہ تھی دال وہ بیٹھنے لگی۔

غناز کے وقت وہ کچھ نہ بول سکی۔ جب رسول فاطمہ اس کے قریب نیت باندھ کر  
کھڑی ہو گئی تو پورے وقت وہ یہ کہہ شش کرتی رہی کہ سجدہ کرتے وقت اُس کی  
کہنی رسول فاطمہ سے نہ چھو جائے، اس لئے وہ بار بار آیت بھول جاتی۔

رات پھر مصیبت بن کر چپانے لگی اور اُس پر پریشانی نے حملہ کر دیا۔ آج وہ  
بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ کوئی بچاؤ کی دوا نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ نفلیں  
پڑھتی رہی۔ پھر اُس نے یا حافظ کا ورد کیا۔ آج اسے خدا نے طرح یاد آ رہا تھا اور  
وہ گڑ گڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ مگر کیا دعا اُس نے مانگی؟ اُس کے منہ سے تو ایک  
نفل ہی نہ نکلا۔ اور پاس ہی رسول فاطمہ دوڑا تو بیٹھی ماتھوں کا چلو اُپر اٹھائے  
بال بل کر دعا مانگ رہی تھی۔ شمع کا بھی اور پریشان ہو گیا، اُس کو ایسا معلوم ہوا  
رسول فاطمہ کے ٹپاؤ میں ڈوبی ہوئی دعا جمع ہو گئی ہے اور جی چاہا ایک ماتھو ایسا مارے

کہ ساری دعایا جو اسے کئے دانوں کی طرح بکھر جائے اور جب رسولِ فاطمہؑ اسے بطور نے جھکے۔ تو۔۔۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی اُسے ترکیبِ سوچھی۔ رات ہو چکی تھی اور میڑان اپنا جکڑ ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ ان دونوں کو عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی کینڈ کہ یہ مذہبی معاملہ تھا۔ ایک دفعہ اس نے لڑکیوں کو میدان میں شبِ قدر منانے سے روکا تھا تو غلِ مچ گیا تھا دوسرے دن مقامی اخباروں کی سرخیاں عیسائی میڑان کے خلاف زہراؑ گھل رہی تھیں۔

وہ چپکے سے اُٹھی اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کنڈی چوڑھا سیدھی اپنے کمرے میں۔ رسولِ فاطمہؑ نے چونک کر اُسے پکارا: ”شمن!“ مگر وہ تیز قدم چلی پڑی۔ کمرے میں پہنچ کر اُس کا دل آندہ چوڑیا کی طرح ہلکا ہلکا ہو گیا۔ پلنگا پر لیٹ کر وہ خاموش۔ بے ہوشیوں میں ڈوب گئی۔

نماز کا کرہ دور تھا، تہی دور کہ اگر رسولِ فاطمہؑ سچتی تب کہیں اُس کی آواز سنائی دیتی۔ خاموش سر جھکا لئے وہ اس کی آواز کا انتظار کرتی رہی لیکن سوائے جھینگروں کی چیخیں چیں کے وہ اور کچھ نہ سن سکی۔ صبح رسولِ فاطمہؑ اُس کی شکایت کر دے گی۔ پھر پھر؟ وہ طرح طرح کے بہانے سوچنے لگی۔ اسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خونخاک سانپ پر پتھر پٹخ کر بھاگ آئی ہے اور اب وہ وہاں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ کہتے ہیں سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلے لینے آتی ہے، لیکن رسولِ فاطمہؑ کے بعد تو اُسے کسی ناگن کا خوف نہ تھا۔ رسولِ فاطمہؑ دینا میں تھا آئی تھی، تنہا ہی رہتی تھی اور تنہا ہی چلی جائے گی۔ کل سے وہ اپنا کمرہ بھی بدلے لے لی۔ مگر یہ رسولِ فاطمہؑ غل کیوں نہیں پھپھاتی؟

صبح نماز کے کمرے کے آگے لڑکیاں ایسے جمع تھیں گویا رات کو کوئی مجبوری ہو گئی ہے اور زمانہ ٹوٹا پڑا ہے۔ وہ بھی بے غرض نبیؐ اور سر سے گزری۔ رسولِ فاطمہؑ بہانہ زدن میں لپٹی ہوئی پڑی تھی، دوچار لڑکیاں اُسے سہارا دے رہی تھیں، دو بھاگ کر میڑان کو بلانے لگی تھیں۔ رسولِ فاطمہؑ بخار میں جل رہی تھی اور اُس کی

مردہ آنکھیں انکاروں کی طرح جاندار ہو رہی تھیں۔  
میرٹن نے اُسے بیماروں کے کمرے میں لے جا کر لٹایا اور بہت پوچھا کہ کون  
اُسے وہاں بند کر گیا مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کوئی نہیں، وہ خود نماز پڑھتے پڑھتے  
سو گئی تھی۔

”پھر دروازہ کس نے بند کیا؟“

”کسی نے بھی نہیں“ وہ برابر بولتی رہی۔

شمن کے دل پر رسولِ فاطمہ کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اُس نے میرٹن سے نہ شاید  
کہہ کے اپنا کمرہ بدلوایا۔ سہاوت اکیلے کمرے میں رہتی تھی اس لیے اُس کے ساتھ نہ ہونے  
کی اجازت مل گئی۔ شمن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھیں  
گی، ساتھ رہیں گی۔ سعادت سے اُس کی بہت بنتی تھی۔

(۱۴)

جب اُس نے دوڑ کر سعادت کو اُس کے کمرے میں آنے کی خبر سنائی تو بجائے خوشی  
سے اُچھل پڑنے کے وہ خاموش ہو گئی، ایک دم سے اُٹھ کر وہ میرٹن کے پاس گئی  
جہاں دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ جب وہ باہر نکلی تو میرٹن چلا رہی تھی، اُس نے زور  
سے دروازہ بھینٹ دیا اور منہ پھلائے لوٹ آئی۔

شمن کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ سعادت اُس کے کمرے  
میں آنے سے خوش ہوگی۔ اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی مگر اُس نے جی کو سمجھایا کہ  
چونکہ سعادت ہمیشہ سے بورڈنگ میں بہترین کمرے میں رہتی آئی ہے، اس لیے وہ  
اس کے آنے کو اپنی سچی تمنی سمجھ رہی ہے۔ سعادت اُسے خاموش دیکھ کر اسکول کا کام  
کرنے بیٹھ گئی اور وہ تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پڑ کر سب کچھ بھول گئی۔

دو دفعہ رسولِ فاطمہ نے چپکے سے اُسے بلایا مگر وہ نہ گئی۔ رسولِ فاطمہ کے  
پاس جانے کی ممانعت بھی ہو گئی تھی کیونکہ ڈاکر نے اُسے دق بتادی تھی یہ بھی

سنا تھا کہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد اُسے واپس نہ آنے دیا جائے گا۔ سعادت ویسے نواب خوش رہنے لگی تھی لیکن پھر بھی بعض وقت شمن کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے، جیسے اُس کی موجودگی سے کمرہ گھٹا جا رہا ہو، کیونکہ اُس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ پڑھنے کے بعد فوراً اٹھ کر اپنی ایک سہیلی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

اُس کی سہیلی، نجمہ، مائی اسکول کے زمانے میں اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ پھر جب ٹائیفائیڈ کی وجہ سے سعادت فیمل ہو گئی تو وہ اُس سے ایک درجہ آگے ہو گئی تھی۔ وہ ایف۔ اے میں تھی اور مائی اسکول کی لڑکیوں سے بہت بزرگمانہ رہتا دیکھتی تھی۔ جب وہ سعادت کے کمرے میں آتی تو شمن کو دیکھ کر فوراً دیر کو بھڑک جاتی۔ بیٹھتی تو بالکل خاموش ورنہ جلدی سے بہانہ کر کے چلی جاتی۔

..... نجمہ سے شمن بالکل بے تکلف نہ تھی اور عموماً اسے دیکھ کر ذرا پریشان ہو جاتی تھی۔ کبھی شمن اپنے کمرے میں آتی تو نجمہ بھی، جو تنہا تنہا کمرے میں بائیں کتی ہوتی، ایک دم خاموش ہو جاتی اور دوسرے لمحے اُسے کوئی نہایت ضروری کام محل آتا اور وہ چلی جاتی۔ مگر نجمہ کو دیکھ کر شمن کچھ عجیب طرح بے چین ہو جاتی۔ اجتنبی دیر کھڑی وہ بائیں کتی رہتی شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا کرتا۔ وہ جلدی سے اُس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بیکار کے کام کرنے لگتی، مگر جب وہ چلی جاتی تو شمن کو بہت افسوس ہوتا کہ اُس نے اسے اچھی طرح دیکھا کیوں نہیں۔ وہ اُس کی اُدھی پھول دار شلوار کی تڑپتی ہوئی سلوٹس، سفید چکن کا کرتہ، جس کا گریبان ڈانچے کو کھینچا ہوا تھا اور مریچیت کرنے سے یہی متوازن پلٹیں پڑی تھیں، شانوں پر پھولا پھولا بھول اُس کی کمر اور بھر تپتا بنا دیا اور اس کا کاسٹی چٹا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھم جاتا تھا اور آجکل تازہ مچھوڑوں کے پچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر چھوٹا کرتا، جب وہ مڑ کر جانے لگتی تو اُس کی چوٹی کا پھندا اُس کے کولہوں پر ٹمکیاں لیتا اور اُدھی شلوار کے



پانچویں میں سے اُس کی سائنالی ایڑیاں نہاھی گوری معلوم ہوتیں، جیسے عور کے  
جھوڑے رنگ کے انڈے،

نچھڑی نازک تھی۔ معلوم ہوتا تھا اُس کے جسم میں ایک بھی کٹی ہڑی نہیں۔  
شتمنی کا دل اُسے چھوڑنے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی نہا کرنا بخود  
میں لے کر زور سے دباؤ تو اپنے ہوئے انڈے کی طرح پھیل جاتا ہے۔

ایک دن یونہی وہ شتمنی کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شتمنی پریشانی ہو گئی اور  
جب اُس نے اپنے دوپٹے کا آخیل جھٹکا تو وہ شتمنی کے بازو پر آن گرا۔ شتمنی کو ایسا  
معلوم ہوا جیسے قیمت پر سے اُس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا۔ وہ شتمنی بیٹھی نہ رہی نہ پیر  
آہستہ سے کہہ ک کہ آخیل گرا دیا۔ لیکن فوراً ہی اُسے افسوس ہوا۔ لہذا، جیسے اُس  
نے کو دہیں سے کوئی بڑی پیاری چیز پھینک دی۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی  
کہ کاش پھر نچھڑا اسی الجھڑا نر از سے آخیل پھینکے اور وہ اُس کے بازو سے آن لکھے  
مگر نچھڑا چلی بھی گئی۔

بعض وقت جب نچھڑا دست سے باتیں کرتی ہوتی تو شتمنی اُسے نکل جانے  
والی نگاہوں سے گھورنے لگتی۔ وہ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش، وہ سر  
موڑ کر ذرا اپنے شانے پر دیکھنا، جیسے وہاں کسی کی پیار بھی نظروں کا جواب  
دے رہی ہے، یا جب وہ اپنی گداز انگلی میں انگوٹھی ٹکھتا کر مدھوم مدھوم سے جیت  
کی طرف دیکھتی، تو شتمنی پاگلوں کی طرح اس شخص سے ڈراے کو دیکھا کرتی۔ نچھڑا اسے  
محسوس کرتے ہی ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ پھینچ لیتی گویا پوچھ رہی ہے: ”کیا  
کہتی ہو؟“ کہہ بھی چکنا۔ ”مگر شتمنی کیسا جاتی اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اُس کی ریشم کی  
ہڈی میں ریشم لگتا۔ زور سے پیٹ میں جیسے ایک دم جھوک چھپتی اور پھر پیاس  
لگنے لگتی، مگر وہ بے توجہی سے کوئی اوٹ پٹانگ کام کیا کرتی۔

پھر اُسے اور کچھ ہونے لگا۔ ہڈیہ ہڈیہ اُسے نچھڑے کے ہونٹوں کی جنبش، آخیل  
کا گچھا اور کرپہ لگی ہوئی پلٹیں یاد آ جاتیں۔ وہ حقوڑی دیر تو اُن سے لطف لیتی مگر

پھر جھنجھلا کر انہیں دور دھکیل دیتی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سعادت نجمہ کے کمرے میں سے اُس کی سائیں کی صدری پہن آئی۔ کلاس میں جب شمن نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو ایسا شمس ہوا جیسے اُس نے کوئی گرم رکابی بخڑالی ہو۔ اُس نے جلدی سے گجرا کر ہاتھ ہٹا لیا، مگر دوسرے لمحے وہ سعادت کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا چکنے چکنے سانپ اُس کی ہتھیلی میں سرک رہا ہے۔ وہ ہر لمحے وقت گری کی وجہ سے سعادت نے صدری اتار کر کمرے پر لٹکا دی اور کھانا کھانا چلی گئی۔ شمن نے کھانے پر سے اکر جو صدری کو دیکھا تو زور زور سے اُس کا دل دھڑک لگا۔ دوبارہ اسکول شروع ہونے کی گھنٹی بج گئی شمن بہانے بناتی رہی۔ وہ چلتی ہو کہ نہیں؟ مس جرتی کا گھنٹہ ہے، دیر ہوگی تو کھائیں گی۔

”تم چلو۔۔۔۔۔ میں ذرا۔۔۔۔۔“ وہ لوٹا اٹھا مگر غسل خانے کی تیاری کرنے لگی۔

جب سب لوٹ کھانا بوردنگ سے چلی گئیں تو ڈرتے ڈرتے زمین پر پڑا رکھ کر اُس نے صدری کی طرف دیکھا۔ پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا اور وہ جا کر دروازہ بند کر آئی۔ آہستہ آہستہ دبے پیرہ بڑھی۔ دھڑکن ایسا کی اتنی تیز ہو گئی کہ معلوم ہوا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ ایک مست کن بھبکا اُس کی ناک میں پہنچا اور اسے جھکے آئے گا۔ باہر کسی نے کوڑے کے ٹہن کو ٹھوکر ماری اور جلدی سے اُس نے صدری پلنگ پر پھینکی۔ مگر دروازے سے وہ لوٹ آئی۔ جلدی میں اُس نے صدری بجائے کمرے کے پلنگ پر ڈال دی! اور جو سعادت دیکھ لیتی تو بے غضب ہو جاتا۔ وہ ضرور بھانپ جاتی کہ صدری جگہ سے بے جگہ کی گئی ہے۔

کلاس میں مس جرتی نے کیسے ڈانٹا، اُسے کچھ سنائی نہ دیا، وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی مگر بڑی دیر تک اُس کی انگلیاں صدری کے مس سے جھنجھناتی رہیں۔ جیسے اُن میں بیٹھی بیٹھی مرجیں لگ گئی ہوں!

اسکول ختم ہوا تو وہیں کیا لڑیوں کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی۔ فیل کو اینیٹ پر گھسنے ہوئے اُس نے سوچنا شروع کیا: آج اُسے معلوم ہو رہا تھا گویا اس نے کوئی حسین جوڑی کی ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں پارٹی ہوئی تھی تو اس نے چپکے سے ایک رس نکالا اٹھایا تھا مگر کسی کے پیر کی چاپ سن کر وہ جلدی سے اُسے تنگل گئی اور ہاتھ دھونے کے بل میں سے پانی پینے لگی۔ اُس رس گلے کا ذائقہ مشکل سے چند سیکنڈ اُس کی زبان پر پھیرا ہوگا مگر اب تک وہ جب چاہتی تھیں کی مدد سے اُس کی مٹھاس منہ میں کھینچ لاتی اور اس کا سارا منہ لذت سے بھر جاتا۔ آج بھی وہ صدی کی خوشبو کو اپنے منتھنوں میں کھینچنے لگی۔ عطر تو نہ تھا مگر تھا ضرور کچھ۔ سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مرغی کے بچے جیسی بو آتی تھی مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کے گھار کی سی ہلک تھی، بالکل ہی نئی، اور آسانی سے کھنچ کر منتھنوں میں گھٹسے ملکتی تھی۔

اب تو اُسے نجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی، مگر قوتِ احساس سے سب کچھ تبادلی تھی کہ اب نجمہ کدھر دیکھ رہی ہے، اُس کے بھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے ہیں، آج اُس نے صندوق کی سنگھائی کے ریشم کا کرنا پہنا تو وہ ایسا جسم پر چمک گیا ہے جیسے جسم پر صندوقی دارلش چڑھا دی گئی ہو۔ آج اُس کے ہموار چمکیلے دانت، دندانہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھار دار موتی۔ نجمہ کے دانت دور سے دیکھنے میں بہت تیز معلوم ہوتے تھے، جیسے نیوٹے کے نوکیلے دانت۔ شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی۔

شمن جب کمر سے پہنچی تو نجمہ کے چہرے نے اُس کے پیر پر پیلے۔ سعادت اور نجمہ پچھلے اسباب کے کمرے میں نہیں بول رہی تھیں۔ اب کچھ دن سے نجمہ جب آتی سعادت سے کوئی ایسی چیز مانگتی جسے نکالنے کے لیے اُسے صندوق کھولنا پڑتا۔ وہ اُٹھ کر اندر جاتی اور پیچھے پیچھے نجمہ بھی چلی جاتی، پھر وہ گھنٹوں دواں بیٹھی ہلکے ہلکے بولا کرتیں۔ شمن کا دل کسی کام میں نہ لگتا اور وہ سانس روکے نجمہ کی آواز پر کان لگا کر بیٹھی رہتی۔

اُس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ بھی اٹھ کر اندر جا بیٹھے، مگر اُسے سعادت سے نفرت ہونے لگی کہ وہ جان بوجھ کر اُسے بچہ سے دور رکھتی ہے۔

اسکول میں فینڈی ڈریس پہن کر انہوں نے کالج کی لڑکیوں کی بھی دعوت کی۔ ویسے بورڈنگ دور نہ تھا اور لڑکیوں کو ملنے کی بھی ممانعت نہ تھی مگر عموماً اُن کے جلسے تہوار جدا ہوتے تھے۔ عید کا موقع تھا اور ڈنر بڑا شاندار ہونے والا تھا ہر ایک کی کا دل مردانہ لباس پہننے کو چاہتا تھا، لہذا اُسے اسکا لڑکیاں حسب فرمائش اپنے اپنے گھروں سے لے آئیں شتمن نے بھی ایک سوٹ منڈوا لیا۔

مردانہ کپڑے پہن کر لڑکیاں شرم کے مارے گر گر پڑیں، خصوصاً وہ تو بے حال ہو گئیں جنہوں نے ڈاڑھی موچھیں لگائی تھیں۔ کچھ تو کمرڈ میں گھسی بیٹھی تھیں، شرم کے مارے چا دیں اور اڑھتے ہوئے اور زیادہ جا در لڑکیاں انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر کال رہی تھیں۔ اختر موٹی نے مولانا شوکت علی کی وضع کی ڈاڑھی اور ٹوپی پہن رکھی تھی جسے دیکھ کر لڑکیوں کی چٹخیں نکل جا رہی تھیں مگر وہ مزے سے ہل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے عرب نوجوان کا لباس پہن لیا تھا جس میں وہ بالکل زنانہ محسوس ہوتی تھی۔ اُس کے پاس نور سی ریشمی ساڑھی پہنے بھدک رہی تھی۔ بچاری نوری نے ساڑھی بھی تو نہیں پہنا شروع کی تھی۔ اس لیے اُس کے لیے وہ عجیب و غریب چیز تھی۔ مگر وہ عرب نوجوان خورشید کے چھپے لگی تھی جو مصری لباس میں بالکل نیچا بن کر رہی تھی۔ شتمن اپنا سیاہ سوٹ پہنے تین دفعہ دروازے میں سے نکلی مگر پھر ڈر کر بھاگ گئی۔

دو چار لڑکیوں نے اُسے گھسیٹا مگر پھر چھوڑ دیا۔ سوٹ پہنے تو کئی لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔ مگر شتمن کا بڑا حال تھا گویا ننگی اور زرا ہو۔ سب ہمان حال میں جمع تھے اور برابر کالج کی لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا سعادت دھوبی بنی ہوئی ہے۔ مشید پٹری اور لمبی لمبی مونچھیں اور کپڑوں کی گٹھڑی شانے پر اور اُس کے ساتھ اُس کے ساتھ ساتھ بچہ دھوبن بنی ہوئی۔ نام کو دھوبن تھی مگر وہ تو لپری پدمنی بنی ہوئی تھی۔ گدوم گیر کا جھلمل کرنا لہنگا اور شونے کوٹے سے مٹھیا ہوا باریک دوپٹہ اور وہی صدری۔

وہی لونگوں کے بچھار کی مہک میں بسی ہوئی سائیں کی مدد میں آج اُس نے دندہ اسہ بھی لگایا تھا اور لپ شلک بھی اور کال بھی پلکے رنگ دار تھے۔ اور پیر؟ اُس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا، مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لالی روشنائی۔ وہ ننگے پیر تھی اور چاندی کی پازیب زمیں پر گھسٹ رہی تھی۔ ماتھے پر اس نے ٹیکہ لگا رکھا تھا۔ جو بالکل مہرے کی طرح دمک رہا تھا۔ شمن شرماتا اور مانا سب بھول کر مہوت اُسے دیکھتی رہ گئی۔

”اے شمشاد کو دیکھتا،“ نجمہ زور سے مہسی اور سب لڑکیاں اُسے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگیں۔

”ہائے اللہ بالکل لڑکا لگ رہی ہے“ نجمہ کا منہ لال ہو گیا۔

”تم کیوں نہیں چلتیں۔ چلو نا۔“ سعادت نے رگھائی اُسے کہا۔

”آؤ، بھی دھوبی تم تو سو جاؤ۔ اور یہ صاحب بہادر۔ ہمیں تو یہ پسند ہیں۔“ نجمہ مذاق میں شمن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی اور شمن کو ایسا معلوم ہوا وہ سو رہی ہے، یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔

شمن کے لباس سے کوئی متاثر نہ ہوا مگر معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی نجمہ اُس کی طرف دیکھتی اُس کا منہ قہقہہ اٹھاتا اور وہ قہقہے مارنے لگتی۔ شمن بھی اُسے براہ دیکھ رہی تھی۔ آج وہ اُس کے بالکل قریب بیٹھی تھی، ایسے کہ کئی دفعہ نجمہ کا جالی دار دوپٹہ اُس کے ہاتھوں پر آن گرا۔

مگر سعادت کچھ مگر رسی مٹھتی تھی۔ اُسے نجمہ کا ہنسنا اور بات بہ بات شمن سے بڑے تکلف پر ناظر بھی اچھا نہ لگا۔ کہانے پر زور سے گھبراہٹ اور جوش کے شمن سے کچھ نہ کھایا گیا۔ کئی مرتبہ نجمہ کی پازیب کھل گئی تو اُسے باندھنی پڑی۔ پھر باری جمجموں سے اُس کے کان دکھ رہے تھے، بار بار اُن کی خبر لینا پڑتی تھی۔ گوزبان سے وہ نجمہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی لیکن اُس کا بھولا بھولا چہرہ، اُس پر بد معاشوں جیسی مونچھیں بال جو بار بار ہیٹ سے باہر پھسل آتے تھے، ہر بات پر شرم کر گھبرا جانا اور پھر خاموشی

سے کھیا کر مسکرا دینا۔ ایسی باتیں تھیں کہ نجمہ سے بے تکلف ہوئے نہ رہا گیا اور وہ اسے شمن کہنے لگی۔

جب شمن نے کچھ کہا تو اُس پر بھی نجمہ کو بہت ہنسی آئی۔ سعادت نہایت سنجیدہ بنی اپنی ایک اتانی سے آنے والے امتحان پر گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے موٹے موٹے اتار دی تھیں اور ہانے کو ڈوب پٹے کی طرح اوڑھے ہوئے تھی، بجائے دھو بی کے وہ بڑی بی معلوم ہو رہی تھی۔

جب انعام دیے جانے کا وقت آیا تو نجمہ گھبرا گھبرا کر سعادت کو ڈھونڈنے لگی لیکن سعادت اپنے کمرے میں تھی۔ نجمہ ہوا کی ہوئی گئی۔ شمن کا دل بیٹھنے لگا۔ نجمہ سعادت پر مری جا رہی تھی۔ اُس کا جی نہ مانا تو وہ بھی کمرے میں گئی۔ وہاں اُس نے دیکھا سعادت بڑی طرح پلٹک پر پڑی ہو رہی ہے، نجمہ اُسے منار ہی ہے مگر سعادت کے غصے کی انتہا نہیں۔ اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔ اتنے میں چند لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہا: ”نجمہ باجی، مس جرمی بلا رہی ہیں“ نجمہ مجبوراً اُٹھ کر چل دی۔ شمن بھی گئی کی طرح سائنڈ سائنڈ۔ ہال میں تمام فینسی ڈریس والیاں دو دو کے جوڑوں میں گزر رہی تھیں۔ جب کوئی عجیب جوڑا گزرنا تھا تو خوب تائیاں بختی تھیں۔

”اے دھوبن کہاں ہے۔ نجمہ“ مس جرمی پکار رہی تھیں۔

”ہیں، تمہارا ادھ بی کہاں ہے؟“

”سعادت کی طبیعت خراب ہو گئی“ نجمہ نے مردہ آواز سے کہا۔

”یہ تو بڑا ہوا۔ اچھا تو تم کسی اور کے ساتھ چل جاؤ۔ جلدی کرو، اب تمہاری

باری ہے“

بغیر کچھ کہے شمن نے نجمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے شمن کہاں پیر رکھتی تھی اور کہاں پرتا تھا، اسے تو بس اتنا احساس تھا کہ نجمہ کے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ ہے اور وہ ہوا میں معلق ہے۔ نجمہ کو انعام ملا۔ انعام تو تین تھے مگر پھر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دینا شروع کیے، یہاں تک کہ ہر لڑکی کے لیے انعام کا اعلان ہو

کیا۔ فوتی گو اس کی سڑی ہوئی دوست برجیس لے دیا اور برجیس کو افسر نے پھرتیوں  
العاموں پر غصہ کر دیا۔

بجہ نے شمن سے اور کوئی بات نہیں کی۔ انوار نے اپنے کے بعد وہ دایس سعادت  
کے پاس آگئی اور جب جلسہ ختم ہونے کا آخری گیت گایا جا رہا تھا تو شمن کی آواز گئی  
ہی میں گھٹ گئی۔ سعادت بالکل خوش کو ایسی تھی اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سر سے  
سر ملائے آخری گیت گارہی تھی۔ وہ۔ دونوں ایک دوسرے میں غرق، دینا سے بہت  
دور تھیں!

رات کو جب شمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے مارے اُس کا بڑا  
حال رہا۔ خاموش وہ اپنی ہتیلیوں میں دانت، ٹیڑھے اپنی آواز کو کھنکھاتی رہی  
سعادت آج کمرے میں نہیں تھی۔ آج چونکہ چھٹی تھی اس لیے لڑکیوں کو ایک دوسرے  
کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔ وہ شے کے یہاں تھی، اسے کیا ہو گیا تھا۔ خوف  
سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بالکل بڑی آگ۔ الی رسول فاطمہ کی طرح۔ ادھ، آج  
اُسے رسول فاطمہ یاد آئے۔ لگی اور یہ اس کا دوسرا ہوا۔ یہی اُس کی قاتل تھی، اُس نے  
ہی تو رات بھر اُسے سردی میں اُٹھنے کو بند کر دیا تھا۔

اور اب وہ بھی رسول فاطمہ کی طرح۔ آف، شرم اور نفرت سے اُسے پسینہ  
آگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سے اُس کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ آج، آج، آج کی روح  
پکار رہی تھی۔

رسول فاطمہ! اُس کی سوکھی کلاٹیاں اور چوہے کی شکل کے ہاتھ، خراب صحت  
اور بد وضع جسم۔ ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ادھ، وہ اُس  
کی قاتل تھی۔ وہ اُس کی آخری التجا بھری سالیس، وہ گھٹی ہوئی آہیں، شمن کو معلوم  
ہوا جیسے مکھڑیوں کی طرح اُس کے جسم پر۔ نیک رہی ہیں۔

مگر وہ مری تو نہیں تھی۔ میٹرن اُسے کہا تھا وہ پہاڑ پر چڑی برائے تو اچھی ہو  
جائے گی۔ کاش، کاش وہ پہاڑ پر چلی جائے! شمن دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نجمہ؟ رسول فاطمہ کے متعلق پشیمان ہو کر اُسے نجمہ کے خیال میں غرق ہونے کا فتور ڈالنا سخت محسوس کرنے لگا۔

غیر نہ آئی: یحییٰ سے وہ پلنگ پر ٹوٹی رہی مگر نجمہ ایک خوفناک، بے رحم خواب کی طرح اس کے دماغ پر بری ہو رہی تھی۔ جس وقت اُس نے رسول فاطمہ سے بات پائی تھی اُسے خیال ہوا تھا کہ سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلے لیتی ہے۔ تو یہ نجمہ اس سے بدلہ لے رہی تھی۔

خوف سے اُسے پھر رونا آنے لگا۔ اپنے پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکا رہیں سُن سُن کر وہ نیم جان ہو گئی۔ ترپ ترپ کر وہ نہ جانے کب سو گئی!

### (۱۵)

وہ ہر ممکن کروٹ پر اپنی مگر غیر نہ آئی۔ نجمہ ایک بھیانک خواب کی طرح اُس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی۔ جب اُس نے رسول فاطمہ سے بات پائی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اُس نے سانپ کو کچا ڈالا، مگر جبھی اس نے دل میں دبا چھپا یہ خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ اگر ناگ کو مار ڈالو تو ناگن بدلے لیتی آتی ہے، وہ اپنے ناگ کی مردہ آنکھوں میں دشمن کی تصویر دیکھ کر اسے بے بسے پرتن باتی ہے۔ تو یہ نجمہ اُس سے رسول فاطمہ کے زخموں کا بدلہ لے رہی تھی۔ دکھ اور خوف سے وہ ترپ کر رو دی۔ ساری رات پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکا رہیں سرسراتی رہیں جنھیں سُن سُن کر وہ نیم جان ہو گئی۔

صبح اُٹھ کر اُس نے سعادت سے بات نہ کی۔ وہ خود کچھ کچھ کھچی نظر آ رہی تھی۔ شمن خاموش لاٹری میں بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھٹیوں کے تین دن پہاڑ بن بن کر اس کے تنہا اور مجروح جسم کو پیستے رہے۔ سعادت روز رات کو غائب ہو جاتی اور بھرے بورڈنگ میں شمن کو قبرستان کا سانپ ٹاچھایا نظر آتا۔ لاٹری میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھتا، موٹی موٹی ڈکشنریوں کو بے معنی نظروں سے گھورتی رہی۔



اُن میں سے ایک میں بھی تو اس کے مرض کا علاج نہ تھا۔ کسی خوفناک انجام کی آمد کے خوف سے وہ سبھی جا رہی تھی۔ یہ اُس کے دل کا غبار جو آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا کب پھوٹ چکے گا!

جیسے کسی نے اُس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سُن لی، اس کا دل غبار سے کی طرح پھولنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر مہوڑی دیر اور بجے اسی طرح مذہب دروازے میں کھڑی رہی تو یہ غبار پھوٹ ہی جائے گا، مگر نجمہ آہستہ سے بڑھ کر الماریوں میں کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ شمن کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی پیٹھ پر کوئی انجیٹھی دھک رہی ہے۔ سارے جسم پر گرم گرم نکتے سے پھدکتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سانس روک کے کتاب کے صفحے پر جھکی رہی۔ غبار آہستہ آہستہ پکھنے لگا۔ ”ارے تمہارے پاس ہے یہ کتاب، میں کہہ رہی تھی کون لے گیا اٹھا کر“ نجمہ نے اُس کے پاس کی کرسی گھسیڑا۔ شمن نے جلدی جلدی کتاب کے ورق تندہی سے لوٹنے شروع کر دیے۔

مہوڑی دیر نجمہ بیٹھی بائیں کرتی رہی، ادھر ادھر کی فضول بکواس، تنی دیر شمن چوری چھپے اس کی ساٹن کی حدری، جس کے دو بٹن گھڑے ہوئے تھے، اور بغل میں دبا ہوا کانوری دوپٹے کا گچھا دیکھتی رہی۔ نجمہ بے چینی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اس کی کاہی اٹلس کی چپتی ہوئی شلوار آہستہ آہستہ ہرا رہی تھی۔ پھر وہ ایک دم پیپ ہو گئی اور بڑے غور سے شمن کے خوفزدہ اور مسرت بھرے دیکھتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔

”شمنی! نجمہ نے اتنے آہستہ کہا جیسے کسی نے دو بار ایک بالوں کو آپس میں رگڑا دیا ہو۔ شمن کی آنکھیں لرزتی ہوئیں اٹھیں اور فوراً جمپک ٹیڈ۔ نجمہ نے اپنی دو انگلیاں آہستہ سے شمن کی تانیاں پر رکھ دیں۔ ایک دم اُس کی پتیلی میں تشنچ بڑا اور وہ سمٹ کر نجمہ کی انگلیوں کو گھٹنے لگی۔ دروازے میں سداوت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نجمہ نے تیزی سے اپنی انگلیاں چھپیں لیں اور عجیب تشکی ہوئی سی مہاسی اُس کے بڑبڑانے

پر چہانے لگی۔

”سعادت!“ اُس نے سمیت کر کے کہا، ”آؤ نا کہاں چلی گئی تھیں؟ میں تمہیں  
مگر سعادت نے ایک تلخ جنبش سے اُس کی بات ٹال دی اور بڑی مشغولیت سے کتابیں  
دیکھنے لگی۔

نجمہ سعادت کے پیچھے پچھے گئی۔ شمعون نے دیکھا وہ کسی بہم سٹے کا فیصلہ کرنے کے  
یہ لیکری کے آخری کونے پر رُک گئیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہا، وہی تھی جسے سعادت ٹال کر  
جانا چاہتی تھی مگر نجمہ نے اُس کا ماتحت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

جلد ہی یہ بات بورڈنگ میں پھیل گئی کہ سعادت اور نجمہ کی جنگ ہو گئی، نیز شمعون پر  
بھی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں، کو یقین تو نہیں پھر بھی اہل نظر کا خیال تھا کہ کچھ اُس کا بھس  
داخل ہے۔ سعادت کا پرانا درد سر کا مرض عود کر آیا اور نجمہ کو گوشت کی بو سے قے  
ہونے لگی، لہذا دونوں نے کھانا نہ کھایا۔ لڑا کیوں کہ گروہ کھٹر پھسر کرنے اور قہقہے  
لگانے لگے۔ سعادت کی علالت تو طویل ہو گئی مگر نجمہ بدستور کھانے کے کمرے میں  
آنے لگی۔ وہ ایک دم سے بہت مفساد ہو گئی۔ جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات بھی نہ  
کرتی اُن سے ہنس مہنس کر مذاق کرنے لگی لیکن بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ  
فکر چمکنے لگتی۔ اُس کا ہر مذاقیرہ جملہ زبردستی ڈھالا ہوا معلوم ہوتا۔ ویسے تو لڑکیاں  
اس کی بات کا جواب برا ہی خندہ پیشانی سے دیتیں لیکن اس کے جاتے ہی جل گئی کہنے  
لگتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اس کی ظاہرہ خوش مزاجی کی اصل وجہ کیا تھی۔ اسے  
صرف سعادت کا غم مٹانے کے لئے اُن کی مدد کی ضرورت تھی۔ مگر کسی کو اسے دکھائی  
سے جواب دینے کی سمیت نہ تھی کیونکہ وہ استانیوں میں کافی پسند کی جاتی تھی اور اپنی  
جماعت میں ہمیشہ آؤں رہتی تھی۔

موتیہ کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے شمعون آہستہ آہستہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کے  
قرب میں رہنے کی کوشش کرنے لگی، کچھ نہیں تو وہ اُس کی ڈاک ہی پکڑنے کی فکر میں  
رہتی تاکہ اسے دینے کے لیے اس کے کمرے میں جا سکے، مگر کسی تھیلے کے معنی پوچھنے یا منہ

کتاب کا پتہ معلوم کرنے اُس کے پاس چلی جاتی۔ بجٹہ کا رویہ بڑا سلجھا ہوا ہوتا۔ اگر غلطی سے وہ ذرا بے تکلف ہو جاتی تو فوراً واپس کھینچ جاتی اور جلدی سے اُسے کمرے میں سے مال دیتی، یہاں تک کہ بعض وقت تو دشمن کو اُس کی رکھائی سے بڑی چوٹ لگتی۔ تین دن ہو گئے سعادت اور بجٹہ کے درمیان پرچہ بازی ہوتی رہی لیکن ملاپ کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ اس عرصے میں بجٹہ کئی دفعہ دشمن کے کمرے میں بھی آئی، ہنس مہنس کر باتیں بھی کیں مگر کچھ خشک سی ہو کر فوراً چل دیتی۔ کئی بار دونوں باغ میں بھی ملیں مگر چھوٹا خاموشی نے انہیں جلد ہی بھاگ جانے پر مجبور کیا۔

امتحان شروع ہونے والے تھے۔ یہ امتحان بھی بورڈنگ میں شاندار مقوار کی طرح آتے ہیں۔ کئی دن پہلے سے لڑکیاں ایک دوسرے کو wish کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھل پھول کا تبادلہ شروع ہو جاتا اور بہت سی تو دوپٹے، ساڑھیاں، چوڑیاں وغیرہ دیتی لیتی ہیں۔ آپس کے لبین دینے سے زیادہ ایک طرفہ دین ہوتا ہے، یعنی وہ لڑکیاں جو دوسروں پر مرتی ہیں وہ بڑا سا دل لھول کر دیتی ہیں۔ وہ خواہ کتنی عریب ہیں، دھپے پر گزارہ کر رہی ہیں، خیراتیں کتابیں اور ہدیے ملتے ہیں مگر جس پر مرتی ہیں، اس کے لیے چوری کریں گی، ڈاکے ڈالیں گی، بھیک مانگیں گی مگر اپنی چیمبتوں کو دس دس روپے کی چوڑیاں، پانچ چھ روپے کے مار پھول اور گجر سے نرود پہنا دیں گی۔

جس لڑکی کی زیادہ مرنے والیاں ہوں گی اتنی ہی زیادہ اُسے چیزیں ملیں گی باس کے علاوہ عین امتحان کی صبح مار اور گجروں سے لاد دیں گی اور بعض چیمبتیاں تو ایسی پھولوں میں چھپ جاتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی برط سے لیڈر کا جلوس نکل رہا ہے۔ جن مرنے والیاں پھولوں اور گولے کے گھنے پہنا کر بالکل دلہن بنا دیتی تھیں اور پھر یہ دلہنیں شرماتی لجاتی امتحان کے کمرے میں چلی جاتیں۔ ہر مرنے والی کا مار پہننا لازمی تھا۔ بعض حاسدوں کا خیال تھا کہ اتنے مار مرنے والیوں کے نہیں ہوتے تھے بس دکھانے کو یہ لڑکیاں خود منکا کر پہن لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں انہی کی

اتنی مرنے والیاں ہیں۔  
شام ہی سے سمن نے بھی بچہ کے لیے سواروپے کا موٹا سا گجرا منگوایا احاطت کو  
جب تک وہ جاگتی رہی اُس پر پانی چھڑکتی رہی۔ بار بار اُس نے ان خوش نصیب  
پتیوں کو چھو ا جو کل بچہ سے معافہ کر لے والی تھیں۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اُن پتیوں  
کی آڑ میں چھپ رہتی۔

صبح اس نے گھبراہٹ میں ناشتہ بھی نہ کیا۔ گجرے کو کبھی اس ہاتھ میں لیتی کبھی اُس میں۔  
وہ کس طرح بچہ کے گلے میں ہار ڈالے گی۔ شاید سیتا جی کو رام چند جی کے گلے میں ڈالے گا  
ڈالتے وقت بھی اتنی الجھن نہ ہوئی ہوگی۔ بلا سے، انھیں مذاق اُڑانے والی لڑکیوں اور  
میرٹن کی تیز نگاہ کا ڈر تو نہ تھا۔ اور یہ اُجد غیر شاعرانہ دماغ کی لڑکیاں تو بس انسانی  
کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی تھیں۔ وہ برآمدوں میں کھڑی ہو جاتیں اور چونکہ خود کسی  
پر نہ مرتی تھیں اس لیے ہر مرنے والی کی گھبراہٹ اور گجروں کا مذاق اُڑاتیں، جس سے  
بعض وقت چستیاں بھی مجروح ہو جاتیں اور عام کھسیا نہ پن اور بد مزگی پھیل جاتی۔  
مرنے والیاں بلکہ تیں تو یہ دوسری لڑکیاں، جہاں ہمیں بازار والیوں کی طرح پیچھے سمجھتی  
تھیں، کھٹے ہوئے طعنوں سے اُن کے قہقہے چھلنی کر دیتیں، ان کی کمزوریوں کو شام  
عام پر کھول کر بھیر دیتیں۔ مگر یہ مرنے والیاں بھی بڑے پتھر کے پلجے والی ہوتی ہیں۔  
کوئی طعنہ، کوئی ملامت انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ ضرورت سے  
زیادہ بے حس اور بے حیا ہو جاتی ہیں۔ بعض تو ایسی مرنے والیاں تھیں جن کے گھروں تک  
اُن کے اس جنون سے عاجز تھے۔ اگر ان پر ذرا بھی سختی کی جاتی تو وہ پاگل سی ہو جاتیں اور  
پھر مجبوراً اُن کے ساتھ رعایت کرنا پڑتی۔

جب پھولوں میں لدی پھندی بچہ اپنے کمرے میں سے نکل تو شمن کے ہاتھ پر لڑنے  
لگے۔ جیسے تیسے کر کے اُس نے ہار بچہ کے گلے میں ڈال دیا۔ بچہ نے ہلکی سی مسکراتی  
اُس کی قیمت ادا کر دی لیکن بجائے امتحان کے کمرے میں جانے کے وہ سعادت  
کے پاس بیماروں کے کمروں میں چلی گئی۔ نہ جانے کیوں شمن کے پر بھی اُس کے پیچھے

اُٹھ گئے۔

اُٹے پیروں وہ واپس ہوئی اور بو جھل پیروں کو گھسیٹتی ہوئی کھوئی کھوئی جماعت میں چلی گئی۔ وہاں تو اس کے دل پر جیسے منوں مٹی پڑ گئی۔ سعادت بالکل تندرست اور خوش بیٹھی تھی۔ اس کا گرجا جو، اس نے اتنے ارمانوں سے نجمہ کو دیا تھا، جوڑے میں پیٹے ہوئے تھی۔

سعادت اور نجمہ پھر ایسے ہی ملنے لگیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ کے امتحان ختم ہو گئے اور اب سعادت اور شمن کے امتحان شروع ہوئے۔ شمن نے نجمہ کو سوارو پے کا گجرا پہنایا تھا، اُس نے سعادت کے لیے تو کروڑوں مار پھول منگائے مگر شمن کے لیے شاید بار منگنا مبہول گئی۔ اُسے کسی نے بھی مار نہ پہنائے۔ اگر اُسے معلوم ہوتا تو وہ چوری چھپے خود ہی منگا کر پہن لیتی۔ بھیلوں میں لدی ہوئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں سر جھکائے وہ امتحان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”شمن.... بھئی مجھے گھر سے نہیں اچھے لگتے، یہ بھول میں گھر سے لائی ہوں، اچھے ہیں نا،“ بلقیس نے اسے مرط کے شگفتہ بھیلوں کا گچھا دیا۔ بلقیس ڈرے اسکا لڑھکی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا شکا تھ ڈھانک دیا اور اسے باغ گے باغ بخش دیے۔ پرچہ کرنے میں اُس کا دل نہ لگا اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے رعاشتی ترقی ملی۔

امتحان کا نتیجہ معلوم ہونے ہی چھٹیاں ہو گئیں اور دو مہینے کے لیے لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیں۔ لیرا لینے کے لیے پھر سے چڑھایا اُٹ گئیں۔ دو مہینوں کا لیرا!

دوسری منزل

(۱۶)

دوبارہ جو وہ اسکول میں آئی تو دنیا بے بدل کھڑی تھی۔ بلقیس کی بڑی بہن جو حال ہی میں لکھنؤ سے آئی تھیں پرنسپل ہو گئی تھیں اور بلقیس اور اس کی چھوٹی بہن جلیس مع لمبے چوڑے خاندان کے پرنسپل صاحبہ ہی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں آن رہی تھیں۔ سعادت کو ڈاکٹروں نے ایک سال کے لیے پڑھنے کو منع کر دیا تھا، اس کی صحت میں کچھ سائنک کیا تھا۔ نجمہ پاس ہو کر کسی اور کالج میں لائبریری چلی گئی تھی۔ شمع کو دنیا سسٹان اور اجاڑ معلوم ہوتی، دل میں تنہائی کی ہوکس سی اٹھتیں، نجمہ کا خیال پھوٹا رہا، گریس مارتا۔ اس میں کس قدر دکھ بھرا ہوا تھا مگر زندگی کی چاشنی بھی تو تھی۔ نجمہ نے اسے اپنی ایک تصویر کبھی دی تھی، جسے اُس نے اپنا بہترین مونس، منجھو اور پایا۔ سعادت بھی اسے اب بہتر رنگ میں یاد آتی۔ ویسے جہاں نجمہ کا سوال نہ تھا وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ کاش اس نے نجمہ کو کبھی دیکھا ہی نہ ہوتا۔ اور اگر دیکھا تھا تو؟ تو؟ وہ آگے کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اُسے سعادت سے دوستی ٹوٹ جانے کا عدد نہ تھا۔ نجمہ تو ایک شعلہ تھی کہ وقتاً فوقتاً ہاتھ تاپنے کی حالت ہو مگر سعادت ایک میٹھا چشمہ تھی جس سے گلاس میں، گلاس کے باہر، کھیل کود میں بھی بے پناہ دلچسپیاں اور ہمدردیاں دلالت تھیں۔ سعادت کو سننے کا مرض تھا۔ وہ اور شمع خدا فرامی بے مزد باتوں پر لکھنؤں چمن کے مہرے پر لٹھیں لگاتیں۔ سعادت بہت ہوشیار تھی اور وہ ایک معلم جیسی مدد بھی دیتی۔ یہی نہیں وہ اگر شمع کو بد دل یا مست دلچسپی تو بڑی سختی سے ڈانٹتی۔ شمع کو اُس کی ڈانٹ میں مادرانہ پیار اور فکر کی جھلک نظر آتی اور بعض وقت وہ اتنا نے کے لیے غصے دکھاتی: ”تمہاری بلا سے، ہمیں فیل ہو جانے سے“ وہ اتر کر کہتی۔

”بس جی بس، زیادہ بکواس نہ کرو۔ ورنہ یہ سعادت ڈالنتی۔“

”ورنہ۔ ورنہ کیا؟“

”ورنہ یہ۔ کہ... کچھ نہیں۔ میری پیاری بہن کیسی۔ آئی۔“ اور وہ شمن کے گلے میں باہنیں ڈال دیتی۔ مگر جب غجہ آئی تو، تو سادا شیرازہ بھر گیا اور شمن سعادت کی موت کی دعا میں لگنے لگی، اس کے سفل خدبات بالکل شیطانی اعمال بن گئے۔  
توبہ!

بلقیس سے شمن کی دوستی بھی عجیب و غریب طریقے پر ہوئی۔ ایک دن بلقیس اور وہ بڈمنٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لیے چمن کی بیچ پر بیٹھی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس کے پوچھا: ”تم غجہ پر مروتی تھیں نا؟“  
”نہیں۔ نہیں تو۔“ وہ ”شمن گھرا گئی اور قسمیں کھانے لگی۔“

”ارے ہم سے جھوٹ بولتی ہو! ہونہ، جیسے ہم جانتے ہیں، اور سعادت تم سے جلتی تھی۔ کیوں؟“  
”جی ہاں۔ کبھی بھی نہیں۔“

”تو اس میں بات ہی کیا ہے۔ میں خود پہلے غجہ پر مروتی تھی مگر آپا پی نے مجھے بتایا کہ لو کیوں کو ہمیشہ لو کوں پر مرنے چاہیے۔“  
”توبہ! یہ شمن نے بدک کر کہا۔“

”ہاں اور کیا۔ اُٹھ سے تو شادی کر کے ہمیشہ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں۔ کیوں ہنسنا چاہی؟“  
”مگر... یہ تو... ہاٹے اللہ بڑی باتیں نہ کرو بلقیس۔“

”اس میں بڑی بات کیا ہے۔ جبھی تو آپ مجھے کوٹیا لے اچھے لگتے ہیں۔ میں بڑی بھی تو ہوں تم سے۔ بلقیس روش پر سے کنکریاں چن کر ہوا میں اچھا لٹے گی۔“  
”کوٹیا لے؟“

”ہاں۔ ارے؟ کوٹیا لے! تم نہیں جانتی کیا ہوتے ہیں۔ چہ ہٹو بھی! تو ہو تم بلقیس تہقہہ لگا کر گھاس پر لوٹ گئی۔“ ارے کوٹیا لے بچی، کاسے اور سفید اس نے ٹھنڈی



گھاس پر گمال رگڑا کر ہلکی سی پھریری لی۔ ”زہریلے۔ نف۔۔۔۔۔“ نماز کی گھنٹی بج گئی اور دونوں بات ختم نہ کر پائیں۔

دو تین دن بلیقیس تھیلنے ہی بورڈنگ میں نہ آئی جو شمن کی الجھن دُور ہوئی۔ اُس کے جی میں کھد بند ہو رہی تھی۔ اس کا جی نہ مانا اور اس نے لغت میں دیکھا مگر اس میں کبھی تھا نہ کوڑیا لے، چتی دار سانپ، سیاہ اور سفید، سخت زہریلے۔۔۔۔۔ جن کے کانٹے۔۔۔۔۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوڑیا لے سانپ بلیقیس کو کیوں پسند ہیں۔

”جی بتاؤ نا کوڑیا لے کون ہوتے ہیں۔“ اُس نے موقع پا کر پوچھا۔

”کوڑیا لے، دل کے ٹکڑے، جان ہوتے ہیں اور کون ہوتے۔“

”او نہ تو بتاؤ نا۔“

کئی دن شمن لپچھتی رہی اور بلیقیس ہنس ہنس کر ٹالیتی رہی مگر ایک دن اُس نے شمن کو ایک تصویر دکھائی، یہ ایک وجہیہ نوجوان کی تھی جو سیاہ شیردانی اور سفید پاجامہ پہنے تھا۔ ایک مہم سے وہ دونوں تہقہہ لگا لگا کر بننے لگیں۔ اچھا تو یہ تھے کوڑیا لے، کالی شیردانی یونیورسٹی کالونیفارم تھا اور یہ تصویر رشید کی تھی۔

دیے بلیقیس اور بلیقیس بورڈنگ میں نہیں رہتی تھیں پر جب کبھی اُن کا مل چاہتا وہ سارے قوانین بالائے طاق رکھ کر بورڈنگ میں آں دھمکتیں پرنسپل کی بہنیں، بھلا کس کی مجال تھی جو چوڑ بھی کر جائے۔ پھر اُن کا دل لگنے لگا، اور بلیقیس شمن کے کمرے میں مستقل رہنے لگتی مگر جب جی چاہتا بغیر اجازت بھاگ جاتیں۔ جلیس بد مزاج تھی اور نورمی کی جماعت میں تھی۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتیں مگر روز جوتا چلتا۔ شمن اور بلیقیس نہایت بزرگانہ طریقہ پر انھیں سمجھانے جاتیں اور طلبہ ہو جاتا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا دوپٹہ اوڑھے گلے میں ہاتھ ڈالے چمن میں گھومنے لگتیں۔

پہلے پہل تو نورمی نے بلیقیس پر مرنے کی کوشش کی اور جلیس نے شمن پر مگر بلیقیس نے نہایت جنگلی پن سے دونوں کو کھینا نہ کر دیا۔ اور پھر کچھ سوچ بچار کے بعد نوں جماعت کی ایک لڑکی کو دونوں نے چاہنا شروع کیا مگر بلیقیس نے وہاں بھی اُن کا ناک میں دم کر دیا۔

جہاں کوئی چیز گم ہو جاتی۔ وہ فوراً چلا چلا کر مجلس اور نور پری پر الزام لگاتی کہ وہ اپنی چھٹی کو دسے آئی ہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بیچاریاں بلقیس اور شمن کے منگائے ہوئے پھلوں میں سے دنا رنگیاں چُرا کر دسے آئی تھیں۔ مگر اب بلقیس کی سرطی ہوئی چپن بھی گم جاتی تو وہ یہی کہتی کہ نور پری اور مجلس اپنی دوست کو کھلا آئیں۔ اس پر نور پری اور مجلس خوب رو تیں اور خوشامدیں کرتیں کہ ہولے ہولے بولو کہیں وہ سن نہ لے۔ شاہ جہاں ان دونوں سے دو گنی بڑی تھی اور زیادہ منہ نہ لگاتی تھی پر جب اُس نے بلقیس کا فکرا مانا تو دونوں کو کمرے سے نکال دیا۔ دونوں روتی ہوئی کچھ نوں میں جا پڑیں۔ اوپر سے بلقیس اور ساتھ ساتھ شمن نے بھی جھپٹنا شروع کیا۔ خوب گیت جوڑ جوڑ کر ٹہل ٹہل کر گائے۔ نور پری اور مجلس قہقہے کھا کر کہتی تھیں کہ شاہجہان آپا نے ہمیں نکالا تھوڑی، یہ کہا: مہربانی سے چلی جائیے، مگر بلقیس کہتی تھی کہ شاہجہان نے پہلے تو دھکا دیا اوپر سے چلیں لگائیں۔ بیچاریوں کے دل ٹوٹ گئے اور اس دن سے شاہجہان کی جانی دشمن ہو گئی مجلس ویسے ہی دل جلی تھی، بیچاری کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس تلخ تجربے کے بعد دونوں نے حنہ کی مزید کوشش نہ کی اور زیادہ تردد بد ذاتی کرنے، کچے آم توڑنے اور مرنے والیوں کو دق کرنے میں صرف کرتیں۔

بلقیس کی پانچ بہنیں تھیں۔ اُن میں سے سب سے بڑی پرنسپل تھیں۔ بڑی حسین، نازک اور شرمیل سی۔ کسی طرح پرنسپل نے لگتیں۔ ساری کی ساری لڑکیاں ان پر لڑ ہو گئی ہونٹیں، شمن خود لٹو ہو جاتی اگر اُس نے بلقیس سے ان کا کچا چھٹا نہ معلوم کر لیا ہوتا۔ جتنا بہت ڈر لپک تھیں۔ بڈمنٹن کھیلنے میں مار جاتیں تو لڑنے لگتیں اور کم از کم گیارہ آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا اور یہی تھیں جن میں سے دو تو پروفیسر تھے اور باقی ”کوڑیا لے“ پرنسپل کی بہن ہونے کی وجہ سے بلقیس بورڈنگ میں اُلٹے سیدھے حکم چلایا کرتی تھی۔ کھالے کے کمرے سے سوائے بیمار لڑکیوں کے اور کسی کو کھانا کمرے میں منگوانے کی اجازت نہ تھی اور اگر ایک گلاس بھی ادھر سے اُدھر ہو جاتا تو آفت آجانی مگر بلقیس کے کمرے میں جھوٹی رکابیوں کے ڈھیر سڑا کرتے۔ میٹرن دیکھتی اور خون کا سا گھونٹ

پہلی کر رہ جاتی کیونکہ اس سے پہلی میڑوں صرف اس لیے نکال دی گئی تھیں کہ وہ آئے دن لڑکیوں کی رپورٹ دفتر میں لے جاتی تھیں اور لڑکیوں میں بلیقیس جلیس اور ان کی چند لڑکیاں تھیں۔ اور لڑکیاں بھی بلیقیس جلیس کی خوشامدوں میں لگی رہتیں، خصوصاً وہ بالخصوص بچیاں جنہیں بورڈنگ سے کھانا مفت ملتا تھا یا فیس معاف تھی وہ اپنی دولت میں پرنسپل صاحبہ کی میراث پر ملتی تھیں۔

بلیقیس کو لڑکیوں کے نئے نئے قصے آکر سنائی۔ وہ اور جلیس کافی چھوٹی تھیں۔ جیسی سے ان کے کوڑیا لوں کی تعداد اطمینان بخش تھی۔ پانچوں بہنوں کے سارے عاشق اگر جمع کیے جاتے تو خاصی پلٹن بن جاتی۔ آہستہ آہستہ بورڈنگ میں کوٹھالیوں کا ذکر عام ہونے لگا۔ ڈسے اسکا لہ لڑکیوں کے بھائی بند چٹکوں اور قصوں کے ذریعے بورڈنگ کی نیم مردہ زندگی میں اس رچانے آئے لگے۔ چھوٹی موٹی خرید و فروخت، پرانی کتابوں کی رد و بدل، لاسکی کے سلسلے سے زندگیاں آگے چلنے لگیں۔ فلم دھوانے یا پرنٹ بنوانے کے بہانے عشق فوطے لگے۔ بالکل جیسے ہزار سال پہلے کی دنیا میں لوگ تصویروں پر عاشق ہو جاتے تھے اسی طرح یہ ناویدہ عشق بھی چلتے، لڑکھڑکھاتے اور گر پڑتے۔ اور یہ کوڑیا لے تھے بھی غضب کے۔ اور کچھ نہیں تو لڑکیوں کے نام عید کاڑھی چلے آ رہے ہیں۔ بگڑ رہی ہیں، کوس رہی ہیں لیکن سارے بورڈنگ میں گھماٹے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کو فخر یہ دکھائے جا رہے ہیں، ایسے، گویا کچھ بدوا ہی نہیں۔ دیکھ لکھ کر لڑکیاں اوٹی اور ہائے توبہ چلا رہی ہیں۔ ایک عورت اور مرد ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں، نیچے ٹیراھے میڑاھے شعر لکھے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا۔ ہر لڑکی نے اپنے چچرے، میرے، خیرے بھائی کا رومان جوڑ جا کر سنانا شروع کیا۔ بلیقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے بھائی کے جتنے دوست تھے وہ سب تو رعبوڑ عاشق تھے، اور بھی جسے پیٹنگ بڑھانے ہوتے وہ بھائی رشید سے دوستی کر لیتا اور اس پہلے مزے سے میٹھا میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔ جتنے بھی کالج میں روشن خیال انقلابی لڑکے تھے

فناں مختلف سماجی اور سیاسی مشکلات پر بحث کرنے اور آئندہ پود کو روشن خیال بنانے کی تجویزیں سوچنے آجایا کرتے۔ سب بہنیں نہایت روشن خیال عموماً بائیں شب خروابی ہی میں اُن سب سے ملتی جلتیں۔ تاش کیرم کا زور بندھنا، نغمہ سرائیاں ہوتیں، باغیانہ بحثیں ہوتیں، کونوں کھڑوں میں نہیں سب کے سامنے عشق چلتے۔ پرنسپل صاحب کا ہنگامہ روشنی سے معمور تھا جس میں پانچوں بہنیں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگمگایا کرتیں۔

رات کو کھنسر بھیس بلقیس ان کے قصے بتاتی، بارہ بج جاتے مگر ختم نہ ہو پاتے۔ ایک دوہوں تو کوئی جھگڑے یہ ان عاشقوں کی فوج سے کون ٹکاتا جائے گا۔ بارہ مرزا تھے تو آپا پی کے عاشق مگر گدیاں بلقیس کے بھی کیا کرتے۔ حیدر صاحب تو آبائی عمروں کے تھے مگر اُس پر دیوانہ تھے۔ وہ تین فلم اُن سے چھیل چکی تھی جس میں سے ایک اُس نے شوق کو دے دیا تھا۔ وہ تو اُن کی انگوٹھی بھی چھین لیتی مگر انہوں نے منس کر کہا تھا کہ وہ دہلی سے نکلتی مٹی انگوٹھی منگوا رہے ہیں۔

”یہ انگوٹھی تو تمہاری کر میں آجائے گی“ انہوں نے اس کو دونوں ٹانگوں میں بھینچ کر اُس کی کمر کو اپنی انگلیوں کے چھلے میں لینے کی کوشش کی جس سے اُس کے بڑی گدگدی ہوئی تھی۔ بہنیں یہ قصے سننے سننے شل پڑ جاتی۔

”تو کیا تم اُن سے شادی کر لو گی۔“

”بھئی کیا پتہ، دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”اگر تم حیدر صاحب سے شادی کر لو گی تو بچارے عباس کا کیا ہوگا، انصارتو اللہ قسم مر جائے گا اور عشرت۔ یہ ڈیر طوہ بالشت کا عشرت بھی تم سے محبت کرتا ہے، چہ تو بہ! شوق کو اُن سب پر ترس آنے لگا۔“ ما! بچارے عاشق! ”اچھی تو میں کیا کروں؟ آخر یہ سب جلیس پر۔۔۔ اُس کا بیچاری کا ایک کا کیا ہے اور ایک بچا سا آؤ! فطیس۔ چہ نفرت میں تو تنگ لگی۔“ وہ عاجز ہو کر کہتی اور سچی بات لکھتی ان انقلابیوں میں زیادہ تر غریب جسمانی طور پر پھیرے چپک مارے اور بد

ہی تھے جو اپنی روح کو تسلی دینے کی خاطر حس کی جلا چاہتے تھے اور پر جانوں کی طرح شمعوں کے متلاشی تھے۔ بلیس سب سے چھوٹی تھی پھر بھی آثار کہتے تھے کہ اپنے زمانے کی نادر شاہ نکلے گی۔ ٹوٹے پھوٹے رنگر دٹ ابھی سے قطاریں باندھ رہے تھے۔ کاش بلیس اپنے عاشقوں میں سے ردی ردی چھانٹ کر بورڈنگ کی لڑکیوں کو دے دیتی۔ جو بیچاریاں خیالی پلاؤ سونگھا کرتی تھیں۔

”تم بھی اپنی باتیں بتاؤ“ بلیس کہتی۔

”واہ۔۔ ہمارے کوئی بھی بات نہیں“

”چرکیسی ہو تم، تمہیں کوئی نہیں چاہتا؟“

شمن کا دل بچھ جاتا، شرم اور احساس محترمی سے اس کے کال تمنا جاتے۔ لہذا ایک دن اس نے سوتھ بچار کے بعد نام لے ہی دیا حالانکہ اسے اپنے سارے سٹے، سوتیلے اور رشتے کے بھائیوں سے نفرت تھی۔ اور وہ بھی تو ہمیشہ اسے دق ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی تو دوسری بھائیوں جیسی حرکت نہ کی تھی جس کا دوسری لڑکیاں مزے لے کر ذکر کرتی تھیں۔ مجبوراً ہی اس نے اسحاق بھائی کا نام لے دیا تھا۔ لیکن اسے خوب معلوم تھا کہ اگر ان کے یا ان کی بیوی کے کان میں اس بات کی جھجک بھی پہنچ جاتی کہ شمن ان کے عشق کے قصے گھڑ کر سناتی ہے تو آفت آجاتی۔ وہ اماں سے جوتے لگوائے جاتے کہ سارا لشہ ہرن ہو جاتا۔ اسے ویسے سوائے اسحاق بھائی کے اور سب ناپسند تھے۔ ان کی برطی لڑکی سے اس کی دوستی بھی رہ چکی تھی۔

”تو وہ تمہیں پیا رکھتے ہیں؟“

پیارے شمن کو نفرت تھی۔ دوسرے اسحاق بھائی سے پیار کرنے والے خیال سے اس کا دم لوٹنے لگتا تھا۔ لسی پی کر جب وہ دودھ کا جھاگ مونچھوں میں سے چوس لیتے تو اسے اُجائی آجاتی تھی۔

”واہ، پیا نہیں کرتے تو تمہیں کیا چاہتے ہیں؟“ بلیس کو اس پر رحم آنے لگا تو شمن نے جی کرنا کہہ کے سوچا کہ اگر اتنی دیر سے وہ اسحاق بھائی سے پیار کر دالے

تو اس کا جی کیسے متلا سکتا ہے ہذا اُس نے شرماتے ہوئے اقبال کر ہی لیا کہ اُنھوں نے پیار کیا تھا۔ اسحاق بھائی سے ایک قلم پھینکے گا ذکر بھی اُن سے خوب مزے لے لے کر بیان کیا حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اسحاق بھائی اُس کے پاس صرف مرطے ہوئے نمب اور کھڑے ہوئے ہولڈر تھے جو کوئی بیوقوف بھی پھینکے گا ارمان نہ کرے گا، پریقیس کو کیا خبر؟

پریقیس کی اور شمن کی دوستی ایسی بڑھی کہ دن رات ساتھ رہتیں، ساتھ اٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ پریقیس اُسے بہت پسند تھی، سعادت سے بھی زیادہ۔ تیر نہیں بچتے۔ سے کم یا زیادہ! ختم اور چیز تھی، دہکتی ہوئی شراب اور پریقیس صاف تنہا بنوا میٹھا پانی، گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بیکر کسی تھجک کے کپڑے اتار دیتی تھی۔ نہانے نہانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر چیونٹیوں اور مچھروں کے کاسٹ کے نشان اپنے بسم پر ڈھونڈا کرتی تھی۔ اگر کوئی آجاتا تو وہ خود جھینپ کر لوٹ جاتا، پریقیس کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

”واہ بھلا لڑکیوں سے کیا شرم؟“ وہ ڈھٹائی سے کہتی۔ ایک دفعہ میٹرن نے ڈانٹا تو پریقیس نے اس سے کہہ دیا کہ ”چونکہ تمہارا جسم پھلڑا ہے جیسا ہے اس لیے مجھ سے جلتی ہو“ اس پر میٹرن ردی بیٹی اور پریقیس کو بھی ڈانٹ پر طی مکودہ کہیں سننے والی تھی۔ اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آہٹنے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی۔ کبھی اُس کے ہونٹ جھوٹ موٹ روٹھنے کے انداز میں آپ ہی آپ ابھرتے اور کبھی خود بخود جھینپ کر وہ آہٹنے کے پاس سے بھاگ آتی نہ نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دبک جاتی۔ جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے روئیں سونے کے تاروں کی طرح چمک اُٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی۔ لیکن وہ گھنٹوں فیصلہ نہ کر پاتی کہ اودی شلووار پر کیا پسی دوپٹہ اوڑھے یا کاسنی! وہ اس بار سے میں شمن کی رائے لیتی۔ شمن بھاری گردن موڑے موڑے بتا دیتی۔ اسے کچھ ڈر سالگتا تھا پریقیس سے کیونکہ کئی دفعہ

باتیں کرتے میں اس کا دل بے اختیار اُس کی گردن پر اٹکیاں پھیرنے کو چاہنے لگتا وہ نرم نرم سڈول سی گردن جسے وہ بڑے پیار سے انداز سے ایک طرف موڑے رہتی۔

بھائی رشید کو پہلے تو بلقیس کا ایک عاشق ہی سمجھی تھی کیونکہ اُن کی تصویر جو اُس نے کوڑیا لوں کی تشریح کے سلسلے میں دکھائی تھی میز پر اب بھی رکھی تھی، جب بلقیس نے بتایا کہ وہ اس کے سگے بھائی ہیں تب وہ سمجھی۔ یہ بھی اسی خاندانی خوبی کے حامل تھے۔ جس کا لُچ یا یونیورسٹی میں پڑھا تین چار زخمی چرطیاں ترپتی چھڑیں۔ کا لُچ کی بہت سی لڑکیاں الکا کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ وہ خود تو چاہے فیل ہو جاتے ہوں مگر جن لڑکیوں نے ان سے دوچار سبکی لیے وہ شرطیہ کامیاب ہو گئیں۔

”خدا قسم تم فوراً مر جاؤ گی رشید پر“ بلقیس شمن سے کہا کرتی۔ مگر شمن کو بوڑھنگ سے باہر قدم رکھنے کی تو اجازت نہیں تو پھر بھلا مرنے کا موقع کیسے ملتا۔ مگر قسمت نے ایک عجیب طریقے سے اُسے رشید سے ملایا۔ سالانہ پنکاک کے موقع پر پرنسپل صاحبہ اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ سب دوسری موٹر میں گئے اور پیڑوں کی آڑ میں نہاتے دھوئے رہے۔ وہ تو لڑکوں کو اس خیال سے لے گئی تھیں کہ کوئی لڑکی ڈوب ڈوب جاوے تو وہ لوگ نکال لیں۔ وہ سب دُور ہی دور تھے لہذا پر وہ ساتھ پر لڑکوں کے دل اُدھر ہی گئے ہوئے تھے۔ بھول بھول کر اُدھر جانگلیں پر چیخ چیخ کر نہیں رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دھکے دے رہی تھیں۔

”شمن رشید سے ملو گی؟ وہ ادھر ہے پڑ کے پیچھے“ بلقیس نے اُلکے لے جا کر کہا۔

”واہ بھئی میرا پردہ ہے“ شمن گھبرا گئی۔  
”اُدھر تم چلو تو میں اُس کی آنکھیں بند کر لوں گی“

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ بلقیس اپنے دوپٹے سے اُس کی آنکھیں بند کر دے گی۔ پھر شمن بھیجتی ہوئی گئی۔ رشید کا قد لمبا سا تھا اور جسم چھریا، آنکھوں پر بڑی بندھی ہوئی تھی جس سے ناک بھی چھپ گئی تھی صرف ہونٹ کھلے تھے اور آہستہ آہستہ ہلکے رہتے تھے جیسے اُسے سخت ہنسی آرہی ہو۔ گھنے بالوں کا ایک جنگل سر پر کھڑا تھا۔ چل چل کر دوپٹے کے چوڑی میں سے بال نکل رہے تھے۔ گریبان کا ایک ٹہن کھلا تھا جس میں سے اس کی بھڑدی گردن کی نیسی ہنسی روکنے کی وجہ سے پھوٹتی نظر آرہی تھیں۔

”ہی ہی ہی“ وہ ایک دم سے ہنس پڑا، شمن اور بلقیس بھی ہنسنے لگیں، رشید ٹوٹنے لگا۔

”ارے بھائی کہاں ہیں یہ تمہاری دوست شمن شمن۔ ان سے کہو ہم سے ہاتھ تو ملائیں“ بلقیس نے اُسے بہت گھسیٹا مگر وہ نہ مانی۔

”دیکھو بھی پھر ہم زبردستی پکڑ لیں گے ہاں۔ پھر بڑا نہ مانے کوئی، ہم آنکھیں پتے ہیں“ رشید نے دھمکی دی۔

مجبوراً شمن نے اپنا ڈراما ہوتا تھا اُس کے ہاتھ میں رینگا دیا، پھر فوراً چھڑانے لگی کیونکہ رشید نے تو مضبوط پکڑ لیا تھا۔

”ارے یہ تمہاری شمن شمن کا ہاتھ ہے؟ نہیں جی یہ تو چو بیا کا پنجہ ہے“ شمن نے ہنسی روکنے کے لئے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

”تو کیا ایک ہی ہاتھ ہے بس؟ اور باقی کا جسم؟ ارے بلی ان کے پر بھی میں نہیں۔“

”ہیں!“ بلقیس ہنسی دبا کر بولی۔

”کتنے؟“

”دو... کھی کھی...“

”اچھا، اور اور بلی اُن کے کالی؟ کالی ہیں؟“

”ہاں بھئی“

”اور ناک؟“ شمن ہاتھ چھڑانے کے لیے دوہری ہو چکی تھی مگر بیکار۔



”بھئی ایسی باتیں کر دو گے تو ہم بولیں گے بھی نہیں“ بلقیس نے کہا۔  
 ”اچھا جانے دو۔ یہ بتاؤ ناگ کہاں ہے الہ کی۔ ناگ!“ رشید نے پھر ٹوٹنا شروع کیا۔ اندھوں کی طرح اُس کی انگلیاں ٹھٹھکتی ہوئی عشق کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ بھٹیوں، پکیں، نتھنے، ہونٹ۔ یہاں تھوڑی دیر کو ٹھٹک گئیں پھر گالوں پر سے ہوتی ہوئی بالوں پر۔

”ارے بلو؟ الہ کے چٹیا تو ہے ہی نہیں کسی ہے یہ چٹیا؟“ وہ اُس کا کال ٹوٹنے لگا۔ منہ کی مار سے دونوں کا برا حال ہو گیا اور ٹھٹک مار کر بھگیا۔  
 ”ارے بے ایمانی۔ بے ایمانی۔ ارے پکڑ لیوٹی۔“ رشید نے دوپٹہ نوح کرشمی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلی۔

لیکن اب اُس کی بھجک ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہانہ کر کے پھر بلقیس اور وہ رشید کے ساتھ کھیتوں میں خربوزے چرانے گئیں۔ وہاں اُس نے دونوں کو کپڑوں میں گھسٹوں تک بھنسا دیا۔ وہاں سے نکل کر جامنوں کی تاک میں مل گئے۔ دونوں نے اپنے دوپٹے بچھا دیئے اور بھاگ بھاگ کر کچی پکی جامنیں مینے لگیں۔ رشید کو لڑکیوں کے دوپٹوں کا استعمال بہت اچھا آتا تھا۔ وہ بجائے انھیں لڑکی کے کندھوں کے اپنے سر پر باندھنا زیادہ پسند کرتا تھا، اور پھر دوپٹوں کی گیندیں کیا عمدہ ہوتی تھیں! وہ لڑکی چوٹ لگتی تھی کہ بس!

جب کینک سے لوٹ کر آئی تو شمن کو معلوم ہوا وہ بادلوں میں جھول کر آئی ہے۔ پانگ پر لیٹ کر سونے سے پہلے اُس نے پوری کینک کو شروع سے لفظ بہ لفظ دہرایا۔ بلقیس کے دوپٹے میں سے رشید کے محلے ہوئے بالوں کے کچھ، وہ اُس کے بچیں ہونے اور گردن کی کپکپاتی ہوئی نیس اور پھر ایسا معلوم ہوا رشید کا ماتھر رنگ رہا ہے اُس کے ماتھے پر، بالوں پر، نتھنوں پر۔ ہونٹوں پر لڑکر رک گیا۔ جلدی سے اُس نے گردن دیوار کی طرف موڑ لی اور سو گئی۔

صبح ہی بلقیس نے بتایا کہ رشید اُس پر بے طرح عاشق ہو گیا ہے۔

” مہڑا تمہیں کیسے معلوم ہے؟ شمن کا دل دھڑکنے لگا۔

” میں پہچان لیتی ہوں۔ جیسے ہی تمہارا نام لولال ٹرخ ہو جاتا ہے اور کیا ہے  
” شمن خود رشید کے نام سے لال ٹرخ ہو گئی لہذا کھل کھل کر دونوں رشید  
کی باتیں کرتی رہیں۔ مگر کسی بہانے سے بھی وہ رشید سے نہ مل سکتی۔ نہ ہی اس کا دل لیا  
بیقرار تھا۔ اچھی بھاری خوراک مل چکی تھی، ابھی وہی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ چلتے پھرتے،  
اٹھتے بیٹھتے پنک کی بہاریں آنکھوں میں سمائی رہتیں۔

لیکن خدا شکر خور سے کو شکرو دے ہی دیتا ہے۔ بلقیس کی ساگرہ نے دنیا ہی بدل  
دی۔ اس کی جماعت کی ساری لڑکیاں اور کئی سہیلیاں جن میں شمن بھی شامل تھی مدعو  
کی گئیں۔ شمن کے پاس کوئی تحفہ بھی نہ تھا صرف ایک سر پر باندھنے کا ریشمی رومال تھا وہی  
اس نے کاغذ میں لپیٹ کر چکے سے بلقیس کو دے دیا مگر بلقیس مارے شرارت کے  
سارے مال میں اسے پجاتی پھری۔ شمن نے دروازے کی آٹھ میں سے دیکھا کہ وہ اسے  
اپنے سر پر باندھ رہی تھی کہ رشید نے آکر تھپیں لیا اور دوپٹے کی طرح اوڑھ کر منہ  
چوڑا کر لگا۔

” آئی، شمن دیکھو یہ رشید نہیں مانتے بھی ہمارا رومال؟“ مگر رشید رومال لے  
کر باہر بھاگ گیا۔ ” دیکھو بھی منع کہ رشید کو، ہمارا رومال تھپیں لیا“ اس نے شمن سے  
شکایت کی۔ پردہ کوڑ کی میں سے رومال کا حشر دیکھنے لگیں۔ رشید اسے گلے میں ڈالے  
ہاکی کھیل رہا تھا۔

شام کو سب لڑکیاں وغیرہ تو جلی گئیں مگر شمن کو پرنسپل صاحبہ کی خوشامد کر کے  
بلقیس نے روک لیا۔ وہ دونوں اور بلقیس مل کر کیم کھیل رہی تھیں کہ رشید دراتے  
چلا آیا۔

” رشید۔ رشید ارے پردہ ہے پردہ! بلقیس اور جلیس چلا میں اور شمن کو  
دوڑچوں میں چھپانے لگیں۔

” کس کا پردہ ہے؟ لڑکیاں تو گئیں!“

”نہیں بھی شمن نہیں گئی۔ اسے بھی رشید۔ آپا بی رشید نہیں مانتے۔“  
 ”وکیڈجی اگر آپا بی سے شکایت کی تو ہاں بس۔“ رشید نے دھمکی دی۔ ”پردہ ہویا نہ ہو  
 ہم کیرم ضرور کھیلیں گے۔“ وہ گھس ہی آیا۔

مقدومی سی جیل و حجت کے بعد یہ طے ہوا کہ رشید اپنا منہ ڈھانک کر کھیلے۔  
 بلقیس اور شمن ایک طرف اور جلیس اور رشید دوسری طرف۔  
 ”بھی کچھ بد کر کھیلو، ویسے مزہ نہیں آئے گا۔“  
 ”اکنی اکنی، جلیس بولی۔“

”نہیں بھی رشید لوٹ کر رکھ دے گا، میں، در دو ویسے۔“ بلقیس چلائی۔  
 ”اپنا بھی میں ماروں تو اکنی دوں گا اور تم مارو گی تو چنٹی۔“  
 ”نہیں، ہمیں بناب چنٹی کی نہیں ہے۔ ایسی زور سے مارے گا کہ کیا تباؤں۔“  
 بلقیس نے دشت زدہ ہو کر کہا۔

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ رشید کی اکنی اور ان دونوں کی چنٹی، مگر ہلکے کی ہند  
 سے مارنے کی نہیں۔ پردے کی وجہ سے رشید وہی ریشمی رومال کا گھونٹ کا ٹھہ کر بیٹھ  
 گیا اور کھیل شروع ہوا۔  
 چھڑانے کے لیے اُسے سب دلہن دلہن کہہ رہے تھے، رومال باریک تھا اور اُس  
 میں سے اُس کی آنکھیں صاف چمک رہی تھیں۔

”بلقیس یہ تو سب دیکھ رہے ہیں!“ شمن نے چپکے سے شکایت کی۔  
 ”خبردار رشید جو تم نے شرارت کی، خدا قسم مار ڈالوں گی۔“ بلقیس نے ڈانٹا۔  
 کھیل پورے شباب پر آ گیا تو پردہ و ردہ سب غائب۔ رشید نے بے ایمانی کی ہذا بلقیس  
 نے ہر بار اُس کا ماتھ ہلا دیا اس لیے وہ مار گیا۔ دوسرے کھیل میں رشید نے ذرا سنجیدگی  
 سے کھیلنا شروع کیا اور بلقیس اور شمن کا دم نکلا۔ وہ صبح کر اُس کا ماتھ ہلا دیتیں تاکہ  
 وہ گر بڑا جائے مگر قسمت میں مار بدی تھی۔ کھیل جیت کر رشید نے بڑی احتیاط  
 سے رومال کا گھونٹ کا ٹھہ لیا اور آستینیں چڑھا لیں۔

” چلیے دلوائیے چنٹی! “ اُس نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور دو انگلیاں جوڑ کر متھیا تیار کیا۔

” بھئی زور زور سے مارنے کی نہیں ہے “ بلقیس اس کے اُپر جڑھ بٹھی۔  
 ” خوب، میری اکٹی نکل گئی تو کچھ نہیں اور اپنی باری پہ چلیں روئے۔ خدا قسم آج ہڑی نہ توڑ دوں تو بات نہیں “ اُس نے پھر انگلیاں تولیں۔ جیسے ہی اُس نے مارنے کا ارادہ کیا شمن لے ہائے کر کے ہاتھ پھیرا لیا۔

” دیکھا تم نے؟ تمہاری دوست حد سے زیادہ مکار ہیں، یعنی میں سے مارا نہیں اور ہائے! “ ان سے کہو سیدھی بٹھیں، جگہ بے جگہ لگ جائے تو ہم ذمہ دار نہیں۔“  
 برطی دیر تک وہ چنٹی مارے بغیر ڈرتا رہا۔ مار چیتا تو چھٹی ہوتی تو بھئی ایک ہی تو بھاری چنٹی ہے، مزے سے لے کر ماریں گے ہم تو، اتنے میں پر نسل مہاجر کے نو کرنے آکر حکم دیا کہ بورڈنگ کی سب لڑکیاں جاویں۔ سب کون؟ وہ کون گیا تھا سوائے شمن کے کہ اچھا تو یہ چنٹی ادھار رہی۔“ رشید نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔  
 ” اچھے رشید ہمیں بورڈنگ تک پہنچا آؤ “ بلقیس کو گرا کر ائی۔  
 ” مہشت، ہم سونے جا رہے ہیں۔“ رشید اتر آیا۔  
 ” اچھی ہمارا بھیا کیسا “ بلقیس اس کی گردن میں جھول گئی۔

پانچ منٹ کا راستہ منہ منہ سے گزرا۔ رشید نے اُس کو آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ دیر تک بچا ایک پرکھڑے مہر پر بحث ہوتی رہی۔ رشید کہتا تھا شمن کو ہاتھ ملا کر مہذب لوگوں کی طرح خدا حافظہ کہنا چاہیے اور شمن کہتی تھی کہ بچا ایک کی وارنش نائز لوں۔ سب کھینچ رہی تھی۔ جب برطی دیر تک بحث ہوتی رہی تو محل کر بلقیس نے شمن کو اُس پر ہکا دے دیا۔ بہت سہلی پھر بھی اُسے دونوں ہتھیلیاں اُس کے سینے پر کھانی پڑیں۔ گھبرا کر رشید اسے کر کے ہٹ گیا۔ اور شمن اندر بھاگ گئی۔  
 بہت دیر تک وہ بلقیس کے چٹکیاں نوچتی اور کوستی رہتی۔

(۱۶)

نمائش آئی اور بلقیس کی وجہ سے شمن کو کئی دفعہ جانے کی اجازت مل گئی۔ نمائش بھی ایک عظیم الشان تہوار ہے۔ سال کے سال میدانِ حشر بپا ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے سونے ہوئے مردے صورتوں کی پکار پر جاگ اٹھتے ہیں اور پندرہ دن کے لیے اومانوں کی دنیا میں بسنت کھل اٹھتی ہے۔ خرید و فروخت کے لیے ٹکے کس کے پاس ہوتے ہیں۔ دوسرے نمائش میں کون بیوقوف خرید و فروخت میں دقت گنوائے۔ ایک آفت برپا ہوتی ہے۔ جس دکان پر جادو کالی شیردانیوں اور کالے برتنوں کا جھگمٹ۔ برتنوں کی مجال نہیں جو ایک دم کے لیے ان شیردانیوں کے سائے سے دور رہ سکیں۔ بندے خرید و دکان موجود، پوڑیاں چھانٹتا دیکھتا دیکھتا دیتے ہیں، ساڑھیوں کی دکان پر کھڑے آوازے کس رہتے ہیں، کھدوؤں والے کی دکان پٹی پڑی ہے غرض ہر جگہ کوڑیا لے پھرتا رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ بدحواس ہوئی جاتی ہیں۔ اگر شکایت کرتی ہیں تو اٹا اپنا آنا بندہ غرض سولی پر جان ٹنگی ہے۔ ویسے بے کوڑیا لوگوں کے بھی دنیا تلخ اور اجڑی ہوئی ڈانٹ ڈپٹ کو دور ہٹا دیا تو بات کیا رہ گیا نمائش میں؟ یہ جگمگاتے جواہرات؟ وہ زین بیوصات؟ جی نہیں یہ اوروں کی دولت ہیں، مفلس طالب علم کو تو اپنی زندہ دلی ہی میں ہزاروں نمائشیں مل جائیں گی۔

بلقیس بہت دن سے شمن سے تصویر کے لیے کہہ رہی تھی۔ رشید اپنے دوست کو اٹھانے بھیج کر اندراج کرانے کو کہتے تھے۔ میٹرن کی آنکھ بچا کر دونوں کھسک گئیں اور روپیہ کی آہٹ والی تصویریں کھینچو الے لگیں۔

”جلدی سے کھینچو“ انہوں نے دہاں کھڑے ہوئے فوٹو گرافر سے کہا۔ یونیورسٹی کے اراکوں کی طرح وہ بھی سیاہ اور سفید تھا۔

”آپ تصویر کھینچو ایٹں گی؟“ وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔

”اور کیا، بھیجی جلدی کیجیے۔“

”جلدی ہی کیجیے۔ تو آئیے یہاں بیٹھے اسٹول پر؟“ اُس نے نیا سگرت سٹکایا شمن

اور بلقیس کی رائے ہوئی ذرا سا پاؤ ڈر اور لپٹ کر لگالی جائے تو اچھا رہے۔ تصویر میں کچھ تو آئی جائے گا۔

”آئینہ نہیں ہے آپ کی دوکان میں، ذرا...“ انھوں نے پوچھا۔  
 ”آئینہ۔ ہوگا کیوں نہیں۔ ادھر آئیے“ وہ ان دونوں کو پھیلے کرے میں آئینہ دکھانے لے گیا۔ وہ پاؤ ڈر لگاتی رہیں اور وہ کھڑا مسکراتا رہا۔  
 ”عطربھی تو لگائیے یہ شرارت سے بولا اور جلیں ٹیڑھ لے لگا۔

”عطرب؟ عطرب؟“

”ہاں ناں صاحب۔ عطرب کی خوشبو بھی تو آتی ہے تصویر میں۔ یہ دیکھیے میرے پاس ہے“ اُس نے انگلیوں میں عطرب لے کے اُن کے کپڑوں میں لگانا شروع کیا اور بڑی مے تکلفی سے:

”رہنے دیجیے“ شمن نے جھلا کر اُس کا ماتھ جھٹک دیا۔  
 ”اچھا۔ اچھا صاحب بیٹھے اسٹول پر۔ ذرا اچھی طرح بیٹھیے اور وہ دونوں بیٹھ کر ادائیں لینے لگیں۔

”یوں بیٹھیے اور دوپٹے کو سنبھالیے۔ میرے خیال میں دوپٹے تو اُسار ہی دیجیے“ وہ کمرے سے زیادہ ان کے دوپٹے وغیرہ پر توجہ دے رہا تھا۔

”ہائے اللہ کتنا بہودہ فوٹو گرافر ہے“ شمن نے بلقیس کے کان میں کہا۔

”آپ کو تصویر کھینچنا ہو تو کھینچیے، ورنہ...“ وہ ہمت کر کے ڈانٹنے لگی۔

”مگر یہ آپ کے گال پر پاؤ ڈر...“ اُس نے شرارت سے مسکرا کر پیار سے بلقیس

کا گال چھوا اور سکرٹ کا دھواں بالکل اُن کے منہ پر چھوڑنے لگا۔

دونوں ایسی گھرائیں کر فوٹو گرافر کو شاید رحم آگیا اور وہ ہٹ گیا۔

”اچھا صاحب ریڈی“ دونوں ریڈی ہو گئیں۔ دو چار بار کپڑے میں سر ڈال

کر پھر بولا۔ ”ادھنوں۔ یہ آپ کے بال کیسے بنا رہے ہیں۔ لائیے میں ٹھیک کر دوں۔“

”آپ کو اس سے کیا؟ آپ تصویر کھینچ رہے ہیں یا۔ چلو شمن جلیں“

”ارے ارے، آپ تو خفا ہو گئیں۔ بیٹھے بھی شمن.... وہ معاف کیجیے گا۔ چہ، میں تو آپ کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ بالکل خراب آئے بال تو فوٹو گرافر کو الزام دیں گی آپ کہ تصویر بگاڑ کر رکھ دی اور کیا یہ وہ کچھ روٹھ سا گیا پھر وہ دونوں راضی ہو گئیں اور اُس نے اُن کی مٹھوٹیاں پکڑ پکڑ کر بال سنوارنا شروع کیے۔ بلقیس نے تھٹک کر اس کے سینے سے مرٹا لیا جسے وہ بڑی طرح بھیج کر بال بنا رہا تھا۔ وہ شرارت سے ہنس اُڑ شمن کی طرف چلا کہ اتنے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور مٹھوٹری سی دیر میں تیلی جا آدی اور آگئے شمن اور بلقیس کو ڈر گئے لگا۔

”ہم جاتے ہیں۔ آپ تصویر کھینچتے ہیں نہ بات...“

”تو جانیے۔ خدا حافظ!“ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

”ابن؟ یہ آپ؟“ نووار دبولہ، ”تشریف لائیے۔“

”ہم تصویر کھانے آئے تھے... مگر... اتنی دیر لگا دی۔“

”تو تشریف لائیے اندر۔ معاف کیجئے گا ذرا میں کھانا کھانے گیا تھا۔“

”اور۔ اور... وہ۔ وہ فوٹو گرافر جو ابھی ابھی یہاں تھا؟“

”جی میں ہی ہوں فوٹو گرافر۔ تو آئیے۔“ اس نے خزیہ اپنی کالی شیردانی کو دیکھ

کر کہا، ”آئیے تشریف لائیے۔“

”تو... وہ... کون تھا؟“ بلقیس ہکاٹی۔

”کون؟“

”دادہ... وہ حمید۔ ارے صاحب وہ تو کالج کے ایک صاحب ہیں،

پرنٹ لینے آئے تھے۔ آئیے اندر جانیے۔“ اُس نے بات ٹالنا چاہی۔

”ہیں؟“ بیوقوفوں کی طرح وہ ایک دوسرے کا منہ تھکنے لگیں۔

”آئیے پھر۔“ فوٹو گرافر نے اپنے اوزاروں سے کھڑکڑا کر فی شرع کی۔

”نہیں، اب ہم کل کھنوا میں گئے، آج دیر ہو گئی۔“

دونوں گجراٹوں نے ایک دوسرے کی دھڑکنے والی دھڑکنے دیکھ کر تھکے بیٹھ کر ان کی

تلاش میں سرگامی پر پہنچے کیسے پھر رہی تھی۔ یہ دونوں بلیں تو پرٹی ڈانٹ۔  
 ”مارے، اور ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے“ دونوں جھوٹ بولیں، اس  
 دن بلیقیں کی وجہ سے وہ بچ گئی ورنہ میٹر ان ان یہاں کو جاتی تھی۔ کتنی لڑکیاں روز  
 اسی طرح کھو کر مل جایا کرتی تھیں۔ اور مزہ بھی بڑا آتا ہے یوں جان بوجھ کر کھو  
 جانے میں۔ جی بھی تو نہیں چاہتا واپس ملنے کی کاش کسی طرح ساری عمر کے لیے اسی طرح  
 نمائشوں میں بٹھکتے پھرے اور میٹر میں نہ پکڑ سکیں۔

دوسرے دن وہ تصویر کھینچوانے نہ جاسکیں مگر نمائش میں وہی کوڑیا لہجہ برابری  
 آپس بھرتا شعر پڑھتا ان کے پیچھے لگا رہا۔ اسے ان دونوں کے نام تو معلوم ہی ہو گئے  
 تھے۔ شرارت میں وہ اپنے دوستوں کو شتم اور بلیقیں کہتا تو وہ فوراً اچپک کر جواب  
 دیتے: ”فولگرافر صاحب!“  
 ”آؤ شتم بندے خرمابیں“ ایک اترتا اور لڑکیوں کی نقل کر کے اپنے دوست  
 کو چھیڑتا۔

”ماں بلیقیں جلد تصویر کھینچوائیں“ دوسرا اٹھلا کر جواب دیتا۔  
 شتم اور بلیقیں جل جاتی مگر انھیں ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جب تک وہ ساتھ رہتے  
 وہ جلتی رہتیں مگر جیسے ہی وہ بچھڑ جاتے ان کی آنکھیں بے چینی سے تلاش کر کے  
 انھیں ڈھونڈ لاتی ہیں، اور پھر ڈھکے چھپے جگہ سے جانے لگتے۔ نمائش کے پھاٹک  
 کے پاس شتم اور بلیقیں کو ایک چھوکر۔ سے نے ایک بندل لا کر دیا کہ یہ وہ دکان پر  
 مہول آئی تھیں۔

”تمہارا ہوگا بلیقیں۔“

”نہیں تو! میں نے کچھ خریدا ہی نہیں۔ کھولو تو دیکھیں کیا ہے اس میں؟“  
 کھول کر دیکھا تو ٹانیاں! چاکلیٹ! اور مٹھائیاں! مارے خوشی کے چیخ  
 نکل گئی اور دونوں بندل پر ٹوٹ پڑیں۔ فوراً ان کی نگاہیں اٹھیں اور اس  
 کوڑیا نے کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ہلکی سی سر کی جنبش سے اس نے انھیں سلام کیا



اور فوراً دونوں جھوٹ گئیں۔ بلقیس نے رائے دی: ”پھینک دو“ مگر جھوک کا تقاضا ہوا یہ بیوقوفی ہو گئی۔ بورڈنگ میں حبیب خرچ ہی کتنا ملتا ہے۔ دونوں وہاں سے چل دیں۔ کچھ روکڑ کے بعد دونوں نے جلیوں میں مٹھائیاں بھرئیں۔

جب نمائش ختم ہو گئی تو شمن اور بلقیس کے نام عاشقانہ خط آئے۔ بڑے ہوتے پڑتے اگر بلقیس پرنسپل صاحبہ کو سب صاف صاف نہ بتا دیتی۔ ہاں تصویریں کھجوانے کا داقو گول کر گئیں۔ بات دب دبا گئی۔ بلقیس نے بتایا کہ غریب کوڑیا مار کتے ہی خط بھیج چکا ہے مگر سب پرنسپل صاحبہ نے مچاڑ کر بلا دیے۔ جب بات بہت بڑھی تو اٹھا کر سارے خط انہوں نے پی۔ وی۔ سی کو بھیج دیے۔ اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ کوڑیا مارے کا زہر بھی پھیکا پڑ گیا۔ رشید کو بھی اس معاملے کی خبر مل گئی اور اُس نے یہ بات اور لڑکوں میں پھیلا دی اور سارے لڑکوں نے مل کر نگوڑ مارے کوڑیا مارے کو نا کول چنے چوائے شروع کیے۔ بلقیس کی رائے تھی کہ خواہ مخواہ بچارے کو پریشان نہ کیا جائے، آخر اُس نے ایسا کیا جرم کیا تھا! اٹا اسی کا تو ہر طرح کا نقصان ہوا تھا!

سالانہ جلسے کا ڈرامہ ہوا تھا تو اُس کی تصویریں کھینچنے کے لیے رشید ہی کو بلا لیا گیا۔ ویسے ڈرامے کی ساری لڑکیاں اُس کے سامنے آتی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی بلا یا جاتا تو بیکار غل جھتا، جھلا کو اعتراض ہوتا۔

شمن لڑکا بنی تھی، اور مونچھیں لگا کر تو شرم کے مارے اس کا دم بکنے لگا بلقیس اُس کی مجبورہ روزانہ بنی تھی۔

”ارے بی بی یہ چھو کر اکون ہے پھر رشید نے حیرت سے پوچھا اور شمن اپنی تلوار پھینک کر جھاڑیوں میں چھپ گئی اور تصویر کھجوانے سے قطعی انکار کر دیا، مگر تصویر کھجوانا ضروری تھی اور اُسے مجبورہ روزانہ کا ماتھو چومنا تھا اور یہاں تو اُسے کھڑا ہونا ہی وبال معلوم ہو رہا تھا، ٹانگیں لرزی جاتی تھیں اور ماتھو ٹکڑے ہوتے۔

”ارے چھو کر سے ذرا پر سے مہٹ کر کھڑا ہو“ رشید نے کہا اور شمن چڑھا

کہ منمنائے لگی۔ بلقیس نے رشید کو ڈانٹا۔

”واہ، شمع تو ڈیوک کا بیٹا ہے، پھوکر اچھو کر کہے جاتے ہو۔“

”اچھا تو ڈیوک کے بیٹے تکبخت کی منجھن کی مونچھیں تھیں! خوب!“

”ہشت بھڑٹے، منجھن بھڑٹے کا جلی ہے۔“ بلقیس نے پیار سے شمع کی مونچھ

کو دیکھا۔

”ہائے بالکل تو اصلی لگ، مری ہیں۔“

اگر پرنسپل صاحبہ اگر نہ ڈانٹتیں تو مذاق کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ تصویریں کھینچتیں۔

”آپا بی اب کے ڈراما ہو تو ہمیں لڑکی بنائے گا؟ رشید نے پرنسپل صاحبہ سے کہا

”بھئی جب کالونچ لگا کر لڑکیاں مرد بن سکتی ہیں تو پھر میں کیوں نہیں لڑکی بن

سکتا، بھئی واہ!“

جب سب جانے لگے تو رشید نے جیکے سے شمع سے کہا، ”اے دیکھو جی میاں لڑکے، ہماری چٹائی اُدھار ہے، کہیں مبہم نہ کر جانا۔“ وہ منہ ہی روک کر تھکتا بیٹھا لگائی

(۱۸)

شمع اور رشید کا ارمان بیٹگیں بڑھاتا رہا۔ روزانہ بلقیس اُس کا ایک پرچہ شمع کو

لا کر دیتی۔ اُس پرچے میں کچھ بھی نہ پڑتا سوائے اُس پرانی چٹائی کے ارمان بھرے ذکر کے۔

اسے رشید شمع شمع یا میاں لڑکے لکھتا۔ سوائے رشید کے شمع کو کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ شمع شمع

امتحان میں وہ بڑی طرح فیل ہوئی اور گھنٹوں شرم سے روتی رہی۔ دعاؤں درجہ مل گیا حساب

میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھی، پرنسپل صاحبہ نے اسے یوشن دلوا دی۔ کہہ سن کر رشید ہی

اسے یوشن دینے پر مقرر کیا گیا۔ اور کوئی شریف و معقول آدمی ملتا ہی کہاں تھا!

یہ طالب علم اور معلم کا رشتہ بھی کس قدر رومان انگیز ہوتا ہے، بات بے بات

عشق اُبل پڑتا ہے۔ پڑھائی تو خاک بھی نہ ہوتی، شمع اور رشید گھنٹوں آسانی سے

باتیں کیا کرتے۔ جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے۔

پرٹھنے کے لیے شمع کو پرنسپل صاحبہ کے بنگلہ ہی پر جانا پڑتا۔ شام ہی سے بنگلہ اندر سبھا کا اکھاڑہ بننا شروع ہو جاتا۔ دوستوں کے بھگت شروع ہو جاتے۔ خاصا بے تکلف جمنا جس میں بے تکلف زندگی پر مباحثے ہوتے، انسانی حقوق پر لکچر دیئے جاتے۔ پانچ چاند کے ٹکڑوں کے گرد ستاروں کے پرے جیتے، ہندب اور لطیف معاشرے چلتے اور بنگلہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

ایک دن وہ اور بلقیس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رشید کی تازہ شراکتوں پر بات چیت کر رہی تھیں کہ پچاٹک کھلا اور کسی نئی لڑکی کا سامان آنا شروع ہوا۔ سامان بہت سا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ کبھی بہنیں آئی تھیں، مگر سامان کے ساتھ نہ کوئی نہ کوئی لڑکی تھی اور رشید گئے ہوئے تھے لہذا شمع بنگلہ پر نہیں گئی تھی۔

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ دو لڑکیوں کو لیے ہوئے اپنے دفتر میں چلی گئیں۔ لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو ان میں سے چھ سات سال کی تھی اور دوسری پندرہ سولہ کی۔ ان کے ریشمی ملبوسات اور فیشن سے متاثر ہو کر لڑکیاں ہلاسوں میں سے نکل نکل کر جھانکنے لگیں۔

کھانے پر پرنسپل صاحبہ نے بلقیس اور جلیس کو بلا کر ان دونوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا اور چاروں نہایت ہندب بنی بیگلے سے آیا ہوا کھانا میز کے صاف ترین کونے پر بیٹھی کھاتی رہیں۔ کھانے پر آج ویسے بھی ضرورت سے زیادہ صفائی تھی۔ ٹوٹے ہوئے ٹام چینی کے ڈونگے اور بے قلعی رکابیاں اس خاص میز پر نہ تھیں بلکہ نئی پلیٹیں، جو کبھی دعوتوں پر نکال لی جاتی تھیں، لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بھی بہت تھا۔ چونکہ جمعہ تھا اس لیے مکھن بچے ہوئے دودھ کی پھکی پھکی کیر بھی تھی۔ اتنے میں پرنسپل صاحبہ اور ایک لیم سٹیم سبیل بیگم نہایت زریں لباس پہنے داخل ہوئیں اور ان نئی لڑکیوں کے پاس جا کر باتیں کرنے لگیں۔ لڑکیوں کی کھسر بھسر سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی اماں جہاں تھیں۔

نوازد لڑکیوں کی اماں نے بھی کھانا چکھا اور منتظمین کی تعریف کرتی رہیں،

”ایسا مزے دار کھانا تو گھر پر بھی نہیں ملتا۔“ مرغی کھانوں کا اشتہار چربی کی پوٹ نوا بزا دی بولیں : ”لذیذ اور صحت بخش“ ”موٹاپے سے عاجز کباب پر پھول سے تنکی موٹی بیگم کی زبان میں اتنا احساس ہی کب رہا ہوگا جو کھانے کی اچھائی بُرائی پر کھ سکتیں۔“

کھانے کے درمیان ہی سے لڑکیاں اور بیگم پرنسپل کے ساتھ واپس جانے لگیں تو بلفیس اور بلیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

شام کو بلیس اُن دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے واپس آئی۔ وہ اب تک بھڑکیلے لباس پہنے تھیں اور ساتھ ساتھ بلفیس بھی ایک خوبصورت سا دوپٹہ اوڑھ ہوئے تھی۔ سارے وقت اُن لڑکیوں کے ہمراہ رہی۔ بورڈنگ میں تو یہ لڑکیاں کیا آئیں عجائبات آگئیں۔ اپنا کام پھوڑ چھاڑ ساری لڑکیاں دیکھنے ٹوٹ پڑیں۔ اتنی دیر میں ان کا کمرہ بھی سچ کر تیار ہو گیا تھا۔ علامہ خوبصورت مسہریوں کے سنگھار میز، جو نہایت ہی عجیب چیز معلوم ہوئی تھی، اور میز پر لمبے، قالین، غالیچے، مٹی پر دست غرض معادہ ہوتا تھا کہ جنگل میں کسی نے پھولوں سے لدا ہوا بھرا گلہ ستہ کھڑا کر دیا۔

شمن ان کے کمرے کے سامنے سے بھی نہ گزری۔ بورڈنگ میں جب سے اس کی بلیس سے دوستی ہوئی تھی وہ دوسری لڑکیوں سے بہت دور بٹ گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ کی منظور نظر ہو کر وہ سب کی نظروں سے گریز کی تھی۔ وہ اُسے خوشامدی، مغرور اور خود غرض سمجھنے لگی تھیں۔ آج جب بلیس نئے ہمالوں کی آؤ بھگت میں غرق تھی وہ بے سہارا اور تنہا لڑکی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانے پر بلیس لڑکیوں کے ساتھ تنگے پر چلی گئی اور مسکراتی ہوئی طبعی آمیز نظروں کے درمیان وہ خاموش اپنی جگہ بدبو دار سالن اور خشک چاد لٹکتی رہی۔

بلیس کچھ چیزیں لینے کمرے میں آئی تو شمن نے منہ پھلا کر شکایت کرنا چاہی مگر بلیس بڑی جلدی میں تھی۔

”اچھی نواب صاحب بھی آج آئے ہوئے ہیں۔ چہ حد خوبصورت کپڑے ہیں۔“

نہیسمہ نے مجھے زبردستی یہ دوپٹہ دے دیا۔ آپاٹی کا حکم ہے کہ لڑکیوں کا دل نہ گھبرانے۔ کوئی بات بھی ہے، کہتی ہیں پرسوں نواب صاحب کو پہنچانے والی تک چلو یہ وہ جلدی جلدی چیزیں سمیٹتی رہی۔

اور اور کو کو تو غضب کی پیادی ہے۔ رشید پر تو ندامت ہے۔ سارے دن کندھے پر چڑھ کر رہی یہ وہ ذرا جھپٹنی ہوئی کسی جلدی سے چل دی۔

دو چار روز کی چٹپٹائی آگئیں۔ بلقیس جلدی اُن لڑکیوں کے ساتھ ان کے مہرین کو خدا حافظ کہنے والی چلی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بھی بلقیس سے کوئی بات نہ ہوئی۔ رشید کسی میچ میں گیا ہوا تھا اس لیے شوق پھر نیگلے سے دور ہی رہی۔ پھر وہ پڑھنے لکھنے پر اس نے کچھ فضا بدلی پائی۔ حالانکہ رشید کو وہ تیس روپیہ آبا سے ہزاروں چالیں چل کر دلاتی تھی مگر وہاں آج اس طرح برتاؤ کیا جا رہا تھا گویا وہ کوئی یتیم لڑکی ہے جس پر رحم کھا کر وہ پڑھا دیا کرتا تھا۔ رشید موجود نہ تھا۔ وہ لڑکیاں زیادہ تر نیگلے پر ہی رہتیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی آہستہ آہستہ بورڈنگ سے اپنی چیزیں بین مین کر گھر لے جا رہی تھی۔ رشید آیا تو اس دن بالکل پڑھائی نہ ہوئی۔ اول تو نہیسمہ کے ساتھ کیرم کھیلنا تھا، دوسرے کو کو برابر کندھوں پر کھڑی رہتی تھی۔ علاوہ بلقیس اور جلدی کے قریب قریب ہر ایک فرد اُن لڑکیوں پر مگھیوں کی طرح چپکا ہوا تھا۔ ان دونوں نے تو جس دن سے وہ آئی تھیں اپنے کپڑے چھوڑ کر اُن کے ہی پہنے شروع کر دیئے تھے۔ پرنسپل صاحب تک کو زبردستی کر کے نہیسمہ نے اپنا شان کا ستارہ اُن کا دوپٹہ اوڑھا رکھا تھا نہیسمہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور اپنا زیور اور کپڑا اُنھیں پہنا کر ہی دم لیتی۔

نہیسمہ کی سنگھار میز جیسے کیسٹ کی دکان! بلقیس جلدی تو ہر وقت منہ پر الالہ پوتا کریں۔ سارے بورڈنگ کی لڑکیاں اُن کے کمروں پر بیچ اُن کی تعریفوں میں جھکا کر تھیں۔ نہیسمہ نے حقوڑے ہی دلوں میں میدان پر لوہا قبضہ کر لیا۔ قریب قریب ہر لڑکی پاؤ ڈر پیٹک، پروانے لشی جھیر، ددپٹے یا چپل کے احسان کے نیچے دب گئی۔ ان کے ساتھ اُن کی بچپن کی کھلائی بھی تھی جسے سارا بورڈنگ اُن کی نقل میں بے بے کہتا تھا۔ موٹی

چوڑی مرد مارسی عورت خوشامدی لڑکیوں کو ہزار دھتکاریں بتاتی پر وہ اُس کے قدم چومنے کو تیار نہ تھیں۔

نیسیمہ اور کوکو پربور ڈنگ کی کوئی یا بندی عائد نہ تھی۔ نوکروں کے رہنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان کے کہیں میں عجیوڑا پر لسل صاجہ نے دی۔ وہ لوگ کھانا اپنے کمرے میں کھاتے۔ کھانا تو خیر اُن کی ”بے بے“ خود اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی جینی کے برتن بھی اُن کے اپنے تھے۔ اُنھیں دو کمرے مع دو غسل خانوں اور اسباب کے کمرے کے ملے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا گھر تھا۔ اُن کے برآمدے کی طرف سے کسی کو گزرنے کی اجازت نہ تھی۔

جلد ہی سنگھ کا مرض پھیلنے لگا۔ غیب لڑکیوں نے لال رنگ کی روشنائی اور چار آلے والا پینڈیوں پر لگانے کا پوڑی ہی مقبوس کیا۔ جدھر دیکھو لال پیلے گال اور مصنوعی گھونگر والے بال نظر آتے۔ بجٹی کے آئے نہ ملے تو سلاخیں گیم کر کے ہی بال الجھالیے؛ پتے ستارے اور گولٹے نہ جڑ سے توپن اور چھوٹے پتر سے ہی چنکا لیے۔ ان لڑکیوں کی دہرے بورڈنگ میں بزانہ، چوڑی والے اور پھل والے کو بھی آنے کی اجازت مل گئی۔ اور کچھ نہیں تو قرض پر ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ کعبختوں کے پاس نہ جانے کہاں سے قاروں کا خزانہ اُن ٹوٹا تھا کہ سارے بورڈنگ کو قرض دینے کے بعد روزانہ ٹوکریوں پھل اور بندلوں بسکٹ آتے اور لنگر بیٹے۔ حملوے بنتے اور یارٹیاں ہوتیں۔ آج کو کو کی سا لگرہ ہے، سارے بورڈنگ کی دعوت، پرنسپل صاجہ کے خاندان بھر کی دعوت۔ آج نیسمہ کا جی گبرا رہا ہے، بلقیس کی سا لگرہ کی دعوت وہ خود کر رہی ہے مع سارے خیرے کے، اوپر سے بلقیس اللہ علیہ کو جوڑا مل رہا ہے، خیرات میں مرلے والیوں کا بھی بھلا ہو رہا ہے شمن اب حساب میں اتنی کمزور نہ رہی تھی جتنی نیسمہ اردو میں۔ اس نے ساری عمر کا نوینٹ میں گزار دی تھی، اب اس اسلامی اسکول کی عاقبت سدھارنے بھی گئی تھی۔ لہذا رشید اسے پچھتر روپیہ پر اردو، جغرافیہ اور حساب پڑھانے لگا۔

تھانہ لیسٹہ نویں جماعت میں تھی۔ گو اس کی انگریزی کئی استانیوں سے ابھی تھی اور اود میں دوسری جماعت کی بھی قابلیت نہ تھی، انگریزی کے گھنٹے میں وہ شمن کی کلاس میں بھی آجاتی۔ سوال سننے سے پہلے وہ جواب دے دیتی اور اتنا سمجھ کہ استانیوں کی باتیں کھل جاتیں، نیز دوسری لڑکیوں پر اور جوتا باری ہوتی۔ سارے وقت لیسٹہ یا کچھ کچھ بلیکس بولا کرتیں اور استانیوں میں شاہی دیا کرتیں۔ باقی کی لڑکیاں گھبرائی اور شرمندہ بیٹھی پھٹکا رہیں سنا کرتیں۔

یہی نہیں، کھیل کے میدان میں لیسٹہ نے سب کو چیت کر دیا۔ وہ کبھی اندھا دھند بھی کر جاتی۔ ہانڈ پوس بر نہایت تیز انگلش میں بونے لگتی جس پر ساری لڑکیاں جھجک جاتیں اور انگریزی کی مدرسہ لسانی اُس کی ساری گستاخیاں انگریزی کے پار سے جھلے سے معاف کر دیتیں۔ نہ جانے کیوں شمن نے پہلی نظر میں لیسٹہ کو دشمن کا عہدہ دے دیا تھا۔ ہر موقع پر اُس کی اور لیسٹہ کی ٹکڑ ہو جاتی۔ دولوں کی گستاخ فطری ٹکڑا تیں مگر جھجک جاتیں۔ اب بھی جب رشید ملتا اُس سے دوچار بیٹھی باتیں کہہ دیتا مگر وہ بات نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ بھرتا جا رہا ہے۔ پرنسپل کی نظروں سے بھی وہ اتر گئی تھی اور بورڈنگ میں تو اُس کی حیثیت تھی ہی ایک غیر جیسی۔ لوری تو جلیس کے ساتھ کو کو کا دم چھلا بن چکی تھی۔ عرض ایک بار پھر اسے ایک ناقابل بیان سنان تنہائی کا احساس ہوا اور اس شدت سے کہ اُس نے ہر چیز سے بے نادت کر دی۔

سب سے پہلے تو وہ کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔ لیسٹہ کی زبان تیز تھی مگر معلومات حنفی کے برابر تھیں۔ محفوظ سے ہی دن میں اُس نے لیسٹہ کی تنبی کا جواب بگڑی ہوئی حفظ کی ہوئی انگریزی میں دینا شروع کیا۔ پورے پورے صفحے رٹ کر اُس نے لیسٹہ کو چیت کر دیا۔ اڈیل گھوڑے کی طرح وہ پیر ہوا گھڑی ہو جاتی اور ساری مسکڑا ہٹوں اور تھپوں کا جواب وہ رکھتی ہوئی زبان میں دیتی رہی۔ اسے کھیل سے نفرت تھی مگر جلیتی دھوپ میں اُس نے شمن کی، یہاں تک کہ وہ کھیل میں بھی سوٹ کھائی شیرنی کی طرح سب پر حاوی ہو گئی۔

لیسٹہ کے احسانات تو غیر تھے ہی جاودہ کے منتر، شمن کی خدیں ہٹ دھرمیاں اور

گستاخیاں بھی برکار نہ گئیں۔ رفتہ رفتہ ساری وہ لڑکیاں جو کسی طرح نیسمہ کی نظروں سے اتر گئی تھیں شمن کے جھنڈے تلے آگئیں۔ نیسمہ کو اب بورڈنگ میں بہت کدقت گزارنے کو ملتا تھا کیونکہ اسکول سے آکر فوراً وہ اُردو کی کمزوری دور کرنے بنگلے پر چلی جاتی تھی۔ کوکو بھی اب وہ بھول جیسی گردیاں نہ رہی تھی۔ بے پے کے تو بس کی نہ تھی۔ بد تمیز بچوں کے گروہ میں ملی خاک دھول میں لوٹا کرتی اور وہ کوکو جیسے چور منے کے لیے لڑکیاں بے اختیار کلاسوں سے نکل پڑتی تھیں، اب چپیں کھا کر کمروں سے نکلتی۔ پھل بھی کچھ کم آنے لگے تھے کیونکہ زیادہ تر تو بنگلے پر چلے جاتے۔ نیسمہ تو زیادہ تر کھانا بھی وہیں کھاتی۔

شمن کمرے میں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اب اکیلی رہتی تھی۔ بلقیس کے جانے کے بعد اُس نے کسی کو نہ آلے دیا تھا۔ وہ ایک تقریر کو رٹنے میں مشغول تھی جو اُسے دوسرے دن کرنا تھی کہ اتنے میں بلقیس آئی۔ وہ کچھ شرمندہ اور پشیمان سی تھی۔ کسی کتاب کے ہانے سے وہ دیر تک میز ٹوٹتی رہی، پھر بٹھ گئی۔ شمن نے بات نہ کی تو خود ہی بولی ”لوٹری بگ میسری کھو گئی، ذرا اپنی دسے دو“ شمن نے کتاب اٹھا کر سامنے ڈال دی۔

”کل کے لیے تیار ہی کر لی؟“

”ہاں“

”لاؤ میں سن لوں“ بلقیس نے قریب آکر پیچ کی کاپی لے لی۔ شمن کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے، جی چاہا سائے کھری کھری، مگر بلقیس کی بھکی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

”چھ خدا قسم نیسمہ مر بھی جائے تو نہیں بول سکتی۔ پتہ ہے اُس نے ابھی تک نوٹ بھی تیار نہیں کیے ہیں۔“

”بھئی وہ تو بغیر نوٹ کے بول سکتی ہے۔“

”خاک بھی ہیں۔ رشید نے اتنی غضب کی تقریر تیار کر کے دی جناب نے پڑھی

”نہیں“



”دیر میری اور علی کی لڑائی ہو گئی“ وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

”ہیں؟ ہٹو!“

”سچ!“

”مگر؟“

”کیونکہ ہے! پتہ ہے تمہیں اتوار کو“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شمش نے بالکل تجسس

کا اظہار نہ کیا۔

”مجھے کہنے لگے کہ آٹھ پلیٹوں کا فلم ہے، چار سیمہ کی تصویریں کھینچ لینے دو پھر تمہاری۔ اور جناب بعد میں معلوم ہوا صرف چھ تھیں جن میں سے ایک جلیس نیکر پہن کر کچھوائے گی۔ جی ہاں گویا میں مرقی ہوں ان کے فلموں پر“

”ایک ہی فلم تھی“

”ہاں۔ کہنے لگے دہلی سے لانا پڑے گا۔ اور خدا قسم اتنی بھیہودہ ہوتی ہیں بعض

لڑکیاں یعنی رشید بیچارے نے جناب کی سینکڑوں تصویریں کھینچیں اور اب .... چہ حد ہے!، بلیقیس روٹھی ہو گئی۔ ”ایک لفظ نہیں پڑھتیں۔ آپا پی لے کہا تو فوراً دوہینے کی ٹیوشن کا چیک لا کر دے دیا۔ یہ آپا پی خدا قسم اتنی وہ ہیں، نہ جلتے کیوں دیتی ہیں؟ آپا پی غریب پانچ ہونوں اور ایک لاٹے بھائی کی اکیلی کفیل تھیں۔“

”تم بھی تو دیتی تھیں“ شمش نے کہہ ہی دیا۔

”جی ہاں، جوتی دیتی ہے چڑیل سے۔ ہنہ۔ وہی زبردستی کرتی تھیں۔ پتہ بھی ہے

یہی کہ اب کے اپنے گھر سُوری لے چلنے کو کہتی ہیں۔“

بلیقیس شمش سے روناؤ دیکھ چلی گئی۔ سہ پہر کو میٹروں سے نیسٹ کے لٹنے کی آواز سن کر

ساری لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بات یہ تھی کہ بڑا آدیا تھا اور پرنسپل صاحبہ کے حکم سے

لوٹا دیا گیا۔ میٹروں سے جو نیسٹہ نے کہا تو وہ مجھ ہی نظر کر لے گی جس پر نیسٹہ خوب بگڑی

مگر شکست ماننا پڑی۔ وہ باہر نکل کر جو کچھ خریدنا تھا خرید لائی، میٹروں چوں نہ کر سکی۔

شام کو مال کے سامنے لوٹن ناٹکا کیا کہ بورڈنگ میں کسی سودے دارے کو آنے کی

اجازت نہیں، خرید و فروخت صرف اتوار کو ہوگی اور بورڈنگ کے باہر کے کمرے میں۔ ساری لڑکیوں نے یہ طالع نامہ نوٹس پڑھا اور بڑبڑایں، گویا بڑی انہیں خریدائی کرنی تھی۔

تیسرے چوتھے دن شمن جو کمرے میں گئی تو بلقیس کو خاموش پلنگ پر لیٹے دیکھا۔ اسے دیکھ کر وہ خاموش کھتی رہی پھر منہ پھیر کر بستر پر اوندھی گز کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ہائیں مائی کیا ہوا؟“ آج بہت دن بعد شمن نے اُسے پیار سے پکارا۔  
 ”ہائے شمن!“ بلقیس اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ بڑی دیر تک وہ اُسے علیسی اور نسیمہ کے عشق کا حال بتاتی رہی۔ عیسیٰ۔ آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے میں بیٹھ چکا تھا اور اس کے باپ کی سفارش سے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور آج بلقیس نے جب اس کی دی ہوئی الیم اٹھا کر پھینک دی تو وہ اٹا بڑا مان گیا۔  
 ”بلقیس تم میری الیم لے لینا، نسیمہ نے اُسے چھڑا۔“ میں اب دوسری منگوا رہی ہوں پرس سے۔“

”بہنہ! گویا بلقیس کسی کی بیکار چیزیں جمع کیا کرتی ہے۔ اور پھر عیسیٰ نے معافی بھی تو نہیں مانگی۔ خیر وہ آج ہی عباس اور انصار کو چائے پر بلائے گی، شمن کو بھی چلنا ہو گا۔“

پرنسپل صاحبہ کے پرچہ پر شمن کو جانے کی اجازت مل گئی۔ آج خوب جھگڑا تھا بلقیس بہت سچی ہوئی تھی مگر نسیمہ نے خد میں کپڑے نہ بدلے تھے۔

رہی اس دوپٹے کے ساتھ کاجیر بھی لیشیں، میرا توجی کھٹا ہو گیا ہے چھی ہوئی جا رہی ہے۔ نسیمہ نے پچھوڑے پی سے سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ بلقیس اُسی کے ویلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بلقیس خون کا سا گھونٹ پی گئی مگر اُس کا پارہ چڑھ گیا جب اُس نے عباس اور انصار دونوں سے انگریزی شاعری پڑھاؤ بھٹ کر کے بلقیس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا۔

رشید نے شمن سے کچھ نہ کہا۔ اُس کی پتی میں کہیں سے ایسی باریک پھانس لگ گئی تھی کہ نکلتی ہی نہ تھی۔ شمن دیر تک اُس کی ٹاٹی پن کی مدد سے پھانس ڈھونڈتی رہی مگر نہ ملی۔ کھانے پر کچھ نسیمہ اور بلقیس میں تیز تیز جھلے چلے جن پر سب نے بلقیس ہی کو ڈانٹا۔ یہاں تک کہ انصار کابینہ بھی کہنے لگا کہ بلقیس بڑی کٹ جھتی کرتی ہے۔ بلقیس کھانا چھوڑ کر چلی گئی جس پر نسیمہ کو ہنسی آگئی۔

بورڈنگ جانے سے پہلے نسیمہ اور بلقیس میں پھر چرچ چل گئی۔ بیچ بچاؤ کروا دیا گیا مگر بلقیس کو پھر سب نے ڈانٹا۔ نسیمہ کے ساتھ شمن کو اُس نے جانے بھی نہ دیا۔ اور وہ اکیلی ہی چلی گئی۔ عیسیٰ ان عباس اور انصار ساتھ جانے کو بللاتے رہے مگر پریسل جٹا نے کہا کہ بورڈنگ کی حدود میں لڑکوں کا جانا ٹھیک نہیں۔

دو روز کہ بلقیس نے شمن کو رات کو اپنے کمرے میں رکھ لیا۔ بڑی دیر تک وہ اُس کا رونا روتی رہی۔ سونے سے پہلے رشید کسی کام سے کمرے میں آیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

”اچھی بجلی بچاتے جاؤ۔“ بلقیس نے اُٹھنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے رشید کی خوشامدی۔

وہ بجلی بچا کر اندھیرے میں بلقیس کی ناک پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی ناک چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس نے شمن کی چھٹکیا کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ شمن دیر تک سُنی بڑی جاگتی رہی۔

دوسرے دن کھانے کی چھٹی میں مال کے سامنے ڈسٹ ٹنگا تھا کہ بیگلے پر آنے کے لیے پہلے پریسل صاحبہ کی لکھی ہوئی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ معنی خیز نظر نسیمہ پر پڑ رہی تھیں اور سر جوڑ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شام کو ایک پوٹلی میں نسیمہ نسی دی ہوئی ساری چیزیں اُس کے کمرے پر بلقیس کا نوکر دے گیا۔ نسیمہ نے جھاڑو دیتی ہوئی مہترانی کو بلا کر پوٹلی جوں کی توں اُسے دے دی۔ نہ جانے کتنے جھلملاتے دوپٹے، کیسے، جوتے، بالیم، باؤٹل، کس کے ڈبے، بندے، انگوٹھیاں اور پنیں۔ لڑکیوں

کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہیں اور ہنراتنی سب کچھ سمیٹ گئی  
امتحانوں سے پہلے ہی گرمی کی وجہ سے جسم اور کوہپاڑ پر چلی گئیں اور یہ بھی معلوم  
ہوا کہ وہ اب نہ آئیں گی۔ اپنی کافر نیم غریب لڑکیوں میں بانٹنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔  
مگر وہ فریخ بچلے پر پہنچ گیا۔

(۱۹)

چھٹیاں آئیں تو گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ دیسے ہی گھر سے ناپسند تھا مگر اب کے پھیٹوں  
میں توجہ ہو گئی۔ نور سی سیدھی اپنی دوھیال ملی گئی۔ اس کا دل بڑی طرح گھبراتا۔ گودہ کئی  
مضانین میں کڑو رہتی مگر لٹ کر دیکھنے کو توجہ نہ دیتا۔ گھر دیسے کھڑا تھا اور دل خفا  
مچار رہتا تھا مگر شتم کا کوئی دوست نہ تھا۔ اُس کی ایک بھادج کے پچہ پٹوا۔ اس اودھم  
میں تنہائی خدا کو سو گئی مگر پھر بھی اُسے ہر چیز بے لگی۔ اودھوری اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی  
کالج میں ہر چیز کتنے انتظام سے ہوتی تھی۔ یہ عقور ٹی کہ ہر چیز شتم شتم  
بلقیس کا خط آیا اور اس کے ساتھ رشید کا پرچہ بھی۔ بڑے بھیا نے خط کھول کر  
دیکھ لیا اور بڑی لمبے دے مچی مگر شتم ایک چالاک! اُس نے کہہ دیا کہ یہ اُس کی سہیلی  
کے چھوٹے بھائی نے لکھا ہے، اور رشید لکھنا بھی تو بچوں جیسی باتیں تھا۔ اُس نے وہی  
اپنی پرانی ادھار کی چٹی مانگی تھی۔ بڑی نکلی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی بھیک!  
کچھ دن بعد بلقیس پہاڑ پر چلی گئی اور خط آنے بند ہو گئے۔ ایک خط سے اُسے  
معلوم ہوا کہ وہ اور بلقیس ٹینیس ٹال میں پڑھیں گی۔ اس کے بعد جب وہ کالج واپس گئی تو  
اسے معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ چلا گیا۔

شتم کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور بالکل  
بجلیاں پھیک روشن ہو گئیں۔ ان کی کمرت بدشمنی کی کوئی شاعریوں سے اُس کی آنکھیں  
پنہ جیا کر پھیک گئیں۔ خاموش اور خوفزدہ وہ سانس روک کر بیٹھ گئی۔ پچہ شرارت  
کرنے میں اُنکی کاٹ لینا ہے تو جھٹ اسے کرتے میں چھپائے سہا ہٹا کرنے میں دیکھ

جانا اسے شمن کے احساسات بھی دکھ اور شرم سے خوفزدہ ہو کر نہ جاسکے دل کے کس انسان کو نے میں اوندھے منہ جاگرسے۔ شاید ہمیشہ کے لیے!

بلیقہ کا خط آیا بھی تو اس میں رشید کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ بھی شاید اس کی طرح آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ جب کوئی اچانک کچھ دیر میں پھسل پڑتا ہے تو رحم دل جلد ہی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں تاکہ گرے والا چوڑا تو جی کھول کر سہلا سکے شمن دیا دہ مرہم پہی کی قابل نہ تھی، بڑی بے رحمی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اب گھر پر بھی دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے چھپے چوری سائیکل سیکھ لی اور بھائیوں سے بھی یہیم پڑھا نا شروع کیا۔ فوری جب وہ خیال سے آئی تو حد درجہ کچی ہو گئی تھی۔ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ چھپ چھپ کر اس نے عجیب و غریب کھڑے سینا سیکھ لیے تھے۔ حالانکہ اسے ابھی ان کی بالکل ضرورت نہ تھی مگر بڑے پُر امرار طریقوں سے پہنچے جاتے، میٹے ہوتے اور دھوکہ بند صند و قول میں سکھائے جاتے۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار کے بھائی سے محبت کرنا سیکھ آئی تھی جس کے نام کے پہلے حرف سے وہی بی کر شرمایا کرتی۔ شمن نے اسے رشید کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا، انداب بتانے کو رما بھی کیا تھا، وہ جان جان کر اسے بھائی رشید کہتی، لفظ بھائی پر غیر معمولی زور دے کر۔ بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی۔ بڑی کے میاں انھیں قتل کرنے پر تھے ہوئے تھے مگر وہ تو بڑی آپا سے دوسرے بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں۔ وہ تو گھڑی میں آن رہیں مگر لوگوں نے ایسا غل جپایا کہ حد ہیں۔ بجاری آپا رور دکر اپنے مرحوم میاں اور سسر کو کوستی رہی۔ عزیز بیگم سے سارے گھر کو نفرت تھی۔ بڑے لڑکے تو ان کا نام سن کر ہی چرواہہ جاتے۔ گودہ پردہ کرنے کے قابل نہ تھے۔ پھر بھی وہ ان سے چھپ چھپ کر انھیں یاد دلاتیں کہ وہ جوان ہو رہے ہیں لہذا خطر سے کیا حد د میں آچکے ہیں، اور چھوٹے ان کی مونچھوں سے جھینپتے تھے جنھیں وہ کند چھیناے کچھ یونہی سا چھد سا کر لیتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر شمن کو بے اختیار غمہ یاد آ جاتی، مگر صورت میں بہت بل تھا مگر بھانسنے کیا بات تھی جو دونوں میں موجود تھی۔ وہ بلی کی مسکراہٹ

جس میں غنودگی امد بیدار ہی ایک ساتھ ڈبکیاں کھاتی نظر آتیں، وہ پختی چھوٹی سی چال گرم گرم سانسیں اوردہٹکا ہوا رنگ!

اُسی زمانے میں شمع کی ایک خالہ کا لہو کا اجماد ان کے گھر میں آکر رہنے لگا۔ اعجاز کا باپ مرچکا تھا اور اماں نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ سوتیلا باپ اس کے حق میں سوت سے بدتر تھا۔ وہ اُسے اور خالہ دونوں کو بڑی طرح کوٹتا تھا اس لیے اسے یہاں بیٹھا دیا گیا۔ بچہ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز کو کوئی کس بات پر مار سکتا تھا۔ وہ عمو ماجپ چاپ اُن کی طرح بیٹھا بوسنے والوں کے ہونٹ کا کرتا۔ شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لوگ اراں کہتے ہیں کہ اُن کے پچھلے شریر نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ اُٹھتے۔ وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چادروں طرف آنکھیں دھڑایا کرتا۔ اُس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں مٹوکی، نریدی اور متحیر نظر آتیں بے پند ماننے سے اُس کی ہر جگہ کی جنبش سے التجا اور بھکاری ہی ٹپکتا۔ کھانے پر سب سے پہلے بغیر کادے پہنچ کر دسترخوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا اور بچوں کو قریب سے بہاتا۔ جب تخت کھانا شروع نہ ہو جاتا تو وہ صوبے سے بیٹھا بیٹھی میٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتا۔ ایک ہی شوق کے ساتھ اُس کی ہر چیز میں جگہ جگہ میں مل جاتا۔ نمک مزاج دکھائیں مٹھاس کے امتیاز سے بے نیاز ہر کھانے کی چیز اُسے مزے دار معلوم ہوتی۔ عمو ماجہ سب کے بعد کھانا ختم کرتا اور کچھ روٹی اور کاجی کی پور بھی کا برطاسا مقدمہ بنا کر منہ میں رکھ لیتا۔ یہ آخری مقدمہ وہ برطاسا انہماک سے دیر تک چباتا رہتا۔ ہاتھ منہ دھو لیتا لیکن کھانے کا وہ کام رکھنے کے لیے وہ کئی ہرگز نہ کرتا۔ ویسے منہ ہاتھ دھونے کی بھی اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صبح ہی صبح برقی دھونے کے نل سے منہ دھو کر بڑی نفاست سے کرتے کہے دامن سے منہ پر تھوکتا اور دھینچے میں پھر بھی نہایت غلط نظر آتا، گدلی اور مردہ رنگ اس کی جلد امد ٹپکے بال اور بچے کیڑے۔

گھر کے کام کاج میں وہ بالکل مستعدی دکھاتا۔ عمو ماجہ اپنے سے چھوٹوں کا کام کر دیتا۔ اُسے بچوں کو دانہ ڈالنے اور کتوں کو چھوٹے ٹکڑے کھلانے کا بہت شوق تھا

دستر خوانی سے سارا کوڑا سمیٹ کر وہ اعلیٰ کے کسی سنان کو نے میں مرغیوں اور کتوں کو پکار کر ڈال دیا، لیکن جلد ہی لوگوں کو اس کے اس شوق کی اصلیت معلوم ہو گئی کچھوں کو دینے سے پہلے وہ سالن گئے ہوئے ٹھکڑے، بچی بچائی ہڈی سے چھکی ہوئی بوٹی اور ایسی ہی دوسری کارآمد چیزیں منہ میں رکھ لیتا۔ اتنا کھانے پر بھی ایک طرح کی بے چینی ہو جی جس کی آنکھوں میں جھلک یا کرتی۔

اجماڑ کا پیاد کا نام اتھو تھا۔ نہ جانے کجنت پر کس کو پیار آتا ہو گا، مگر لوگ بچوں کے نام رکھتے وقت دوسروں کے احساسات کا حق تو سے خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑا دروازہ دار تھا۔ آبا کو انگریزی بالوں سے محنت نفرت تھی اور لڑکے سر منڈواتے وقت غدر بھا دیتے تھے مگر جیسے ہی نانی آکا اتھو اپنا بے ہنگم سر بے بیٹھتا اور مسکرا مسکرا کر منڈوا لیتا۔ انعام کے دو پیسے لے کر وہ کربندیں بڑی سی گانٹھ باندھ لیتا۔ مگر آبا کو یہ انعام دے کر بالکل خوش نہ ہوتا۔ اپنے اصول پر قائم تھے مگر اتھو کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر نفرت کی ایک لہر اُن کے دل میں بھی اٹھتی۔ سب کو اس کے سر سے نفرت تھی۔ بچنے میں ایک ہی نسخہ لینے رہنے سے اُس کا سر ایک طرف کیڑا لگے ہوئے خرگور سے کی طرح پھٹکا ہوا تھا۔ چپٹ کھا کر وہ خوش مزاجی سے منہں پڑتا، جس پر رحم کا جذبہ ذرا سراٹھاتا لیکن نوٹا ہی یہ رحم ایک غیر فانی نفرت میں تبدیل ہو جاتا۔

چھوٹے بڑے چلتے اور اس کا مذاق اڑاتے، نوکر گو کیاں دیتے اور برابر والے اس سے گھس کھاتے۔ اس پر طرہ یہ کہ جب شمن پیدا ہوئی تھی، تو خالد نے اتھو کے نام کا ٹھیکر سے میں روپیہ ڈال دیا تھا، ٹھیکر اتھو تھا نہیں کیونکہ شمن کے پیدا ہونے پر ہم اُن کی تھی مگر دہانی بات ہو گئی تھی۔ اماں بھی چپ ہو گئی تھیں کہ خالد کا دل نہ ٹوٹے۔ ماں غریب ہزار جانی سے بیٹے پر قربان تھیں۔ جب کوئی تھوڑا آکا وہ سنئے کپڑوں کا جوڑا اور تل کے لٹا دے کر آجاتیں۔ اتھو اچھا بیٹا ہی کر وہ لڈو پاندیاں کی مثال میں لے کر ہر ایک کے سامنے پیش کرتا، مگر سب کے انکار کر دینے پر سارے لڈو اسی کو نینگ لگانے پڑتے۔

علاوہ غریب ہونے کے خالد بد مذاق اور پُر اُکے فیش کی بھی تھیں۔ اتھے بڑے

گھوڑے کے لیے پھول دار کرتا اور لال ٹول کار مال لائیں۔ عید کے دن صبح تڑپ کے  
 ماں بیٹے اٹھ کر باسی بیچ پانی سے غسل فرماتے اور کورسے کھٹک دار کپڑے پہن کر توجہ  
 کو سلام کرنے اُن کے پھولوں پر پہنچ جاتا۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کی پوٹلی بغل میں دباؤ  
 ہنستی مسکراتی خالہ ہوتیں، مگر سب ہی تو اس خلل اندازی پر بڑا بڑا تے اور کوئی بھی  
 جی سے دعا نہ دیتا۔ اتو بڈنگ ہونا ایک سب کو بیٹیں ہی کہتا۔ تاش کھیلنے میں جب وہ  
 اسپید اور ڈائمنڈ کے بجائے وہی حکم اور اینٹ کہتا تو مچھلے بھیا کا خون گھول اٹھتا۔

”اتو کے بچے سلام کرنا پکڑ کر ادھر ادھر بھی“ اتو ناک پکڑ کر چاروں طرف  
 سلام کرتا۔ ”اتو اب ایک ٹانگ پکڑے ہو جلدی، جلدی“ وہ اسی کے گٹوں پر ٹھاک  
 سے پھڑکی مارتے ”نہ بھیا کیوں مارے گا اسے ہونگڑے کو نہ کھلیا تیں اور پھر  
 اتو سے خوشامدیں دوسرے بچوں کے بسترہ کروا تیں، بکھرے ہوئے جوتے سوزے  
 دکھواتیں۔ ایک پیسہ، ادھی چوٹی ہوئی آم کی گٹھلی، جھوٹے دودھ چاول لالچ دے کر اتو  
 سے ہر ممکن خدمت لی جاسکتی تھی، اور غریب بڑا دوں گٹھلیوں اور جھوٹی ہڈیوں کے نیچے  
 دبا ہوا کوڑا غلام کی طرح کام کرتا۔

جب شمشیں اتو کو دیکھتی تو وہ اُسے موٹی سی گستاخ کالی نظر آتا۔ اُس کے جذبات  
 کھول کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اُس کا جی چاہتا کسی کی بڑیاں دانتوں سے  
 چبا کر تھوک دے۔ اوپر سے عاقبت نا اندیش خالہ نے اتو کی گت دیکھ کر سوچا اگر منگنی  
 کا ذکر پھیر دیا جائے تو شاید آئندہ داماد سمجھ کر اس شدت سے آزار نہ پہنچایا جائے  
 لہذا وہ بیچ بھٹی میں بیٹھ کر ارمان بھری باتیں کرنے لگیں۔ سب دم بخود رہ گئے اور شمشیں کے  
 توڑن بدن میں چٹکاریاں چٹختے لگیں۔ مارے نفرت کے وہ اُس کے منہ پر تھوک بھی تو نہ  
 سکی۔ مگر اتو کو عجیب ہی اثر ہوا۔ وہ ہکا بکا تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر  
 ایک دم اُس کی پھڑکی پر نہ جانے جسم کی کھن رگوں سے خون جھلک آیا، اٹھ کر وہ  
 بچہ تھا شاہر بھاگ گیا۔

اُس دن سے شمشیں سے وہ بے طرح شرمایا اور بھینپنا سارے چنے لگا شمشیں کو دیکھ کر



وہ مفلوج سا ہو جاتا اور اگر وہ پاس سے بھی گزر جاتی تو وہ شل ہو جاتا۔ اس کی غیر فانی ہنر کے بعد یہ پہلا جذبہ تھا جو اس شدت سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا تو شمع کے پتے پتے گٹنے گٹنے۔ اُمیدوار مادوں کی کسی سنجیدہ شرم اور تکلف دیکھ کر اُس کا جی چاہتا اُس کے منہ پر جوتا مار دے اور بدترین جھگڑا اُس کی شان میں دہرائے۔ ایک اور بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اُس میں۔ وہ اُس کی چلبلی بیوقوفیاں جو وہ لوگوں کے خوش کرنے اور منہ سائے کو کیا کرتا تھا پھینک دیتا۔ گودہ شمع سے شریابا رہتا لیکن چھپ چھپ کر گھنٹوں اُس کی ہرجنبش کو گھورا کرتا۔

رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر برابر ڈال دیئے جاتے۔ اس کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمع کے قریب اڑا لیتا۔ کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے کیونکہ لوگ اُسے حدودِ جبر کا بیوقوف سمجھتے تھے، لیکن شمع کا ہی جی جانتا تھا۔ جب سب سو جاتے تو اس پر آہستہ آہستہ اُس کے پردوں میں اپنے پیر کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چمکیاں لیا کرتا۔ وہ اُسے ڈانٹ کر ڈور جھٹک دیتی مگر وہ سوتا بن جاتا اور رات کو اسے کھلتی تو اُسے اپنے پلنگ پر سو رہے سے بچد گئے معلوم ہوتے۔ شاید وہ ساری رات جاگتا کرتا تھا کیونکہ دم بھر کو شمع چین سے نہ سو پاتی، اس کا ماتھ پیر اُس کی پنڈلیاں ان کو سہلایا کرتا۔

”کیا ہے اس پر ہم مار دیں گے؟“ اُس نے کئی بار جوتا اٹھا کر مارا مگر کھڑا ہوا اس پر آہستہ آہستہ اُسے خوفزدہ کرنے لگا۔ وہ اُس سے بچنے کے لیے بوڑھی انا کی پٹی سے پٹا ملا کر سونے لگی اور دوسری طرف پلنگ دیوار سے اڑا لیتی اور اُسے دہی بادشاہ اور بادشاہ زازی کی بوسیدہ اور بد مزہ کہانیاں سننا کرتی۔ سنتی کیا خاک کہانیاں اُسے لٹی پڑی تھیں۔ پڑای ہوں، ماں کیا کرتی۔ اُس کے خیالات بہت دور کی بنیاد ہی دلچسپ ہلکی پھلکی کہانی کا تانا بانا جو اُس نے میں مشغول ہوتے۔ اس لطیف کہانی کی وہ ہیر نہی ہوئی اور ہیر نہ جانے کون کون تھا کس کی مجال تھی جو اس کی ان کہانیوں کا ہیر و بھنے سے اٹکا کر رہے۔ اُس نے ایک بار ”ہیر راجھا“ فلم دیکھا تھا۔ ہیر نے کیا

بھولے پن سے آٹھ چوٹی کھیلنے میں رہ گئے کو بکڑ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی دل دھڑکانے والی معصوم سی ملاقات اُس کی اور رشید کی ہوئی تھی۔ پلنگ میں جب... وہ...

وہ سو جاتی سائیں سائیں خواب اُسے بے بے پلنگ دے کر جھلاتے۔ ایک بار ہی اوپر چڑھتی چلی جا رہی ہے، پھر چڑھتی ہے اور پھسل پڑتی ہے۔ چٹکی چٹکی زمین اس کے پیروں کے نیچے گد گد یا کرتی چل چل کر بھاگ رہی ہے۔ وہی بلقیس کا کمرہ ادکیم کا تختہ۔ رشید بلقیس کے دوپٹے کا گھونگٹ کاڑھے ہیں۔ وہ پردہ کرتی رہے نارشید سے۔ رشید کی بے ایمان آنکھیں دوپٹے کی مہین چلیں میں سے جھانک رہی ہیں۔ وہ ما گئی، جیتا ہوا رشید اُس کی کلائی پکڑے دو انگلیوں کو ملائے جنہی مارنے کو تیار ہے۔ کہ ایک دم سے ٹھنڈی دم گھونٹنے والی خلا اُسے لپیٹ کر بھر کی طرح گھما ڈالتی ہے۔ گرم گرم پانی کی بے آواز دھاریں کندھوں اور کپٹیوں پر سے پھسلتی رشیدی چلی جا رہی ہیں کہ ایک دم سے وہ جاگ پڑتی۔ اوہ! اتوار کے بھوکے ماتھے!

دلی ہوئی خوفزدہ چیخ کے ساتھ وہ دیکھتی کہ اتوار کے سرمالے سے بھاگ کر پانی پینے کے مشکوں کے پاس بڑا مشغول نظر آ رہا ہے۔ وہ اُس کی لہرتی ہوئی پھٹکار کا کوئی جواب نہ دیتا اور پانی پی کر خاموش اپنے پلنگ پر جا کر تباہ گھنٹوں خوف سے شمتی کا پناہ کرتی، ہزاروں بغضیں جگہ بے جگہ جھنجھٹایا کرتی ہیں۔

نفرت میں خوف کا اور اضافہ ہو گیا۔ اتوار دن بھر تو بالکل معصوم دکھائی دیتا لیکن۔ لیکن رات کو بھوت کی طرح ڈراؤنا نظر آتا۔ اُس کی صورت اور بھی اس سے ہو چلی تھی۔ دن رات، مراد نہاٹے پڑھنے میں جتا رہتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ اُس کی وہ غیر فانی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کئی بار لالانے پردہ دسترخوان پر آتا، دو چار لقمے بے توجہی سے کھا کر چل دیتا۔ اب اُسے دودھ میں لسانہ، خرگوزدوں میں ہیک اور آموں میں گھٹاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میڈک میں رٹ رٹا کر وہ وظیفہ پانے لگا لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا جب کہ وہ رات کو شمن کے سرٹانے یا پانٹنی کھڑا اٹھ نہ آتا ہو۔ اب وہ ماتھے نہیں لگاتا تھا بلکہ بے چینی سے ٹھٹھا، گرک جاتا، جھکتا اور پھر

جھجک جاتا۔ ایک دن شمن کا دوپٹہ ہانگ کے نیچے لٹک رہا تھا، اُس نے جھجک کر اٹھایا پھر گہرا کر اُس کے اوپر ڈال دیا لیکن فوراً ہی وہ پکھٹانے لگا کہ آخر اُس نے جانا کیوں پھینک دیا دوپٹہ دوبارہ اٹھانے کی ساری کوشش اُس کے لرزتے ہونے ہاتھوں نے خاک میں ملا دی۔ شمن کو کھلبلاتا دیکھ کر وہ جلدی سے پانی پینے لگا۔

عموماً شمن جاگ بھی جاتی تو بڑی بڑی اس خاموش ڈرامے کو دیکھ کر تھی۔ جونہی اُسے دلیر ہوتا دکھیتی کر دٹ لے کر جانے کی دھمکی دیتی، گر وہ خوب جانتی تھی کہ اس میں اتنی مہمت نہ تھی کہ بیداری کا اعلان کر سکے۔ کر دٹ لے کر وہ کبھی بھی بڑبڑانے لگتی۔

”مر جائے، مر جائے، کاش، اب تو مر جائے“ وہ کچھ نہ سمجھتا اور جھجک کر اُس کے ہاتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگتا، مگر ایک دن تو شمن کے ضبط کا پیمانہ پھلک ہی گیا۔ ہمارے وہ گیلے بال کھولے سو گئے۔ رات کو اُسے ایسا معلوم ہوا کوئی اسے بالوں سے پکڑے جھرنکے دے رہا ہے۔ جھلک کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخیں مارنے لگی۔ اُس کی سانس رُک گئی، منہ پھٹا تھا مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ جب اُس کی آنکھ کھل تو اب تو اُس کے بالوں میں بھوکے کتے کی طرح منہ دیئے سسکاؤں سے رو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اب تو اُس نے زور سے چل اٹھا کر ماری۔ صبح کو اُس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر چپلی نہ ملی۔

”میں نے ناک کو کتے کے کھینچ ماری تھی، نہ جانے کدھر گئی“

”اُوں، کتا رات بھر بندھا رہا ہے، کتا کہاں سے آیا؟“ کسی نے کہا۔

”اسے شاید مری کھلی رہ گئی ہو، کوئی جھنجکی گتا ہو گا“

”ہاں جھنجکی ہی تھا۔ ایسا ڈراؤنا“ شمن نے سہارے پر چلنا شروع کیا۔

”یہ کتنے مونڈی کاٹے اٹھا بھی تو لے جاتے ہیں“

”کتے چپل کا کیا کریں گے؟“

”اے یو نہی اللہ مارے اٹھا لے جاتے ہیں۔ میری نئی دلی کی جوتی کلیم میاں

کی کینا اٹھا لے گئی، حرا خورد نے ساری چھپنی کر ڈالی“

بات ٹھنکتی ہوئی اسی طرح کہیں پہنچی مگر شمن کی الجھن نہ گئی۔ آخر جیل گئی کہاں؟ اُس دن سے ابجو کا پتہ نہ مل سکا۔ دوسرے چوتھے پر پہنچ گیا، شمن نے شکر کیا بکھوت سے جان تو چھوٹی۔ اس کے بعد اُس نے ابجو کو حد درجہ بے تعلقی اور اپنے پر پڑھنے لکھنے میں غرق دیکھا۔ ابجو تو کھا کر جیسے اُس کا پیٹ بھر گیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور شمن کے جالے میں دو چار دن رہ گئے تھے کہ ابجو کو سکول سے پیدل آتے میں ٹوٹ گیا۔ ویسے تو کسی کو پتہ نہ چلا لیکن شام کو جب اُسے سستی سے پرے رہنے پر ابانے ڈانٹ کر پڑوں میں پانی دینے کے لیے کہا تو لپک کر اٹھ بیٹھا، دو چار دن چلا بھی مگر پھر جھوم کر نہ میا پر آ رہا۔ دیکھا تو ایک سو پانچ بج رہا!

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے خدا نے اُس کی دعا قبول کر لی اور ابجو چلا۔ رات بھر اُسے بخارا اور نڈیان نے جھنجھوڑا اور دوسرا دن بھی بیہوشی میں گزیر گیا۔ ویسے ابجو کسی کی خبر نہیں رہتی لیکن اگر کوئی سمجھا ہو جائے تو گھر کو ڈٹ ڈٹ کر کے رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ اگر مرغی کی بھی ڈانٹ ٹوٹ جاتی تو ایک نہنگا مہرچ جاتا۔ ابجو کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ اٹھ کر بھاگتا۔ سارا گھر اُس کا ماتھا چھونے گیا مگر شمن نے جا کر جھانکا بھی نہیں۔ باری باری سب کی ڈولی لٹائی گئی تو شمن کو بھی جڑا جانا پڑا۔ وہ ارادہ کر کے گئی تھی کہ مراد کو ہاتھ بھی نہ لگائے گی مگر جب اُسے بے سدھ دیکھا تو ترس آگیا اور وہ برف کی ڈلی لے کر اُس کے سر پر گر گئے۔ سر میں سے بھیکے نکل رہے تھے، ہونٹ پر پڑائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے کونوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ ابجو کی حالت قابل رحم تھی۔ باہر برف کی تلیفیاں کھل رہی تھیں، شمن نندیدی نہ سہی پر جی تو لوٹ رہا تھا۔ اُس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر ابونے پانی کے لیے ہونٹ چبانا شروع کیے۔ اُس نے برف کی ڈلی لے کر اُس کے گرم گرم دیکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی، ہونٹ اُس کی انگلی سے چھو گئے، وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ابونے آنکھیں کھول دیں اور غیب سے آنکھیں جھپکا۔ اُسے دیکھتا رہا۔ ایک منہ سیسکا، ہنٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی شمن بھاگ کر جانے لگا۔

” شمع ” اُس نے ایک بار حلق سے کھانسنے کی کوشش کی مگر وہ باہر آکر ملائی گی برف کھانے لگی۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حلق جل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف کے پھلکے اُس کا گلا بھیجنے لگے۔ برف کی پیالی رکھ کر اُس نے اپنی انگلیوں کے پورے بھاپ سے گرم کرنا شروع کیے، جیسے کسی لاش کو چھو لینے سے اُن کا خون جم کر رہ گیا ہو۔

وہ کھڑے بینک پر پانی چھڑک کر پڑھی۔ جسم میں گرم گرم سلاخیں دھڑکتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہوتا۔ آج کو بخار سے جھلٹی ہوئی آواز اس کے کان میں سانپ کی چھنکار کی طرح رینگ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا اُس کے جذبات کیوں بے طرح اُٹھ تھیل ہوئے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن جب آج کو لستر بدلتے کے لیے اٹھایا گیا تو شمع کی کھوئی ہوئی چپل وہ دونوں ہاتھوں میں بھیجنے اندھا پر پا تھا۔ بخار اتر کر حرارتِ غریزی سے بھی پارہ لچھے گر گیا تھا اور آنکھیں پتھر اُچلی تھیں !

(۲۵)

سوتے سوتے جو آنکھ کھلی تو شمع نے گھر میں عجیب طرح کی چپل پہل دکھی، ایک لمبا بانس بے چراسی کمروں کے چالے لے رہا تھا اور مہترانی پر موری صاف نہ کرنے پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ بڑی آپا ناک پر کپڑا باندھے تختوں کے نیچے سے کوڑا نکلا رہی تھیں، اماں الماریاں کھول کر چینی کے برتن نکلا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کلکتہ والے چچا امی نے ہونہار سپوت عباس کے تشریف لا رہے تھے۔ عباس اکلوتے ہونے کے علاوہ انگلیٹ سے انجینیئری پاس کر کے آئے تھے۔ کلکتہ والے چچا حدودِ جہنم لائق اور نکمے تھے۔ مگر یہ اُن کا بیٹا نہ جانے کس طرح ہر نکل آیا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ لے کر انجینیئری پاس کر آیا چچا بچا کر کے دن پھر گئے۔ خاندان میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک خوفناک بھیت کی بیماری سی رہی۔ جہاں جا کر پڑ جاتے دھکے دے کر نکالے بغیر نہ نکلتے۔ اماں تو اُن سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ لڑکیاں یو جی دعا سلام کر کے چلی آتیں اور وہ نوکروں کی دھتکاریں اور

مذاق کا نشانہ بنے جب تک ہنس نہ سکتی تھی جسے رہتے ، پھر کہیں اور ٹھوکر میں کھانے چلے جاتے۔ عباس کو ایک ماسٹر نے رسم کھا کر رکھ لیا تھا اور آج جو وہ چمکتے ستارے کی طرح آنکھوں میں چمکا چھوڑ کر نکلے والیں آیا تو سارے خاندان کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ منجھلے اور چھوٹے ماموں اسٹیشن پر مار بھولے کر پہنچے۔ خالہ بی نے تو چار اسٹیشن پہلے ہی ناشتہ کا انتظام کر دیا تھا۔ شمشک کے یہاں چینی کے برتن اور چاندیاں قالین بچھنے لگے تھے اور کوٹھے کا کمرہ سمجھنے لگا۔

خیر خدا خدا کر کے عباس میاں مع اپنے بدتماش باب اور بھوڑاں اور چچا رو بہن فہمیدہ کے دو پہر کی گاڑی سے پہنچ ہی گئے۔ اماں نے عباس کو بھیج کر بھلے لگایا اور چچا کو ریح دے دیا۔

”اے فہمیدہ ماشاء اللہ کتنی بڑی ہو گئی یہ بڑی آیا اُسے پیار سے لپٹا کر بولیں، تم نوری کے ساتھ سونا، اچھا!“  
شمالہ بی جل کر کمرہ پر گئیں۔

”اُدی! بھلا اپنی عمر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر نوری کے پاس کیا جی لگے گا۔ اے بیٹی تم اپنی مینہ آپا کے ساتھ جاؤ، وہ تمہارا منہ ماتھ دھو لائیں گی۔ کیا کھڑی کھڑی تک رہی ہو منہ، اسے مینہ، بہن کو غسل خانے بلے جاؤ۔“

رہا آپا حیرت زدہ رہ گئی۔ اندھیرے کہ نہیں! داند بیوہ کا کسی کو خیال نہیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے خدا کا خیال کریں گے مگر فہمیدہ کو مینہ اور احمدی سب کی آنکھوں میں دھول چھونک کر لے اڑیں!

”اے شمش، عباس کے لیے گرم پانی بھجوا دیا ہو تاکہ ڈھٹا بنی بیٹی ہو، اماں نے ڈرتے ڈرتے کہا، بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔

”اے شمش خاک اتنا سوچیں گی۔ نوری؟ جاؤ تو ذرا میری بجلی کی انگلی پر پانی گرم کر کے اوپر لے جاؤ۔ بڑی آیا پولیس۔“

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ دھلا، انخر یہ عباسی صیاں کو لے کر اُدپر سے اُتر آئیں، سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔

چچا غریب تو بولا لگے اور سمجھے بھی نہیں کہ کیوں اتنی خاطر میں ہو رہی ہیں۔ بیچارے کو بڑی آنکس ہی محسوس ہوتی۔ وہ تو بیچارے المیہ خواشا ندوں کے عادی تھے، جب آتے تھے ڈیوڑھی میں پننگ ڈلوادیا جاتا تھا، وہیں سینی میں کھانا چلا جاتا۔ سانسے کہنے کی خواشا ندوں سے وہ ہول کھا گئے، پر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور لڑکے کم اور نکھڑا بول کھلا کر کبھی وہ عباس کے لیے ٹیٹہ کو پسند کرتے اور کبھی نوری پر رحم آجاتا، ٹیٹہ کی عمر جا رہی تھی تو نوری کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ یتیم تھی، کبھی بلقیس پر مہربان تو کبھی حسنا پر کبھی شمش پر عنا کی ہارش تو کبھی احمدی پر۔ الہ کالیس چلتا تو وہ ساری کی ساری لڑکیوں کو ایک دم بہا لیتے۔

وہ کسی کام کو کہتے تو سانسے گھر میں کھلبلی پڑ جاتی۔ مائیں لڑکیوں کو دوڑاتیں اور وہ بیچاریاں کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ایک مقابلہ ہو رہا تھا، گویا دیکھیں کون چچا چچی کو خاطر دے سے بے حال کر کے ٹرائی، یعنی عباس کو، جیت لے جاتا ہے بڑی آپانے تو ایک نئی ہی ترکیب نکالی، وہ یہ کہ نوری انگریزی کے جملوں کے معنی پوچھنے عباس کے سر پر سوار کر دی، مگر ٹیٹہ ماشاء اللہ خود ہوشیار تھیں اور عباس کی زیادہ تر توجہ اُن ہی کی طرف رہتی تھی۔ نوری کو وہ بچہ سمجھتے، شمش کو بد مذاق اور احمدی کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اس بیچاری کا نتیجہ تو صاف ظاہر تھا۔

ٹیٹہ بی کچھ لمبائی شرمائی عباس کے مذاق کا جواب دیتی رہتیں۔ اُن کے لیے سویر پڑنا شروع کر دیا تھا جسے خال بی بھی بنواتی جانتیں۔ بلقیس حد سے زیادہ شرمیلی تھی ہر ماں کے ہٹو کوں پر مجبور ہو کر بڑھتی اور کچھ کھینچ آتی۔ شام تاش بچلی کا جھاڑ ہوتا۔ چچا گالیاں بک بک کے پل باندھ دیتے۔ ایک دفعہ اسی طرح گالی بکنے پر ماں نے

اُن سے پردہ کر لیا تھا پر آج سب ہندوب بیڑیاں کھٹکھٹا کر منس پڑتیں۔ خالہ بی ٹکھے  
 کے پیچھے پہنہ چھپا کر مخی منبتیں۔ چچا خوب بے ایمانیاں کرتے مگر شریز پچھو سمجھ کر معاف  
 کر دیے جاتے پچھی اُجلی دیواروں پر پیک کی پچکاریاں مارتیں کہ اماں لمر لمر لمر لمر لمر لمر لمر  
 مگر کیا مجال تھی جو کوئی بول جائے۔ بات یہ تھی کہ عباس باوا اماں کے غلام تھے۔  
 یوں تو عباس ترقی نہ ہی ہے سب سے زیادہ متاثر تھے مگر جو نہی وہ کسی کام سے ہٹتی  
 وہ احمدی، شمش، باطنیس پر مہربان ہو جاتے۔ مذاق تو وہ سب ہی لڑاکیوں سے  
 کرتے اور اُن کے مذاق کا رُخ دیکھ کر ہی سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ ویسے  
 ٹہینہ سب سے بڑی تھیں اور پہلا حق ان کا تھا، یہاں تو بخت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ شمش  
 کے باپ کے احسانات چچا کی جان پر بہت تھے لہذا یہاں کی کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔  
 نورمی یتیم تھی اور یہاں خاندان والوں کی شرافت اور عباس کی عالی ظرفی کا سب  
 کو یقین تھا۔ پھر فیصلہ کیسے ہو گا؟ سب منتظر تھے۔

ویسے عباس بہت ہی دلچسپ تھے۔ جو نہی وہ اندر آتے لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے  
 سے جمع ہو جاتیں اور پھر یا تو ان کا ہٹن ٹوٹ جاتا جسے بلقیس، احمدی یا شمش مانگتیں  
 یا ٹہینہ کی چھٹکیا کے پاس والی انگلی میں لفظ نہ آنے والی پچانس چھب جاتی جو کسی سے  
 نہ نکلتی پر عباس کی طرح کھٹکا کرتی۔ جب عباس اس پچانس کو نکالتے تو انہیں ایسے  
 لیے جھلے سوجھتے کہ ٹہینہ پسینہ پسینہ ہو جاتا:

”بھئی اس شریر انگلی کا بس ایک علاج ہے یہ وہ جھنڈے۔“  
 ”جھلا کیا علاج ہے وہ؟“ وہ آپ کر دیجیے نا یہ ٹہینہ شرماتیں۔  
 ”اس کا علاج یہ ہے کہ ایک جھنگائی ہوئی انگریھی۔“  
 ”بیٹے! وہ شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی، خالہ کی ہاتھیں کھل جاتیں۔“  
 ”اچھا خیر لہیے، اب کچھ نہ کہوں گا۔“

اس کے علاوہ نورمی روز بروز انگریزی کے الفاظ میں کرمہ ہوتی جاتی۔ ٹہینہ  
 اپنا غم دھڑکے سے گھٹنے اور ڈانٹوں کے مارے نورمی کو لگے لیتی۔ چچا مریخ مسلم کھاتے



کھاتے اور دھوئے ہو گئے۔ بھیجی نے گاجر کا حلوہ اتنا لکھا کہ معدہ جواب دے گیا، فہیدہ کے دو پٹوں کو رنگتے اور چھتے نمینہ اور احمدی کے انگوٹھے سوچ گئے۔ سب سانس روکے، زرافہ میں غرق ممبر سے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھئے انڈنٹ کس کل بیٹھتا ہے، کس کی قسمت جاگتی ہے!

شمق کو عباس پسند تھے۔ اس لیے ہی نہیں کہ اُن کے بال گھنیرے یا سے اور آغیس خلائی تھیں بلکہ وہ منسا سے جوہیت تھے۔ بیٹھے بیٹھے کال میں ٹھکی بھر لینا ایک دم سے دردِ سر کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا یا ان بجائے ہاتھ کے منہ میں لینا اور لیتے وقت انگلی دانتوں سے دبائے کی کوشش کرنا، بھولے میں ران یا گھٹنا مسل دینا وغیرہ

جاڑوں کے دن سب رضائیاں اوڑھ کر بیٹھ جاتے اور ان رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بچلیوں کی طرح کوندتے۔ لڑکیوں کے گرد وہ میں نعھی نعھی لہر زبیل چل چل کر بکھ جاتیں۔ وہ دور ملتیں لیکن پھر سمٹ آتیں۔ کھر کے بزرگ بھی و بچوں کے منہ مذاق سے ذرا دور پان چھالید میں غرق بیٹھے رہتے مگر ان کے کان انھیں کی طرف لگے ہوتے۔

رات کو جب سب لڑکیاں کھسک کھسک کر نہیں تو عباس کی ڈالی چوٹی چنگاریاں دہک اُٹھتیں۔ سوائے نمینہ کے وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں اور ان کے دلوں میں ذما بھی تو رشک نہ تھا۔ گوپیوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشمہ کی بفسری کی سے پرنا چتیں، اور جب عباس راس رجانے کے لیے کھانے یا آرام کے کمرے میں آتا تو وہ سب کچھ مھول کر اُس کے گرد منڈلانے لگتیں، مگر نمینہ زیادہ تر فہیدہ کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ وہ اسے اکیلے میں بھابی کہہ کر چھپڑا کرتی تھی، نمینہ نے اسے سب کے سامنے کہنے کو منع کر دیا تھا۔ وہ اب عباس سے اور بھی زیادہ شرمائے لگی تھی۔ حالہ بی دن رات گو گھرو، لچکوں اور کڑوں کے ذکر کیا کرتیں، ان کی اندھیرا کر مڑی میں کچھ دن سے مراد آبادی اور تاجے کے برتنوں کی آواز گونجنے

لگی تھی۔۔۔ بڑی آپا بھی غافل نہ تھیں۔ انھوں نے چٹ پٹ چوہے ریتیاں تروا کر نئے فیش کے دست بند بنوانے شروع کر دیے تھے اور ہر وقت چینی کے ان صلوں کا ذکر کرتیں جو وہ بھلکتے یا مبدئی سے منکرانے والی تھیں۔ جو ابک دم سے سب کچھ ساتھ لے ہو گیا تو بیچاری مادرے ہولوں کے مرنے جا رہی تھی۔

شمن کی اماں دم سادھے ہوئے تھیں کیونکہ ذرا سی دیر میں بڑی آپا اپنے بے وقت مرنے والے میاں کو یاد کر کے ماتم شروع کر دیتی تھیں۔ نانی ہو کر نواسی کا بیٹا بن چھپی لیتیں؟ پھر بھی آپا:۔۔۔ احتیاطاً طعنے دیتی رہتی۔

”اے ہے لوگ یتیم بیوہ کا غریب چوسنے سے بھی نہیں چرکتے۔ اسے بھی دلوگوں، کو تو بہت مل جائیں گے، یتیم کو جڑ جائے تو بہت جانور۔ قرآن پاک میں بھی یہی لکھا ہے کہ یتیم یتیم بیوہ کا ستی، پھر:۔۔۔ مگر خالہ بی تو یہ باتیں سن کر بالکل بھولی انجانا بن جاتیں؟ وہ جہیز کی تیاری میں منہمک تھیں۔

اس کے علاوہ اور بھی قیاس آرائیاں ہوتیں، جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں لوگ موسم دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں اسی طرح بڑھی آپا خالہ بی سے اور چھٹی بھائی سے باتیں کرتیں۔

”ہمیں بی میری بات مانو یا نہ مانو پر دیکھ لینا وہ بھتیس سے تو کرنے کا نہیں۔ ہاں اپنی نوری۔۔۔ مہانی آپا کو خوش کرتیں۔

”اے بی تیل دیکھو تیل کا دھار دیکھو۔ تمہینہ تو کیا شمن سے ہی کوئے تو بہت جانور۔ بڑی آپا جواب دیتیں۔

”دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ ویسے تمہاری خالہ بچے جھاڑ کے پچھے تو پڑ گئی ہیں۔ اے کل آنکھ کے نشہ کا لحاف بنایا ہے کیا موانچھو دار ذالوی جیسا میں نے تو کہہ دیا ہے۔۔۔“

موضوع ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوڑ چکے، کبھی ایک

آگے تو کبھی دوسرا آگے۔ یا جیسے انڈو دیوہور رہا ہے، لوگ اپنی اپنی سی کرچکے ہیں، نیچے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ چچا چچی پیغام دے ہی نہیں چلے، اردن ہی منہ سے چھوٹے ہیں۔ کھایا پیا اور پیرپار کے سوٹھے، اور یہاں سب کی تیندیں حرام ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک کے دروازے پر باران کھڑی ہے مگر دولہا اندر قدم نہیں رکھ جکتا۔

ادھر عباس نے آنکھ مچولیاں کھیلنا شروع کر دی تھیں، بلقیس جب کھیلے پر آدے سے چھایا نکال رہی تھی تو نہ جانے عباس کدھر سے آن پہنچے اور بکرا لیا، بڑی تسکین سے بھاگی۔ اور پھر ایک دن شمن جو ایک دم ڈرائنگ روم میں چلی گئی تو وہ ٹہینہ خاتون کو گھیرے کھڑے تھے۔ ٹہینہ تو بھاگ گئی، پر جب شمن جانے لگی تو عباس اس لے ماتھ پکڑ لیا، ”کہو گی تو نہیں؟ کیوں شمن؟“

”کیوں نہیں کہوں گی۔ پٹھر جلیے ذرا،“ شمن نے ذرا شرارت سے کہا اور منہ سے۔ ”نہیں نہیں۔ دیکھو کبھی سے نہ کہنا۔ سنو۔۔۔“ اور وہ کوئی بہت ضروری بات سنانے اور قریب آگئے۔

”اچھا ابھی چھوڑ بیٹے تو، کسی سے نہ کہوں گی۔“ وہ اپنی جاں چھوڑا لے لگی۔  
”اولی ہوئی، قسم کھاؤ، ہمارے سر کی قسم کھاؤ پہلے۔“ عباس نے کھسیٹ کر اسے اور قریب کر لیا۔

”اچھا۔ اچھا آپ کے سر کی قسم، چھوڑ بیٹے۔“ وہ بوکھلائی۔  
”لیکن سنو تو یہ، اٹھو لے اسے بھیغیا جانا۔“

”شمن؟“ انہوں نے تڑپ کر بھاگتی ہوئی کچھلی کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔  
”دیر تک وہ جھٹلائی ہوئی مانتی رہی۔ عباس کے قرب سے نہ جانے کیوں اسے اتنی گھین آئی۔ وہ ان سے ندان کر سستی مٹی مگر دُور سے، یہ اتنے قریب کی چھلیں اسے بڑی کڑوی معلوم ہوئیں۔“

”کیوں؟“ وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عباس کے بال ٹھیک سے کتنے ملتے تھے۔ دیکھ

یقینہ بھی اُسی کی طرح نکالتے تھے مگر تہ بچہ کیا سیر فقی جس سے اُسے کہیں آئی؟ لوگ۔ ایک ہی چھپو منہ میں ڈال ڈال کر کھاتے ہوں تو ہی مبتلا ہی جاتا ہے۔ اس منہ کا لعاب اُس منہ میں بہا رہا! مقتدر ہی دیر ہی پہلے ٹیٹا نہ بھاگی تھی... اور...

عباس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور جانے کے خیال سے وہ اُداس ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بدول ہو جاتیں اور سارے بڑھے بوڑھے بھی سہم جاتے۔ وہ ایک ایک دن ٹال رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے لڑکیوں کو اندھیرے کے اُجالے گھیر رہا تھا۔ اور ادھر بھی چاروں طرف پٹھیکار کی کھنکھیں، دانے ڈالے جا رہے تھے، بھال پھینکے جا رہے تھے اور شکاری لاشوں کے آس میں بیٹھے تھے۔

شادی بیاہ کے دن رات چڑھے ہوئے مگر چچی اور چچا منہ میں گھٹنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ آخر خالہ بی کے صبر کا پیمانہ چھٹک ہی گیا۔ چچا کے جواب سے ایسا معلوم ہوا ایک آنہ بھی آئی اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کرتی چلی گئی۔ آئی۔ سی۔ ایس کا انٹر ویو ہوتا ہے۔ کامیاب طلبہ کیسے ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے مٹھائیاں بانٹتے ہیں، ہند۔ یونیورسٹی کی جاتی ہے اور جو بیچارے قسمت کے مارے رہ جاتے ہیں ان کے یہاں چھڑی ہوئی مورتی سی جو جاتی ہے، ہزاروں ارمانوں کا خون اور لاکھوں مشاغل کا قتل گاہ بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں مہر کو گونڈا ٹھانے والا نہ رہی کیونکہ آئی۔ سی۔ ایس کا عہدہ ہی توڑ دیا تو یہ ایک قومی اور ملکی سوچ کہلا سکتے گی۔ یہی ہوا کہ چچی کے چلنے سے پہلے سب کو عباس کی شادی کا زبانی بلا مارے دیا۔ اس شادی کا جو انگلیٹڈ جالے سے پہلے ہی ان ماسٹر صاحب کی لڑائی سے پہلے ہی ہو چکا تھی جنہوں نے عباس کو تعلیم دلوائی تھی۔ لڑائی کا ہی سہی تھوڑا اور غریب بھی مگر سکھ رہا بہت تھی!

سنگھڑ بھرنے نہ جانے تھے تہمیزوں، چوہہ سے ریتوں اور آنکھ کے نشہ کے لحاظوں پر  
 جیٹا دھیر دی۔ ایک دم اماں کو مرغیوں پر پار آنے لگا۔ گاجر کے حلوے ختم ہو کر عبادہ  
 نہ بنے۔ ہمشیدہ کو جو خالہ جوڑا دے رہی تھیں اُس کا درپٹہ نہ جانے کہاں کپڑوں کے  
 ٹھیکہ سے لگا ہوا تھا۔ اسی طرح اسی کو مہا گیا۔ دیوانہ وزیر پر یکایک کی جھکنا لگا۔

لمبے اور گہرے زخموں کی طرح دلوں کے پار ہوئے لگیں۔ چچا اور چچی ایک ضروری کام کی وجہ سے ٹوٹا روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے اور ٹینکے کے ہمسریا کے دورے پھر سے تازہ ہو گئے۔ لکھنؤ کی تہی سڑک پر سڑکی کی طرح ابھرائی اور ٹھیک ممانی بلقیس کو براہ نصیبی جلی کے خطابوں سے پکارنے لگیں۔

چچا اور چچی خوفناک چھوڑاں تبسیمی میں کھجوں میں چھوڑ گئے۔ چچی دو کیے مہتر میں سہولے سے بانڈھ لے گئیں اور فہرہ ٹینکے کے چاندی کے بندے اتارنا بھول گئی۔ چچا سارے تاش کے پتے ٹھیک میں سان گئے اور عباس؟ نہ جانے کتنی آہیں اور شب بیداریاں چند معصوم دلوں میں چھوڑ کر چل دیا۔

(۲۱)

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس کا داخلہ ایک امریکی مشنری کالج میں ہو گیا۔ اب مشن کو معلوم ہوا کہ دنیا کتنی لمبی چوڑی ہے؛ اب تک تو وہ جیسے اندے کی سطح پر رنگ رہی تھی چکنی بے رنگ اور لامتناہی مگر پھر بھی محدود، جتنا بھی چلے جاؤ وسعت ختم نہیں ہوتی، پھر بھی جہاں تھے وہیں۔ کالج میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ٹاکر گاڑی میں اڑی چلا آرہی تھی کہ جھکنا آگیا۔ اسے بہت جلد اس جھکنا کے غل غپناڑے میں ڈوب جانا پڑا۔ ادبی جلسے، دلچسپ لکچر، پرزور تقریریں، ہنگامہ خیز سیریاں اور قیامت انگیز عشق بازیاں۔ پہلی بات جو دریا کیاں بے تکلفی کی کرتی ہیں وہ عاشقوں اور جاہلینے والوں کی ہی ہوتی ہے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا بھاؤ اسی ذریعے سے معلوم کرتی ہیں۔ مثلاً میرٹھی پر ساری یونیورسٹی مرتی ہے، بلیا رائے پر سیاست کی پوری کلاس فدا ہے اور مکمل پرفیکشن کے پنڈت جی تین سال سے مر رہے ہیں، کشور پر فارسی کے استاد نیم جان تھے، باقی لڑکیوں پر بھی حصہ اسداں کے چچرے اور میرے بھائی اور پڑوسی فدا تھے۔ کم از کم کالج کی فضا میں تو ان کا یہی حصہ تھا۔ کالج کے قوانین بڑے سخت تھے۔ دیئے تو کسی کا سگا باپ بھی بغیر جہان میں کے ملنے نہیں دیا جاتا

تھا اس کے باوجود بھی عشق کا انتقام ساگر پر اٹھنا چاہیں مار رہا تھا اور اس معاملے میں چھلے ہوئے منہ اور سر طے ہوئے پیلے دانوں والی میڑوں کی بھی کچھ نہ چلتی تھی۔ ان میڑوں سے سب کو یہی بغض ملتی تھی۔ شاید جنگ عظیم میں ان کا عاشق مانا گیا تھا یا شاید چھوڑ چھا کر چل دیا اور غریب نے اس بہانے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ ہر لڑکی کے ماذ معلوم کرنے کی فکر میں لگی رہتیں۔ جہاں دس بجے اور اللہ کی بندی بجلی بج کر نہ لے سکے یہ سر پر سوار احمود دو دو گھنٹے پہلے سے سونے کی تیاریاں شروع کر رہی تھیں غسل کر کے منہ پر پائش کی جاتی، گنتی کے چاند بادل ایٹھ کر گئے زخم نہاسے جانتے اور ہی ٹھہر کر بٹی ہوئی فیلوں کی صورت میں ان کی پیشانی پر تھرکتے نظر آتے۔ ڈھیلے ڈھالا جاپانی ٹونا جس پر اڑدہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور بغیر ایڑی کی سیلیریں پہن کر جب وہ چلتیں تو ان کا ڈھلا ہوا جسم ایسے کلکلاتا گویا ان اڑدہوں میں جان پر طرہی ہے۔

باوجود انتہائی نفرت کے ہر لڑکی کو ان کی خوشامد میں اتوار کو ان کے مرحوم عاشق کی تصویر کی تعریف کرنا پڑتی۔ یہ تصویر ایک فوجی گورے کی تھی۔ نہایت کریم، فٹ بھر لمبا کرخت چہرہ اور اوپر کا تنگ ہونٹ دانتوں پر سے ایسے کھنچا ہوا جیسے کسی رختے میں دانت پس رہا ہے۔ منڈی بھری اور چھدرے بال۔ بیا لوجی کی لڑکیوں کا خیال تھا کہ میڑوں اور اس گورے کا بیچ مل جاتا تو یقیناً گھوڑے کی کوئی عجیب الخلقت قسم پیدا ہوتی۔

یہ میڑوں کسی لڑکی کو بغیر عاشق کے تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں حالانکہ خود بیماری نہیں تھیں۔ ایک دفعہ پریمیا کا سگا بھائی آیا تو وہ برآمد سے ہی میں کھڑی تھی، اجازت لینے کا خیال بھی نہ آیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی، بلکہ شہن کو بھی ساتھ گھیسے لے گئی۔

پیارا زیندر حد سے زیادہ بوکھلا یا ہوا رہا، پھر بھی جو نہی میڑوں کو تہہ چلا مانگتی ہوئی موقع واردات پر پہنچی۔ بہتیرا پریمیا نے کہا کہ وہ اس کا سگا بھائی ہے، دوسرے نہایت چھدرے مگر وہ نہ مانی اور رپورٹ کر دی۔ مگر پریمیا ایکسچینج پرزدہ، وہ دلوں

لگا یا کہ پریمیا بھی خاموش ہو گئیں۔ پہلے تو دو ملاقاتی کارڈ ڈھونڈ کر ان پر ملنے والوں کے نام لکھ گئے اور پھر ان پر شمن اور پریمیا کے سر پرستوں کے دستخط کرائے گئے جو ایک بی۔ اے کی لڑکی نے کر دیئے۔ ان کارڈوں کی رد سے شمن کو نہ صرف پریمیا کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی بلکہ وہ اُس کے گھر چھٹیوں میں جا کر دن رات رہ سکتی تھی۔ حالانکہ شمن اور پریمیا صرف دو ماہ سے کلاس فیلد تھیں لیکن ان کارڈوں پر لکھا تھا کہ ان کے والدین خاندانی دوست ہیں۔ یہ کارڈ پرنسپل کی میز پر چپکے سے رکھ دیئے جب پرنسپل آئیں تو پریمیا نے بڑی معصومیت سے کارڈوں کا ذکر کیا، بلکہ اخبار کے نیچے سے نکال کر ان کے ہاتھ میں پکڑا دیئے، الٹی میٹرم پر ڈانٹ پر ماری!

لہذا اتوار کو شمن پریمیا کے ساتھ اُس کے گھر گئی، نہ نیند کے ساتھ اور چھ سات دوست بھی تھے مگر پریمیا نے زبردستی کی اور موٹر باب بھر گئی۔ دوپہر کا وقت چھلکائی دھوپ، لڑکے پھلڈ پر بے جملے دے دے رہے تھے مگر شمن کے جسم میں ٹھنڈی چنگاریاں ریٹک رہی تھیں، عمر میں پہلی بار اتنے ڈھیر سے کھورے کوٹ، بڑے بڑے جوتے اور بے ضرورت مہیٹ اس سے اتنے قریب آئے تھے، شاید ان دونوں پر رعب ڈالنے کے لیے سب نرط کے اترا رہے تھے۔ وہ پریمیا سے بے حد بے شکایت تھے۔ ان میں سے ایک، جسے سب بوٹو کہہ رہے تھے، پریمیا کے شانے سے لگاؤ نگہ رہا تھا اور ہر جھکاوے کے ساتھ اُس کا سر پریمیا کے سینے پر آن کر تا جس پر پریمیا دانت پیس کر اس کے گھنے بالوں کے گچھے جھنجھوڑا لیتی۔ انور اُسے سمجھتا رہا۔ بازو پر اپنی تین دن کی مونڈی ہوئی موجھیں جھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہایت فراٹے سے نہ جانا۔ کیا اُوٹ پٹانگ قدم شمن کو سنانے میں سزق تھی۔ موٹر احاطے میں گھومتی ہوئی برآمدے کے سامنے ٹک گئی۔ بیٹھے بیٹھے جوڑ سُن ہو گئے تھے، ہر جی مشعل سے ٹانگیں کھینچ کھینچ کر نکالیں اور سب تہمتیں پھلتے اندر رہیں۔

شمن سب سے تھکے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ پریمیا کسی سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔

دوست چرخ چرخ کر ان دونوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے، آخر کو پریا پست ہو  
کہ صورت سے لڑھک پڑی!

دشا باش رائے صاحب! "نریندر نے حریف مخالف کی ہڈی ٹھٹھک کر کہا۔  
"اے شمن... رائے صاحب یہ ہے وہ شمن جو پریمانے تعارف کر آیا۔

"ہوں؟" وہ حشمے کے نیچے سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھما کر بولے، اُن کے  
ہونٹوں میں ایک مبہم سا سگا جھول رہا تھا، اور اس میں سے دھوئیں کی لمبی لمبی چپکیاں  
لے کر وہ ہونٹ کے کونے سے بائیک ڈھول کی صورت میں پھونک رہے تھے۔  
پاس ہی اسٹول پر نہنگوں کی طشتری اور بڑے بڑے پٹے سے تھے اور ساتھ ایک  
تھوڑی کی نامکمل تصویر دیوار پر چسپاں تھی

شمن آہستہ بپا کر غور سے انھیں دیکھنے لگی۔ خوب مضبوط مگر چھریا جسم، ادنیٰ قد  
اور پتے ہوئے سونے جیسا رنگ، اُس پر چاندی سے بھی زیادہ اچھے بالوں کا ڈھیرا  
یہ عجیب و غریب صورت دیکھ کر شمن ایسی بوکھلائی کہ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنی  
دیر سے انھیں گھور رہی ہے، کہ ایک دم سے رائے صاحب بولے:

"اے... کیا نام ہے اس لڑکی کا؟ کچھ بھلی ہی معلوم ہوتی ہے۔"

"شمن!، درتین گلے ایک دم چلائے۔

"چمن؟"

"نہیں، شمن!"

"ادھر آ... چمن!" رائے صاحب نے دھوئیں کی ڈوریاں بھونکتے ہوئے  
کہا۔ شمن اٹھ کر کھڑی۔ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے وہ اُس کے قریب آگئے اور ایسے  
شمن سے دیکھنے لگے گویا وہ کوئی عجیب و غریب جانور ہے۔ شرارت سے اُن کے  
چہرے کے چھوٹے چھوٹے غنیمات مسکرا رہے تھے اور بھڑکیں پھڑک رہی تھیں۔  
ایک دم سے انہوں نے اُس کی آنکھوں کے پونے کی گھنٹ کر دیکھے۔

دربان لگا لویہ انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمن نے بے ساختہ زبان نکال دی



جس پر ایک زور کا تہقہہ پڑا اور وہ گھبرا کر دو قدم بچھے بیٹھا آئی۔  
 ”کیا بات ہے، کچھ کہو کی معلوم ہوتی ہے۔ اسے پریمیا کچھ دانہ پانی تو ڈال  
 اس بیڑا بانی کے لیے۔ کیا ہے تیرا نام۔۔۔ چمن؟“  
 ”شمن، رائے صاحب!“ پریمیا چلائی۔

”شمن؟ یہ شمن کیا ہوتا ہے؟ بنیں ہم تو اسے چمن کہیں گے۔ اسے کھانے کو دو  
 کچھ اور سے بھر دو تو اتنی پیلی کیوں ہے؟ کیا تیرے پاس پوڈر سوڈا کچھ نہیں؟ ادھر آ۔“  
 اس سے پہلے کہ شمن کچھ سمجھتی رائے صاحب نے اس کے گالوں پر بربرس سے سرج رنگ  
 لگا دیا، کھسیا کر وہ ہتھیلیوں سے گال رگڑنے لگی۔  
 ”دو برط سے خواب ہیں آپ، بیٹھے پریمیا نے انھیں دھکیلی دیا اور شمن کو غسل خانے  
 میں لے گئی۔“

شام کو رائے صاحب اور سب لوگ تیرنے کے لیے حوض میں اترے۔ شمن کو  
 تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے وہ کنارے پر پانی میں بیڑا ڈال کر بیٹھ گئی۔ رائے صاحب دو  
 تین دفعہ اوپر سے کودے اور برطی ویرنگس تیراکی کے کمالات دکھاتے رہے کبھی چت  
 تیرنے تو کبھی بیٹھا اور کبھی دیر دیر تک پانی میں غوطہ کھاتا جاتے۔

”ارے یہ جل کوڑا کیسا بیٹھا ہے“ انھوں نے شمن کو کنارے پر پر لٹکائے دیکھ  
 کر جھپٹا۔ ”یہ پانی میں کیوں نہیں اترتی؟“ جب پریمیا نے بتایا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی  
 تو انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور غوطہ مار گئے۔ شمن حیرت سے منہ پھاڑے  
 پانی کو گھورتی رہی کہ اب نکلیں اور اب نکلیں کہ ایک دم سے سب چلائے۔  
 ”مگر۔ مگر۔“ اور شمن غوطہ آپ سے پانی میں! اور بدھو اس ہو کر رائے صاحب  
 کو ناخوئی سے کھڑے چنے لگی جو اسے ڈوبنے سے بچانے آئے تھے۔

”ہیں ہیں۔ ارے لڑچھے گی تو پھر مگر کو دے دوں گا یہ شمن کھسیا کر لبوڑنے  
 لگی اور سب کا ہنسنے ہنسنے بڑا حال ہو گیا۔  
 رات کو جلدی جلدی کھانا کھایا گیا، اس کے بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع

ہو گئے۔ سب کی رائے ہوئی کہ نالغ ہو۔ پہلے تو پریشانے اپنے تازہ سبق کا خطا ہرہ کیا۔ اور جب وہ تھک گئی تو سب چلائے: ”رائے صاحب، رائے صاحب“

پہلے تو رائے صاحب خاموش رہے، پھر انھوں نے سگار طشتری میں ڈال دیا اور لمبی کی طرف پشت کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ باجا بجا رہا اور وہ پاؤں جلانے دبا دبا کر گھومتے رہے، پھر آہستہ سے انھوں نے گڑا اتار کر ہوا میں اچھال دیا اور اپنے برصہ بازوؤں کو سہلاتے رہے، پھر شمع کا منہ حیرت کے مارے پھٹکا مچھٹا رہ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ مرے اور ان کا کسرتی جسم سرتال پر لہرانے لگا، جیسے کوئی سنگین بتہ یا ایک انگڑائی لے کر جھاک اٹھا ہو۔ مری بدن جو کچھ دیر پہلے قدرے بڑھا معلوم ہو رہا تھا کچھ ہوئے سار کی طرح بچ اٹھا۔ سڈول قبضوں کی بٹے پناہ خدیش، پنڈلیوں کا مضبوط غم اور چوڑے چکلے سینے کا حلال۔ معلوم ہوتا تھا سُر با جسے سے نہیں بلکہ ان اعضا کی لوحِ جنتش سے نکل رہے ہیں۔ انگلیوں کی حرکت، پیر کا دھماکا اور مچھلیوں کی ہر لرزش فخر بن کر پھیل گئی۔ پشت پر روشنی لمبی چاندی جیسے گھنے اور سمندر بالوں کو تریشے ہوئے سروں کی طرح منور کر رہا تھا۔ ایک دم جیسے طوفانی کی دھڑ تیز ہو گئی، ساڑ دو گن میں بھاگنے لگے، تہر و غضب کا پر حلال دیوتا پر اسرار دنیا سے نکل کر غنیمت و غضب کے کوڑے برسانے لگا۔ دھوم گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دیا دلوئے صاحب ایک ہیبت ناک پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سفید دھواں سمندر کے جھاگوں کی طرح قدموں میں لہریں لے رہی تھی۔ ان کے نقرے بال بال نکل ایسے معلوم رہے تھے جیسے پہاڑ کے پیچھے سورج طلوع ہو رہا ہو۔

ساندھ گئے، نالغ ختم ہو گیا مگر شمع کا دماغ ناچار رہا اور جب مذاق میں رائے صاحب نے دودھ سے ”ہو، کر کے اس کے آگے تالی بجائی تو بے ساختہ اس کی گھٹی سی بند ہو گئی اور اگر سب نہ ہنس پڑتے تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتی۔ وہ سیرانی سب کی صورتیں دیکھنے لگی اور پھر خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

”ڈر لوگ چوہیا! رائے صاحب نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر

جھگڑا ڈالا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”بول سیکھے گی تو جی؟“

شمن نے دانت نکال کر سر ہلادیا۔

”جنتہ! بڑی آئی سیکھنے والی۔ پر تیار اس چھو کری کو دیکھنا کہتی ہے ناچ سیکھے

گی۔ اسے بھی لانا تو ڈر لگا گی، میں ذرا اس کو ناچ سکھا دوں“

”میں کوئی بندر یا بول؟ واہ!“

”اوہو! بندر یا نہیں تو پھر کیا بھالو ہے؟ اچھا مٹھائی لا اور شاگرد بن جا“

”پہلے آپ سکھائیے تو پھر مٹھائی لاؤں گی“

”واہ! بھی خوب رہی۔ پچھتے فیس دو بھی تو ناچ سکھائیں کہ وہ دیکھے ہی؟ بس دو

بھینے میں میتری کی طرح ناچتے گئے گی“

”واہ میں تو آپ کی طرح۔۔۔ آپ۔۔۔“

”شمن! رائے صاحب نے میری تو مٹھائی مضم کر لی اور کچھ نہیں سکھایا۔“ پریرا بولی۔

”ارے شش، خاموش۔ ہاں کیا نام ہے لڑکی تیرا؟“ ”پچھ؟“ اچھا مٹھائی ہاں

دے بس تو اب کے چھٹی میں آکر ہمارے کہتے میں بٹن ٹانگ دے۔ اور ہم تجھے ناچ

سکھا دیں گے، سمجھی؟“

”ہاں؟“

”ہاں ہاں۔ سب کرتوں کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ جو پریرا ہے نا، ایک دم

روتی نکلتی! بس شوخی کرنا جانتی ہے۔“ پریرا اس تعریف پر اترا اٹھی اور رائے

صاحب کی گود میں لگ گئی۔

بٹن ٹانگ کر ناچ سیکھنے کا پکا وعدہ کر کے وہ پریرا کے ساتھ ہی ہوٹل لوٹ

آئی۔ راستے بھر وہ رائے صاحب کی باتیں دہرا کر منستی رہی۔ جسم کو پینٹنگ پر ڈال

کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آئی ہے۔ ناچ کے تاثر میں اب تک

اُس کی روح پھنسی ہوئی، پیچ و پیچ گھوم رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج اُس کا دل کسی

مقتا طیسی طاقت کے آگے ماتحتیاب دینیہ کو چاہتا تھا، آج اس کے دل میں عبودیت  
نویزگی کی طرح کھل رہی تھی۔

”راسے صاحب کا نام کیا ہے؟“ اُس نے مانپتی ہوئی آواز میں پریا سے پوچھا۔

”ارے، بھئی! میرے پتا جی ہیں راسے صاحب!“ پریا ہنسنے لگی۔

”مگر... مگر پریا!“ وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیوں؟“ اُس نے کروڑوں سے کہ پوچھا۔

”کچھ نہیں پریا۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”بھئی! نفیس راسے صاحب کہتے ہیں، انھیں سب سے پہلے صاحب کہتے ہیں۔“

بڑے اچھے ہیں، میرے اُد پر جازہ چھڑکتے ہیں۔“

شن چڑا گئی۔ اس کا جی پانا پریا کو ڈانٹے کہ وہ کیوں اُن سے جان چھڑا کر اتنی

ہے مگر پریا بات اسے انتہائی بے نیکی معلوم ہوئی، وہ خاموش اپنے سینے سے چپٹا۔

آگے چھپے چھپتی رہی۔ لوہے کے پلنگ کے دنگیاں سے ہوسے تاروں سے اکھرا اکھرا

نغمہ نکل کر اسے سوچنے میں مدد دینے لگا۔

(۲۲)

شام کو لڑکیاں اُد چنے اور چنے میاہ بدمراد رجمیر ہیں کر کالج کے میدان میں آزادانہ چھلانگیں

لگاتیں، مائی، میرے اور جو کھیا بہ بہ نہ نہ رانوں اور سڈول نیڈلیوں کو گھور گھور کر دیکھیں

سینکھتے، چوڑا ہاتھ بھی شام کو اسی وقت برآمد سے بھاڑتا۔ میرٹن کو اس مہتر سے

خاص عناد تھا۔ وہ اُن کے اسٹیل میں صفائی کرتا تھا اور بقول اُن کے نہایت ہی

بد معاش اور بد نظا تھا۔ زیادہ تر وہ اُسے ڈانٹتی ہی نظر آتیں۔ جب دیکھو جب ہو مشکل

کے سنسان کوئوں میں اُسے گھیرے ایک آدھ تار مکرٹائی کے جالے کا، دو چار ادارہ

تکے دکھا دکھا کر ڈانٹ رہی ہیں، مگر وہ بھی بلا کا نمدی تھا، سر تھکائے اپنے سفید

دانت، چمکایا کرتا۔ وہ اُس پر جھلا جھلا کر چڑھا ہی بیٹھتی تھیں مگر وہ انہیں ٹوٹی ہوئی

جھاڑ سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھتا۔ اُس کی جھاڑوں کے پھاٹوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ  
 کبھی کا اپنی دانست میں کوڑے کے ساتھ جھاڑ چکا ہے۔ پھر ان کا ڈھیٹ پن تھا کہ پھر  
 بھی ٹوٹی پڑتی تھیں۔ نہ معلوم اُسے دیکھ کر انہیں کیا ہو جاتا تھا۔ جب وہ لڑکیوں کو  
 گھورتا تو وہ بلبلا اُٹھتیں۔ اپنی چھوٹی سی مونڈھیا پر بیٹھ کر تاسف سے مبرا ہوتی۔ انہیں  
 تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رنگتی ہوئی بھی نہیں  
 محسوس کرتیں۔ وہ خود اپنا پھنسا ہوا فراک ادا کرتے ہوئے کہہ لے جو مونڈھیا کے  
 چاروں طرف پہاڑ کی چٹانوں کی طرح جھومتے رہتے تھے۔ میں مشغول رہتی۔ نہ جانے  
 اتنی نجیت و نزار مونڈھیا ان کا وزن کس طرح برداشت کر رہی تھی! وہ اس ظالمانہ  
 انداز سے اُس پر پہلو بدلتی گویا وہ چھوٹے مہتر پر سوار ہے۔ سے دسنے کی کوشش کر رہی ہیں  
 ان کا بس نہیں تھا ورنہ وہ اُس کی ہڈیاں چیر کر جھاڑو بنا ڈالتی یا اُس کے خون سے فرش  
 دھواڑالتیں۔ وہ اس کی بد معاشی کو منہ دوستان کی مذہبی تنگ نگاہی پر محمول کرتیں۔  
 ان کا خیال تھا کہ اگر وہ جیسا ہی ہو جائے تو یقیناً اُس کی سیاہ روج پاک ہو جائے۔  
 برطسے ماڈرنری کے انداز سے وہ لڑکیوں سے اُس کے چالی چلن کے بارے  
 میں گھما پھرا کر سوال کرتیں۔ انہیں چھپ کر جھانکتا تو نہیں؟ کہہ صاف کہتے ہیں  
 کوئی نخس انہیں سے تو نہیں کرتا؟ اس کی مسکراہٹ بڑی لرزہ خیز تھی۔ ایک مہتر تھا  
 نینتال میں، جہاں وہ پہلے پہل نوکر ہوئی تھیں، وہ اکیلے دوکیلے لڑکیوں کو پکڑ کر حرم  
 لیا کرتا تھا۔ ایک اور بھنگی جلیپور مشن اسکول میں انہیں ہاتھ میں چھپ کر دیکھا کرتا  
 تھا۔ پچھلی لوگ ہم لوگ کو بڑا حیران کرتے، ان کا عزت بھی بہت خراب کرتے ہیں۔  
 یہ تھے ساتے وقت ان کی دھنسی ہوئی بے رول آنکھیں گزشتہ زمانے کے جوان نعمت  
 کی یاد میں بھوک بھوک ہو جاتیں اور ہونٹوں پر شدت سے پسینہ چھوٹ نکلتا یا بیجاری  
 سفید دیوایاں بجائے وجہ قیادوں واسے کانہوں کے ان کانے بھنگیوں کے ہتھے  
 چھوڑ رہی تھیں۔ ان کی سیاہ روجوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے  
 میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں گھسے جاتیں۔ ان میموں کی یہ گت دیکھ کر رونے لگتا

کھڑے ہو جاتے۔ ایک خارج قوم ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستان کی پانگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہماری ہوئی اور شکستہ نظر آنے لگتی ہو وہ گلاب کو شرمادینے والی زرخیز بتیل میں ڈوبے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سوکھ جاتیں، وہ آسمان کی نیلا سٹ سے زیادہ شفاف آنکھیں سوکھنے والا ب میں سیاہ بینڈ گول کی طرح ابل آتیں، بال اور ٹیکس خزاں رسیدہ پتوں کی طرح غائب، جگہ بہ جگہ گوشت کے اُبھار، تنگ جوتوں میں سے ٹخنوں پر کے گوشت کے بھوتے ہوئے نوٹھڑے۔ یہ تھیں وہ چیزیں جو باقی رہ جاتیں۔ میرٹن جب ہندوستان آئی تھیں تو جنگ عظیم کی ٹو سے جھلسی ہوئی مگر نوخیز کلی تھیں۔ اور اب گو بھی کی پالاماری کا ٹھہ کی طرح بھری جاتی تھیں۔

بھنگی سے ان کی ایسی لاگ ڈانٹ بڑھی کہ ایک دن وہ چھتری سے کر اس پر پل پڑیں۔ اسے مار کر وہ پسینے میں شرابور روتی ہوئی کرسی پر گر گئیں۔ لڑکیوں کے ٹھٹھ کر کے پر ٹوٹے پرٹے۔ بظاہر سب ہمدردی ظاہر کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ان کے ہاتھ پر سہلاتی تاکہ ان کا جی ٹھکائے ہوتا۔ دوسرے ہوسٹل کی میرٹن کو خبر ہوئی اور وہ دوڑی ہوئی آئیں، لڑکیوں کو بھگایا اور ان کے جسم کو، جو ربڑ کے فیتوں اور ٹوریوں سے مصنوعی گڑبایا کی طرح جکڑا ہوا تھا، ذرا پھیلا یا تو ہوش ٹھکانے ہوئے علم نفسیات کی لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کر کے چمکتے لگانے لگیں۔ بات پر لپل تک پہنچی اور چھوٹے مہتر کو میرٹن بھون ہوسٹل میں بھیج دیا گیا۔

بیجاری معاملات کی اس الٹ پھر کے لیے بالکل تیار نہ تھیں اور نہایت بردباری سے سرلا کر کہتیں کہ پرسپل کو اپنے اس قیصلے پر بچتا نا پرٹے گا۔ ان کے دباؤ سے گل کر بھنگی ساری لڑکیوں کو خراب نہ کر دے تو بات نہیں!

چھوٹے بھنگی کے بجائے بڑھا ہنتر، جو یانی کا لچ کے زمانے سے کام کر رہا تھا، نشاط محل میں صفائی کرنے لگا۔ اُسے سب سمجھا رہے تھے۔ ڈاکو کو جیسی صورتہ سیارہ پھٹا رہ جیسی رنگت، شب بیداری اور بھنگ کی وجہ سے سرخ آنکھیں اور

آواز ایسی جیسی گہری سی بادلی میں کوئی مھوٹ گڑا گڑا رہا ہو۔ نہایت صاف اور مقطع وردی، رجب دار چال۔ میڑن جو کوئی بھی حکم دیتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔ جھانستے ہیں!، بھاری ہلیت زدہ ہو کر رہ جاتیں۔ لڑکیوں سے روٹا لسی آواز میں اپنی بے عزتی کا گلہ کرتیں۔ جو زیادہ جی بھرتا تو سارا عفتہ انھیں پرانا رشتہ کیلئے کسے چھلکے بے جگہ کیوں پھینکے؟ رومی کا غلجھجھ کر کے برطی کھنوج لگاتیں کہ اس پر کس لڑکے نے لکھا ہے۔ معلوم کر لینے کے بعد وہ سارے پرزے مع کوئی تنبیہ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر لگا دیتیں۔ لڑکیاں نوج ناچ کر پھینک دیتیں۔ ایک دفعہ خود پرنسپل نے جو دنیا بھر کی رومی بورڈ پر چکی دکھی تو غریب کو الٹی ڈانٹ بتائی۔

دنیا میں ان کی طرف ایک دوست نہیں؛ مس جو لیس۔ چھ فرٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قدر سپاٹ سینہ اور مردوں جیسے کٹے ہوئے بال! شید کرتی تھیں جو ان کی لائٹا بلی عادتوں کی وجہ سے درد و دن نہ ہوتا۔ یہ درزش اور کھیال کی تعلیم دیتی تھیں۔ نیک بخت اس زور سے گیند میں مٹ لگاتی تھیں کہ جی لڑا اٹھتا۔ نئی نئی لڑکیاں تو ان کے سامنے ٹانگیں کھلے چہرے پہنچتے شرماتیں۔ آواز پھٹی ہوئی جیسی پندرہ سو لہ برس کے لڑکے کی ہوتی ہے۔ میڑن اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتی تھیں اور جب کوئی سو بیڑا ان کا اور کوئی کپڑا اسیتیں تو جہاں جہاں لڑکیوں کو دکھاتیں۔ ذکر کرتے ہیں وہ ہمیشہ ڈیر مس جو لیس، ہی کہتیں، اور ان ڈیر مس جو لیس سے لڑکیوں کو ملتی بغض تھا۔ اول تو وہ سوائے درزش کے اسکا مات کے بہت کم بولتیں۔ شمن کو تو ان سے بات کرتے موت آتی۔ گڑا گڑا کرتی بھاری امرکین لہجے والی انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پلے نہ پڑتا درزش کرتے میں ذرا کسی نے غلطی کی اور دیوٹی نے چھپٹ کر لگا یا اک مٹکا!

ایک دن کیسیل کی نئی یونیفارم کے لیے مس جو لیس لڑکیوں کی ناپ لے رہی تھیں، شمن کو سخت گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ ایک ایک لڑکی اندر جاتی اور ناپ دے کر واپس لوٹ آتی۔ شمن کی جب باری آئی تو وہ چپکپاتی ہوئی دفن میں داخل ہوئی۔ مس جو لیس





باغ میں واقع تھا۔ نہایت صاف ستھرے خوبصورت کمرے اور سامنے کھلا میدان۔  
عام طور پر لڑکیاں اُتار کو غل غپاڑے سے بچنے کے لیے سات کے کمرے سے پہن کر  
ان کمروں میں ذرا سا بیماری کا بہانہ کر کے جا لیتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ کالج سے ملحق  
جو بونیورسٹی تھی وہاں کے لڑکے آتے جاتے ان کمروں کی کھڑکیوں کی طرف تالاکرتے  
تھے اور کئی گھنٹے بھی ان کھڑکیوں سے وابستہ تھے کچھ لڑکیاں بد معاش لڑکوں سے خداد  
ہولے سے پہلے ان ہی کمروں میں بیماری کا بہانہ بنا کر رہی تھیں۔

اسپتال کی فرس ایک سیاہ قام حبشی نژاد امریکی تھیں۔ پچھلے ہونے جسم کی  
ٹھنکنی سی عورت فرسوں کے سفید برائی لباس میں سنگ موسیٰ اور سنگ مرمر کا  
بنابنا مقبرہ معلوم ہوتی۔ عام طور پر ان کی گفتگو ان فرار ہونے والی لڑکیوں کے  
متعلق ہوتی جو بھاگنے سے پہلے ان کے زیر سایہ رہی تھیں۔ ہر لڑکی کو وہ اصولی صحبت  
سمجھاتے وقت جسم کی خوبصورتیاں قائم رکھنے کی اہمیت پر مدلل لکچر دیا کرتیں۔ "بوائےز  
کو گھیرنے کے تیر ہدف کھنچے تو انہیں ادب یاد دیتے۔

"پنڈلیوں کے بال فلاں پوڈر سے ڈاؤ تو موٹے نہیں نکلیں گے۔ کمرپے ساڑھی  
خوب کھینچ کر باندھو ایسے۔" وہ ساڑھی کو بالکل تہ بند کی طرح کس کر بتاتیں۔  
"اتنا تنگ باڈی مت پہنا کہ وہ سارا جسم تنگ جائے گا۔ انگلیش گرلز کو دیکھو  
وہ انگلیش گرلز کا ایسے ذکر کرتیں گویا انگریزوں نے صاف ہی مفتوحات ان منڈی ہوئی  
ٹانگوں اور چسپ باڈیوں کے ہی بل بوتے پر زیر کر رکھے ہیں۔ جسم سے بدبودور کرنے  
کی اور مختلف پوشیدہ دواؤں کے نام مفت بتایا کرتی تھیں مگر بجائے شکریہ گزار  
ہونے کے لڑکیاں اگلی چراغ پا ہو جاتیں۔

یہ فرس ہر وقت امریکی یعنی اپنے دسیں کی تعریفیں کیا کرتیں اور بڑے بڑے  
معزلین کا ایسے ذکر کرتی تھیں کہ ان کے سگے چچا ماموں تھے۔ عبادت کے لیے جب  
ساری لڑکیاں اور پرنسپل سر مشہور کھانے سے قبل جمع ہوتیں تو وہ بھی امریکی لڑکیوں  
کے پیچ میں کاتے تل کی طرح ملاحظت سے چمکا کرتیں۔ ان کی آنکھیں سفید چمڑی کی تھیں

کے غور سے اور بھی گڑا ہوں میں جا کر چمکنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کو اس معجزے سے متاثر کرنا چاہتی ہیں کہ دیکھو ہم سفیدی کے کتنے پاس بیٹھے ہوئے ہیں سفید میمیں بھی اپنے سر انداز سے یہی کہتی معلوم ہوتیں کہ لوگو دیکھو تم ہمیں اور عیش و عشرت گروہ ہم کتنے بند ہیں کہ کچھ ہو یا کوئی ہم ہر ایک کو پاس بٹھا لیتے ہیں۔ یہ دیکھو ہم اس لئے توڑے کے ساتھ کس خندہ پیشانی سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں اور تم ہمیں تک چوڑھا اور غور رکھتے ہو؟ نہ جانے یہ سفید توپیں سیاہ انسانوں کو انسان سمجھ کر اس کا احسان کس پر جتنا چاہتی ہیں اور کس دھوم سے اس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ انگلش چرچ جدا ہے اندوہاں کنوئیں اور ان کے ساتھ ہندوستانیوں کے بدلنے کی اجازت نہیں، مگر چینی میں ایک دفعہ باری سے سفید انسانی کا لے چرچ میں عبادت کر کے اُسے مقدس بنانے ضروری چلی جاتی۔ ہندوستانی لڑکیاں مارے غور اور احسان کے بوجھ کے گردنیں اکڑا کر عبادت گاہ میں داخل ہوتیں۔

شتم کی ایک عیسائی دوست ایلیا تھی۔ بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز۔ جنوبی ہند کی مخصوص پیکلیٹی رنگت، بھونرا ہے سیاہ بال اور سادھوؤں کی سی سرخ ڈور سے کھنچی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، اور اسے دنگ کے پکے جامن جیسے پھلے ہوئے ہونٹ اور ستا ہوا چہرہ۔ اُس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی سختیں اور دانت غیر معمولی نیلا ہٹ مائل سفید تھے جب وہ زور سے تہقہ لگاتی تو بہت سے دانت چمک اُٹھتے جو ہر سے دما دما رہا زہریلے معلوم ہوتے۔ لڑکیاں اُس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیا کرتیں۔ گو وہ عیسائی تھی لیکن گرجے بہت کم جاتی، اور اگر جاتی بھی تو صرف دوا کوئی کے ساتھ مل کر حمد گانے۔ اُس کی آواز بہت رسیلی تھی اور گانے کا بہت شوق تھا۔ غسل کرتے وقت وہ پوری آواز سے اوٹ پٹانگ گیت گایا کرتی۔ اُس کے کمرے میں بجائے یسوع کے کرسٹ کی تصویر پر لگی تھی جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی: مجھے سفید رنگت سے گھنی آتی ہے اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے، اور حکم کے ساتھ

عقیدت کا جذبہ مجاہد نے عبودیت کے دل میں بنیادوں کی آرزو پیدا کر دیا ہے، دوسری طرف ہنٹے کھیلنے بھڑکی جاتی کو دیکھ کر دل ناچ اٹھتا ہے۔

پھر ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن کی تصویر تو نکالی کہ بھونک دی اور اس کے بجائے وہ تصویر لگا لی جس میں ایک بندر پیر پر بیٹھا کیا کیا رہا تھا، وہ بندر نیچے سے ایک لکڑی اُس کی پیٹھ میں چھب رہا تھا اور پہلے بندر کا آدھا گویا ہوا کیلا زمین پر گر رہا تھا جس پر نیچے والا بندر مسکرا رہا تھا۔ جب لکڑیوں نے اُس سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص تقبیہ لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔

”کرشن جی کی بھڑکی کو کیڑا لگا گیا تھا، اُس میں سے مینڈک، طرطرا رہا تھا۔ وہ ہانکتی، ”کھن کھن کا برطاشو تین تھانا، معلوم ہوتا ہے حقوڑا کھن بھڑکی میں لگا رہ گیا۔ سو دیک چاٹ گئی۔“ اور پھر وہ منہ چڑا کر کہتی: ”بھائیوں سو اے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا؟ سنا ہے بیاہی عورتیں زیادہ پسند تھیں۔“

اس پر لکڑیوں نے اس کی بُری تمنا بنائی، ”پرنس سے شکایت کر دی۔ یہی نہیں، وہ کئی بار شمن سے لکھ پڑی، ”یہ سب بیخبر عورتوں پر کیوں فدا تھتے؟ یوں تو میری ہشتم بھی بیخبر تھا۔۔۔“ مگر شمن عرصے سے بے قابو ہو گئی اور اسے نکل آئے، اٹھائے نہ خائونہ معافی مانگ لی۔

تین چار دن بعد بندروں کی تصویر میں تیسرا ہوا، پیر پر بیٹھا ہوا بندر جہاں بل بن گیا اور نیچے والے نے دھوئی پہن لی اور ہاتھ سے چھوڑ کر گرتا ہوا کیلا ہندو کا نقشہ برہ گیا۔

ایک کوڑا تنگ بہت بڑی آتی تھی مگر وہ اس بقیدی تصویر میں نت نئی نگار یا دکھاتی اور اپنے نیلگوں دھار دار دانت کھول کر لمبے لمبے تقبیہ لگاتی۔

اُس کی بیہودہ گوئی اُس قدر بڑھی کہ ایک دن لکڑیوں نے سُختی سے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ دینک وہ اُس سے بحث کرتی رہی، حبیبہ دفتر سے نکل کر بہت خفا ہوئی۔

۱۔ اسے اس دیکھ کر اس کا جی کڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ پرنسپل نے کہا ہے کہ اگر اسٹنڈہ اس کے متعلق شکایت سی گئی تو لٹریٹیشن کر دیا جائے گا اور وہ باقاعدہ عبادت میں شریک نہ ہوئی تو ہوسٹل سے نکال دی جائے گی۔ گوشتن کو اس کی باتوں سے ڈر معلوم ہوتا تھا پھر بھی وہ اسے سمجھاتی رہی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے بعد ایتھانے کالج چھوڑ دیا اور یونیورسٹی چلی گئی۔ وہیں کینڈاش ہوسٹل، جو یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لئے خاص طور پر کھولا گیا تھا چلی گئی ہ مگر اکثر وہ شمشن کے پاس آیا کرتی۔

شمشن کو اس نے کچھ خشک سی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں مگر ان میں اس کا قطعی جی نہ لگا۔ ایتھانے یونیورسٹی میں جا کر جیک اٹھی کلاس میں اول رہنے کے علاوہ اسے یونین کا پریزڈنٹ بھی بنا دیا گیا جہاں وہ ہنگامہ خیز تقریریں سے لڑاکوں اور پروفیسروں پر چھا گئی۔

(۲۳)

اسکول اور کالج میں لٹنا لٹنا چھوڑا فرق ہے کہاں ایک مسلم درس گاہ اور کہاں امریکن مشن کالج! کہاں تو یہ حال کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سیواہ شیروانی اور نرنگی ٹی پی ہیں کہ آجائے تو لڑکیوں کو دور سے پڑ جائیں اور تھلک مچ جائے، جرمانے ہوئے پھر اسکول اور کہاں یہ کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوئے ہی تھی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے لڑاکوں سے مہذب طریقے پر ملایا جاتا اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی، پرنسپل اور استانیان اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے ملاتیں، پھوٹو پر دیر سا وقفہ رہتیں اور پھر ان کو بے تکلف باتیں کرنے کے لیے چھوڑ جاتیں۔ اس جلسے کی بڑی زوردار تیاریاں ہوتیں، چائے پانی کے علاوہ ڈرامے اور ناچ گانے کا بھی ایک پروگرام تیار کیا جاتا، لڑکیاں بھی کپڑوں لٹوں کا انتظام کرتیں، خوب شاندار جوڑے تیار کر لیتے جاتے۔

نئی لڑکیاں تو جلسے کی دہشت سے ہی بے حال ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سخت عیب کی بات ہونے والی ہے۔ بہت سی تو اپنے گروں پر اس کا ذکر ہی نہ کرتیں۔

بلکہ جیسے چوری سی گناہ کر لیتیں۔ پرانی لڑکیاں ان کا مذاق اڑاتیں؛  
 ”سنو شمن تمہیں اپنے ساتھی کا پیار لینا ہوگا“ پریم نے شرارت سے کہا۔  
 ”ہائے!“ شمن کو پسینہ آیا۔

”اور کیا، پیار تو لینا ہی ہوتا ہے اور پھر دوسرے دن پرنسپل کو ایک پرچے پر لکھ  
 کر دینا ہوتا ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کا پیار لیا“ اور دس گے تائید کی۔  
 ”ہاں، اور پھر جس نے سب سے زیادہ پیار لیا ہے ہوں اس کو انعام ملتا ہے۔“  
 ”اور... اور جو نہ لے تو؟“

”جو نہ لے تو اس کو جرمانہ، اور سالانہ رپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی بالکل کمزور  
 ہے، خراب!“

مار سے پریشانی کے شمن کی نیند اڑ گئی۔ جو ابامیاں کے پاس سالانہ رپورٹ پہنچا رہی تھیں۔  
 اور انہوں نے دیکھا تو بس خیر نہیں۔ نہ جانے کن مصیبتوں اور سفارشوں سے تو بھیجا تھا اور  
 وہ تو یہی کہتے تھے کہ اسی کالج کی کلاس میں کھلوانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ دوسرے محیط  
 بچیاں جب سے انگلینڈ سے آئے تھے تعلیم نسواں کے حشر سے زیادہ خلاف ہو گئے تھے یہ  
 الٹی ہی بات تھی۔ حمید بھائی نے انگلینڈ سے آکر بوڑھی نانی تک کا پردہ تراوا دیا۔ بیچا ہی  
 ہزار بڑ بڑاتیں نکھوں کی آہ لیتیں مگر بھنگی، بہشتی، باورچی سب ہی گھر میں آتے۔ جو ان  
 جوان بہنیں مزے سے لیٹی بچوں کو دودھ پلایا کرتیں، خالہ اماں ٹیٹھی خوب آرام سے  
 لکھوایا کرتیں، اور نیم اماں نہایت بے تکلفی سے لیٹی چودہ پندرہ برس کی میرا سے انیس دلوں  
 بوڑھی نانی لرزتیں اور مقرر تیں۔ بہشتی، بھنگی پیٹے لنگی سر پر ڈال کر آتے تھے اب یہ خود بچا ہی  
 گونگٹ کا ٹھکانہ لیتیں۔

”نانی اماں اتنی بوڑھی ہو گئیں مگر مردوں سے شرمانا نہ چھوڑا۔“ حمید بھائی چڑا رہے تھے۔  
 اور نانی غریب، مڑ مڑا صورت دیکھتیں۔

مگر محیط بھیا نہ جانے کن متعصن موریوں کی غلاظت میں ہولی کھیل کر آئے تھے۔  
 کہ اور زیادہ پردے کے حامی ہو گئے تھے۔ خاندان کی سب سے بیوقوف اور بے ہنگم

لوٹ کی سے شادی طے کی اور شمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کیا۔

بکرے کی مال کب تک خیر منائی! جلسے کا دن بھی آ ہی گیا۔ شمن کو تو بخار سا چڑھ آیا۔ رات بھر اُسے عجیب عجیب دماغی خواب بن کر سناتے رہتے۔ کبھی کالج کے غنڈے اُسے جینے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے، کبھی دیکھتا وہ شیشے جیسے پلکے پر اُپر اُلٹی پھسل رہی ہے اور اُس کے کپڑے اتنا دار ہو گئے ہیں، ہتھیلیاں چھل گئی ہیں، کبھی دیکھتی میٹرن کھوٹے عنب کی پیٹ پر سوار اُسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے، وہ غسل خانے میں نہا رہی ہے کہ ہمیشی نزداد نرس لے چو پٹ دروازے کو دیے، وہ پیچھے مار کر گڑای مڑی ہو گئی۔ جب اُس کے جو اس درست ہوئے تو پر میا اُس کے منہ پر سے چادر اتار رہی تھی: ”کیا ہوا؟ کیا کوئی برہ اسپناد کچھا تو نے؟“

”ہاں!“ وہ گہرا کر آنکھیں میچالے لگی۔  
”پگلی کہیں کی! ایسے زور سے سچتی کہ میں ڈر ہی تو لگی۔ اُٹھنا، چائے کی گھنٹی بھی ہو گئی!“

سارے دن کسی کام میں جی نہ نکلا۔ عام طور پر اڑکیاں بالکل بے فکر سی نظر آ رہی تھیں۔ بخور سے وہ ہر لڑکی کو گھور کر اُس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی مگر کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا اُن کے پہروں سے یا تو وہ واقعی بڑی بہادر تھیں یا اُس کی طرح بن رہی تھیں۔  
شام کو ہر کمرے میں کپڑے بدلے جانے کی آواز دھم مڑ رہی تھی۔ سوئی دھاگے اور بٹن سے لے کر بساڑھیاں بلاؤز اور بندے وغیرہ ایک دوسرے سے مستعار مانگے جانے لگے۔ شمن نے اپنی لٹھے کی شلوار اور چٹا ہوا دیو پٹہ نکالا۔ آج اسے دوپٹہ بہت نا کافی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس بار ایک چنٹ کو کھول ہی رہی تھی جو اُس نے انگلیوں میں چھالے ڈال کر بڑی کاوشوں سے بنائی تھی کہ پر میا آگئی:  
”اے پگلی، شلوار قمیص پہن کر جائے گی! وہ ڈانٹ بتائیں گی پرنسپل کو یاد دہانگی۔“  
”کیوں؟“

”کیوں کیسی؟ معلوم نہیں کہ ساڑھی پہنی چاہیے کالج کی لڑکیوں کو۔“

”مگر میرے پاس تو اس وقت بس وہی چرخا لے والی ہے، اور چمپر بھی نہیں۔“  
”تھارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بھلا اس جلسے میں سوتی ساڑھی چلے گی؟ میرے پاس ہے، آؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

شمن نے بہتری کو شش کی خوشامدیں کہیں مگر پریمانے اسے کاسی ریشم کی ساڑھی جس پر بھاری بنارس فیٹ لگا تھا، اور بروکیڈ کا شلو کا پہنا دیا۔ وہ تو ہلکا سا پائڈری لگا لیتی اور بس، مگر پریمانہ مانی اور زبردستی سرخی اور کاجل لگایا، پھر پھر ہاتھ چوڑیاں اور تھمکے، جن پر ملمع کیا ہوا تھا مگر اصلی معلوم ہوتے تھے، اُس نے خود ہی پہن لیے۔ نہایت سبک اڑھی کا جوتا پہن کر چلا اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پتل صراط پر چل رہی ہے۔ جوتا ذرا اونچہ دباتا تھا مگر وہ سہہ گئی۔ آج اُس نے پریمائی کی حرص میں کم کم کی بندی بھی لگائی۔

جیسے کا شور شروع ہو گیا جسے دیکھ کر بے طرح سچا ہوا تھا۔ مس جو تہ تک نے آج اپنی مردانہ وضع کی فراک پر پھولوں کا گچھا لگا کر کچھ نسوانیت سی پیدا کر لی تھی۔ تھوڑا بہت زنانہ پن جوان میں باقی رہ گیا تھا۔ میڑاں بھی آج تنگ فراک کو اور زیادہ تنگ بنا کر منڈھے ہوئے تھیں۔ ان کے جسم پر بندھی ہوئی ڈوریاں اور فیتے بستر بند کے نسروں کی طرح اُن کی فراک میں سے جھلک رہے تھے۔ ایسا بھی مہانوں میں آئی تھی۔ اپنی سادہ دکھنی ساڑھی اور اونچے جوڑے میں وہ بالکل الورا کے غامدوں کی دیو داسی معلوم ہو رہی تھی۔

شمن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مہمان اُسی کو گھور رہے ہیں اور کوئی دم میں بھاری بنارسی فیتے کی ساڑھی اُس کے جسم سے پھسل کر اُسے برہنہ چھوڑ جائیں گی۔ ساڑھی پہننے کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پلو کھینچتی، کبھی پلٹیوں کو منٹ لیتی کہ کھل تو نہیں گئیں، پھر ایک دم آپچل بہت زیادہ لمبا لگنے لگتا تو چپکے سے اسے سر کا کر اُس لیتی۔ ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ کم کم کی بناری گوری کی طرح ماتھے میں اٹکی چھ رہی ہے اور کوئی دم میں انار کے دانے کی طرح پھوٹ کر اس کے سارے چہرے

پر بہہ جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ ملنے کے جھسکے بوجھل ہو کر کان کی لوٹوں کو کھینچنے لگے۔  
 اتنے میں پرد فلیمر اور پرنسپل بھی آگئیں اور تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اندھا  
 دھند ہاتھ پکڑ کر جوڑے، لگائے شروع کر دیے، اور تھوڑی ہی دیر میں زیادہ تر بڑ گیا  
 ایک ایک لڑکے کی میرا ہی میں نظر آنے لگیں۔ جب شمن اس عجیب و غریب تماشے کو  
 خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ چکی تھیں اسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا پریشان حال لڑکا  
 نظر آیا۔ شمن نے اسے چونک کر دیکھا، اس کی منارت بھری نظروں سے وہ ادھر بھی  
 سیٹھا گیا اور جبری طرح مہکلا کر اپنی ٹائیٹ لٹے لگا۔ شاید وہ بھی آج شمن کی طرح پہلی  
 دفعہ سوٹ پہن کر آیا تھا :

جب ذرا حواس درست ہوئے تو اس نے نہایت گھبراتے ہوئے اور لڑکوں  
 کی نقل میں چائے بنا کر محل دینہ شمن کو پیش کرنے شروع کیے۔ انگریزی میں شمن شکر یہ  
 کہتی اور وہ جواب میں مستعدی سے "کوئی بات نہیں میڈم" کہتا لیکن بڑھلا ہٹ  
 میں کمی بار "میڈم" کے بجائے "مر" کہہ جاتا اور پھر شرم سے نیلا ہو کر اس کے  
 حلق میں میٹھ سے پانے لگے۔ اس کو اتنا گھبرا ہوا دیکھ کر شمن کو ہنسی آگئی۔ وہ کافی  
 بہادری سے انگریزی کے گھسے گھسائے جملوں میں اس سے باقاعدہ باتیں کرنے لگی  
 تھوڑی سی بات کو نہایت شستہ اور قواعد سے رصع انگریزی میں کہتی۔ وہ دونوں  
 باتیں کرنے لگے لیکن دو چار جملوں میں ہی گفتگو کا سارا مواد ختم ہو گیا۔ مجبوراً دونوں  
 نے نہایت تندہی سے کھانا شروع کر دیا اور باقی وقت میں چائے کی پیالیاں ہونٹوں  
 سے چپکائے رہے کیونکہ چائے پیتے میں بولنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ میں وہ نہایت  
 حسرت سے اور لوگوں کو دیکھتے جو ایک دانہ بھی نہیں کھا رہے تھے اور برابر تھپتھپ  
 لگا رہے تھے۔ ایک دم شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گندے نالے کی متغیر  
 کچڑ اس کے حلق میں گھول دی، بڑی زور سے ابکا کر آئی مگر اس نے کلا بھیج کر چائے  
 کے بڑے سے گھونٹ سے بھرتہ نگل لیا۔ گرم چائے نے سارے حلق اور معدے  
 تک کو جھلسا دیا۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلا، اس کا دھکی



بڑے رحم کی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا اُس کی طرح وہ بھی پسین کی پھل کھانے کی عادی نہیں۔ اس پھل کو کھانے کے لیے مشق کی ضرورت ہے اور وہ مشق مسلسل خانے میں مسلسل الٹیوں کے بعد حاصل ہو سکتی ہے، مگر اس وقت دینی چوڑیاں پھرے کی تیلیوں کو حسرت سے تک رہی تھیں اور زبان بند تھی۔

شمن نے دیکھا کہ ایلما اسے بڑے غور سے دیکھ کر کچھ چپکے چپکے اپنے ساتھ سے کہہ رہی ہے، پھر اُس کا مخصوص قہقہہ فضا میں گھنکا اور دھار دار دانتوں کی قطاریں چمک اٹھیں گھر اگر دونوں نے چائے کی پیالیاں رکھ دیں اور ایک دوسرے سے چھپا کر دمال ڈھونڈنے لگے۔

ایلما نے تاک کر ایک پکاسا انگور پھینکا۔ شمن ایسی گھرائی جیسے ڈوب می توجا گئی اُس کے دس میں۔ باوجود تندہی سے تلاش کرنے کے رومال نہ ملا۔ بس اس کے ہیکل اُسے ہونے لگا۔ شمن نے جلدی سے رومال نکال کر اس کا گال پونچھ دیا۔ شمن کو مدد مل رہا تھا۔ کم کم کی بندی اُس کے سارے جسم پر بہہ گئی، اور وہ بیچارہ بھی کرنے کو تو اس قدر محبت کا کام کر گیا مگر پھر اس بڑی طرح بھینپا کہ شمن کو ترس آگیا۔ ایلما اور اُس کا ساتھی بے حال ہو کر سننے لگے، پھر وہ دونوں اپنی کرسیاں گھسیٹ کر اُن کی میز پر آگئے۔

”ارے سطر تم تو بہت چل کھلے ہو، واہ بھئی!“ ایلما کے ساتھی نے اس نے مدد سے بیچارے کی پیٹھ ٹھونکی کہ مل کر رہ گیا۔

”شمن اپنے دوست سے ملاؤ نا، ایلما نے کہا۔

”یہ... یہ...“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔

”ہیں؟ ایسی کھانے میں مشغول ہو کہ نام بھی نہ پوچھا“

”جی... نہیں تو“ حمایت میں بولا۔

”ارے بھائی اتنی دیر سے برابر کھا رہے اور...“

”جی ہاں...“ وہ بھی ہکلا یا، اس پر دونوں نے پھر قہقہوں کی بھرا دیا۔

”اور تم بڑے آوارہ ہوتے جلتے ہو، ابھی۔۔۔“

”میں سوچ کھتا ہوں... اَمَعاف کیجئے گا۔“ وہ جلدی سے شمن کی طرف مڑا۔

”میں نے تو یہ نہیں پوچھ دیا تھا کہ آپ کا رومال نہ خراب ہو۔“

شکر ہے کہ ایلیا اور اُس کے ساتھی افتخار کے آجانے سے وہ دم گھڑنے والا

طسم خاموشی تو ٹوٹا۔ افتخار نے دونوں کو چھوڑ پھڑکے بے تکلف بنا دیا۔ منتھڑی دیر

میں ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ایلیا افتخار کو کہیں بھڑکے شمن اور اُس کے ساتھی کے بیچ میں بیٹھ

گئی۔ منتھڑی ہی دیر میں جلسے کا لطف آ گیا۔ عجب مزاج تھا ایلیا کا بھی! عشق بازی پر

تل جاتی تو سب کو بچا کر چھینک دیتی اور ایک دم جی اکتا جاتا تو سب کو سونے کے پتوں

کی طرح ہھاڑ کر اٹھٹھڑی ہوتی۔

ڈراما ختم ہوا اور جلسہ بھی بکھر گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پر یہاں اپنے بھائی نریندر کے

ساتھ اُسے ڈھونڈنے پہنچی۔ دوسرے دن چھٹی تھی اور پریمیا اُسے اپنے ساتھ دو دن

کے لیے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ دونوں کپڑے بدل کر جوڑ جھڑ میں دستخط کر رہے تھے

تو میٹر نے کہا پہلے پرنسپل سے لکھو اگر اجازت لائے، ایک ہندو لڑکی کے گھر جانے

کے لیے عام دستور سے مختلف اور زیادہ سخت اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پرنسپل کے پاس سے پریمیا دھانسی صورت بنائے واپس آئی۔

”کیوں؟ اجازت ملی؟“

”نہیں۔ ڈانٹ ملی اور جرمانہ۔“

”اچھا ہوا۔ ہم پہلے ہی کہتے تھے ٹھیک نہیں۔ بہت نٹ کھٹی کرتی ہو تم۔“

میٹر خوش ہو کر بولیں۔

”اور پرنسپل صاحبہ نے کہا ہے کہ کیونکہ یہ جرمانہ آپ کی کوششوں سے ہوا ہے

لہذا آپ کے ہی چاکلیٹ کھانے کے لیے دے دیا جائے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے ان کے سامنے

اجازت کا پرچہ بٹال دیا۔ جس میں نہایت شستہ سختی سے یاد دلایا گیا تھا کہ انہیں بے

کار باتوں کے لیے پرنسپل کو حیران نہ کرنا چاہیے۔

اس کے بعد نہ پوچھے کیا ہوا۔ میرٹن نے بے عزتی کی حد دیکھتے ہوئے مچھوٹ مچھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ استغفا دینے کی دھمکی دینے لگیں، جو وہ کبھی نہ دے چکی تھیں۔ شمن اور پریمیا کپڑے بدل کر دوسرے دن پہننے کے لیے کپڑوں کی پوٹلیاں باندھ کر زیندر کے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ میں ٹھس گئیں۔ کچھ مہمان ابھی رخصت ہو رہے تھے، زور شور سے شب بخیر کہا جا رہا تھا، جب موٹر احاطے میں مڑ کر بھاٹک سے گزری تو شمن نے دیکھا اُس کا جلے والا سا مٹی دیوار سے لٹکا کھڑا تھا، جیسے وہ جاتے جاتے رُک گیا ہو!

”اُوہ!“ اُس نے پہچان کر کہا۔

”کون تھا؟“ پریمیا نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔“

”لڑکا کا تھا؟ ہوں، یہ بات ہے!“ پریمیا نے زور سے اس کے چٹکی لی اور زیندر نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔

شمن ایک عجیب شیریں جذبے کے ماتحت مسکرا اُٹھی۔ کیرم کھلتے میں نشا نہ ٹھیک بیٹھے تو دل جھوم اُٹھتا ہے، بالکل اسی طرح کوئی چیز دماغ میں سرور اور شیریں لہریں طرح تیر گئی۔

راستے بھر پریمیا جہاں لے کر آگئی تھی وہی اور زیندر نہ جانے غلطی سے یا قصداً اُس کی ران کو کھنٹی سے پیتا رہا مگر وہ کہیں اور تھکی، دور۔ موٹر سے بہت آگے وہ اُڑی چلی جا رہی تھی۔

(۲۴)

رات آرام سے گزری۔ دوسرے دن شمن کرسی پر بیٹھی راستے صاحب کے کمرے میں بیٹن ٹانگتی رہی اور وہ اُس کے پیروں کے پاس قالین پر بھیسکڑا مار سے بیٹھے کہانیاں سناتے رہے اور سوئی میں تاگہ پر نہ کر بھی دیتے جاتے۔

”اٹا مت ٹانگ دیجھو میں، سنا،“ وہ بڑی معصومیت سے بٹن کو الٹ پٹ کر غور سے اٹا اور سیدھا دیکھتے۔

”یہ سیدھا“ وہ بڑی ہچکچاہٹ سے کہتے اور شمن ہنستی۔  
پھر وہ اُسے شہزادیوں، بھٹیاریوں اور جادوگر نیوں کے قصے سنائے گئے۔  
یہ کہانیاں شمن نے ہزاروں بار سنی تھیں مگر اسے صاحب ان میں دل سے باتیں جوڑ جاتے۔ وہ بار بار بھول کر اُس ایک بھٹیاری کا ذکر بیچ میں گھسیٹ لائے جو ہر مسافر کے ساتھ چور کھیلتی تھی اور پاس اپنی بٹی بٹھا لیتی تھی، جب بارے لگتی تو بٹی کو اشارہ کر دیتی اور بٹی لیمپ بچھا دیتی۔

”اتنے میں وہ چادلی بدل جاتی اور مسافر مارا جاتا“ اسے صاحب بڑے جوش سے کہتے۔

”واہ، بھلا بٹی لیمپ کیسے بچھا سکتی ہے؟“

”ایں؟“ سائے صاحب بڑے بھولپن سے چونکتے۔

”اور کیا، بٹی لیمپ کیسے بچھا سکتی ہے؟“

”چھو... کمرے“ وہ بٹی کی نقل کرتے۔ شمن ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور اسے صاحب بھی بچوں کی طرح کھلکھلا اٹھتے۔

”نہیں، اصلی میں بھٹیاری جو تھی وہ چراغ جلا کر بٹی کے سر پر رکھ دیتی، جب اشارہ کرتی تو بٹی سر ہٹا کر چراغ گرا دیتی، بس“

”دو مگر مسافر بڑے بیوقوف تھے: اول تو وہ چراغ بٹی کے سر پر کیوں رکھنے دیتے تھے؟ بھلا بٹی کا سر بھی چراغ رکھنے کی چیز ہے؟ دوسرے وہ اُس سے ساتھ کھیلے ہی کیوں تھے؟“

”چل مٹ بھی، اب یہ میں کیا جانوں! تو ہوتی تو ان سے فرود لے چھتی“

”اور کیا، اور بھٹیاری کو پولیس سے پکڑا دیتی“

”اؤنہ، سارا کہانی کا مزہ کرا کر دیا۔ بچل کہیں کی، بھلا بھٹیاریوں کو پولیس پکڑ

سکتی ہے؟“ کہانی کہتے وقت اُن کے چہرے اور دماغ میں کتنا بچپن آجاتا تھا! اُن کے چہرے کی جھریاں خفیف مسکراہٹیں بن جاتیں اور آنکھوں پر سے بڑھاپے کا خلاف مرگ جاتا۔ یہی چہرہ اخبار پڑھتے وقت اور دفتر میں کام کرتے میں کس قدر بُرا اور خشک ہو جاتا تھا!

شام کو رائے صاحب کرسی پر لیٹ گئے اور پکارا:  
 ”بھئی ہمارے سر میں تیل کون ڈالتا ہے؟“ پر تیا اور نریندر لہٹنے لگے پر تیا کا کہنا تھا کہ وہ تو ہسپتال میں رہتی تھی، نرئی سارے وقت رائے صاحب کو ہڑپ کرتا رہتا تھا، پھر بھی اُس کا جی نہیں بھرتا۔ نریندر کہتا تھا کہ پر تیا کو ایک سکرے تیل ڈالنے کا سلیقہ ہی نہیں۔

”چمن تیل ڈالے گی، نرئی پیروں کے انگوٹھے کھینچے گا اور پر تیا میری گود میں بیٹھے گی پھر رائے صاحب نے فیصلہ کیا، پر تیا فوراً اٹھلا کر ان کی گود میں لپس گئی۔

رائے صاحب اس کے بال بالکل سفید نہ تھے۔ اُن میں پلاٹینم کی سی دھندلی سیاہی جھلکتی تھی، جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بلوریں برف پر ہلکا سا شام کا غبار چھایا ہو۔ ہوں۔ بالوں میں غضب کا گھناؤ تھا اور ذرا سا چھو دینے سے اُن میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی۔ رائے صاحب ان بالوں سے کس قدر پر اسرار اور غیر مرئی معلوم ہوتے تھے۔

شمن شمعیت کے عالم میں اُن کے پالش کیے ہوئے خنوں کو ڈری ڈری چھو رہی تھی، پاس ہی پر تیا گھاس پر ادھمی لیٹ کر اُدٹھنے لگی، نریندر بید منتن کو رٹ بنوا نے چلا گیا اور شمن رائے صاحب کے بالوں کے گنجان کرے میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ ہر سکو انداز میں اُن کی آنکھیں بند تھیں مگر بلیکس کانپ رہی تھیں۔ وہ سوئے نہیں تھے۔ آدھے کھلے ہونٹوں میں سے سچے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مصدوعی دانت اور سونے کے تار نظر آ رہے تھے۔ اُن کے تلخ قبضہ کو نیند کبھی بلکے اور سے لینے دیکھ کر شمن کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نرم نرم ٹھنڈی دھندلی چلی جا رہی ہے۔ کپٹی

کے پاس ننھی ننھی شریا نہیں، معلوم ہوتا دبی ہوئی زندگیاں بھڑک رہی ہیں۔ بچوں بیچ مانتے پر اُدھر سے قفسے کی طرح کھچی ہوئی رنگ، آنکھوں کے گوشوں میں چڑیا کے پنچوں کے نشان، پتھر میں سے تراشا سا مضبوط جبرٹا! اُس پر رعب اور نامعلوم سی دہشت طاری ہو گئی۔ بے خیالی میں اُس کی سرد اور سہمی ہوئی انگلیاں اُن کی مڑھی ہوئی گردن پر جاکیں!

”ارے کیا کر رہی ہے؟“ دنیا جاگ پڑی، شمع گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چٹانے لگی۔ رائے صاحب کے مانتے پر کس ڈال کر زور زور سے کھانسا اور چھینکنا شروع کر دیا۔ شمع کو ان کی اس چھوڑی حرکت سے سخت کوفت ہوئی، وہ جاگ پڑی۔  
 ”تھک گئی؟ چل مانتے دھو، آج تجھے چاٹ کھلائیں گے؟“ وہ پیار سے بولے۔  
 رائے صاحب اُٹھ کر پتھر کے کان میں گھاس کے نکتے سے گدگدی کرنے لگے۔  
 پریا ننھے بچوں کی طرح چل چل کر اُٹھی اور گھاس پر بیٹھ کر سب سے چاٹ اور کافی اُڑائی۔  
 راستے کے کھانے کے بعد پریا بیٹھی ایک تارہ جھاڑ پر پنچو رہی تھی۔ کالج میں خرمیت نہ ملتی تھی جو مشق کرے اور یہاں کھیل کو وہی اتنا ہوتا کہ کچھ یاد ہی نہ آتا۔ کل رائے صاحب نے اُسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملاحت کرنے لگے۔ راگ راگیناں بھول کر وہ بیس بیس میں پڑتی جا رہی تھی۔ انھیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں مقفورا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔

طنبور اُٹھا کر انھوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے پنجے سے نال دیتے جاتے۔ دیر تک وہ کچھ گاتے رہے شمع خاک نہ سمجھی مگر وہ اُن کی گہری لوجھدار آوازات کی خاموشی میں مل جل کر اُسے نیند کے جھولے بھلانے لگی۔ نہ جانے کیا شرتھے، دھیمے اور نرم، جو احساسات پر بھوار کی طرح برستے رہے۔

قریب قریب ہر اتوار کو شمع ان کے گھر جاتی۔ ہر سال لڑکیوں کو ملنے جلنے والوں کا نیا کارڈ بھروانا پڑتا تھا۔ عام طور پر تو لڑکیاں کارڈ بھرنے کا ہنک پھانک دیتی تھیں۔ کیونکہ جو گھر والوں کے دستخطوں کے لیے بھیجتیں وہ کبھی واپس نہ آتے۔ اب کارڈ بھروا

کے لیے بڑی مصیبت آئی۔ پیسے کارڈ پر جو دستخط تھے وہ جعلی تھے اور اس دفعہ پرنس نے کارڈ بجائے لڑکیوں کو دیتے کے سرپرستوں کو خود براہ راست بھیج دیے تھے اور وہاں سے شہنشاہ کے لیے یہ جواب آیا کہ کہیں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اگر کوئی رشتہ دار ملنے آئے گا تو وہ اجازت نامہ ساتھ لائے گا۔ لیکن اس طرح بڑی گڑبڑ ہوئی۔ خود برطانیہ بھیلا ملے آئے اور گھنٹوں پرنس سے لڑے۔ وہ آبامیاں کے پاس ہو کر نہیں آ رہے تھے لہذا اجازت نامہ نذر دھنقا۔ غصے میں آکر وہ کارڈ خود بھڑک کر منسوخ کر دیے گئے۔ ایک اور لڑکی کا کارڈ پرنس نے آیا لہذا اس سے بھی اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ وہ بہت چراغ پا ہوا۔ خیر یہ طے ہوا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اجازت نامہ لکھے بیٹرن سوئٹس سے اٹھائی گئی تھیں، وہ بڑبڑاتی ہوئی پرنسپل کے کمرے سے ملاقات کے کمرے تک پیغام رسانی کرتی رہیں۔ پھر قلم دوات منگوایا گیا، گھنٹوں لگ گئے پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ کارڈ پرنس بتا کر چل دیا اور سر بھرے نئے اخبار میں انکی سیدھی چیزیں چھاپا دیں۔ ایک اور لڑکی کا سکا بھائی ملنے آیا۔ اتفاق سے وہ سامنے ہی برآمدے میں کھڑی تھی، بے اختیار دوڑ کر لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد خیالی آیا کہ اجازت تو لی ہی نہیں، اگر بیٹرن کو خبر ہو گئی تو؟ اور واقعی سانپ کی طرح اس کی پسلی پھر کی اور سر پر موجود۔

”بغیر اجازت کس سے بات کر رہی ہو؟“

”اپنے بھائی سے۔“

”شہوت کیا ہے کہ یہ تمہارا بھائی ہے؟“

”شہوت؟ ارے یہ میرا سگا بھائی ہے۔ کیا تم سمجھی ہو یہ میرا عاشق ہے؟“

”کیا معلوم؟ لڑکی کی جل گئی۔“

”مجھے تو کہتا ہے کہ آپ سے ملنے آیا تھا۔۔۔ آپ کا۔“

”ہشت“ اس کا بھائی بولا اور بیٹرن کا تو یہ حال کہ انگاروں پر لوٹ گئیں۔

لڑکی بولی، ”اگر آپ کو یقین نہیں کہ یہ میرا سگا بھائی ہے تو چلیے سائنس روم میں خون کا معائنہ کرا کے دیکھیے، اور کیا؟“ غرض آئے دن یہی جھگڑا ہوتا کرتے۔ روز روز

کے قصوں سے منتظمین بھی تنگ آگئے تھے۔ لڑکیوں کی چالوں کے آگے کسی کی نہ بن آتی۔ برطی لے دیے جتنی لہذا پھر کارڈ بھروانے کا تقاضا ہوا۔

اب کہ شمن کو دوسری چال چلنا پڑی، یعنی نہایت صفائی سے کارڈ پر دستخطوں کی نقل کر ڈاک سے پرنسپل کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ ننھی ننھی چوریاں برطی پیاری معلوم ہوتیں۔ اتنے رعب دار بزرگوں کو اتنا بنا کر لڑکیاں چکے چکے ان کے بھروسے پر ملتیں۔ ڈھائی تین سو کارڈوں میں دو چار جعلی چلا دینا کچھ مشکل بات نہ تھی!

شمن کا جانا صرف چند اتواروں کے لیے رکا اور وہ پھر جانے لگی۔ رائے صاحب سے اُس کی خوب گفتی۔ بچوں میں وہ پتہ بن کر کھیلنے خوب بے ایمانیاں کرتے۔ پریمیا کی توان سے باقاعدہ نشستی ہوتی۔ پھر بھی اگر وہ پریمیا کی طرح شمن کے گدگدیاں کو دیتے یا گال نوح دیتے تو وہ بُری طرح جھینپ جاتی اور دیر تک الگ الگ رہتی۔ اُن کے سامنے ننھا سا بچہ بن جانے کی خواہش ہونے لگتی۔

ایک دن مذاق میں انھوں نے اسے پیسے ڈالا تو وہ کھپا کر رو پڑی۔ رائے صاحب کچھ تھیرا اور کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے زور سے تو انھوں نے بھیچا بھی نہ سنا جب شمن سکرا دی تو وہ بن کر روٹ گئے۔

کھانے پر وہ زبردست سے کچھ گاؤں وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور پھر کسی کام سے اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ شمن اُن کی بے رخی سے رو بانسی ہو گئی۔ اگر وہ واقعی خفا ہو گئے تھے تو بے اختیار اُس کا دل بورڈنگ بھاگ جانے کو چلا۔ پلنگ پر چپ پڑی وہ سنان دوپہر میں سو جا کی۔ آخر اتنی جلدی اُس کے آنکھوں نکل پڑے؟ رائے صاحب کو دیکھ کر اُس پر رقت کیوں طاری ہو جاتی تھی؟ پھر اُسے زبردست کا خیال آگیا: وہ سب کے سامنے کتنا چپکا بنا رہتا تھا پر اکیلے میں بُری طرح شٹا جاتا۔ شمن اُس کی گھبراہٹ سے اور بھی شیر ہو جاتا اور جب وہ شوق بھری کن آنکھوں سے اسے ناگتا تو بزرگانہ انداز سے مسکرا اٹھتی۔ اب وہ پتہ نہ تھی اسے معلوم تھا زبردست اسے چاہتا ہے! یہ چاہت کیا ہوتی ہے؟ زبردست اُسے بالکل



چغند معلوم ہوتا۔ اس کی محبت کیتی بے نیکی اور کتنی بے منگم تھی اور رائے صاحب پہنچا تو اسے دیا تا نظر آتے۔ بیٹھے بیٹھے اس کا جی چاہتا وہ لمبی لمبی ان کے صندل جیسے پاک قدموں میں لیٹ جائے، وہ آہستہ سے اسے سہارا دے کر اٹھائیں اور اس کا چکر کھاتا ہوا سر اپنے پر، سر اسیٹنے سے لگاؤں۔ ان کا فراخ سینہ، جس میں سے مقدس مندروں کی سی مسجور کن خوشبو آتی تھی، ایک بار ہی وہ اپنے نکتے چوڑے کر کے اس جہک کو پی جائے اور ابھی غنودگی میں ڈوب جائے۔

پر کیا کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا، دونوں بچوں کے لیے سب کچھ بن کر رہ گئے۔ کچھ لوگ تو انہیں چھوڑا کہتے تھے اور بعض انہیں فلسفی مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے، دشمن کو وہ ناروا جی اوتار معلوم ہوتے۔ پر کیا کے ساتھ کہ اسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ کم کم کی ٹیکی چھپ کر لگاتی اور آئینے میں اسے اپنی شکل عجیب سی معلوم ہوتی۔ ننھی سی خنیں بوند سے اس کے چہرے پر ہزاروں رنگینیاں اور سنگار پیدا ہو جاتے، اس کی آنکھیں کچھ کچھ ایلیا کی محبت سادھوؤں کی سی آنکھوں سے مشابہ ہو جاتیں۔ اور بال زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگتے۔ معلوم ہوتا وہ ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں میں لیٹی ہوئی آہستہ آہستہ سلاگ رہی ہے۔ اس وقت رائے صاحب کے طلسمی بال اور دھلی ہوئی صبح کی طرح جھللاتی پیشانی کے علاوہ اسے کچھ نہ نظر آتا اور وہ نہ جانے کن نامعلوم تاریکیوں میں بٹھکنے لگتی۔

نام کو کھانا کھاتے میں کچھ دھرم اور سماج کا ذکر چھڑا گیا۔ پر کیا زور شور سے لکھ دینے لگی ہر نذر سمجھی بیچ بیچ میں بول اٹھتا، ایک ایک رائے صاحب بولے:

”ارے ارے چھوڑو، تو ہندو ہے کہ مسلمان؟“

سب ایک۔ ہم خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تھکنے لگے۔

”رام رام، جو کہیں مسلمان ہوئی تو اپنا دھرم تو بھرتھٹ ہو گیا سمجھو۔“

”رائے صاحب ہمارا دھرم ایسا بڑا نہیں کہ کوئی اسے بھرتھٹ کر سکے۔ دنیا

کی کوئی شکستی ہمارے دھرم کو آپرخ نہیں پہنچا سکتی۔“ پر سیاہولی۔  
 ”چل چل، جانے دے“ انھوں نے پرتیا کے جوش کو ایک طرف جھٹک کر کہا۔  
 ”کیوں رہی چپن، توتبا۔“

”راٹے صاحب دیکھیے میری طرف۔“ نریندر جوش سے چیخا۔  
 ”نہ، نہ بھی میں کچھ نہیں دیکھتا، یہ جو لڑکی ہے نا، یہ اگر مسلمان ہوئی تو۔۔۔۔۔“  
 ”راٹے صاحب آپ،“ پرتیا غصہ سے بے حال ہو گئی، ”اور آپ کے کتنے دوست جو مسلمان ہیں تو۔۔۔۔۔“

”ہمارے دوستوں کی اور بات ہے۔ وہ۔۔۔ مگر یہ لڑکی تو۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا، رام رام۔“ مارے شرم کے نریندر اور پرتیا دوا لے ہو گئے اور شمن نے سہم کر بلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ راٹے صاحب کے چہرے پر ویسی ہی درشتی قائم تھی۔  
 ”مذاق نہیں ہے، اب ہم سب کو پراخت کرنا پڑے گی سوا لگ، اور بھی اس بھوکری کو ہندو بنانا پڑے گا۔ کیوں پھر۔۔۔“ وہ جھک کر شمن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

”تو لے تجھے بھی ہندو بنائے دیتا ہوں۔“ گلاس میں سے پانی لے کر وہ ناخون سے شمن کے منہ پر چھڑکنے لگے۔ اڑم شرطم نہ جانے انھوں نے کیا پرانا شروع کیا۔ ایک دم سے پرتیا دور کر ان کے بازو سے جھول گئی اور زور سے شانے میں دانت کاڑ دیے۔

”اُف، اُف، اُف،“ راٹے صاحب جلدی جلدی اپنا کندھا سہلانے لگے۔  
 ”اچھا مت بننے دو، ہم تو کہتے تھے چلو بھی اچھا رہے گا، کوئی موٹا سا بنیا ڈھونڈ کر اس کا بیاہ کر دیں گے، مگر۔۔۔۔۔“  
 شمن تفتناقی ہوئی میز پر سے اُٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی اور آنکھیں بھیج بھیج کر جھوٹے آنسو لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ارے، ارے، ارے، ہمارا بیٹا روٹ گیا، وہ چھپے چھپے آئے، دیر تک وہ

اُسے بھلاتے رہے مگر شمع روشن رہی۔

”اُنھیں میچیں کون آئے، اُنھیں میچیں کون۔“ اُنھوں نے اُنھیں بند کر کے اُس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ ان کی باتیں اُنھیں کھلی ہوئی تھی جس میں سے شریقی شراب شرارت سے جھانک رہی تھی، شمع نہیں پڑی، لپک کر راکھ صاحب نے اُسے اٹھا لیا اور کرسی پر ڈال دیا۔

شمع نے ایک کہانی سنی تھی کہ ایک آدمی اپنے ایک دوست کو دفن کرنے گیا تو اُس کی تسبیح قبر میں گر گئی۔ بعد میں اُسے یاد آیا تو اُس نے سوچا چل کر لے ہی کیوں نہ آؤں اُس نے جا کر قبر کھودی اور نیچے اُترا تو دیکھا مردہ غائب، ہاں قبر کے مہربانے ایک کھڑکی کھلی ہے۔ اس کھڑکی کے اندر داخل ہوا تو سامنے اُس کا دوست ایک مرتع تخت پر چلہ رہا۔

بیاد برطے ٹھاٹ ہیں تمہارے تو، اُس نے کہا: ”ہاں بھائی تمہاری دعا سے مزے میں ہیں، میں اور بھائی تمہاری تسبیح رہ گئی تھی سو یہ رہی۔“ وہ بولا: ”ہاں وہی تو لینے چلا آیا تھا، خیر تم سے بھی ملاقات ہو گئی، اچھا بھئی السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔“

وہ آدمی قبر سے نکلا تو معلوم ہوا دنیا ہی بدل چکی ہے: نہ گھر نہ بار نہ بچے نہ بیوی؛ ایک سو دو سو برس کے بوڑھے نے بتایا کہ اُس کے لکڑ دا دا کے لکڑ دا دا کے لکڑ دا دا کے زمانے میں سنا جاتا تھا کہ کوئی آدمی اس نام کا رہتا تھا۔

تو یہ ہیں قدرت الہی کے کرشمے۔ یہاں تو علیک سلیک، ہی ہوئی اود دیاں جگ بیت گئے۔ جب رائے صاحب نے اُسے اٹھا کر کرسی پر ڈالا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آسمان پر ستاروں کے ہنڈوسے میں چمک پیریاں کھا کر ایک دم رک گئی۔ ہر چیز اُسے اپنے گرد گم گاتی محسوس ہو رہی تھی اور مندریں بیسی مقدس خوشبو سے اُس کا دماغ سنبھل رہا تھا۔ جلدی سے وہ اُٹھ کر لڑی ہوئی اور لرزے سے ہرے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

(۲۵)

دوسرے کی چھٹیوں میں اُسے اس مرتبہ کوئی گھر سے لینے نہ آیا۔ گنتی کی دو چار لڑکیاں بورڈنگ میں رہ گئیں، وہ بھی اپنے اپنے مشغلوں میں ٹو دو بی رہ گئیں۔ پریمیا اور شمن ہر وقت ساتھ رہتی تھیں، اُس کے جانے کے بعد شمن دن بھر پریشان ٹھٹھکتی رہتی۔ کسی پرانے نیچے دری ڈال کر نادیں پرٹھا کرتی، پھر کبھی کبھی شام کو دو چار لڑکیاں مل کر سنیا پالی جاتیں، تب تو شمن اور بھی بد کھلا جاتی۔ خاموش کر سی پرلیٹ کر وہ رامائین کا ترجمہ پڑھا کرتی، سینا جی کی زندگی پر اُسے بڑا رشک آتا۔ کس مزے سے وہ رام چندر جی اور پنشن جی کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منایا کرتی، ہونگی۔ چودہ برس کی لمبی چوڑی حسین پکنک ایسا کہتی تھی کہ اچھا سی ہو جو رام چندر جی کو بن باس ملا، کچھ تو غریبوں کی دیکھ بھی نہ لیتا۔ کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کتنے افسانہ ہیں جو جانوروں سے باہر اور جنگلوں سے بھی گئی گوری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں لیکن تاریخ میں کوئی ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں لکھتا۔ یہ بڑے لوگ اگر عیاش و عشرت سے اتنا کر سنیا س رہے ہیں تو مصفا کی۔ لیکن ان سب سیلوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو پانی ہی تنگی دنیا میں ہو تے ہیں۔

پندرہویں دنوں میں اُس نے اُن گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے وہ "سینا جی" نے اُسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ آخری باب، جہاں وہ اپنے ارہمے آقا کے پاس لوٹ کر آتی ہے، اُس کو اتنا پایا معلوم ہوا کہ تین چار بار پڑھ کر بھی سیر نہ ہوئی۔ ٹیکو کی کہانیاں، خصوصاً کاسٹل اوسے، پڑھ کر تو سوچ بچ آنسو نکل پڑا۔ اُسے۔ ہارٹس کی مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ پس پیر نے اُس کی رنگ۔ رنگ کو پوچھا کہ پست کر ڈالا تو وہ بائرن، شیڈلے اور گئیس کی شاعری تھی۔

جب کل پانچ چھٹیاں رہ گئیں تو پریمیا اور زیندہ اسے لینے آ پہنچے شمن کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ پریمیا سے ناواض تھی۔ زیندہ کے ساتھ گئیس کرٹھن میں بھی اعتراض نہ ہوا اور جب اُس نے حسبِ عادت اُس کا پرچہ شمن نے چٹاخا۔ اُس کے گال پر ایک بقیہ چھڑا۔ پریمیا بھی اُس کی حمایت میں زیندہ کے چٹکیاں بھرنے لگی۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی اور اس سے

مجھے یوں شوق اُڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روحانی طور پر تو پہنچ بھی چکی ہے۔ رات بھر  
پر تیار اور زبرد سے ناراض ہیں کہ وہ اُسے اتنی دیر میں کیوں لائے۔ وہ اس کے انتظار  
میں کس قدر تنگ گئے ہوں گے۔ اُسے دیکھتے ہی وہ نقلی مگر اصلی مرتیوں جیسے دانت  
ایک دم جگمگا اٹھیں گے۔

مگر گھر پہنچ کر نہ ہی دانت جگمگائے اور نہ اُس کے انتظار میں کوئی تھا کا ہوا نظر  
آیا۔ نہ اُسے صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کو گئے ہوئے تھے، نہ اُسے  
کے متعلق کچھ نہیں کہہ گئے تھے۔ گھر سونا سونا ہو رہا تھا، شمع اُگڑ چکی تھیں۔ اوپر سے زبرد  
نے بدینا قیاس شروع کر دیں۔ پر تیار کو سوتا پایا کہ اُس نے شمع پر سرخ مع اعلان عشق کر دیا  
اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ بس ٹوٹا ہی تو پر تیار ہے۔ شمع اُس پر بجائے بجھنے  
کے پیار سا آگیا، وہ مسکرا دی اور جیسے ایک عقلمند ماں نے کہ شیشے کا گلاس مانگنے پر  
بڑے پیار سے پہلا دیتی ہے اسی طرح شمع نے زبرد کو چمکا دیا اور جب وہ ناامید ہو کر  
سبکیاں لینے لگا تو شمع کا جی چایا اُس کا بے وقوف سراپے سینے سے لگا کر تپکیاں دے  
اور ٹٹا دے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دم نہایت عقلمند اور بزرگ سمجھنے لگی۔ زبرد اسے  
بے حد شرم اور تکس معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بیچارہ اُس کی بزرگانہ باتیں سن کر دیر سے ہی سیرت  
نزدہ ہو رہا تھا، بالکل ہی سٹپٹا گیا۔ چائے پر کچھ جھینپا، کچھ روٹھا بیٹھا رہا۔

شام کو رات کے صاحب اپنا تک واپس آگئے۔ گویا شمع کی خاموش پکار نے انہیں  
کھینچ بلایا۔ خاک اور دھول میں اُسے ہونے خاکی کپڑے، مٹییلی بالوں پر خاک کی افشاں  
جیسے سورج پر ہلکے ہلکے بادلوں کی پرچھائیاں، دھوپ سے رنگ کچھ اور تھلس کر شورخ  
ہو گیا تھا۔ اور جب پیر اُسے ہونے ہونٹوں کے درمیان ستاروں کی لڑیاں چمکیں  
تو شمع کا دل غوب زور سے اُچھلنے لگا اور اُس کی نگاہیں مٹی میں بھرتے ہوئے  
جہاز کی جوتوں پر جم گئیں۔

آتے ہی انھوں نے بھر گلاس برف کا پانی پیا اور خلاف معمول سر ہاتھوں سے تھام  
کر بیٹھے۔ پر تیار اور زبرد ویسے اُن سے اتنے بے تکلف تھے، مگر انہیں خاموش

دیگر کو پیاروں کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔ اُن کی ایک تنہی نگاہ چانٹنے کی طرح لگتی۔ اور پرتیا جیسی بے چینی تھی بھی دیکھ کر رہ جاتی۔

”کیا بات ہے؟“ شمن نے خاموشی اور سکون سے متاثرہ آہستہ سے پوچھا۔  
”شک گئے ہیں، یا شاید...“ وہ رک گئی۔

”کیا؟“

”شاید مس فلپ سے رابطہ ہو گئی۔ وہ بھی تو شکار کو لگی تھیں۔“ پریا نے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں سے جا کر کہا۔  
”کون ہیں یہ مس فلپ؟“

”میں ایک۔ یہاں انیسکڑس آف اسکولز ہیں، رائے صاحبہ کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی مگر صاحبہ ان کیلینڈر میں رائے صاحبہ سے ملے تو بس دھالے کیوں دو دن میں شادی بھی کر ڈالی۔ اب... اسے تم نے کسی کی تصویر نہیں دیکھی جو رائے صاحبہ کے بنوائی ہے، ابھی وہ بھی دکھاؤں گی۔ ہاں، تم ہی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آکر بیٹھا کرتی تھیں، مجھے آکڑش تھیں اور اس قدر سبھی کہ ہماری دایہ چی خوب اُن سے گھر کا کام کر داتی تھیں۔ دھرتی باندھتی تھیں، اور بڑی کاہل تھیں۔ یہ چوڑیل جب ہی سے انھیں پھانسنے کی فکر میں تھیں، یہ فلپ کی بچی! رائے صاحبہ اسے بہت چاہتے ہیں مگر جلاتے بھی خوب ہیں، مگر صاحبہ رونی سے تو پھٹتے ہیں۔“ بڑی بڑی ہے،“ شمن کے دل نے پکارا۔

”ہاں، مگر رائے صاحبہ اسے کبھی نہیں مناتے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہیں ملاقات ہو جاتی ہے کسی پارٹی جلسے میں۔ اور رائے صاحبہ کی تو یہی عادت ہے کہ ذرا دیر میں ہنس دیا اور ذرا میں رُلا دیا۔ پھر اس دن...“ پریا نے رائے صاحبہ کی بھرائی ہوئی آواز جیسے چوڑے ہال میں گونجی۔

”اے رستم! تم بھی آیا ہو اب۔ کب اُسے دوست ہو رہے صاحب نے گویا  
اب اُسے دیکھا۔ وہ ذرا مسکرا اُٹھے۔ ”... ابھی ذرا اُتار۔ وہ کوٹ میں پھنسے  
سوئے ہوئے۔“

شمن کو رات اُتارنے لگی۔ تھیں بڑی طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور جسم جل رہا تھا۔  
وہ پراسرار منبروں کی مٹی خوشبو کا جھونکا اُسے آہستہ سے جھجھوڑ گیا، مگر وہ سنہل گئی اور  
زمین پر بٹک کر بڑا اکھوٹے لگی۔ ”اُسے صاحب۔ یہ پرکھنیچ لیے۔ اور جھک کر ہوئے  
سے اُس کے گال پر دو انگلیاں مار دیں۔ شمن گبرا کو ٹھڑی ہو گئی اور پیرا جوتے کھولنے  
لگا۔“

کھولنے کے لمحے سے شمن کو چہرے سے رنگتے معلوم ہوئے۔ اُس نے بجلی جلائی تو  
نریندر نامہ عاشقوں کے سارے مزوری تاثرات چہرے پر جمع کیے کرسی پر اکڑوں  
بیٹھا تھا شمن جیسے اُس کے حال دل سے بے خبر کرسی کھینچ کر پاس بٹک گئی۔  
”گنتی گرمی ہے۔“

نریندر شیب

”آج تو انیس کریم بنتی“

نریندر شیب

”اُسے صاحب کو فالودہ پسند ہے ناچ اُس نے براہ راست پوچھا۔“

”نریندر! کوئی سامنے کی کھڑکی ہی کھول دے، شکے بھی تو بند ہیں؟ معلوم ہوتا  
ہے کہیں آگ لگ گئی ہے۔... ہائے کوئی۔...“

نریندر نے ایک حقارت آمیز نظر اُس پر ڈالی اور جھنکا تا ہوا کھڑکی کے کوڑے دھڑ  
دھڑ کھولنے لگا۔

”نریندر! کیا ہفت غنہ ہو؟“ اُس نے پیار سے پھر طر۔  
”ہیں۔“

”ہاں.... تو پھر اس نے زیم کے ذکر پر مسکرائے کیوں نہیں؟“ باوجود کوششوں کے زئید مسکرا ہٹ کو نہ روک سکا۔  
 ”ابوہو، بن رہے تھے جناب! بندیدے کہیں کے! کہیں جاٹوں میں بھی کرلی اس کو ہم کھاتا ہوگا!“

”تم نہیں جانتی کہ....“  
 ”ہونہ، جیسے تم تو بہت جانتے ہو۔“  
 ”اگر تمہیں کسی سے اتنا پریم ہوتا، وہ انگریزی چھانٹنے لگا۔“  
 ”آہا، پریم! پریم کی نیا.... پریم.... کہو نا آگے؟“  
 ”ہنہ... امیں....“ زئید جھٹکیا۔

”دیکھو زئید تم مجھے ڈانٹو گے تو... ہاں، اچھا نہ ہوگا۔ بڑے آئے ڈانٹ کے بولنے والے۔ اور اسی پر کہتے ہو پریم ہے؟ خاک پریم سے تمہیں جی ہاں، پریم ہوتا تو یوں اپنا ریکیٹ چھپا کر نہ رکھتے اور لوکاٹ تو طرے وقت پکے پکے خود نہ بچل جاتے۔“

”کیوں جھوٹ بولتی ہو، کتنے سارے توڑے مگر اس نے پریمانے لپک لیے، ہنہ!“

”خیز لوکاٹ تو پریمانے لپک لیے اور ریکیٹ کی بات گول ہی کر گئے؟ ہنہ، جیسے میں کھا ہی تو جاتی تھا، رابلا۔“  
 ایک دم سے زئید پریشان چل دیا، شمس مسکراتی ہوئی اطمینان سے کرسی پر پھیل گئی۔

”یہ لورکیٹ اور مجھ سے بات نہ کرنا، زئید نے ریکیٹ ٹنچ دیا، کچھ دیر شمس اسے دیکھتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔“  
 ”او.... فوہ نرمی!“

”مجھ سے مت بولو جی، سو دفعہ کہہ دیا، ہاں، نہیں تو...“



شمن امت کے معصوم جذبے سے بے چین ہو کر سننے لگی۔ اگر اس طرح بالکل ایسے ہی فریادیں کے سامنے پیش کر دیتا، "ہم نے نہیں کھڑکی نہر... جی!" تو یقیناً وہ شہر یا کہ چھوڑ چکا! اسی کے گلے کا مار بن جاتی اور پھر حکم ملتا ہے: "ہم سے مت بولو جی!" وہ خوب تنہی۔

"اوہ، نرئی ڈیر!" وہ نریدر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ کھنے لگی۔ ایک دم سے نریدر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر دیکھ کی طرح لپٹ گیا۔ شمن نے گھبرا کر اسے دور دھکیلا۔ سارے بال اور کان کھسٹ ڈلتے، بچا را پیٹے ہوئے کتے کی طرح کونے میں دبک گیا اور شمن کچھ خوفزدہ، کچھ شرمندہ بھاگنے لگی کہ آتی ہوئی پریمیا سے ٹکرا ہوئی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"وہ... آ... کچھ نہیں یہ نریدر مجھے مار رہا تھا۔" وہ ایک دم بات پلٹ کر سننے لگی، پھر مصنوعی غصے سے گال پھلایا۔

"ہائیں! نرئی کے بچے، یہ را تیرا کھٹا اور کہتا تھا کہ گم ہو گیا۔"

"ہاں، جھوٹا۔" وہ زمانے کا۔ "شمن نے تائید کی۔"

"کیوں مار رہا تھا پاری شمن کو؟ کیوں؟ کیوں؟" وہ رنجیت کے جال سے نریدر کے سر پر پٹے لگانے لگی۔

بھرا ہوا نرئی بھنبھوڑ ہی کھاتا کہ اتنے میں رائے صاحب کبیل لپٹتے آئے اور بات ٹل گئی۔

"آج نریدر کو کیا ہو گیا ہے؟" رائے صاحب نے اسے غصے اور شرم سے مسخ دیکھ کر کہا، "تم دنوں نے ستایا ہو گا۔ کیوں؟"

"پریم ہو گیا ہے پیارے کو!" شمن نے وہی زبان سے جھنسی روک کر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

"پریم، پریم... رائے صاحب۔" پریمیا نے چننا شروع کیا۔

"کیسے؟ اپنے نرئی کو؟" رائے صاحب بن کر نریدر مند ہو گئے۔

”ہاں، چہ بیچارہ۔“

”وہیں مار دوں گا، ہاں“ نریندر غرایا

”ارے باپ ارے! مگر کس سے ہو گیا ہے پریم؟“

”ایک ہے“ شمن اترا نے لگی۔

”سجھو، مہنتہ“ نریندر مارے شرم کے اور بھی بھنا گیا۔

”اے بیچارہ! رائے صاحب اب اپنا سڑی تو۔۔۔“

”میں چھڑی مار دوں گا۔۔۔ پر تمہاری بچی۔“

”اور رائے صاحب۔۔۔“ قبل اس کے کہ بریا کچھ بولے نری نے کھٹ سے چھڑی

کا دستہ اُس کی انگلی پر رکھ دیا۔

کھانے پر نریندر کے عشق نے سب کو ہنس دیا، منصوبہ شمن تو بے تحاشا سنہتی رہی۔

اُسے یہ کھیل نہایت ہی مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ رائے صاحب میں بھی اپنی پرانی شگفتگی

لوٹ آئی، وہ دیر تک بیٹھے کانٹوں اور چھڑی کی مدد سے میز پر مچھے بنا کر امتحان لیتے رہے،

مگر انہوں نے صرف شور برپا اور زبردستی سے جا کر سو گئے۔

شمن اور بریا اُدا سی سے نڈھال ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو گئیں، یعنی شمن جاگتی

رہی اور بریا سو گئی۔ شمن نے جاگنے اور خود سے بات کرنے کی ایک عادت سی ڈالی۔ رونا

سونے سے پہلے وہ خود اپنے حضور میں اپنے رائے احساسات اور تجربات ایک

کر کے پیش کرتی اور اُن پر خود اپنا فیصلہ سنتی، یہاں تک کہ وہ نہ جانے کب سو جاتی۔ اُس

صوبے میں اسے ایسا معاملہ ہوتا جیسے کسی نے مرے دار کہانیاں سنا کر سلا دیا ہو۔ راجیہ

نے جو ہولے سے اُس کے گال پر دو انگلیاں چھوادی تھیں وہ ایک دم تازہ ہو گئیں، سامنے ہی

اسے گزرے ہوئے جنم کی بھولی ہوئی باتیں یاد آ گئیں، دور، بہت دور، صدیوں پہلے

رشد نے کیرم کھیلنے میں اُس کی کلانی کو پکڑا تھا، چنٹی مارنے کے لیے دو انگلیوں کو مار کر پھر چھوڑ

دیا تھا اور وہ کھیل سکتی ہوئی چنٹی اب بھی اُس کی رگ رگ میں چمکیں لے رہی تھیں۔ اُس نے

اپنی کلانی پر سنسناتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مس بھلائی میں نیگا۔

گیا۔ اس طرح گویا اُس نے اس نیم مردہ سچوٹ میں نئی جان ڈال دی، اسے سکون کی نیند آگئی۔

صبح اُس کی آنکھ خلاف معمول دیر میں کھلی تو کالچ کی گھنٹی کی آواز نہ کہیں درز سنائی دی۔ درابو شس اُسے پر معلوم ہوا کہ کالچ میں نہیں بلکہ پریا کے پلنگ پر ہے۔ اور یہ آواز کسی نے کانسی کی تھالی رسوئی میں گرائی تھی۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

راٹے صاحب اب بھی شست نظر آ رہے تھے۔ شمشن دیر تک مس فلپ کو کوستی رہی جس سے لڑ کر وہ اتنے ملدڑ ہو گئے تھے۔ منگر پھر بھی اُسے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں تازگی آجاتی۔ اور وہ ایک آدھ جملہ ضرور کس دیتے، دیر تک بیٹھ کر تاش بھی کھیلے اور بے ایمانیوں بھی کہیں۔ آج شمشن کا دل بے اختیار اُنھیں چھو رہے کو چاہتا تھا لہذا وہ پریا کے ساتھ ساتھ اُن سے لڑنے بھی لگی۔ نہ جانے کس بات پر انھوں نے زور سے اُس کی انگلی چٹخی دی تو بچوں کی طرح چل گئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا ایک دم اُن کے مندر جلیب سینے کے پٹ کھل جائیں اور وہ ٹرنگوں ہو کر اُن میں سما جائے۔

وہ روٹھی ہی رہی۔ پریا ڈھونڈ کو کبڑے دینے چلی گئی اور زبرد کا دورہ قائم تھا وہ منہ پھیلائے ہر آمدے میں پڑھتا رہا کہ راٹے صاحب آئے۔ شمشن نے بن کر منہ پھیلا لیا، انھوں نے اُس کے چوڑے ہوئے گالوں کی نقل میں اپنے گال پھیلا لیے اور شمشن کے چہرے پر اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ شمشن پر تو بھتی سوار تھی وہ نہ جانے کس بات پر جل اٹھی اور اُن کے چہرے پر بکھر کر رہنے لگی۔

”ارے، ارے، ارے میرا بہن“ راٹے صاحب نے اُسے چھوڑا تو وہ اور بھی بگڑ گئی۔ وہ متعجب ہو کر صورت دیکھنے لگے۔ اُنھیں سنجیدہ دیکھ کر وہ ڈر گئی اور بری طرح اُن سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

راٹے صاحب نے ہنستے ہوئے اُسے بچوں کی طرح تھپکنا شروع کیا۔ وہ خاموش اُن کے سینے سے سر لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی، یہاں تک کہ اس پر بخند لگی سی طاری ہو گئی۔ راٹے صاحب نے جھپک کر اُس کا چہرہ دیکھا تو وہ ایک دم سوچی بن گئی۔

رائے صاحب اُسے تھکتے رہے، پھر آہستہ سے اُنھوں نے اسے سر کا کر پلنگ پر لٹانے کا ارادہ کیا تو وہ ایک دم اُنھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کانپ اُٹھی۔  
 ”نہیں، نہیں رائے صاحب“ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”کیا ہے؟ کچھ... ارے“ وہ اس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر گئے۔  
 ”میں... میں... نہیں رائے صاحب، مجھے گراہی موت رائے صاحب...  
 رائے صاحب... رائے صاحب ہیں... میں... آپ سے پریم کرتی ہوں! اس  
 نے سوکھہ ہوئے گلے سے آخر کہہ ہی دیا۔

”ہیں؟“ وہ اس کی طرف اجنبیوں کی طرح دیکھنے لگے۔  
 ”میں آپ سے... پریم... رائے صاحب... میں...“ اس کی آواز اور  
 گھٹ کر سہم گئی۔  
 ”ایں، چمن... اچھا سو جاؤ“ وہ جلدی سے اس کی لپٹی ہوئی انگلیاں انگ  
 کرنے لگے۔

”نہیں... نہیں رائے صاحب، میں مرجائوں گی۔ رائے صاحب مجھے...  
 رائے صاحب مجھے دور نہ بھیجیے“ رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے اُن کے  
 ماتھے پر تپڑ مار دیا۔

”رائے صاحب... میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی“ اس نے اور قریب  
 ہو کر کہا، رائے صاحب چاروں طرف گھرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔  
 ”دار سے پرہیز...“ اُنھوں نے آواز دی۔

”مت بلائیے کسی کو۔ رائے صاحب میں مرجائوں گی۔ میں پریم کرتی ہوں راجیبا“  
 سامنے دروازے میں نہ بند۔ کتاب ایسے حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا، جو بغیر  
 اُس نے شمن کو یہ کہتے سنا اس کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا، جیسے کسی نے اُسے ماں کی  
 گالی دے دی ہو۔ شمن کی زبان لڑا کھڑا گئی، وہ ڈھیلی ہو کر پلنگ پر اوندھے  
 منہ گھری۔

مائے صاحب چلے گئے، بغیر دوسرا لفظ دہان سے نکالے۔ اور شمن کا جی جانا کاش  
پلنگ سمیت وہ زمین میں سماتی چلی جائے۔ نیچے، نیچے، اتنے نیچے کہ بالکل زمین کے کلیجے  
میں جا چھوے۔ مارے ہمدیت اور شرم کے وہ آنکھیں بند کیے اُسی طرح شام تک پڑی رہی۔  
کوئی ایسی ترکیب ہوتی جو وہ بنا کچھ کہے سنے اپنا منہ ڈھانکے دہان سے بھاگ نکلتی۔ اُس  
کے کمرے میں کوئی نہ آیا مگر اُسے صاف معلوم ہو گیا کہ نزدیک را اور پریمیا دوسرے کمرے  
میں ڈرے ڈرے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہ اُس نے کیا کر دیا؟ اب کیا ہو گا؟

کانپتی لڑتی، آنکھیں جھٹکانے جب وہ باہر نکلی تو نزدیک را جلدی سے اپنے کمرے  
میں گھس گیا۔ وہ بھی اُسے منہ دکھاتے ڈر رہا تھا۔ پریمیا نے عورت کی پوری بہادری سے  
اُس کا مقابلہ کیا، گویا وہ آج پہلی مرتبہ اُس کا بہ حیثیت ایک اجنبی ہستی کے استقبال کر  
رہی ہے۔ وہ بڑے اخلاق سے بولی اور دونوں نے جا کر ہر دُعا لوگوں کی طرح چائے  
پینا شروع کی۔ آج نہ کچا لوؤں پر جھگڑا نہ اند بے سگڑوں پر تعینا تہلپی ہوئی۔ اُس کی ہمت  
نہ پڑی جو اس نے صاحب کا نام بھی لیتی۔ پریمیا نہایت تپا کس نہ اُسے پھل دینے دیتی  
رہی، شمن سمجھی تکلف سے کھاتی رہی۔ کبھی کبھی اُسے پریمیا آٹھ پچا کہ دیکھ بھی لیتی مگر ایسے  
گھبرا جاتی گویا اُسے نہیں پہچان پائی۔ دونوں بے طرح سمجھی ہوئی تھیں۔ وہ بے تکلف  
سہیلیاں ایک دوسرے سے بہت دور غیرت کی خشکی میں جا پڑی تھیں۔ ان کے  
حواس بے طرح جھٹک گئے تھے، جیسے دو دوستوں کے بیچ میں ریشمان در آیا ہو اور  
ایک دوسرے کو پچا بھی نہ سکیں۔ شام تک خاموش رہنے کے بعد شمن نے بڑی مشکل  
سے اس سے بورڈنگ جانے کی اجازت دے الفاظ میں طلب کی جو ایسی تیزی سے  
ملی کہ اُس کا منہ اتر گیا۔ ڈرائیور تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا۔ اُن واحدیں وہ مثالی ڈھنڈھار  
بورڈنگ کی چہار دیواری میں تنکے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اُس نے  
بجلی نہیں جلائی اور جوتوں سمیت لحاف میں سکر کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن لوگوں سے آٹھ ملائے وحشت معلوم ہونے لگی۔ گو وہ کچھ نہ جانتے  
تھے پھر بھی جیسے اُس کے منہ پر لمبی لمبی سطر لکھی اُس کے گناہ کا ڈھنڈھارا چھٹ

رہی تھیں۔ وہ کچھ چھپانا چاہتی ان تجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں اور وہ ہچک کر دوڑ ہو جاتی۔

تو وہ بد معاش تھی! پرے درجے کی آوارہ! اُس نے ایک مقدس انسان کی پاکدامنی پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے مگر خدا نے اُسے بچا لیا۔ یہ اُسے کیا ہو گیا تھا؟ یہ ٹوٹے ہوئے ذرے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہو گا؟

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی لڑکیاں ٹوٹنا شروع ہو گئیں۔ اب پریمیا بھی ایک دن بعد آجائے گی! پھر کیا ہو گا؟ وہ اس آئینے میں اپنی صورت کیسے دیکھ سکے گی۔ اس کی وحشت بڑھتی گئی۔

دوسرے دن صبح لائبریری میں لڑکیاں سر جوڑے اخبار پر مکھیلوں کی طرح جھمی ہوئی تھیں، کچھ بلند آواز سے پڑھ رہی تھیں۔ جیسے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو متاثرین لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک کے بعد دوسرا گویا اخبار پر جمع ہو رہا تھا۔ ”چہ... ہا... بیجاری پریمیا...“ اس نے کسی کو کہتے سنا اور اس کے ہاتھ سے لڑ کر کتابیں چھوٹ پڑیں۔ مجرم کی طرح نظریں نیچی کیے وہ منتظر رہی مگر پریمیا نے شاید اُسے دیکھا نہیں۔ اس کی نظریں اخبار کی طرف اٹھیں۔ لڑکیاں اُسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، آہستہ سے وہ ابڑھی، احتیاطاً کرسی پر بٹھ گئی۔ رات کو راتے صاحب بارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ یہ اُن کی پرانی بیماری تھی جس کا یکا یک حملہ ہو گیا۔ وہ خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی رہی کسی نے کلاس چلنے کے لیے شانہ ہلایا اور وہ چلنے لگی لڑکیوں کی روکے ساتھ۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ ایف اے کلاس نے اُسے اپنی جماعت چھوڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر روکا۔

”ہیں؟“ وہ ٹٹٹک گئی۔

”تم تعاری کلاس تو پیچھے رہ گئی، یہ اب کہاں جا رہی ہو؟“  
”اوہ، میں نقشہ بنے جا رہی ہوں، کل سنگ دوم میں قبول آئی تھی، دوسرے

عین موقع پر بات سوسھ گئی ورنہ غضب ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً پکڑی جاتی تیز قدم وہ سنگ روم کی طرف چلی مگر وہ کافی دور تھا، اُس نے مجھے مرط کر دیکھا کہ کوئی دیکھ کر نہیں رہا ہے اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی۔ اپنی کلاس میں گھس گئی۔

نہ جانے اُس نے اس دن کیا پڑھا اور کیا سنا! آئندہ تو اُس کی آنکھوں سے جب ہی خشک ہو گئے تھے جب وہ دن رات متواتر اپنی بد معاشی ان کی یاد میں رہتی تھی۔ چہرے پر کوئی آثار لاننا کمزوری کی نشانی تھی، مگر پریمیا کی خالی کرسی دیکھ کر اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رائے صاحب نہیں پریمیا مر گئی۔

رائے صاحب مر گئے! اس خیال سے ہی اُس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی۔ اُن کو جلا دیا گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُن کے وہ بال۔ وہ سورج سے زیادہ روشن تاج جلا یا نہیں جاسکتا! وہ کچے سولے جیسی رنگت اور سچے موتیوں جیسے مصنوعی دانٹ۔ ناممکن! وہ خود ہی فیصلہ کرتی۔

رائیس بڑی بھیانک ہو گئیں۔ رائے صاحب اس کے دماغ سے کسی طرح نہ نکلنے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ وہ باقاعدہ اُن سے ڈرنے لگی۔ رائے صاحب سے، جن کے قرب کے خیال سے ہی وہ لرز اٹھتی تھی۔ ایک دن اُس نے ایک ہمارشی کی اسٹری بڑی دھوم دھام سے نکلنے ہوئے دیکھی۔ ہمارشی کو پاکی میں باندھ کر بیٹھا دیا گیا تھا، دانٹ کھلے ہوئے اور منہ پر سیندر، ہلدی اور چندن کے داغ، جلد باسی بنلین کی طرح جھڑکھڑکھ اور سیاہ، اس پر سے ہلکی ہلکی سطرے گوشت کی سی لبساند! پھر تو یہ حال ہو گیا کہ مارے ڈر کے دن کو ایکے کمرے میں جاتے دم نکلتا۔ رات کو معلوم ہوتا دہی پاکی والا مردہ اُس کے سر پر بٹھا ہے۔ وہ ہمت کر کے آنکھیں ٹیرٹھی کر کے دیکھتی اور وہ جھپ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ کبھی بٹی کے نیچے سے ماتھ پھیل کر اس کا گلا ٹٹول رہا ہے، کبھی غسل خانے میں اُس کے پیچھے پکڑے پکڑے پکڑے جاتے جاتے وہ دلیری سے مرط کر دیکھتی اور ایسا معلوم ہوتا کوئی تیزی سے گھبنے کی آڑ میں ہو گیا، جھاڑیوں میں دبک گیا، گیلری میں سرک گیا۔ پسینے چھوٹ جاتے اور بھٹنے لڑا کرتے۔

بعض وقت رات کو کھانا کھاتے میں ایسا معلوم ہوتا کہ مردہ انگلیاں اُس کے  
بچنے میز کے میچے ٹپول رہی ہیں۔ وہ ڈر کر کیر کھینچتی تو وہ ہاتھ بھی ساتھ لٹکا چلا آتا۔ چیخ  
مار کر الگ کرتی تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اُس کی شکلوار کا پانچہ ہے۔

ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی۔ دیکھا رائے صاحب کے ساتھ  
بیٹی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم وہ اُٹھ کر ناچنے لگے، اُن کے بازوؤں کے پٹھے  
پھول پھول کر اُچھلنے لگے اور بال گز گز بھر کے سانپوں کی طرح کھرٹے ہو جھومنے  
لگے، مصنوعی دانت مُرتال میں بجنے لگے، تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے  
اور وہ شمن کی طرف بڑھ گئے۔ اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری لیکن انھوں نے اس کی  
آنکھوں میں آگ ٹھونس دی شمن منتا تر چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے  
مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی۔

”خُن خُن“ کچھ کہا اور وہ اُٹھ کر بے نقاشہ بھاگی۔ وہ بھاگتی چلی گئی اور شاید  
ساری رات اسی طرح بھاگتی رہتی اگر ایک دم چوکھٹ اُس کے ہاتھ پر اچھل کر نہ  
لگتی۔ وہ گر پڑی۔ جب آنکھ کھولی تو رائے صاحب اُس پر جھکے ہوئے کچھ ناک  
میں ٹھونس رہے تھے جو دوزخ کی آچ کی طرح دماغ کو جلانے ڈالتی تھی۔ اُس نے  
پھر چیخ ماری اور اُٹھنا چاہا مگر دو تین سفید سفید لمبوتری شکلوں نے اُسے دبوچ  
لیا۔

”چپ چاپ لیٹی رہو“ یہ پریسل کی آواز تھی۔

”میں نے جیسی ہی طاری ڈالی یہ پاگلوں کی طرح نہ چنے لگی اور پھر بھاگی“ میٹر  
خود نہایت خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

تو یہ میٹر ان تین جھپٹیں دن رائے صاحب کا بھوت سمجھ رہی تھی۔ ان کے سفید  
بال کاغذ کی بتیوں میں لپٹے ہوئے دو محل تاج کی طرح چمک رہے تھے، طاری ہاتھ  
میں تھی اور وہ خود ہسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اُسے بجلی کچھ جانے کے بعد بھی میز پر اوندھا پڑا دیکھ کر



انہوں نے طاریح ڈالی، بس وہ پاگللوں کی طرح بھاگی۔ حسن اتفاق سے اُس کا خواب اور میٹرن کا بیولا ایک ہی کڑی میں الجھ کر دماغی مچل کا باعث ہو گئے۔ صبح تک اُسے زور کا بخار چڑھ آیا اور اسی حالت میں اُسے گھر پہنچا دیا گیا جہاں تین مہینے اُسے ٹائیفاؤٹ نے جی بھر کر کھنچھوڑیاں دیں۔

(۲۶)

بیماری طویل تھی اور ساتھ ساتھ غیر دلچسپ! حال ہی میں اُس نے ایک کتاب پڑھی تھی جس کی ہیروئن شروع سے آخر تک بیمار رہتی ہے اور اس بیماری کے وسیلے سے اُن کے عاشق صاحب کو اس قدر بہترین مرتعے حاصل ہوتے ہیں کہ حد نہیں؛ جب دیکھو جناب مرلینہ کو سہارا دیے دو اپلا رہے ہیں؛ اُس کے نازک ہاتھوں کی نازک ترین ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں؛ اُس کے پیاسے لبوں میں انگور کا رس پھوٹ رہا ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار اُس کا دل بیمار پڑنے کو چاہا کرتا۔ وہ اُن رنگین لحوں کا حسین تصور جس کے خیال ہی سے اُس کی نبھیں اُچھلنے لگیں اور حرارت تیز ہو جاتی تھی۔

مگر اب جو وہ بیمار پڑی تو یہ حال کہ تیار دار تو درکنار مرے سے لوگ اُس کے سامنے چیخ چیخ کر بولتے، بچتے لڑتے اور پٹتے، سامنے برآمدے میں اناج ٹھیکے جاتے؛ ہاؤن دستے میں ہلدی دھنیہ کوٹا جاتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اُس کی آواز نہ نکلتی؛ سامنے لوگ لڑا لڑا کر تاش پچی کھیل رہے ہیں، پانی مانگا تو کون کھیل چھوڑ کر اُٹھتے، زکر کو آواز دی جا رہی ہے اور وہ بھی ایسے تنگھاڑ کر کہ مردے جی اُٹھیں۔ ذرا غنودگی طاری ہو جاتی تو پھر کسی کی ”وہ مارا“ کے نعرے سے آنکھ کھل جاتی۔

سامنے روز لمبا چوڑا دسترخوان بچتا، تر بال اُڑائے جاتے۔ شمع کی روح بلبلہ بلبلہ کر کھانوں پر منڈلاتی آنکھیں خزان دیکھ دیکھ کر پتھر اجاتیں، قوتِ شاد کھانے کی ٹہک کے حملے بہتے بہتے سُن پڑ جاتی۔ بھائی بہن مرے دار کھانے کھاتے دکھا کر

کہاتے اور اسے چڑا دیتے۔ سب اُس کے ندید سے پن کو اُس کی کمزوری اور فطری  
 لپستی پر محمول کرتے۔ اُس کی بیماری کی وجہ سے گھر والے پریشان نہیں عاجز و حذر رہتے  
 جی تو اُس کا ایک دن جلا جب خاندان کے دو بڑھوں کو جنازے کی نماز پر بحث  
 کرتے سنا۔ وہ دونوں اُس کی طرف منہ کیے رہیں لیکن کچھ نہ کہتے اور اسے یہی معلوم  
 ہوا کہ کنایتاً اُسی کی نماز جنازہ پڑھنے کی تاک میں تیا ریاں کر رہے تھے۔ ان میں  
 سے ایک ہر وقت وضو کرتے تھے مگر اس قدر بدبو جسم سے پھوٹی تھی کہ دم لوٹ  
 جاتا تھا۔ دوسرے قطعی خطی تھے۔ شمع ان دونوں میں سے کسی کی پڑھائی ہوئی نماز  
 سے جنت میں جانے کی متوقع نہ تھی۔ پھر چند لوگ بیٹھ کر لمبائی چوڑائی پر بحث  
 کرنے لگے۔ دوسرا ان گفتگو میں وہ کاغذ کے ٹوٹے ٹوٹے موٹے کر تشریح کرتے جاتے۔ پچھ  
 مڑ کر اُس نے سسک سسک کر رونا شروع کیا اور جب وہ سب چلے گئے  
 تو اُس نے ڈرتے ڈرتے اُس کا غری کفن کے نمونے کو دیکھا۔ کس قدر نامافی تھا یہ  
 لباس خدا نے ذوالجلال کے حضور میں جانے کے لیے! بھلا اگر ایک سیلا ہو جوڑا  
 خراب ہو جائے گا تو کون سا ایسا لڑکا آجا۔ ٹے گا؟ موت سے اُسے اور بھی ہول  
 نظر آنے لگا۔

مگر موت اتنی بھیانک نہ تھی جتنی موت کی آؤ بھگت۔ معلوم ہوتا سب کو اس  
 کے مرنے کا پُر اشتیاق انتظار ہو رہا ہے۔ اُسے نفرت ہو گئی۔ سب کے نفرت ہو گئی  
 زندہ یا مردہ وہ ان کے لیے مر چکا تھی یا شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ کون تھے  
 سب اُس کے؟ مانا کہ سب بھائی بہنوں نے ایک ہی ماں کے شکم میں تکمیل پائی تھی  
 مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک مکان میں ہزاروں کمرے دار آتے ہیں، رہتے ہیں،  
 چلے جاتے ہیں، سڑاک پر لکتے انسان چلتے ہیں، چھکڑے گھسٹتے ہیں، لاریاں  
 دوڑتی ہیں، وہ کون ہیں؟ ایک دوسرے کی؟ کوئی نہیں! اُس نے جواب دیا اور  
 وہ اُسے مل گیا۔

تین مہینے کے بعد بخار متھک گیا لیکن اُسے بھی بڑی طرح تھکا گیا۔ ایک تو بیماری

دوسرے اس قدر بغیر دلچسپ۔ جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر پانگ سے کسی تک جانے کے قابل ہوئی تو بجائے خوشی کے اسے رونا آیا۔ بال سب جھڑ گئے تھے، ہاتھ پیر پہلی لکڑی کی طرح خشک اور صورت ایسی جیسے مردہ کفن پہاڑ کر نکلا آیا ہو۔

اسی زمانے میں نور سی بھی ایک بیٹے کے لیے آئی۔ وہ سال بھر سے اپنی دھیال رہنے چلی گئی تھی۔ بڑی آیا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آکر وہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی بہرتے پھٹکارتے سانپ کی طرح پانگ جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر ماتی تھی۔ بوڑھی خزانے ساس اس کے منہ پر بار بار حقارت سے اس گور سے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی۔ وہ خوش تھی کہ بہو جلد ہی جلد بوڑھی ہو کر خطر کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اسی لیے تو اس نے کٹھن زمانہ گزارنے کے لیے میکے بھیج دیا تھا۔ کہ کچھ تو باپ نبھیوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی۔ بات بات پر اسے گردن توڑ بخار کی طرح چڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی پھوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آیا ایک زندہ شہید کی طرح سراو پنا کیسے خاموش رہ جاتی۔ اسے اس ساس سے کافی نفرت تھی۔ یہی تو وہ ڈانٹن تھی جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی؛ وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایک دن وہ ہوگی اور اس کامیاں۔ اگر اسے اس دن کی خبر ملتی تو بڑھیا کے منہ پر خاک ڈال ان تین سالوں کو کلیجے سے نکال رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دیوانی تھی مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ ماعجب نظر آتا تو بل کر خاک ہو جاتی؛

”اے بھی یہ ہر وقت کے چرچے...“ وہ ناک سکڑ کر طعنہ دیتی اور بڑی آیا شرم سے پالی پالی ہو جاتی۔ وہ جلدی سے اپنے آپ کو اس کے ترستے ہوئے ہاتھوں سے چھڑا کر بھاگ آتی اور ساگ بینے لگتی۔ دور بیٹھا وہ حسرت سے نکا کرتا، ارمان

بھرے اشارے کرتا، ترسی ہوئی نظروں سے گھورتا، جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پڑی  
عورت ہو۔ مگر وہ نہ جاتی۔

جو نہی وہ کالج سے آتا بڑھیا اپنے امراض کا پٹلا بکیر کر بیٹھ جاتی اور اُسے  
گھر سے رہتی، جو نہی وہ اپنی جان چھڑا کر بیوی کے پاس آتا وہ بہرہ کو فوراً کسی فردی  
کام کے بہانے بلا لیتی۔ بہو صبر کی سلی کلیجے پر دھڑکے بیٹھی رہتی، مانتا کام میں لگے  
رہتے مگر دل میاں کی آدھ لکھی بات میں۔

وہ اسے کہیں کام میں بھی نہیں لگتا تو جاؤ اسے ہاں نہیں تو، وہ اس کے دل  
کا حال معلوم کر کے نئے طعنے سے اُس کے قدم حکر دیتی۔ جب اُسے یکا یک یقین ہو  
جاتا کہ بہو واقعی نا امید ہو چکی ہے اور بیٹے کا مزاج کافی گرم ہو گیا، چاؤ چوہے  
کا خطر ختم ہو گیا، تب وہ اسے چھوڑ دیتی۔

میاں کا پارہ اُتارنے میں ساری حشادیں، سارے لاڈ، جن کے آمرے  
میں وہ پہاڑ سے دن کاٹتی، مٹی میں مل جہتے۔ وہ بے چھپے لفظوں میں شکایت بھی  
کرتی، معافی مانگتی مگر پڑھا ہوا ہوت لیکن آسانی سے مٹا دیتی اور جاتا ہے پھر سامں کو  
خبر ہو جاتی تو وہ اور بچے پر بھول تبوٹتی۔

وہ اسے ہم نے تو کبھی میاں کی جوتی پہنا کہ نہیں مگر گڑی، وہی بچارے اللہ بخیر  
ہمارے تین سو ساٹھ منہ کرتے تھے، پر آٹھ کل کی لڑکیوں کا تو بس۔۔۔ تو بہت ہے!  
میں جانتی ہیں نصیر پر۔

وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سن لیتی اور یہ سچ کر صبر کر لیتی کہ کبھی تو یہ طعنے دے کر  
کوڑے میں دفن ہو نہ جائیں گے۔ اُسے اللہ بڑھیا پر رحم کرنے لگتا۔ وہ اسے تختہ غسل  
پر لاچار و بے بس آخری سفر کے جیسے تیار دیکھتی۔ اس نے لچکا سا دھ کر لیا تھا کہ اس کا بیٹا  
دخترہ دوسرے جناح سے کوڑے کی تاک لوگ یہ نہ کہیں کہ تعلیم یافتہ ہو کے انھوں بڑھیا  
کی اقبست بھی اٹھائی ہو گی، سالانہ اس سے بچتے یقین تھا کہ وہ کتنے جوانی پر چارہ میل  
کیے جائیں بڑھیا بغیر توفان دیے اپنی ذرا دیتوں کے عذاب اسے نہ بچے۔ سلی کا ہاتھ

بہت تو عذاب بھوگنا ہی پڑے گا۔ اگر یوں نیا زندگی سے کام چل جاتا تو پھر کیا کہنے تھے اور پھر تو وہ فراخ دلی سے نتیجہ کرتے بھی بھڑائی۔  
مگر بڑھیا اُس کے گلے میں جکی کے پاٹ کی طرح لٹکی رہ گئی اور خود اس کی ساتیں سونی اور دن بھیا ننگ کانٹوں سے بھر گئے۔

نوری اب جوان ہو رہی تھی لہذا اس پر وقت بہو کو چال چلن سے رہنے کی تلقین کرتی۔ یا تو وہ غریبے کے ڈر کے مارے کسی سے ملتی جلتی نہ تھی یا اب سارے کنبے کے لڑکوں کی بلا میں لینے پڑی گئی۔ ساس اور بہو نے مل کر لڑکا گئے پر کرماندھلی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی مہمی کا سادھیکٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرایا گیا۔ اُس کے کنبے والوں نے لاکھ اودھم مچائی مگر ایک نہ چلی۔

نوری جب آئی تو نہایت شرمیلی اور فرمانبردار بن کر آئی۔ بڑی آبا بڑی جانفشانی سے ہمیں جمع کرنے لگی۔ اُس نے ایک دم سارے خوجے بند کر کے تنگی میں گزار کر نئی شروع کر دی۔ نوری بھی پھٹے پرانے کپڑے بڑے شرمیلے خوجے ساتھ پہن لیتی۔ ہر چیز ہمیں کے لیے رکھ دی گئی۔ کو لڑکا ابھی میرٹک میں پڑھتا تھا اور انگلینڈ جانے والا تھا اور اس طرح نوری کو کم از کم سات سال امیدواری میں گزارنے تھے مگر وہ آنے والی خوشگوار زندگی کے حسین خوابوں کے نشے میں کچھ بھی تو نہ محسوس کرتی۔ وہ ان چھوٹوں کو چھتے کے جوڑے کی امید میں کلیجے سے لگا کر پہنتی۔

اُسے اب احساس بزرگی بھی ہو چکا تھا۔ اُس نے سارا چلبلا پن چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گورالوں کی طرح سنجیدگی اختیار کر لی۔ وہ شوق سے اپنے آپ کو کچھ بڑی خیال کرنے لگی تھی۔ اُس کا مول اتنی جلدی ہو گیا، اور جس طرح دوکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تولیےز متوقع قیمت پر ہو جائے، کوئی گاٹھ کا پورا آن پہنچے نر باقی کا مال بیکر پڑا رہ جاتا ہے اسی طرح شوق بھی کچھ متیر اور حقیر سی رہ گئی۔ اسے ایک ہلکا سا احساس کمتری بھی ہونے لگا۔ آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی

ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دُوم نچی مرغی کی طرح وہ بدہیئت اور حقیر نورانی کی رومانی کینسی کے آگے ایک متعفن مچھڑا مقدم ہوئی۔

اسی عرصے میں کالج سے لوٹنے میں اعجاز دو چار روز کے لیے آیا۔ جب اُس کا خط آیا تو کسی کو پڑھ کر سنا لے کی مہلت بھی نہ ملی، وہ خود ہی نانگے میں بیٹھ کر گھر تلاش کرنا اُن پہنچا لیکن جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو اللہ کی شان یاد آنے لگی۔ وہی سوکھا مارا بد وضع جانور ایک جھپٹا نوجوان بن چکا تھا۔ اُس کا گھٹا ہوا سر پکیلے بالوں سے آراستہ تھا، قیمتی سوٹ کپڑوں میں رکھے ہوئے کپڑوں کی تہیں بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

اسے دیکھ کر شمع کے دل پر گھونسلہ سالکا۔ معلوم ہوا وہ برسوں کی کھوئی ہوئی چہل نہ جانے کس گم نام کو نہ سے اُچھل کر اُس کے منہ پر لگی۔ وہ خود بخود پیچھے پھسٹ گئی ہوئی جھرو کے مارے ہوئے بالی اور تپتی ہوئی روٹو اور سوکھے ہاتھ زیادہ فواد نے نظر آنے لگے۔ اُس نے اسے دیکھتے ہی ایک دم اُس کے خلاف اکبر، موچیتا عم کر لیا۔ وہ اپنی پرانی نفرت کو اعجاز کے سامنے جھجکتا دیکھ کر ادب بھی چھوڑ گئی۔

اعجاز بالکل نیا چہرہ اُلا برا کر آیا تھا۔ وہ جھینپ اور چھچھریوں کو کوہ اُس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت پورب زبان، منس مند اور ریر۔ آتے ہی اُس نے حیرت سے شمع کو گھورا۔ وہی جلد کی آنکھیں کس گستاخی سے اس کے آگے پار تیرتی چلی گئیں۔

”ارے یہ شمشاد توی دلی، اور تمھاری چٹائی کچھ سے کتر گئے، جی واہ! اُس نے قہقہے لگانا شروع کیے اور شمع جھلا کر رہ گئی۔ لوگوں نے اُسے باتوں میں لگایا، کسی نے بھی تو یہ نہ بتایا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اعجاز کے سامنے اپنی بد صورتی کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتی تھی بلکہ یونہی، کیوں وہ غلط فہمی میں مبتلا رہے!“

وہ اس کی جان کو ایک بلا بن کر آیا، دن بھر قہقہے لگا تاہ آیا تو وہ دن کھی لے

تھا مگر دو ہفتے بعد بھی بہانے بنا کر رہے چلا جاتا تھا۔ لوگ اس میں اس قدر دلچسپی لینے لگے تھے کہ روزہ کسی نہ کسی بہانے سے روک لیا جاتا۔ نور کی تو اس سے خوب کھل مل کر باتیں کرتی۔ وہ بھی اُس کے ہونے والے میاں کی باتیں کر کے چھڑا کرتا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر اُسے اُلجھا کرتی۔

شمن کا جی چاہتا کوئی اعجاز کو اُس کی پُرانی تصدیق دیکھا کر اُسے وہ غلامتیں بھی تو یاد دلائے جو وہ کبھی چھوڑ آیا تھا۔ نہ بہانے لوگ اپنے ماضی کو کس طرح اس قدر آسانی سے جھٹک کر آگے بڑھا جاتے ہیں۔ اُسے ان لوگوں سے سخت نفرت تھی جو پہلے داسے غریب، بد وضع اور کم عقل آج کو بھول کر اس نئے انسان کی آؤ بھٹک کرنے لگے۔ وہ اُسے کیسی کیسی حقاقت بھری کھوکھلیں مار چکے تھے مگر آج اس پر داسے۔ وہی منجھ بھائی جن کے سامنے وہ ناک پا کر اٹھک کر پکا تھا اُسے موڑ میں یہ ایسے قصے، وہی اماں جو اگر وہ کتوں کا کھانا چرایا کرتا تھا تو صبح کا ناشتہ بند کر دیتی تھیں اب مرنے کھانے اُس کے منہ میں ٹھونے دیتی تھیں؛ کبھی دو دن بھی تھے کہ ذرا دیر تک سوتا رہتا تو آج پھر پانی کا لٹا اوندھا کر اُس کی چادر پانی اُٹھ دی جاتی تھی۔ آج دن چڑھتے تک سوتا رہتا پھر بھی لوگ یہی کہتے:

وہ اللہ رکھے جوانی کی نیند ہے، سونے دو یہ شمن سگ کر رہ جاتی۔ لوگ سچ بولتے کیوں ڈرتے ہیں! یہ کیوں نہیں کہتے روپے کی نیند ہے، اس جاؤ اد کی نیند۔ جو اس کے چچانے اپنی زندگی ہی میں اُس کے نام کر دی تھی۔ بڑا ذلیل تھا اعجاز۔ وہ ان کی کھوکھلیں کیسے بھول گیا؛ بیچ کہیں کا! جب لوگوں نے کھوکھلیں بھی نام نہاں اور شا کر رہا اور جب کہ وہی لوگ اپنا کھوکھلیں چاٹ رہے تھے وہ نہایت خوش تھا۔ یہ کیوں اور کیسے؛ مگر شمن اب بھی وہی شمن تھی، وہ اب بھی اعجاز کے وجود پر کھوکھلیں کو تیار تھی۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ تاش کھیلنا، سنی نداؤ کرتا مگر شمن ان سب سے دور کسی نہایت غیر دلچسپ کام میں ڈوبی رہتی۔ وہ اعجاز سے بالکل مخالف سمت چلتی۔ اگر وہ اُس سے کبھی کچھ کہنا بھوچا تھا، تو یہی

کوئی نہایت معمولی سی بات، تو وہ سنی ان سنی کر جاتی۔

جب سے وہ آیا تھا لوگ نئے نئے پلنٹروں سے ہر وقت اُس کی شادی کا ذکر کرتے۔ بڑی آبِ حیا رہی کے تو ہاتھ کٹ چکے تھے، وہ نورنی کے بیسے ہاں کھچکی تھی۔ حالانکہ کئی دفعہ اُس کی نیت بہک بھی گئی۔ سال دو سال میں اعجاز کو کر دیا جائے گا اور وہ ہونے والا دما رہ جائے کب مل نہیں جو تنے کے قابل ہو، اس کے علاوہ اور سارے خاندان کی لڑکیاں اُس کے قدموں میں لا ڈالی گئیں مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔

اتفاق کیسے یا قسمت، اُنہی دنوں بلقیس اور حلیس اپنی خالہ کے یہاں آئیں۔ زمانہ کلب میں اجانب کشم سے ملاقات ہو گئی۔ بلقیس بال برابر ہی تو نہ باری تھی وہی چاہا، پین، تنج، سج کر بولنا اور اپنے اپنے قہقہے شمس سے اس قدر بے پروا کر گیا ملی کر شانے دیکھتے تھے۔ گھل مل کر دونوں میں بائیں ہوئیں۔ بلقیس اپنی خالہ کے یہاں زمانے سے عشق لڑا اُسے اتنی ہوئی تھی۔ خالہ کا گھر اچھا خاصا بھرتی کا دفتر بنا ہوا تھا، شہر کے تمام شادی کے قابل یا قابل ہونے والے لڑکے اُن کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ تین چار اپنی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کے نسب کے لئے میں ملا۔ اُنہی تئیں۔ اُنہیں اس قدر ہمت ہو گئی تھی کہ جس لڑکی کا جس لڑکے سے چاہتیں ہو لڑکا دیتیں، فریقین کتنا بھی چاہیں کچھ بس نہ چلتا نکھٹو اور بد قسمت لڑکے سوچ دیکھتے ہی ہتھ پیر کی جڑا کی طرح چمن زار سے نکال کر پھینک دیے جاتے۔ اُن کا آنا بیکھت قابل اعتراض ہو جاتا۔

بلقیس خالہ کی تمام مہولتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پڑاوان چھوڑ کر اُس نے کچھ دن سلیف اور فیشن سیکھنے کے لیے انگریزی اسکول میں نام کھواں تھا اور وہاں سے ایسی دھار دار ہو کر آئی تھی کہ سند نہیں عجیب بات اس لڑکی میں یہ تھی کہ وہ ہر اس نسوانی حربے کا، جو مرد کو مارنے کے مصداق میں آتا ہے، فخریہ ذکر کرتی، چالاکیوں، خدیغہ نمبوں، درمکاروں کا بڑی مصدقیت سے اعتراف کرتی



”عیسیٰ مجھے خاک پسند نہیں پر جب میں نے اسے ستار سنا یا تو کنجشٹ مر گیا۔  
جلیس نے دامن بچا یا مگر پیاری شرمائی“

”منور حد اٹو ہے، تیرے کل بڑا ڈٹا میرے لیے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ  
کر لایا۔ بڑا پڑھا کو ہے، کہتا ہے: پروفیسر بنوں گا۔ اب بھلا شمن کتنے سال لگ  
جائیں گے! کم از کم چار سال رکھ لو۔ بھلا کون بیٹھا رہنے دے گا مجھے؟ آخر پڑنا ڈٹنا  
پولیس ہے، جان کو اٹکیا ہے مگر میں نے ابھی تو کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ خدا قسم جو  
آخر میرے لیے پڑتا جیسی انکو بھی نہ لایا تو کبھی جو کہ جاؤں منگنی“

”خالد بی کہتی ہیں آخر خاصا ہے مگر میں کہتی ہوں موسیٰ کی جائداد حد بڑی  
ہے۔ تیرے تین سوڑیل ہیں اور۔۔۔“

کلب کے بعد وہ شمن کو اپنی خانہ کے گھر لے گئی اور دوسرے دن دو توں نہیں  
بغیر کہے سنے آدھیں شمن کے گھر۔ یوں تو گھر اچھا خاصا تھا مگر بے سلیقہ بن ادا پارٹی  
کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دو چار ٹوٹی کرسیاں، میسل دریوں کے تخت اور بان کی کھری  
چار پائیوں کے سوا کچھ اٹھنے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔

تھینتی کھینتی شمن انہیں اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس کا کمرہ کہنا بالکل بیجا  
تھا۔ اسی جگہ کچھ صندوق، چینی کے برتنوں کی الماری بھی تھی۔ ایک طرف چھت میں  
جرط اول کا سامان جھول رہا تھا۔ کونے میں جالا لینے کا بانس کھڑا تھا جسے کبھی حرکت  
نہ دی جاتی۔ مکڑیوں اور چھپکلیوں کا پر سکون راج قائم تھا۔

”اپنے کمرے میں چلو نا“ بلقیس نے جیکے بے اس کے کان میں کہا اور شرم کے  
مارے شمن کا بھی مرجانے کو چاہا۔ روپے کی کچھ کمی نہ تھی، پینشن ہی اتنی کافی تھی کہ اگر  
چاہتے تو دھنگ سے رہنا مشکل نہ تھا، مگر پینشن سے پہلے کون سے ٹھکانے سے ایسے  
گھر میں پندرہ بیس لوکر اور مفت خور سے موجود۔ باہر چار چار بھینسیں، گھوڑے،  
کیتے اور مرغیاں وغیرہ بھری پڑی تھیں۔ باہر تو کچھ بیٹھنے کے لیے مونڈھے وغیرہ تھے  
جی مگر گھر میں بڑی بڑی بیویاں بھی آئیں تو شتم پشتم پلنگوں اور تختوں پر چا دیں

بچھ جاتیں۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنے گھر کی حالت نہ بتائی تھی اور بلقیس جلس سے دوچار دفعہ گپ بھی مار دی تھی۔ وہ تو اس گھر میں پیدا ہو کر بچپائی تھی۔ کاش وہ کہیں اور جنم لیتی۔ اتنے بہن بھائیوں کے بجائے دو ایک لائق خالق بھائی اور وہ ایک اکیلی لاڈلی بیٹی ہوتی، کوٹھی بنگلہ ہوتا، صوفے اور کوحیں ہوتیں، چائے واسے چچا اور قربان ہونے والی خالائیں ہوتیں۔ کاش اس کے گھر میں بھی ایک باغ ہوتا اور وہاں نارنگی اور لوکات کے پھول ہرکا کرتے تھیں توڑنے کے لیے اُس کی انگلیاں حسین اور نازک ہو جاتیں، مگر۔ یہ تو اسے خواب میں بھی میسر نہ ہوا، اس نے خواب بھی سدا سجد ایک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور جڑیلوں کی دنیا کے۔

دو بلقیس اور جلس کو لے کر احاطے کے ایک سنان کونے میں چلی گئی۔ یہ کہہ رہی کوڑے کرکٹ، ٹوٹی ہوئی اینٹوں، بوسیدہ ڈلیوں اور ٹوٹی ہوئی چھینکوں سے ڈھکا پڑا تھا مگر بلقیس بڑی بے تکلفی سے دھلیز پر اخبار کا کاغذ پکھا کر بیٹھ گئی، جلس فوراً ہی کے دو انٹرنیٹ اور ایلیاں بیٹھ چلی گئی۔

گھنٹوں سر جوڑے وہ نہ جانے ایک دوسرے کو کیا باتیں بتاتی رہیں۔ بلقیس نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح تندہی سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے اور وہ تمام تیاریاں یہ تھیں کہ اتنے ڈھیر سے لڑاکوں میں سے ایک زندگی کا ساتھی چننا تھا۔ اتنے جنوں میں سے ایک کو چن لینا اور باقیوں کو مونڈ اچھلی کے تھیلوں کی طرح جھاڑ دینا بلقیس جیسی جذباتی لڑکی کے لیے کتنا مشکل تھا

”آخر تھیں محبت کس سے ہے؟“

”محبت جو بچ پوچھو تو مجھے عباس سے ہے بچپن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے

ہیں اور پھر ہمارے خیالات بھی ایک جیسے ہیں“

”چھ... جھوٹی پہلے کہنی تھی میں انسا پر مرتی ہوں، بڑا قوم پرست ہے۔

یہ ہے، وہ ہے، دشمن نے جڑ کر کہا۔

”ہے تو وہ قوم پرست ملک میں پڑتا تو گزر کیسے ہو سکتی ہے اس کی؟ بھئی بات

یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے موسیٰ پسند ہے۔“

موسیٰ نے اس پر ہنسنے لگا۔ ”مجتبٰ میں تو انسان ان باتوں کو سمجھتا بھی نہیں“

”مگر اہل میں تو مجھے آخر ہی سے زیادہ محبت ہے“

”جنتہ و آخرتہ سے اس کی نئی مورت ہے“

”چہرہ بھی تم تو ہو یونوف۔ موسیٰ اس کی خاک پسند نہیں۔ خدا قسم موسیٰ کی مورت دیکھو تو برابر جاؤ“

”تو پھر ثابت ہے“

”محبت تو غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر۔۔۔“

”مگر؟“

”مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے۔ کیوں نہ نہا بھی؟“

”کیوں؟ یہ تو بالکل زندگیوں جیسی بات ہوتی“

”ہشت، زندگیوں جیسی کیوں ہوتی؟ اگر ہے بھی تو کیا ہوا؟ شمن ایک ہی

تو بات ہے“

”کیا؟“

”ہاں بھی، دیکھو۔۔۔ آپ جیسے۔۔۔۔۔ ابھ بھی مجھے نہیں معلوم تم تو بحث کرتی ہو

پہ تو بہ ہم کیا باتیں کر رہے لگے؟ شمن شمن نے کل نماز پڑھی تھی“

”اچھا؟“

”ہاں، آخر نے کہا تھا میں شلواری میں بالکل لیلیٰ معلوم ہوتی ہو۔ وہ جو

میرا لانا ان کات روں والا دوپٹہ ہے میں نے ایرانیوں کی طرح لپیٹ کر اوڑھنا تو کہنے

لگا۔۔۔ وہ کچھ ٹرکی۔

”کیا کہنے لگا؟“

”دیکھنے لگا لاؤ تمہاری تصویر کھینچ کر دیلی میں بھیجوں گا۔ میں نے کہا جائے نماز

پر کھڑا ہو جاؤں تو زیادہ اچھی رہے گی۔ مگر شمن کھڑے ہو کر تو عدیری لگی تو میں

”بیٹھ کر دے مانگنے لگی۔ تصویر کھینچ کر.... ہی.... ہی“ وہ ہنسی۔

”کیا؟ کیا؟“

”وہی کھینچ پیار کر لیا، بدترین کہیں کا؟“ بلقیس بنا کر ٹرمانے لگی۔  
 دونوں ہنس رہی تھیں کہ اعجاز خالص معشوقانہ انداز سے رعیت کھانا ہوا برآمد۔

میں بکلا۔

”اودھ؟ معاف کیجیے گا؟“ وہ جلدی سے مڑ کر جاتے لگا۔

”خدا“

”کیوں؟“

”کہن تھایہ؟ ہائے بالکل فریڈرک مارچ کی سی شکل ہے۔“ بلقیس نے زور سے

شتمن کا بازو مسل کر لیا۔

”ہے ایک، ہمارا رشتے کا بھائی“

”اچھا؟ بے ایمان کہیں کی؟“

”دادا،“ شتمن مسکرائی۔

”جان ہے خدا قسم، شرط یہ تم مرنی ہو اس پر۔“

”ہمنہ، کبھی بھی نہیں۔“

”ہائے بڑی بد مذاق ہو۔ خدا قسم وہ.... وہ دیکھو ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔“

تھیں گھوڑا ہو گا۔“ وہ پھر انزائی۔

”چپ گدھی کہیں کی؟“ شتمن نے اس کے خوب چٹکیاں لیں۔ کوئی ٹیغزبانوس سی چیز

دل میں کلبلائی مٹو رہ چلائی ہی رہی۔

جب بلقیس اور جلس جاملے گئیں تو اعجاز پھر باہر نکلا کہ کسی نوکر سے فصول باتیں

کرنے لگا۔ جب ان کی موڑ چلی گئی تو وہ شتمن کی طرف مڑا، وہ جلدی سے اندر چلی آئی۔

شام کو کھانے کے وقت اعجاز جان بوجھ کر اس کے پاس گھس کر بیٹھا کہیں بلقیس

کی باتیں سن کر وہیں یس بد مذاق ہے؟ وہ پیار بیٹھی باتیں بھی کرنے کی کہ شتمن کی مگر

شمن نے کسی بہانے سے اٹھ کر جگہ بدل لی۔ وہ پان لگا رہی تھی کہ پاس آ بیٹھا۔  
 ”ایک ہمیں بھی، پر بھئی منہ نہ کاٹ دینا،“ وہ اتر کر بولا۔ شمن نے جب پان دیا  
 تو اُس نے اُس کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی، شمن نے جل کر پان چھوڑ دیا۔ یہ فرسودہ روٹا  
 اُسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اسے ان گونگے عاشقوں سے سخت نفرت تھی جن کا رواں بولتا  
 ہے پر منہ سے نہیں پھوٹتے۔

دلاؤ میں پڑھا دوں ”اُسے پڑھنا دیکھ کر وہ پاس آں بیٹھا۔  
 ”پڑھ جا، یہ شمن نے شرات سے کتاب بند کر دی اور جوتا پہنتی چل دی۔ وہ خوب  
 اُس کی چالوں کو پیمیاں رہی تھی، وہ آج پھر وہی پرانا بھوکا اتو معلوم ہو رہا تھا اور اب  
 گر دیسے منڈا رہا تھا جیسے گوشت پر چل۔ شمن جان جان کر اُسے دیکھا رہی تھی۔ اچھا  
 کو پاس آ بیٹھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ترقی محسوس کر رہی تھی۔

دو دن تک وہ ترنار ہا مگر شمن نے اسے بولنے کی مہلت نہ دی ہنگرات کو جب  
 سب کچھ سوچ لے تھے وہ باہر سے کسی بہانے سے آیا۔ پہلے تو وہ حسبِ عادت دکھانے  
 کے لیے کچھ ڈھونڈتا رہا، پھر پانی پینے لگا۔ ”رک رک کر اُس نے پورا گلاس چروٹھا لیا۔  
 شمن ہنسی وبائے خاموش پڑی رہی۔ وہ مڑا تو شمن نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ وہ  
 واپس لوٹا۔

”شمن“ اُس نے آہستہ سے پکارا۔

”کب ہے؟“

”یہاں بیٹھ جاؤں،“ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اچھاؤ پلنگ کے کونے  
 پر بیٹھ گیا۔

”شمن ایک بات کہوں؟ کئی دن سے...“ اس کی آواز ٹنگ گئی۔ شمن کے ہاتھ  
 پیرسٹن ہونے لگے، جملہ حواس ایک لفظ پر جمع ہو کر پھٹنے لگے، اُس نے سانس روک  
 لی۔

”تم جانتی ہو دو سال کی ٹرننگ ادھر ہے اور پھر کسی اچھی جگہ پوسٹ ہو جاؤں گا۔

چچامیاں کی جانڈ ادبھی کافی ہے مگر میں سوچتا ہوں شملہ پر ایک کوٹھی خرید لی جائے تو.....

”کوٹھی اور باغ... نانگی کی کلیاں... شمن کی انگلیاں اٹھنے لگیں۔

”میرے خیال میں میری حیثیت کا انسان ایک تعلیم یافتہ لڑکے کے بیٹے ناموزوں تو نہیں... ٹھیک ہے نا“

”عجائز“ اُس نے سانس کو پھیپھڑوں میں گھونٹا۔

”ہاں شمن۔ یہ لوگ تو جاہل ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔ احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں۔ تو بس اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ...“

”میرے... میرے ہاتھوں میں...“ شمن نے زور سے ہٹھکیاں بھینچ لیں تاکہ وہ نامعلوم سی دولت کہیں رنگ نہ جائے۔

”وہ تمہاری دوست ہے نا...“

”ایں؟“ شمن نے مضبوطی سے ٹیوب میں ہوا روک دی۔

”ہاں... بلقیس تمہاری پرانی دوست ہے... تم چاہو تو شادی کروا سکتی ہو۔“

”مگر...“

”بھئی دیکھو بہانے مت بناؤ۔ ہماری بھینو کیسی، خدا قسم جو تم کہو گی... وہ تمہیں ہارڈی کا چمڑے والا پوسا سیٹ پسند ہے نا...“

”مگر...“ اُس نے اُسے روک کر کہا، ”بلقیس کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے

..... معاف کرنا آج...“ وہ بضد ہوئی، ”وہ ذرا اور قسم کی لڑکی ہے“

”مگر شمن... میں کافی آزاد خیال ہوں...“

”میرا مطلب ہے اسکل لڑکیوں کو آزاد خیالی سے زیادہ کلچر چاہیے...“

”تو...“

”اور وہ خاندان دیکھتی ہیں، معاشرت دیکھتی ہیں۔ بلقیس کے امیدوار زیادہ تر

تو لڑکوں ہی کے خاندان سے ہیں۔ دوسرے تم سوچتے ہو یہ تمہاری چاہندا بہت ہی

نہر دست ریاست ہے کہ....  
 ”میں یہ تو نہیں کہتا...“ اعجاز کی آنکھوں میں اُسے مہوک اور شکست بھلتی نظر آئی۔

”فضول بکواس ہے“

اعجاز مہر جھکا۔ ”پہلا گیا، وہ خاموش ہے جس وحکت پر ہی رہی، کچھ نہ سوچا۔ اُسے تو بس ایک احساس تھا کہ اُس نے نارنگی کے چھاٹ میں ہاتھ ڈالا اور کسی زہریلے ناگ نے پھی مار دیا۔ زہر کی طرح کوئی چیز سذناقی لہراتی اُس کے دماغ کی طرف چڑھتی چلی گئی جسے جھٹکنے کی بھی اُس نے کوشش نہ کی۔

کیا اُسے اتنے مجتہد ہو چلی تھی؟ چہ۔ تو بہ کیجیے، اس واسطے کہ سوتج کہ وہ منس پڑی۔ پھر؟ اس نے اس کا جواب پانا ضروری نہ سمجھا۔

اعجاز کے جانے سے پہلے اُس کی شاہی کا ذکر چھڑا، وہ کچھ دل برداشتہ سا رہا چونکہ شمن کے والد نے اُس کی پرورش میں کافی پیسہ خرچ کیا تھا اس لیے پہلا حق تو انھیں کو پہنچتا تھا۔ اس سے قبل کہ کچھ اعجاز سے کہا جاتا اُس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز سے علاوہ ہر جا نور سے شادی کر سکتی ہے۔ جھگڑے سے اُٹھتے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونڈ رکھے مگر کالچ جا کر اُس نے صاف صاف انکار کر دیا اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ ساخنہ اندان میں تاریخ ہو گیا۔ اعجاز کچھ کھینا نا اور مختصر سامہ گیا۔ بلقیس کا ذکر اُس نے کسی سے نہ کیا۔ اور شمن؟ زور لگا کر اُس نے ہر گرفت سے چھلنا شروع کیا۔ بغاوت! اُس کی رگ رگ ضرور سے پھڑک اُٹھی۔ اُسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہوئے گی۔ اُس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیے، امیدیں خاک میں ملا دیں۔ اور! کتنی ظالم تھی وہ؟

(۲۷)

ایلیا کو دیکھ کر تو وہ اُس سے پست ہی لگتی۔ اُس کے کاندر سے پرانا تھڑکے رکھے تو وہ

دورخ کی آگ میں سے بھی سکراتی ہوئی گزر جاتی۔ وہ اس دفعہ ایک تحفہ لائی تھی نا ایلینا کے لیے، ایک باغی کی گود میں وہ ایک نیا باغی ڈالنے لائی تھی۔ ایلینا نے اپنی جادو بھری آنکھیں اس کی نظر آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا اٹھی۔

”کیوں؟“ اُس نے صرف اتنا پوچھا۔

”میرا دل!“ بجائے لمبی چوڑی تفصیل کے نئے باغی نے پیر جھائے میدان میں۔  
 ”Good“ ایلینا نے مسرت سے جھوم کر کہا، ”ٹھیک کہتی ہو کسی کو ہم سے کیوں؟ کہنے کی جرات ہی نہ ہونا چاہیے۔ آؤ چلو“ گہرے چیلے کی بانہہ پھڑکی۔  
 اسی دن ایلینا نے اُسے یونیورسٹی کے یونین کے صدر اور سیکریٹری سے ملا یا۔  
 بہت تیزی سے غم نے اُسے دنیا کے اُس رخ کو دیکھ لیا جہاں انسان اپنے گھونگے جیسے خول سے باہر نکل کر اپنے وجود کے سوا بھی کچھ دیکھتا ہے۔

وہ ایلینا کے کمرے میں گئی تو ذرا دیر کو ٹھٹاک کر رہ گئی۔ اس کے منگ پر یونین کا پریزیڈنٹ افتخار بیٹا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینرپا کر لوٹنے ہی والی تھی کہ ایلینا سیر پر تولیہ کو صافنے کی طرح لپیٹے غسل خانے سے نکلی۔ اُس نے شمن کا تعارف کر لیا۔  
 گودہ افتخار سے اچھی طرح واقف تھی مگر بات چیت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلینا بال سکھانے لگی اور شمن سے چائے پانے کو کہا۔

”دودھ بالکل نہیں، شکر ایک چمچ،“ افتخار نے تیکہ پر سر گھما کر حکم دیا۔  
 ”یہ سرطی چائے میں دودھ ہمیں لیتا بلکہ نیبو پھوٹ لیتا ہے“ ایلینا نے تشریح کی۔  
 ”نیبو؟“

”جی ہاں، آپ نے کبھی نہیں پی روسی چائے؟“ افتخار نے بات اٹھالی۔  
 ”روسی چائے؟“

”ہاں، روسی چائے میں نیبو ڈالتے ہیں۔ آپ بھی آزمائیے، بڑی مزہ سے دار ہوتی ہے یہ شمن نے چمکیاتے ہوئے نیبو اٹھا کر پیالی میں پھونکا دیا۔  
 ”اور لوگ تو ابھی تک آئے نہیں، سیتل سیدھا وہیں پہنچ جائے گا،“ یونین کے



آزاد اور ترقی پسند گروپ کی میٹنگ پکنک کی صورت میں کھلے میدان میں ہونا قرار پائی تھی۔

”کیا مس بوگا بھی چلے گی؟“

”لو! مس بوگا نہ چلے گی تو پھر جا ہی کون سکتا ہے۔ مگر کیوں پوچھا تم نے؟“

”یونہی، ایسے ہی۔ بات یہ ہے کہ مجھے کمبخت سے نفرت ہے۔ عورت ہے کہ...“

وہ کچھ کہتے کہتے رگ گیا، پھر تیزی سے بولا:

”کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم کسی طرح اُسے بھولے سے چھوڑ جاتے“

”اے وہ اپنی موٹر سائیکل پر دندناتی چلی جائے گی۔ تم نے دیکھی نئی موٹر سائیکل

لی ہے اُس نے“

شمن بڑے انہماک سے چھچھلا رہی تھی، افتخار نے اسے غور سے دیکھا:

”یہ اب جینی گھل رہی ہے“ وہ ابرو سے اشارہ کر کے بولا، ”میرا مطلب ہے

پیالی کی چینی۔ کب تک چلا بیٹھ گی، کچھ دیر میں پسینہ سے میں سوراخ ہو جائے گا“

ایمان نے دانت چمکا کر اپنی مخصوص منہی اگلا شروع کی اور شمن نے جھینپ کر پراسا

گھونٹ چڑھا لیا، دوسرے اُبکائی آئی اور وہ منہ پر دمال رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔

”یہ ۰۰۔ یہ چلے؟“ نیبو سے دودھ بھٹ کر گدے رنگ سے لوتھڑے چائے

میں لوبکیاں لگا رہے تھے۔

”خوب! ابھی دودھ ڈالو تو نیبو نہیں پھوٹنا چاہیے“ افتخار نے اُس کے لیے نئی

چائے بنائی یہ روسی چائے پیئے کے لیے مذاق ہونا چاہیے“

چائے پی کر گروہ کے گروہ شہر کی حدود سے باہر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔

کچھ تاخیر میں اور کچھ سائیکلوں پر لڑکیوں کو بٹھائے قبضے دکھاتے چل دیے۔ راستے

میں مس بوگا اپنی نئی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر، کالج کے مشہور کھلاڑی، کو بٹھائے سب کی

آنکھوں میں دھول بھونکتی نکل گئیں۔

آسمان گہرا لا جو ردی اور شفاف تھا، معلوم ہوتا تھا گاڑھی گاڑھی وارنش

کی ہوئی ہے۔ خشک ہوا موسم خزاں کی، نیم مردہ پتیوں کو ادھر سے ادھر گھسیٹتے پھرو ہی تھتی۔ گو ہوا ہلکی پھلکی اور نرم پڑ گئی تھی مگر اس کا ہر ٹپا پنجہ جسم میں زندگی دوڑا رہا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے پچھتے چھدرے پیرطوں کے نیچے تے کھلنی سے بھر گئے۔ دو جٹا لفظ عناصر کے لطیف اور اچھوتے ملاپ سے فضا میں بہا ہوا جی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مردانہ آوازیں زیادہ بھاری بھر کم اعلیٰ لڑکیوں کے قہقہے زیادہ مریٹے ہو گئے تھے۔

لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی، لہذا ایک ایک لڑکی بطور تیرک پر گروپ میں بانٹ دی گئی۔ یوں ایسا ہے جدا ہو کر شمن ایک بالکل نئے اور جھینپو قسم کے بیز ڈیپ گدوہ کے پتے چڑھی۔ قدم پھونک پھونک کر نہایت عالمانہ اور شستہ گفتگو شروع ہو گئی اور بہت جلد سب کی قابلیتیں جواب دے گئیں، بے طرح دم گھٹنے لگے۔ ادھر ایسا کہ گردہ میں یونیورسٹی کے پتے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے۔ ان کی آب و تاب دور جی سے لوگوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ ایک طرف مس بو کا چند بے فکر وں کے جھانکے ہیں اپنی کھردری آوازیں انگریزی کے مزاحیہ گیت گانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تالیاں بجاتے ہیں ان کی بانہوں کا پلیدل گشت تھل تھل ہل رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں آدھا گھسا ہوا افتخار سب سے الگ چیلوٹیوں کی قطاروں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا، گویا وہ آیا ہی اس غیر ضروری کام کے لیے تھا۔ شمن کے سامنے، جن میں سے اکثر ایسا کہ پرستار تھے، بے چینی سے اس کے قرب میں پہنچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے مگر عجوبہ بیٹھے شمن کو جھگت رہے تھے، ورنہ ان کے دل تو ایسا اور مس بو گاکے قہقہوں کے متبادل پر ناز رہے تھے۔

شمن کو اس گھٹے ہوئے سکونی سے سخت گھراہٹ ہو رہی تھی نہ اس کا پس چلتا تو وہ خود بھاگ کر ایسا کہ قرب میں پہنچ جاتی یا کم از کم یہی معلوم کرتی کہ افتخار جھاڑی میں الجھا ہوا کون سے معسے سلجھا رہا تھا۔ ساتھیوں کی بیوقوفانہ خاموشی سے وہ جی ہی جی میں سلگ رہی تھی۔ فضا نہ جانے کتنی دیر گزر رہی تھی اگر سیتل اور ایسا میں پرچوش

جب تک نہ شروع ہو جاتی۔ سیتل ایلیا کا برابر کی سپرٹ کا مقابل تھا گو ایلیا اُسے بر میدان میں ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی تھی، پھر بھی وہ سبب بھی مڑا کر دیکھتی اُسے جیتا مٹا پاتی۔ ان دونوں میں قابل رشک نفرت تھی۔ اگر ایک دن تھا تو دوسرا رات۔ جتنی ایلیا پر اسرار تھی اتنا ہی سیتل چٹیل میدان کی طرح سبے لذت۔ ایلیا انتہا کی تلخ اور تیز، سیتل حد درجہ بے فکر اور مسخرہ، اگر کٹ کے علاوہ انگریزی شاعری میں بھی ٹانگ اڑی ہوئی اور یہاں اس کی ایلیا سے ٹڈبھڑ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ سیتل کے بازو گوریلے کے سے اور سینہ گینڈے کا سا لیکن دماغ اُونٹ سے بھی بدتر۔ وہ شاعری سے اتنا ہی دور ہے جتنے ٹیگر گلی ڈنڈے سے۔ اس پر ہر موقع پر ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے۔ زبانیں دونوں کی تیز تھیں لہذا لوگ بے چینی سے ان دو متضاد عنصر کے ٹکرانے کا انتظار کرتے۔

آج ایلیا ہندوستان کی آبائی غلامی اور ناداری کا علاج واحد ایک، سرے سے عام تباہی اور قتل تجویز کر رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اس کی سسکتی ہوئی قوم کو آپ حیات نہیں بلکہ زہریلی گیسیں ملنا چاہیے تاکہ ایک بار بالکل نام و نشان مٹ جائے۔ طاعون کا علاج کیدیم کے انجکشنوں سے نہیں بلکہ لوسہ سے داغنے سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ صدیوں کا سمویا ہوا زہر مریموں سے نہیں بلکہ زہری سے پختہ جاسکتا ہے۔

سیتل نے تیلے ہند جہول میں ا۔۔۔ ایک نیم حکیم خطرہ جان سے تشبیہ دے رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں جو علاج نہ جانے۔

”وہ ڈاکٹر نہیں گدھا ہے جو ایک عضو کے مڑھانے پر اسے جڑ سے کاٹنے کے بجائے زہبک کی مالش تجویز کرے۔ یہ صدیوں کے نبھاتے ہوئے کیڑے! عبث ہے ان میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا۔ مٹی کا تیل چاہیے تھوڑا سا“

”وہ بے جان تو نہیں، ہاں کمزور ہیں“

”تو کیکٹ کھلائی چاہیے ان سب کو“ ایلیا کے حق میں قہقہہ پڑا۔

"ہاں، اور حقوڑی سی شاعری کی خوراک... سو اسے سس بوڑگا کے کسی نے  
 داد نہ دی۔ اُن کی ہنسی میں چنگھاڑ تھی کہ سب کے قہقہے ماند پڑ جاتے۔ ایسا انہیں مادہ  
 چرخ کہا کرتی تھی۔ وہ زندگی کو پلکے پھلکے بغار سے کی طرح ہوا میں لہراتا دیکھنا چاہتی  
 تھیں۔ اب ایک نئے تیسرے مضمون ہیں۔ ایم۔ اسے کمر ہی تھیں اور اُن کے دویہ سے  
 معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے ہر مضمون کو لے کر ایم۔ اسے کمر ڈالیں گی۔ مگر ایسا کما خیاں  
 تھا کہ علم سے زیادہ انہیں کالج کی زندگی کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی۔ یونیورسٹی کی  
 چھار دیواری کے باہر اُن کی زندگی صفر کے برابر ہو جاتی تھی۔ سوائے پروفیسر ویس  
 اور کالج کے لڑکوں کے انہیں کسی سے بات کرنی بھی نہ آتی تھی۔ انہوں نے بہت چاٹا مار  
 نئی زندگی کی عادت ڈالیں، کہیں نوکری کر لیں مگر کچھ ٹی نہ چلی۔ تانگے میں جتنے کاغذی  
 ٹوٹے کھلے میدان میں کلیں کرنے سے شرماتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پیارے ایشی بڈ شیکل تھیں اور  
 سوائے کالج کے اُن پر کوئی لٹونہ نہ ہوا بلکہ وہ خود باوجود کوششوں کے کسی پرنٹونہ ہو سکیں۔  
 لکچر ہال، لائبریری، ریڈنگ روم، بورڈنگ کاکھانا، آسٹے دنائے نئے افسانوں  
 کا واحد اور اخراج۔ انہیں اس کی ایکسپلٹ پڑ گئی تھی۔ وہ ہر نووارد پر قابض ہو  
 جاتیں، اُسے ساتھ لیے لیے تمام اصول اور یونیورسٹی کے عجائبات سے دوچار کر لیتیں  
 بالکل ایک غنیمت کرنے والی ماں کی طرح وہ ان کی چھوٹی موٹی پریشانیوں کو پرانے اور  
 شرمیلے لڑکوں کی بد معاشیوں سے بچا لیتیں۔ عباس، ایک بالکل ناناہ فرسٹ ایئر فول  
 کو تو وہ بالکل پوٹے تانے چھپائے رکھتیں۔ لیکن ہر نیا شکار کچھ دن بعد اُن کا شکار ہی بن  
 جاتا، اُن کے دوست شفقت کی گیمروں سے اکتا جاتا اور اُن کا انہیں مشق ستم بنانا  
 جنسی اعتبار سے وہ ایک عجیب و غریب جملہ تھیں۔ سنا ہے جب وہ سانس میں  
 ریسرچ کر رہی تھیں تو پروفیسر سترم نے اُن کی بڑی راہ در ستم تھی، یہاں تک کہ بار بار  
 بچے تک بیٹھی سانس کی گتھیاں سلجایا کرتیں، لیکن ایک دن جب منشا کی پرنسپل سے  
 جملہ تھیں نہایت ہی دقیق گفتی سمجھا سنے کا کوشش کی تو انہوں نے تیرا بے بسا انہیں  
 دندھا کرتے کرتے چھوڑا۔ اب تک ننھے سے سہمے ہوئے بچے کی طرح اُس حادثہ

کی تفصیل بیان کرتیں، اور اس سبب سے لڑکوں کے ہر موافق کا جواب دیتیں کہ وہ ہنستے ہنستے بہ حالی ہو جاتے۔ وہ ذرا بھی نہ جھینپیں اور پروفیسر کی دھمکے اور نالیوں کی تشریح عمل کر کے سب سے کہتی جاتیں۔

ایسا کہتی تھی کہ افتخار بھی کبھی زندہ نہیں رہا، ان کا چہنچہا تھا پر اُسے ان سے اس دن سے نفرت ہو گئی جس دن انہوں نے عشق و محبت کا کچھ عجیب بھونٹا لے اور لکھنا دس نے پن سے ذکر کیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ وہ نہ ہی افتخار لکھنؤ ان کے کمرے میں بیٹھا رہتا، وہ سر پر بنا کرتیں اور افتخار ان کے ڈاکو پر سر رکھتے پڑا رہتا۔ وہ اُس کی دست درازلیوں کو خلیاں جھکتیں اور اشارے کناس سے کہہ دیتیں۔

آج کل وہ ہر طے اور شور سے سیتل پر کر مضرعاتیں۔ دوسو بیڑی کر دسے چکی تھیں اور وہ دن بھر موٹر ٹیکس پر لا دسے پھرتا۔ اس کی ہر بات پر ڈاکو زلفی، اور ڈاکو فیس، کہتیں گواہی آسے اچھے خاصے تعلقات تھے مگر سیتل کی بیٹی تھیں اپنا فرض سمجھتیں۔ جب سیتل نے ایلیمینٹس یا نیما نے خیا لاتے کا مذاق اڑایا تو وہ جوش سے چیخ پڑیں، اور جب ایلیمینٹس کو چھوٹا ہوا چھوٹا کہہ دیتی تو سیتل کو پٹہ ہو سکتے ہیں کی طرح چھوٹا رہیں جس پر اس کا منہ سرخ پڑ جاتا۔ لڑکوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اسے گود لینے والی ہیں اور ڈاکو فیس ہو ان کے پایا کی کپڑوں کی ٹائیس ہیں وہ سب اسی کو ٹائیس گی۔

سیتل نے مار تے ہوئے پہلے ان کی طرح ٹیٹو سے بر حملہ کیا:

”خورت کو سیاست سے کیا تعلق؟ اُس کا تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ...“ ایلیمینٹس نے انہیں ان سے چپکے اٹھیں۔ وہ سیتل کے اس حملے کے آگے کچھ بے دست پا ہو جاتی۔ مگر قبل اس کے کہ سیتل صورت کے اس ایک مصرع کی تشریح کرتا افتخار نے اسے محفل درہم برہم کر دی۔ افتخار کے عروج کے ساتھ ہی سیتل کا وجود چاند کی طرح چھوٹا پڑ جاتا۔ وہ کبھی افتخار سے نہ جھگڑتا بلکہ فخر پر ہار مان لیتا۔

افتخار نے فٹ نہایت تھکے ہوئے آنکھوں کی کاپر ڈگر ام بڑا ڈالا۔ ایک لڑکے کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی سب گہرا ناکہ کھڑا ہے۔ نیا اور شرمیل لڑکا داسی

دیر میں تھنہ، مشق بن گیا۔ گھنٹوں چکر تار مارا کوئی ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصے میں مس بوجھا سریت سے چھینے چھینے بالکل بدحواس ہو چکی تھیں۔ تالیاں بجا کر اور منہس کر وہ کھیل اور تماشا بنائے دیتی تھیں۔ پسینے میں شرابوڑ تازہ سکے ہوئے کیک کی طرح تھمتایا ہوا تھا، بڑھیلے بدنہ بازو جن پر ہنور سے تل چھاپے کی طرح جھبے ہوئے تھے، ہوا میں بات بے بات اچھل رہے تھے؛ باڈی کے بند کھپیل کر کنڑھوں پر سے نیچے آ رہے تھے اور ساڑھی اونچلی نیچی ہو گئی تھی۔ جب ان کے بنائے ہوئے داؤں پینچ لگا کر بھی وہ اڑکا کسی کو نہ پکڑ سکا تو وہ لوگوں کو جان بوجھ کر چور بن جانے کی رائے دینے لگیں۔

رد ادا چھٹکارا! اسما آگے کو! تو کیوں دیکھا ہوا ہے؟ تنگ کیا بھچارا۔ ارے سیتل سنگھ اب بھی تیری باری، تو بن چور۔

جب کسی نے نہ سنا تو کھیل کے تمام اصول توڑ کر چور سے اغلیگر ہو گئیں۔ چور نے اٹھیں فوراً بوجھ لیا اور غریب پر اس معنی خیز قہقہے لے گھڑوں پانی اُلٹ دیا جو اس کے دوستوں نے اس کے حالِ زار پر لگایا۔

مس بوجھا نے محل محل کر بیٹھ ہوا آئی اور تیار اتلا کر ہر ایک کو تیار نہ لگیں لیکن بیچارہ کی خوشی نہایت مختصر رہ گئی کیونکہ انتخاب نے فوراً اس کے بڑھ کر اپنے آپ کو پکڑا دیا۔ کھسیانی ہو کر وہ اسے پھڑپھڑوں سے مارنے لگیں اور ہنستی ہوئی پھر غائبینوں میں، ان میں کھیل بد مزہ ہو کر مصیبت بن گیا کیونکہ انتخاب جب کسی کو پکڑتا جان بوجھ کر اس کا نام نہ بتاتا اور سزا کے طور پر پیر چور بنتا۔ اگر اس کے بچاے کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا گت بنتی مگر لوگ نہایت تندہ پیشانی سے منہس رہے تھے۔

شش کیل سے بے تعلقی نہ جانے کہ بعد کی تھی اور کیا سوچ رہی تھی کھیل سے ذرا ہٹ کر ایسا نظری انتخاب کے لمبے پڑے جسم کے جو سر کی پیڈوں پر بیٹھا لگا رہا تھا لے رہا تھا، ایک عجیب نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سیتل نے کچھ کہا اور ایسا کے زہریلے و انتہائی بھڑپنے کی دھاردار کھپنیوں کی طرح چمکنے لگے۔ سیتل سے اس کی تلخیوں کا جواب ایک طنز پر اسکا اور اس سے دیا اور اس پر بھی ہر می جسم کی طرح

پتیوں پر لڑھکا دیا۔ کراہی خشک پتیاں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح جھلک کر خاموش ہو رہی تھیں، اتیانے اس ہنک آمیز لڑاڑ سے کھسکا کر زمین سے ایک مٹی کا ٹولا اٹھایا اور زور سے سامنے پڑ کے تنے پر کھینچ مارا۔ سیتل نے بروقت قبضہ لگایا اور اب ایسا معلوم ہوا وہ قبضہ اُس ڈھیلے میں چھپا بیٹھا تھا اور ہار یک ذرہ کی شکل میں فضا میں بکھر گیا۔

شمن زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے لگی۔ بے خیالی میں اُس نے دیکھا بھی نہیں اور افتخار نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ ایسی بُری طرح بھڑکی جیسے سچ مچ کے چور نے دلوچ لیا ہو۔ افتخار کی انگلیاں رستی کے پنجوں کی طرح اور مضبوط حکم کی گئیں۔ وہ چھوڑنے والا آدمی نہ تھا۔ غل بچا کر بے انصافی اور بے ایمانی کی دہائی دینے لگا۔ ساتھ ہی مس بوگا پرتالیوں اور چیخوں کا دورہ پڑ گیا۔ شمن کو مجبوراً خاموش کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بھجوانا پڑا۔ حالانکہ افتخار اُسے فوراً پہچان گیا تھا مگر بن بن کر وہ اُسے ٹٹوٹے چلا گیا، ناک کو ہاتھ، ہاتھ کو پیرتا کر سب کو غیب منسایا، خصوصاً مس بوگا تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

”ارے سچے بتاؤ میرے ہمارے ہی گروپ کا کوئی آدمی ہے یا۔۔۔“

روٹی۔۔۔ اچھٹکھا رٹی۔ ہی ہی۔ مس بوگا اپنی جگہ پر دولوں پیروں پر بھڑک رہی تھیں۔

”ارے مونچھیں! نہیں مونچھیں نہیں۔۔۔ کون ہو سکتا ہے؟ سیتل جیسا، قادر ہی۔۔۔؟“ وہ اور بنا اور شمن روٹھائی ہو گئی۔ افتخار نے پٹی کھول دی۔

”ادہ آپ؟۔۔۔ معاف کیجیے گا۔“ وہ مضحکہ خیز ادب سے جھکا اور مس بوگا نے

پھر ہنسی کی چیخیں ماریں۔

افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ شمن کو جیسے گودھ کی بوٹی میں سے نکال کر اُونچے چھوڑے پر کھڑا کر دیا۔ یونین کا صدر محمودی ہستی نہیں، اگر وہ کسی میں دھسپی لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ واپس لوٹتے وقت دس بیس سائیکلیں سٹین کی گئیں، یہاں تک کہ مس بوگا نے اُسے سیتل کے ساتھ ہی بیٹھ جانے کی دعوت دے دی۔

”ہاں، ہاں تم اس کی گود میں بیٹھ جانا“ وہ بڑی معصومیت سے رائے دینے لگیں۔ سیتل نے مسکرا کر شانوں کو ایک استقبالیہ جنبش دی اور شمنی کا جی چاماس لوگا کے ایک زور کی چپت لگاٹھے، جیسے وہ اپنے بدتمیز چھوکر سے کے گندے کلاس میں پانی پلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔

رات کو شمنی الیما کے ساتھ ہی رگ لٹی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی۔ گھوم پھر کر سیتل کا ذکر آجاتا اور ایلما دانت پیس کر رہ جاتی۔  
”مگر جانتی ہو؟“ اُس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔

”کیا؟“

”یہ... کہ مجھے سیتل سے نفرت کیوں ہے؟“

”پتہ نہیں“

”دنیا میں مقصداً و عناءاً ایک دوسرے کے قریب ہی بھڑک اٹھتے ہیں؛ پانی کو قریب پا کر آگ اور بھڑکتی ہے، سیاہی کو دیکھ کر سفیدی اور زیادہ تندہی سے چمکتی ہے۔“

”ہوں؟“ شمنی سوچنے لگی۔

”کیا مجھے سیتل سے محبت ہو سکتی ہے؟ ویسے ہی پوچھتی ہوں۔“

”کیا پتہ ہو بھی جائے؟“

”ہاں شاید، مگر جانتی ہو وہ... وہ محبت کس قسم کی ہوگی؟“

”جانے!“

”اسے دیکھ کر دل میں بڑے ذلیل جذبات متحرک ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے میں ایک گوشت کا لہو تھڑا ہوں، جیسے...“

”کیا؟“

”سمجھ نہیں، تم نہیں سمجھو گی“ مقوڑی دیر وہ خاموش بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی اُنھیں کھولتی بند کرتی رہی۔



”رشتہ... سیتل کو دیکھ کر... بد معاشی کرنے کو دل چاہتا ہے! یہی نا؟“  
اُس نے ہولے سے کہا۔

”ہیو... اللہ نہ کرے۔ نفرت ہے مجھے تو۔“ شمن جھکی۔  
”ہاں ہاں نفرت ہی تو ہے... اور نہ، تم نہیں سمجھتیں؟“ وہ کچھ ادا اس ہو گئی۔  
”دیکھو... مگر ہوتا ہے ایسا... دنیا میں کئی طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ کچھ  
تو ایسے جنہیں دیکھ کر سوئی ہوئی مانتا انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور کچھ ایسے جن کے  
ساتھ دو چار باتیں کر کے جی بھرتا ہے۔“ وہ شمن سے زیادہ خور کو سمجھانے کی  
کی کوشش کرنے لگی۔

”مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ لمبا چوڑا معاہدہ کر کے اُن کے ساتھ  
لمبا چوڑا سفر کرنے کو دل چاہتا ہے“

”سفر؟... کیسا سفر؟“

”زندگی کا سفر!“

”مگر سیتل؟“

”ہاں ٹھیک ہے اور چند ایسے بھی ہیں جن سے ایک بار تجربے کے طور پر۔“  
”تو رہے ایسا؟“

”اور پھر اُن کی صورت سے گھن آنے لگتی ہے، اُن کے قصور سے جی متاثر

ہے، جی چاہتا ہے پھر انہیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور مجھ بول جائیں۔“

”کرے کی دھندلی روشنی میں ایسا کاسا نورا چہرہ اندھیرے غاروں میں جی ہوئی  
کاٹی کی طرح بے جان ہو رہا تھا، اُس کی آنکھیں اور کبھی غیزانوس اور بوڑھی بیو  
رہی تھیں۔“

”عجیب لڑکی ہو۔“ شمن نے جلیبے خود سے کہا۔

”کیا؟ عجیب لڑکی! ممکن ہے عجیب لڑکی کی بیوی نہیں... شاید وہ چپ ہو گئی۔“

”شمن؟ اُس نے پھر کہا، ”جب میں اپنے دل کو ٹوٹ لیتی ہوں تو وہاں بڑے

درختیہ نہ خیالات پیچھے نظر آتے ہیں، تجھ میں جلدی سے وہیں بند کر کے لوٹ آتی ہوں؛  
میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایک دن وہ باہر نکل کر تجھے دلوچ نہ لیں۔ شمشاد، اگر میں ان  
میکوٹوں کو باہر نکل آئی تو... ”  
”کون سے بھوت؟“

”یہی... یہی جو میرے دل میں اُدھڑ پٹا گنگ ناچا کرتے ہیں، مگر بہت برا ہوا  
بہت ہی برا“

”وہ بھی بد قسم تو۔ ایسا پائل کہیں کی، یہ بلا یہ بھی کوئی بات ہے، کجنت سیتل...  
وہ نہیں نہیں، تم ڈر نہیں، میں سو بات کہہ ڈالتی ہوں بھی نہیں کرتی، تجھ میں تم  
جب ایک بار کچھ سوچتی ہوں تو... اچھا سو جاؤ تم، شکست کٹی ہو“  
”اہیں نہیں، تجھے نیند نہیں آ رہی ہے، کہو تم۔ دیکھو ایسا تم اس کجنت سیتل کے منہ  
نہ لگا کر... نہ جانے، کچھ کیوں اس سے ڈر لگتا ہے؟“

”ڈر؟ تو تمہیں بھی اس سے ڈر لگتا ہے؟“ ایسا نے اس کے پاس جھک کر پوچھا۔  
”اور کیا بچی، ایسی کمینگی نہیں ہے“

”اس سے بچتی وہ ڈر... وہ ڈر... اب کیسے بتاؤں، اُنہ، تم سمجھتی کیوں نہیں؟  
ایسا اس کی کندھنی سے عاجز آ گئی۔

”اور وہ کیا کہہ رہا تھا، خورشت کا ایک ہی مصرف ہے، کیا ہے وہ؟“  
”اے وہ، یہی مصرف، جو جو وہ تمہیں سمجھتیں، وہ ہمیشہ ہی کہتا ہے کہ خورشت  
مرد کی دلچسپی کے لیے پہلا کی گئی ہے۔“

”چہ تو رہا منٹوس کہیں کا تو تمہیں غصہ نہ کیا تھا؟“  
”اے؟ نہیں تو تجھے اس بات پر غصہ نہیں کیا تھا بلکہ... جب وہ لڑتا تھا تو  
تم غصہ نہ کیا تھا؟“  
”کیا؟“

”نہ تیرا، اب تمہیں کیسے بتاؤں، اُس کے قہر اور اُدھڑ ٹوٹی ٹوٹی لکیر کی شہلا بھی

اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا... جو...“

”کیا؟“ ”شمن نے ڈر کر پوچھا۔  
”جنہیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ مثلاً جیسے افتخار ہے، اب مجھے اس سے محبت نہیں، ہے بھی وہ بڑا عجیب، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو...“

”اے الیسا،“ شمن بیوقوفوں کی طرح سینے میں سانس لاسے کی کوشش کرنے لگی۔  
”ہاں بھئی، اور کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ... وہ...“  
”مر جاؤ۔ خدا کرے“ شمن بگڑ گئی۔

”لیکن میں ایک لمحے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی... آ... آ...“ اس نے لمبی سی جھابی لی اور لحاف میں پھسل کر لیٹ گئی۔  
”تھک جاؤں، میں تو دو دن میں تھک جاؤں یہ اس نے سونے سے پہلے بار بار تنگی ہوئی جھابیوں کے درمیان دہرایا۔

(۲۸)

الیسا کی پیمانی بن کر کیلاش ہسپتال آنا پڑا۔ پرنسپل اس کی گمراہی پر تیار کر کے پارکیش مجبوراً انہیں درس اخلاق دینے کے لیے اسے نکالنا پڑا۔ اس نے پہلے کیا کیا منصوبے باندھے تھے کہ آزادی ملی تو یوں گلچھڑے اڑائیں گے۔ مگر جب چروایا کہ ہر ایک بار کتر دیا جائے تو وہ پیچھے ہٹ کر باہر بھی قید ہی رہتی ہے اور یہ کاتے ہوئے اس جہنم میں تو نکلتے نہیں، نکلتے بھی تو طوطے کی طرح ہیں۔ دو سرے جب انسان پر خود اپنی نگاہی کا بار پڑتا ہے تو وہ بہت کوتاہ نظر ہو جاتا ہے۔ بھجور کے چھوٹے اور بہانے خود کو دینے میں کیا لطف؟ پھر میں جانے کا بہانہ کر کے سینما اڑ جانا، اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ آزادی سے جلد ہی جی بھر گیا۔ معلوم ہوتا تھا اب کسی کو اس کے چال چلن کی بھی فکر نہیں رہی۔ وہ بلا سے کچھ کہنے کسی کو کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا

لوگ اپنے کان دھوئی کا بوجھ چھٹا کر آہستہ آہستہ اُس کے سر پر ڈالتے جا رہے ہیں، اور رول کی قید سے چھوٹ کر خود اپنی ذمہ داری کی زنجیروں میں جکڑتی جا رہی ہے۔ اس کی ہستی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: ایک محافظ اور دوسری محضوظہ! لاٹری سے نکلنے میں سیتل سے ٹکڑ ہو گئی! یقیناً اتنا تو غیر مرئی نہیں ہوں کہ کھاتی بھی نہ دوں! اس لیے مصنفہ جھلاہٹ سے کہا: شمن نے حال ہی میں عینک لگانا شروع کی تھی، جھینپ کر شیشے رومال سے صاف کرنے لگی۔

”جی ہاں، خوب صاف کر کے دیکھیے۔ ویسے چھوٹ کی چیز تھی باریک تو نہیں کہ خوردبین سے دیکھنا پڑے!“

شمن کو ہنسنا پڑا، سیتل بھی ہنس دیا۔ وہ نیسل لینے جا رہا تھا، لیکن اب تو اُس کے قلم سے کام چل جائے گا۔ ایلیا سچ بتی تھی کہ سیتل کے قرب میں انسان گوشت کا لوتھر بن جاتا تھا۔ اُس نے نہایت بے تکلفی سے اس کے گریبان سے قلم ایک لیا اور قبل اس کے کہ وہ کچھ بڑا مانتی وہ نیزی سے مانی مانگتا ہوا نوٹ لینے پر رے کونے میں چلا گیا، شمن ٹپی ہوئی مشکل لیے دوسرے کونے کی میز پر بیٹھ گئی۔

باوجود کوشش کے شمن سیتل کے وجود کو نظر انداز نہ کر سکی۔ بار بار اس کی نظر اُسی گوشے کی طرف بٹک جاتی جہاں وہ کچھ کتا میں اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکرائے موٹی سی ڈکٹری گھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا اور سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جاتا تھا۔ بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ سوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا۔ اُس کی پھنسی ہوئی سپورٹے شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر بندھی ہوئی تھی۔ مضبوط گردن و رزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار ہلچل بدلتا۔ اس کا کمرتی جسم بالکل اڑدس کے جیسے کی طرح کھینچا ہوا اور سٹدل تھا۔ بھڑپن زیادہ گھنی اور تکیوں آنکھیں از حد پتھر لی اور گہری ہو رہی تھیں۔ جب وہ اپنے ہونٹ روٹھنے کے انداز میں سیکیڑ لیتا تو بالکل خنڈی بچے کی سی شکل ہو جاتی۔



”یہ آپ کا قلم؟“ اس نے گار کھجائے کسے بہانے اسے کالی سے لگایا۔ اس کی آنکھوں نے بتا دیا کہ کیوں قلم دیتے اس کی انگلی ذرا زیادہ دیر تک دب گئی، دشمن نے گھبرا کر قلم چھوڑ دیا۔

”ارے ہاتھ جمل گیا؟“ وہ اپنی پھرتیلی آنکھیں جھپکا کر مینے لگا۔  
دور لاپرواہی سے مڑا کر اس نے ایک پنڈنگ کو دیکھنا شروع کیا، جیسے وہ جانتے جاتے رک گیا ہو۔ پاس رکھے ہوئے اسٹول کا سپہارا لے کر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر دشمن کی طرف مڑا۔

باہر سردی میں تو کھڑا کر گھوم رہے تھے، لائبریری بھی دور نہ تھی، لیکن دشمن کا دل ایسے دھڑکا جیسے وہ سسنان تنہائیوں میں نامعلوم خوف سے بھاگ رہا ہے مگر سب راستے بند ہیں، بڑے بڑے تشرات الارض لمبے چوڑے دیانے کھولے چاروں طرف سے لپک رہے ہیں۔ اگر سیتل ایک لمبی سی چیمری ہے تو اس کا قیمہ کر ڈالنا تو بھی اس میں جنبش کرنے کی سکت نہ آتی، مگر سیتل الونہ تھا، اسے کچھ پھلوں سے نفرت تھی۔ وہ نہایت مہیر سے پرلے کے پیچھے کھڑا ہو بیٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور پھل کے پک کر رسدار ہو جانے کا انتظار کرتا، یہاں تک کہ خود اس کی آنکھیں شش میں دس کی بارش ہو جاتی، محبوبہ اور اسے چکھ لیتا، بالکل زبردستی کی دعوت سمجھ کر۔

سیتل چلا گیا مگر بڑی دیر تک اسے وہ ملا جلی یاد آیا کیے جو بہت دن ہوئے جب وہ اور نوری کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ اسے جھانکا کرتی تھیں اور پھر اس باختم ہو کر کھڑکی سے گر گیا کرتی تھیں۔ وہ جلدی سے کاسن روم سے بھاگ آئی۔

یونیورسٹی میں دو گروہ تھے، ایک تو پروفیسروں کا چیتیا اور دوسرا عزیز، مگر جس کی حرکتوں پر یونیورسٹی کے مٹھانے میں اس کے علاوہ تھوڑی سی نفرت بھی رہا کرتی تھی۔ اس گروہ کے سردار ایلیا اور افتخار تھے، ایسی لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکار تھا۔ اس کی زبان اس قدر طراہ تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو ہکا دیتا مگر جو بھی دل میں کوئی نیا خیال پیرا ہوتا، بڑے بڑے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا۔

اسی لیے منتظین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی، یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اہم موقعوں پر اسی کی رائے سے جہان اور صدر چنے جاتے۔ یونیورسٹی کو کوئی بہانہ بھی نہ تو اسے دفع کرنے کا نہ ملتا تھا، ورنہ وہ تو کبھی کا کھر کی کھے جوئے میں جتا نظر آتا۔

صورتِ شکل سے وہ نہایت معمولی درجے کا انسان نظر آتا تھا۔ عام طور پر ایک قسم کی نا سمجھی اور بے وقوفی طاری رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا یہ اس کا اصلی چہرہ نہ تھا۔ اس کا اصلی چہرہ تو بہت مہوڑی دیر کے لیے صرف پرنسپل نے اپنے دفتر کے پرائیویٹ لمحوں میں دیکھا تھا یا کبھی کبھی جب وہ خود کو بھول جاتا تو دیکھنے والے اس کے چہرے سے مکرر خاطر ہو جاتے۔ اس کے ہونٹ حملہ آور بھیڑیلے کی طرح ہنٹوں پر سے کھینچ جاتے اور آنکھوں میں صدیوں کی دبی ہوئی غلامی کی خاموش بغاوت سلگنے لگتی۔ اس کی صحت عموماً خراب رہتی تھی اور زیادہ تر کھانسی چھینکنا رہتا تھا۔

قدرتی طور پر شرم کی نظریا بار بار افتخار کی طرف اٹھتی۔ گودہ بہت کم اس سے بات کرتا مگر جب کبھی وہ ملتے ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے پہچانتے ہیں۔ وہ اس کی ہر بات پر آنکھ میچ کر صاف کرنا اپنا فرض سمجھ چکی تھی۔ اب وہ مداخلت کے گردپ سے قدم برطھا کر مدد دیتی جا رہی تھی اور نئے انتخاب پر اسے یونین کا کارکن بھی بنا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی برطھا کر کچھ غرور کی حدود کو چھونے لگی تھی۔ اب ایما سے اپنی ہی جیسی مگر زیادہ عقلمند اور ذہین نظر آتی تھی، اب وہ پیسے کی طرح مسحور ہو کر اس کی پراسرار آنکھوں اور زہریلے واٹنوں سے اتنی متاثر نہ ہونے لگی تھی۔ ابے خود اپنی ہنسی میں ایک غیر مانوس سی جھنکار سنائی دینے لگی تھی۔ ہاں افتخار اور اس کی کھوئی ہوئی سنی جھلاہٹ اسے اب بھی میخ کر دیتی تھی۔

اسی زمانے میں الہ آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا جلسہ شروع ہو گیا اور پرانے حقداروں کو پیچھے چھوڑ کر نہ جانے کیسے شمن کا انتخاب نمائندہ جماعت میں ہو گیا۔

(۲۹)

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے لہذا لوہے میں رک گئی۔  
 نوری اندر کمرے میں مائیکوں بیٹھی ملی۔ شمن کو دیکھ کر وہ اُس سے لپٹ گئی۔ نوری اور  
 شمن ہمیشہ ان مصنوعات سے پاک رہی تھیں مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے  
 پیارا بل پڑا۔ بڑی محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے  
 تک باتیں کرتی رہیں۔ عام باتیں جو ایک مائیکوں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی بچپن کی سہیلی سے  
 کرتی ہے، ہونے والے شوہر کے متعلق سنے سناٹے افسانے، اس نند کے اسان بھرے  
 دکھڑے، ٹیکے، جھومر اور بازیوں کا ذکر۔ ماں، دادی اور دوسرے رشتہ داروں کی  
 مدد سے اس لے دور رہی دور سے عشق کر لیا تھا۔ جہیز کی تیاری میں گویا روحانی گورنٹ  
 شپ ہو گئی تھی۔ ہر ناکے پر وہ ہونے والے میاں کا خیال ایک لڑکی میں پروتی جاتی  
 ساس نندوں کا رمنٹک برتاؤ اور بری اور چڑھاوے کے ذریعے سے وہ ہونے  
 والے ساتھی کو بخوبی پہچانی چکی تھی، اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضد اور عادت وہ اچھی  
 طرح جان گئی تھی؛

”اے انہیں بھندی سے نفرت ہے۔ مگر رنک سے تو چڑھتے ہیں۔ بڑی خوشامدوں  
 سے تو سہرا باندھ رہے ہیں۔“ وہی عام چھوڑے دوہاؤں کے خنجر سے مگر نوری انہیں  
 بے انتہا عجیب و غریب بنا کر سنار ہی تھی۔

”کہتے ہیں گھڑنگٹ نہیں کاڑھنے دیں گے۔ بھلا میں بھائی میاں کے سامنے کیسے  
 چلوں گی، میرا دم تو نکل جائے گا۔“ اس نے منگنی کے بعد ہی سے اس کے تمام راتے داروں  
 سے ناطے جوڑ لیے تھے اور انہیں ناموں سے پکارتی تھی جن سے وہ اُن کا ذکر کرتا تھا۔  
 دو روز صبح شیکو کرتے ہیں ورنہ ایسے کھرورے کمال ہو جاتے ہیں کہ حد نہیں ہے۔  
 وہ ایسے کہنے لگی گویا وہ برسوں سے ان گالوں کو سہلانے کی عادی ہے۔ تخیل بھی کیا  
 غضب کی چیز ہے! جہاں کسی کی رسائی نہ ہو، پرنہ پر بھی نہ مار سکے وہاں مزے سے  
 خیالوں کے ہنڈولے میں جھولتے چلے جاؤ۔ منگنی سے پہلے ہی نوری کا پردہ کھینچ لیا گیا



تھا اور اب وہ تین سال انگینڈا رہ کر آ رہا تھا۔ کوئی پوچھنے کو نہ تھا، یہ سب تجھے کس نے بتا دیا کہ اس کی ٹیڑھی کھڑی ہے، مونچھیں پیسنے والی ہیں اور ہتھیلیاں چکنی ہیں؟  
 شمن نے اس سے بالخصوص نہ پوچھا ورنہ وہ اسے شادی کے بعد کی اپنی پر سکونی زندگی، بچوں کے پیار کے نام، روزانہ گوشت ترکاری کا حساب کتاب سمجھتا دیتی۔  
 نہ جانے کب سے وہ زندگی کی اس جمع تفریق میں مشغول تھی، اور پھر صبا کا خیال تھا۔  
 کہ ٹیڑھی ابھی کم سن ہے، بوجھ نہ اٹھا پائے گی۔ یہ بھولی مائیں! اتنا نہیں جانتیں کہ  
 ذرا سی فتنی تھی جیسی سے بڑھی دادی بن چکی تھی۔

ٹوڑی کو چھوڑ کر وہ دور زندگی کے ہیر پھیر پر غور کرنے لگی۔ یہ لڑکی ذات بھی معمر  
 ہے۔ چار پانچ سال کی تو بچی نانیوں جیسی۔ جو دیکھے کالوں پر ہاتھ رکھے کہ ابھی یہ حال  
 ہے تو بڑھ کر آفت کا پرکھ ملے گی۔ جہاں دس پانچ سال اور بیٹے ایک دم رنگ  
 پلٹ۔ وہ بزرگوں جیسی گفتگو اور طور طریق غائب، اس کی جگہ دوپٹے کہیں سے توپا جامہ  
 کہیں، گریباں چاک ہے تو جوتی پیروں سے نکلی بھاگتی ہے، بات کرتے میں سو بار تباہ  
 لڑکھاتی ہے اور ہزار بار چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔ کیا نئے انقلاب اور تازہ مصیبتیں  
 اس شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں کہ سدھ بدھ ہی غائب ہو جاتی ہے یا حسرت شبا  
 ایک چھٹکار بن کر ہوش و حواس کو معطل کر دیتا ہے۔

ٹوڑی خواب بیداری سے جی سیر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سر اپنے بازو  
 سے نہ ہٹایا۔ اس کا نرم گرم جسم، خوابوں سے رنگین چہرہ، اُٹھنے میں بھمے ہوئے میلے  
 کپڑے، وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔ عورت! کیا یہی تھی عورت جو عروس کی مرغ  
 قاب کی طرح سجا کر بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی! اسے ہلا دھلا  
 کر حط میں لے آیا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت بسا نہ ہو بھی تو معلوم نہ پڑے، ایسے  
 ہی جیسے مڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپا لے کے لینے ڈھیر سا مسالہ  
 چھڑک دیتا ہے، بالکل اسی طرح دلہن کو شیر سے پسینہ پھیر کر دہانے حلق میں اتار  
 دیا جائے گا اور جب ایک باز گل گیا تو ہوا شیر اڑا ہے یہ دیتی وارنش دھو چھو

گھسوں میں اندر جاسے گی اور دھن صرف بیوی رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے دشمن کے جسم میں لپکی دھڑلگی۔ تو رہی کے لوجہ ان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے اور ہزاروں فکریں جن کوئی کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔  
 وہ عورت کا حرف ایک مصروف ہے... اسے سینل کے الفاظ یاد آ گئے۔

دفعۃً اسے الہ آباد کی میننگ بھی یاد آ گئی، سفوفاً آخری اجتماع ہوتا روں کی چھاؤں میں الاؤ لگ کر کیا گیا تھا۔ چاروں طرف گھسوں کی صورت میں میٹھ کر کانا پیو ہو رہی تھی، دنیا کے اہم مسائل طے کیے جا رہے تھے، لڑکوں کی بھاری اور مہم آوازوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی ہمیں بولیاں رو پل گھنگھروں کی طرح بج رہی تھیں، بیچ بیچ میں مونگ پھلیوں کے چھنکوں کی جڑ جڑ، بالکل ساز سنگیت کا لطف آتا تھا۔ الاؤ دھیمادھیم ہو گیا تھا، صرف ابھی بھی جب کوئی گروہ مونگ پھلیوں کی مٹھیاں بھر کر پھینکتا تو ایک آدھو شعلہ لپک اٹھتا۔

اس دن کتنی نگاہیں اسے اپنے جسم میں چھپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور بجائے ان کو جھٹک دینے کے سینے سے لگا کر پھکیاں دی تھیں۔ اسے سردی لگی تھی تو کتنے کوٹ اور مفلر اس پر برس پڑے تھے۔ ہر ایک خود کو اٹھا کر اس کے قیمتی جسم کو بچانے کی فکر میں تھا، نہ جانے اس قربانی میں کیا لطف آتا تھا کہ ہر اتنا جھکا جاتا تھا۔ اتفاق کیسی یا جو کچھ بھی اس کے ماتھے میں افتخار کا کوٹ آیا تھا۔ پہلے تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ سگریٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشیاں کن خوشبوئیں ایک دم دم مار پر چڑھ گئی تھیں۔ دشمن نے اڑھتے ہی کون سے ہزاروں کوٹ تھے جو ان خوشبوئیں کو پھینک سکتی؟

اس نے چھپے چوری اس دلچسپ کوٹ کی جلیبیں بھی طویل طوالتیں۔ افتخار برٹا لاپرواہ تھا، منوں کوٹرا بھرا پڑا تھا، تمباکو کا چور، ٹوٹی ہوئی دیاسلاٹیاں، دوچار فیسل کی چھیلن کٹے ٹکڑے، پروگرامر کے ٹکڑے، مرط سے پچھلے دوسری

جب میں مزنگ پھیلوں کے چھلکوں کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو وہ الاء کی رونق میں نہ پڑ سکی اور نہ جانے کیوں اسے اپنی صدی میں اڑس لیا۔ جلسہ بھر لے لگا تو وہ افتخار کو ڈھونڈنے لگی۔

درکمال کر دیا آپ نے تو، بھئی میں نے سب کی حرص میں دے دیا تھا کوٹ اور آپ قبضہ ہی جمانے میں۔ خدا قسم مرا جا رہا ہوں سردی کے مارے۔ یا تو مجھے بھی لپیٹ لیجئے اسی میں یا۔۔۔

افتخار کو بندیاں بکتے دیکھ کر شمس سہم کر رہ گئی۔

”لیجئے اپنا کوٹ؟ اس نے ہمت کر کے کہا۔

”نہیں، اور آپ؟ مرنے کا شوق ہے؟“

”میں یہ پہنے ہوں، کافی گرم ہے۔“

”اور جو، جل گیا میرا ہاتھ تو۔۔۔“ اس نے بن کر صدی کا کپڑا چٹکی سے چھڑوا۔

”اچھا اب بیہمت اور جلدی سے کمپ میں جا کر کبتر میں دبک جائیے۔ نیند

جو نہیں آ رہی ہے میں جا کر اپنا کوٹ پہنی لوں گی۔ لیجئے۔“

دونوں کمپ میں آئے اور افتخار نے کوٹ نہ لیا بلکہ اس کی رضائی اوڑھ لی۔

دونوں باہر آ گئے تھے۔

”کاہے کی خوشبو ہے؟“ افتخار نے بناوسی رضائی کو ناک سے رگڑ کر پوچھا

تھا۔ شمس نے نہ جانے کیا جواب دیا تھا۔ ایک بے کی خاموشی درمیان میں حاصل ہو

گئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کا وجود جی طرح کھٹکنے لگا۔ افتخار نے

سگریٹ سلگایا اور پھر جھنجھلا کر مسل ڈالا۔

”ہنہ!“ وہ طنز سے فرمایا۔

”جی؟“

”آپ چاہتی ہیں میں چلا جاؤں۔ یہ سنبھالیے اپنی رضائی؟“

”ایں؟“

”اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں... میں... بلکہ میرا مطلب کچھ یوں نہیں“ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں کو بے معنی سی جنبش دی۔  
”مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے بہت پسند کرتی ہو“  
”یہ... میں؟“ وہ چرط کر مٹکائی۔

”ہاں، اور جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اسے روک کر بولا، ”میں تم سے بہت بڑا ہوں، دنیا بھر کی عورتیں کھائی ہیں، بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اس لیے... تو... خیر جانے دو۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ ایک دم گم ہو گیا۔  
”ہاں اسی لیے تم سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں“  
”دیکھیے!“

”تم بہت بھولی ہو... اس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔“ اس نے جلدی سے اسے الفاظ کی تردید کی، ”معصومیت ایسی دولت نہیں جس پر کوئی اس دنیا میں ناز کر سکے... تو میرے خیال میں...“  
”تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ شمع خاموش رہی، نہ جاننے کیوں اسے تردید کرنے میں احساس کمتر ہی ہوئے لگا۔

”اور میری عمر اسی وراثت کی سیاحی میں گزری ہے۔ میں نے اتنی بار محبت کی ہے کہ یاد بھی نہیں۔ ماں کی محبت سے لے کر مجھے نڈائیوں، فقیروں اور ان سے بھی گری ہوئی عورتوں کی محبت نصیب ہو چکی۔ مگر تم سے جو محبت... لاشوں ولا قوتہ!“ وہ جھلایا، ”کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ نہیں، بلکہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں عجیب جذبات موجزن ہوئے لگتے ہیں۔“

”تم... تم... تو نہیں سکتیں۔ تم سے لگاؤ پیدا ہوتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے... جیسے جیلائی سمجھ جلیے میں تمہیں اپنا کوڑے دے دوں اور جھنے کے لیے تو مجھے...“  
”تم... تم...“ وہ محفوظ رہے گا۔ ”شمس طرگئی کہیں اس نے خط نکالتے دیکھ کر نہیں دیا۔“

”تم اس میں سے کچھ نہ پیرا سکو گی؛ برسوں کے لیے بھی اگر میں اپنی محنت مع تمام رحمتہ ثنوی کے سپرد کر دوں تو بھی خیانت نہ کرو گی۔ اور یہ اطمینان جتنا نہیں سکتا ایک مرد کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میرا مطلب اور مردوں سے نہیں خود اپنی ذات سے ہے۔“

”مگر یہ کیوں؟“ وہ ایک دم بولا۔

”یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔“

”میں؟ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ ہنہ، خود ہی نہیں سمجھتا کہ تم جیسی سیدھی سادی لڑکی مجھے کیا دے سکتی ہے جو مجھے دردِ دل کی خاک چھان کر بھی نہ ملا۔ میں تمہارے ساتھ بغیر شکے بہت دور تک جا سکتا ہوں۔۔۔“ شمن کو املیا کا لمبا سفر یاد آ گیا۔

”مگر تمہارے راستے جدا جدا ہیں۔۔۔“

”کیوں؟“ شمن نے کسی غیبی ہاتھ سے گلا چھٹا کر کہا۔

”اس لیے کہ... کہ تم بالکل چوکور ہو... اور دنیا کے گھسے کھا کر میں بالکل گول“

”وچکا ہوں۔“

”مگر ترشنے سے ہیرا اور زیش بہا ہو جاتا ہے۔“ شمن اپنی زبان کی طراری چھینٹ گئی۔

”ہیں؟... مگر میں پتھر ہوں... تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں ہی رہا ہوں؟“ وہ بگڑا۔

”نہیں تو۔“

”ہنہ... جانتی ہو میں نے تمہاری رضائی کیوں اڑھی؟“ شمن کا دل دھڑکا۔

”اسے دیکھ کر مجھے گوری ہوئی زندگی کی باتیں یاد آ گئیں۔ تمہیں نہیں معلوم میری ایک

بہن بھی تھی۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ مجھے بے تک یاد ہے ہم دونوں ایسی قوس

فزع کی طرح انگلی رضائی میں گھس کر ریل ریل کھیلا کرتے تھے۔ آج اس رضائی کو دیکھ

کر... سنسومت اتم تنہی کیوں ہنوا؟ ماں اسے دیکھ کر میرا دل بے اختیار ریل ریل

کھیلنے کو جا رہی تھیں دیکھ کر میرا دل ہمیشہ چھڑنے کو پامتا ہے، مگر میں رک جاتا ہوں

کہ کہیں تم اسے کچھ اور نہ سمجھنے لگو۔ شمشاد، معشوقاؤں کے توہم نے ہزاروں ٹپکیاں

لہاں میں مگر ویسی چٹکی، جو میری بہن چنگ کے نیچے گھس کر میری پیٹھ میں بھر لیا کرتی تھی،

اس کی یاد آج تک میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ میری بہن مرگئی اور پھر مجھے ویسی محبت نصیب نہ ہوئی۔“

وہ تھوڑی دیر تک رضائی پر لیٹے ہوئے تارے نائخوں سے کھڑپا رہا پھر کچھ یاد کر کے بولا:

”ہم صبح ناشتے پر اردو کی کچھڑی کھایا کرتے تھے۔ وہ دہلی تھی اور برطانیہ کی سی تھی اور میں بنگلہ پر بیٹھ کر کودا کرتا تھا تو وہ لڑکھا کر میرے اوپر آن گئی۔ اسے کھانسی کی وجہ سے کھی کھانے کو منع کر دیا گیا تھا مگر وہ ضد کرتی تو بیوی روئی کی گولی بنا کر کچھڑی پر رکھ دیتیں۔ وہ قطعی نہ سمجھتی اور مرے سے کچھڑی کھا لیتی۔ ایک دن میں نے اُسے بتا دیا۔“

”بیٹھو یہ کھی تھوڑی ہے، روئی ہے۔“

”وہ روئی؟“ وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی اور جب اسے اماں کی چالاکی معلوم ہو گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔ تم نے کبھی اردو کی کچھڑی کھائی ہے؟  
”اماں! شمن کا گلا بھرا یا۔“

”اور... اور... اسے یہ میں تم سے کس قدر بے لگائی باتیں کر رہا ہوں، لا حول ولاقوہ! تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بھی نرا چند ہوں۔“ وہ کھسیا گیا۔  
”اسے میں قیالکل بھی...“

”جھوٹ، تم مجھے قطعی الو سمجھ رہی ہو۔ اور غیص تو کیا! میں جب تمہیں پسند کرتا ہوں تو بجائے تمہیں آغوش میں لینے کے یہ اردو کی کچھڑی...“  
”تو کیا ہوا، آپ مجھے بہن کی طرح چاہتے ہیں؟“

”ایں؟ قطعی نہیں۔ میں ان لوگوں کو پرے درجے کا مکار سمجھتا ہوں، جو بغیر لڑکیوں کو، جو ان کی معشوقہ بن سکتی ہیں، بہن کہتے ہیں۔ مگر شاید تم کچھ ٹھیک کہتی ہو میں معشوقان بناتے بناتے تھک چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں لفظ بیوی سے چڑتا ہوں مگر میں تمہیں بہن تو نہیں بنانا چاہتا، لا حول ولاقوہ!“

”کیوں؟“

”کیونکہ ہوس ہی نہیں سکتا۔ ایک سرے سے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا۔ بہت دفعہ میرے دل میں تمہاری طرف سے ایسے خیال آئے ہیں جو ایک بہن کے لیے نہیں آتے۔ تم ابھی نہ سمجھو گی، ایک دن آئے گا جب ان الفاظ کے معنی تم خود بخود سمجھ جاؤ گی۔ تم کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھائی نہیں بلکہ دوست سمجھو، ایسا دوست جس سے کسی قسم کا تکلف نہ ہو۔“

”کیوں نہیں؟“

”میری بہن زندہ رہتی تو میں اسے کبھی بھی حرف بہن نہ سمجھتا، اس کی شادی ہو جاتی مگر ہم بہترین دوست رہتے۔“

”آپ شادی نہیں کریں گے؟“

”شادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی کو اچھا شامپ لگا کر وصول کرنا یہی شادی ہے؟ تو میں کنوارا ہی بھلا، اور ویسے تو...“ شمن کچھ تھجینپ گئی۔

”تو اس میں کیا ہٹا؟“ وہ جلدی سے بولا ”مرد ہونا کوئی عیب تو نہیں اگر ہم کہتے نہیں مگر ہماری ماں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ... ہم مرد ہیں۔ میں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔“

”آپ شادی کے خلاف ہیں، میرا مطلب ہے نکاح کے“

”قطعی۔ نکاح ایک وعدہ ہے جو صرف اس لیے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مکر نہ جائے۔ ذرا سوچیے تو سہی، زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں؟ شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔“

شمن کچھ نہ سمجھی۔

”تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں؟“

”گدھا پن کرتے ہیں۔“

”واہ“ شمن لاجواب ہو کر رہی۔

نوری نے کروٹ لی اور اس کا سر بازو سے ڈھک کر تکیے پر ٹک گیا۔ شمن نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا، شاید وہ آنے والے کل کے سب سے زیادہ رنگین لمحوں کو سمیٹ کر خواب دیکھ رہی تھی، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ رات کی تنہا خاموشی میں شمن کا جی چاہا کاش وہ کسی طرح جھانک کر اس کی جگہ گاتی دنیا کی ایک جھلک دیکھ سکتی، مگر افتخار کے الفاظ گھوم پھر کر اسے اپنی دنیا میں واپس گھسیٹ لے گئے۔

”اور کیا، گدھاپن تو ہے ہی۔ اگر مجھے کوئی عورت کہے کہ مجھے تمہارا اعتبار نہیں، چار آدمیوں کے سامنے کہو کہ تم مجھے... مجھے...“ شمن کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ اکت گیا تھا مگر پھر جلدی سے بولا:

”تو میں اس سے کہوں گا: بیگم صاحبہ چلتی پھرتی نظر آؤ، ہمیں چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر ہی کوئی چیز مل جائے تو پھر...“

”مگر یہ تو نا انصافی ہے آپ کی!“ وہ جلدی سے بولی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں؟“

”کیوں صاحب، عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی؟“

”لوگ تو عورتوں کی ہی زندگی دو بھر کر دیتے ہیں۔“

”مردوں کی نہیں کرتے؟“

”مرد پروا جو نہیں کرتے؟“

”تو عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پروا کریں؟ کہہ دیجیے سماج۔“

”اور کیا؟“

”اور یہ سماج بنایا کس نے؟ خود انڈا پھوٹ کر بچ نکل آیا؟“

”نہیں تو؟“

”جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔“



”مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنا پڑتی ہیں“ شمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”یعنی بچہ وغیرہ؟“

”جی ہاں“

”بھئی واہ، کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ جیسی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے۔“

”ارے!“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے، اور وہ اس کی بدحواسی پر زور زد سے ہنسا۔

”مگر جو بچے ہوں گے وہ...“

”حرامی ہوں گے وہ...“

”حرامی ہوں گے؟“

”ہاں...“

”حد ہے۔ جی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں ہیں حرام، حلال اور جھٹکا سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں۔ قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار انسان بننے کا حقدار ہے۔“

”مگر میرا مطالب ہے... اقتصادی مشکلات“

”تولیوں کیسے میاں نہیں بنیک کی کتاب چلے گی“

”یوں ہی سمجھ لیجیے“

افتخار کو کچھ لا جواب سا دیکھ کر شمن کو دکھ سا ہوا، وہ بولا:

”مٹیک کہتی ہو یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں۔“

ابھی تو نہیں شاید ہماری تمہاری زندگی میں وہ وقت آجائے کہ اس کا جواب مل جائے۔“

دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس کیمپ کی طرف چل دیئے۔

”ہاں ایک بات اور جو تم سے کہنا بھول ہی گیا۔ اس نے رضائی دینے کے لیے

ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا۔ "ہاں تم اپنی یہ رضائی مجھ کو دے سکتی ہو؟"  
"رضائی؟"

"ہاں، اس کوٹ کے بدلے میں نہیں بلکہ مفت۔"  
"اے لیجیے یہ وہ الٹی احسان مندی تھی۔"

"سلام" اس نے مسخرے پن سے ہاتھ کو ہاتھ لگائے۔

"ایک بات اور، وہ یہ کہ میں سینی ٹوریم جا رہا ہوں، ڈاکٹروں نے مجھے ڈی بی جی ڈی  
ہے۔ اسے...؟" وہ شمس کی گھبراہٹ پر مسکرایا، "جیسے یہ کوئی نئی بات ہے۔ پرانی  
شکایت ہے، دودھ بھڑالی رہ آیا ہوں۔ مگر مگر اب کے شاید جلدی نہ نکل سکوں؟"  
"لیکن آپ اتنے بیمار تو نہیں نظر آتے۔"

"نظر آتے ہیں آتما مگر تم جیسی نظروں کو، اندیشہ ہے کہ کہیں میرے جراثیم دوسروں  
کو لگ نہ جائیں، یہ چھوٹ کی بیماری ہے؟" اس نے معنی خیز تہقید لگایا۔ ہماری مہربان  
گورنمنٹ نے "بی" کلاس میں میرے لیے پلنگ دلوادیا ہے، سارا خوجہ یونیورسٹی اور  
حکومت کے ذمے؟" وہ ہنسا رہا۔

"جب شارح عام پر ایک گڑھا ہو کر اس میں غلاظت بھر جائے جو پرانے جانے  
والے کے منہ پر اچھلنے لگے تو حکومت کا فرض ہے کہ عام صحت کی خاطر اسے دور کر دے۔  
شکر کر کہ پونا جیل سے بچ گیا ورنہ... اور یہ میں کیا بکنے لگا؟" چلنے سے پہلے اس  
نے کہا۔

"ہاں ایک وعدہ کرو۔ یہ رضائی تو میں نے لے لی، اب ایک اور بھی قیمتی وعدہ مانگا  
چاہتا ہوں؟"

"کہیے؟" وہ اب بے صبر ہو چکی تھی۔  
"کہ کبھی میں تمہیں کوئی ہدایت کر دوں تو تم اس پر عمل کرو گی۔ میرا مطلب ہے کہ  
میری وہ درخواست جس سے تمہارے اوپر رنج نہ پڑے؟"  
"میں اس سے نہیں ڈرتی۔"

”مجھے معلوم ہے، مگر میں تمہیں اتنے تندہ میں نہیں گھسیٹنا چاہتا، میں پختہ وعدہ نہیں چاہتا۔ سوتھ لو، اگر تم سمجھتی ہو کہ۔۔۔“  
 ”آپ نے میری خاموشی کا غلط اندازہ لگایا۔“  
 ”تو۔۔۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں“  
 ”تو آؤ۔“

”قدم اور کاغذ لے کر افتخار نے اُس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ جب سارا کیمپ غفلت کی نیند سو رہا تھا تو دوسرے ہسٹون نے سرخوڑ کر چند سطور لکھیں۔  
 ”آنکھیں بند کر دو“ افتخار نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔  
 ”ہائے!“ سوئی کی نوک شاید انگلی میں گہری اتر گئی۔  
 ”لکھو۔“

”شمشاد!“ شمن نے لرزتے ہوئے انگلیوں سے لکھ دیا۔

”خدا حافظ۔“ وہ رضائی میں منہ چھپائے تاریکی میں ڈوب گیا۔

شمن جاگ اٹھی۔ یہ خواب اُس نے لفظ بہ لفظ دہرایا۔ بھرتے ہوئے حواس سمیٹ کر اُس نے پھر زنجیر کو پکڑا۔ مختصر آنکھیں پھاڑے جیسے وہ اب بھی کیمپ کے ہلے ہوئے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج، آج اسے کسی نے خوب جھنجھوڑیاں دے کر زندگی کے نئے موڑ پر دھکا دے دیا تھا۔ دیر تک حواس ریساں ترہا کر بھاگتے رہے مگر دور دھندلی روشنی میں اسے بہت لمبا راستہ اٹھنا۔۔۔ گرتا نظر آ رہا تھا۔ آج اُس نے اپنے خون سے اپنے دلینا پر عبودیت کا تشقہ کھینچ دیا تھا۔ اُسے معلوم بھی نہ تھا کہ اُس کا خون اتنا سُرخ ہے؛ اور یہ نام۔ شمشاد۔ سُرخ پرچم کی طرح شفق بن کر کتنی دیر تک پھیلا آ رہا تھا۔

اُس نے پھر بن بیابانی دہن کی طرف دیکھا؛ کل وہ بھی اپنے دیوتا کے حضور میں ہاتھ ٹیک دے گی۔ نور سی دھندلی ہو کر ایک آدمی کی عورت رہ جائے گی۔ غرور اور اطمینان

کی لہروں نے ہلکے رے لے کر کسے سلا دیا۔

(۳۵)

شادی کے درمیان میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کتنے ہی بزرگوں سے بڑی ہو گئی ہے۔ اُس نے بڑھئیوں کو خوب چھڑا، یہاں تک کہ وہ محل محل گئیں۔ وہی اعتراض، جنہیں سنکر وہ رد دیا کرتی تھی، اُس نے توڑ مڑ کر اُسٹے اُسٹے اُسٹے کے سراپا دیے اور اس سیر سے پن سیر کہ معترض کھسیا گئے، اور لوگ ہنس دیے۔ خصوصاً ان بڑھئیوں کو تو رلا کر چھڑا جو ہر بات پر:

”اے ہے، فوج جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی بے شرم ہوتیں!“

”تو بے ہے، گریباں تو دیکھو، سارا آگ پھپھا کھلا پڑا ہے“

”جب دیکھو جب ٹھٹی ٹھٹی، جب دیکھو دھما چو کر طی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے“

ان لوگوں کو جلا کر اُسے بڑا مزہ آیا۔ ہنایت ڈھٹائی سے اُس نے اُن کی ہر بات

کی کاٹ شروع کر دی، گویا ساری عمر کی ڈانٹ کا آج پُورا پورا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔

اُسے آج معلوم ہوا کہ بجائے غصے کے ان بڑھوں پر رحم آنا چاہیے۔ جوانی کہیں ڈانٹ

پھٹکار سے دیتی ہے؟ ہاں تو ہمیشہ بڑھاپے کی ہے۔ جب قدرت کسی کو خزاں کے

بے رحم ہاتھوں سے مسلا شروع کر دیتی ہے تو وہ دانت کچکچا کر بہا رہی چوٹیں اتارتا

ہے۔ مسرت بھرے تھپتھپے ٹھٹی ٹھٹی، بد معاشی اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے

جوان لڑکیوں کی چکنی نرم باہیں اور سڈول جسم دیکھ دیکھ کر بڑھئیوں کو اپنے کھٹائی جیسے

چمرخ جسم پر غصہ آتا ہے، جی پر چھریاں چل جاتی ہیں، یہی جی سے دعا نکلتی ہے کہ کوئی

ان کی طرح جوانی کو خزاں کی چادر میں لپیٹ کر ان کے ساتھ ساتھ دفن کر دے تاکہ

وہ ان کی طرح مرجھا کر جلد از جلد مردہ اور بے رنگ ہو جائے۔

محفل میں جتنی لڑکیاں نظر آئیں سب بد مذاق اور جھوٹی، دو چار لڑکے دکھائی دیے

وہ ڈرپوک اور دتوے۔ مگر پھر بھی اُن میں کھل مل گئی تاکہ ایک دفعہ وہ بھی پڑھی لکھی لڑکیر

کے اخلاق سے متاثر ہو جائیں۔ چند لڑکیاں پڑھی لکھی بھی تھیں مگر شمن کی طرح لڑکوں سے گھل مل جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ اُن کے لڑکے اب بھی رونٹک، بد معاش، اور بے رحم داسے بنے ہوئے تھے جن کی آوازیں سنکر وہ اضطراب میں بندھی گھوڑیوں کی طرح ہنسنے لگتیں۔ گوزبان سے بیٹھی لڑکوں کو گویں رہی تھیں مگر جان بوجھ کر ایسی جگہ جا رہی تھیں کہ اُن سے ٹکے ہو جا۔ ع۔ اور پھر وہاں سے ایسی اتر کر شرماتی لجاتی تھیں گویا کچھ چھین ہی تو کیا۔ پھر گھنٹوں پسینے میں ڈوب کر دل دھڑکا یا کرتیں۔ لڑکے بھی جھگڑاؤں میں جو کچھ نہ کر جاتے کم تھا۔

یکجہت کہیں کا، میرا کلیجہ اب تک، کانپ رہا ہے۔ وہ اس پر لذت شکر کی گدگدیاں باریک کر کے دوسری ٹکڑے کی تاک میں لرزاکرتیں۔ اس کے علاوہ کئی لڑکیاں اپنی ہونے والی سانس نندوں سے وہ شاندار عشق چلا رہی تھیں کہ کیا کہنے۔ وہ اُن سے ہونے والے شور کا تصور وابستہ کر لیتیں اور اُن سے ایسے شرماتیں جیسے نئی دلہن، دلہا سے شرماتی ہے۔ جھلا اس رومانی عیاشی سے کون روک سکتا ہے؟

کہاں یہ رنگین فضا اور کہاں کالچ کے کھلے میدان میں پروفیسروں کے زیر سایہ ایک دوسرے سے مصنوعی منہی طاری کر کے پوچھنا، آپ کا مزاج کیسا ہے؟ گویا ایک لڑکی کو ایک لڑکے کے مزاج کی تو پڑی رہتی ہے۔

شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزاد ہا ہی تو قید ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردے میں رہنا چاہیے۔ سچ تو ہے، کتنے مزے سے پردے میں آنکھ پھولی کھلی جاسکتی ہے۔ جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بد صورت تو خاص فائدے میں رہتی ہوں گی، جسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا۔ یہ حقوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔

جب ہی تو پچھلے زمانے کا ادب اُٹھا کر دیکھو بد عورت، حسن مجسم رکھی ہے عورت حسینہ محی یا دوشیزہ، اور اب اُسے اُستانی، ڈاکرٹنی، نرس، فقیرنی، آجنگن یا لڑکی کہا جاتا ہے۔ یہ پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی؟ وہ اس کے

سامنے قتل و غارت کے حربے کیا ہوئے۔ بہتر نظر کند اور ابرؤں کی دھار کھٹل بات  
یہ ہے کہ پردے سے نکل آئے پر غار میں، سرے ہستی کا راز کھل گیا، سب کو معلوم  
ہو گیا کہ ابرو نوچ کر کھانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بولیاں مسکارہ کی مدد سے  
گرائی جا رہی ہیں، ہونٹ ”ٹنجی“ کے صدقے برگ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پر روت کی  
شوق کھیل رہی ہے۔ کوویسہ ہندوستان میں جتنی محسن کی قلت پڑے تھی اب بھی ہے مگر  
یہ پردہ ہٹ جانے سے تو نظر کا پردہ ہی اٹھ گیا، عورت بڑے نقصان میں رہتی۔  
دولہا شام کو گھر میں آیا تو صنف نازک بھڑکی مکھیوں کی طرح جھٹ گئی، اچھی چلی  
پردے والیاں پر بھر کو ٹپٹیا میں پھر وہ بھی مست ہو گئیں۔ مرد میں، خواہ وہ دولہا ہی  
کیوں نہ بنائو، کتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے دماغ کھو بیٹھے ہیں۔ اس پر  
سنم یہ کہ ساتھ ساتھ دو چار دولہا کے شاہی بھی ریگ آئے۔ پہلے تو دو چار ٹوٹی چھوٹی  
ناکارہ بڑھیوں نے غل چایا مگر پالا جوان ہی مارے گئے۔ یہ طے ہوا کہ شہ بالے فیڑیٹ  
جائیں بشرطیکہ اپنی رشتہ داروں کے دھڑوں میں منہ چھپانے کا پختہ وعدہ کریں۔ ان  
کی دھڑوں میں سے جھلکتی شریر آنکھوں کو دیکھ کر شمن کو بے اختیار طعنیں کی سالگرہ کا  
دن یاد آ گیا جب کرم کھینے میں رشید کو رومال کا گھونگٹ نکال کر کھیل میں شریک  
ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔

یہ بھی دولہا کے دم چھلے کھولے ہوئے ہیں، شمن نے مصنوعی غصے سے پوچھا تو ان  
میں سے ایک کبوتر باز دی جیسی آنکھوں والے نے کچھ دانتوں ہی دانتوں پر جواب دیا  
بیس پر اس کے سامنے نے لمبی ماری۔

”پاگل ہے جیہا را“ ایک نے شمن سے سفارش کی۔  
”پاگل نہیں دیوانہ کہو“ اس نے پھر کبوتر باز جیسی آنکھیں چلائی اور پھر کچھ ٹیڑھا  
جس پر اس کے سامنے نے چپ رہنے کی رائے دی۔

جتنی دیر دولہا دلہن سے آرسی مصحف کی کشتی لڑتا رہا لڑے دو سری لڑکیوں  
کے چٹکیاں بھرنے کی ٹاک میں لگے رہے۔ معلوم ہوتا تھا ایک نہیں چھ رات آرسی مصحف

ہو رہے تھے۔ لڑکیاں چڑھ کر باتیں سنار ہی تھیں مگر جتنے کا نام نہ لیتی تھیں، جی ہوئی  
مقابلہ کر رہی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت نوری کلیجہ بھاڑ بھاڑ کر روتی، شمن جل گئی۔

”بن کیوں رہی ہو، مری تو جاتی تھیں شادی کے لیے“

”واہ!“ نوری کھسیا کر تھک سنبھالنے لگی۔

”یا اس لیے خوشی کے مارے رو رہی ہو کہ اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی۔“

نوری چپ ہو گئی اُس کے آنسو بھی نہ جانے کیسے خشک ہو گئے۔

دھ کوئی زبردستی ہو رہی ہے تمہاری شادی، کیوں کر لی؟ اب طلاق لے لو، شمن

نے اُسے خاموش دیکھ کر اور جلے جلے کھلے کہے۔

اُسے نوری بالکل صافے بل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا

کیسے کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی، بیوقوفوں کی طرح نہیں، پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد

میں تڑپے تو اور پھندا اُس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے، اور وہ چند بھی ڈھول تاشے

سے اُسے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سووے میں اور آئے دن جو

چاؤڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچا لوہا پڑیوں

کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے۔ جب تک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ

سودا بھٹٹا!

مگر جب دو لہا نوری کو لے کر جانے لگا تو شمن کے دل کے کسی نامعلوم کونے میں

ایک عجیب سا شبہ پیدا ہوا، جیسے نوری فروخت نہیں کی گئی بلکہ یہ جو اُسے لکھنے سے

لگائے جا رہا ہے اپنی زندگی کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے لے جا رہا ہے۔ یہی نوری

یہ کم عمر لہڑ لہڑکی۔ اس کی ہستی میں ایسے گہرے نیچے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ

اُسی کے ہاتھ میں لگام دے کر اُسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ حیف ہے

کہ یہ مرد عورت کو پر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر جب یہ

جوتی اُن کے سر پر بچتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو چکتا ہے۔ اُسے سارے مردِ مظلوم

نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے میں لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو ان کی کمائی پر بائبل  
اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر۔ وہ اپنے جسم  
کی قیمت لیتی تھیں۔ بجائے درجنوں کے صرف ایک سے۔

پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں؟ شاید اس طرح خود ان کی کمزوری آڑ  
میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں بٹاتا، بزدل ہی  
شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح  
ہے جو پر جاکا چاگر، بن کر اٹھیں اٹو نہاتی ہے۔ اُس کی چالیں کسی قدر خطرناک اور پُر اثر  
ہیں! بجائے شرمندگی کے اُسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔

مراثنیں گاہری تھیں، اُن کی آواز میں رقت تھی،

ہم تو بابل توڑے کھوٹے کی گیتاں

جدھر ہاں گونج جائیں!

”کیا کہنے ہیں اس معصومیت کے! گویہ گائیں، بیلوں سے زیادہ بھولی ہوتی ہیں۔“

شمن نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے کہا: ”اور کیا بہن، بگائے بیچاری تو ہوتی ہی

سیدھی ہے۔“

کیا گائے سینگ نہیں مارتی؟ ویسے بیل بیچارہ زندگی میں زیادہ اٹو نہتا ہے۔ یہ  
کوہو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارتے جاتا ہے؟ بل کے بل کو کب فرصت  
ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے! لیکن یہ گائیں! سوائے گھاس چبانے  
اور دودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہیں؟ اُن کی بلا سے دودھ پھر طے سے نہ  
پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھالی۔ نہ ہاتھ بلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان گائے  
کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوجتا بھی نہیں۔

اُس کا اب بھی جی جل گیا۔ مراثنیں بیچاے دو لہا کا مذاق اڑا رہی تھیں، جی چاہا  
جا کر ان کا منہ مسل دے۔ مہختہ، بیلوں میں بھی جاتی ہے۔





(۳۱)

نادی سے لوٹی تو ایسا معلوم ہوا اور عزیزوں کو دفن کرائی: ایک تو نوری اور دوسرا  
 افتخار۔ نوری کو دوسرے دن سے سوائے درہما کی شرارتوں کے اور کسی جھگڑے  
 میں لکھی نہ رہی، سارا دن بیٹھی وہ بھولیدوں کو سرگوشیوں میں افسانے سنا سنا کر بے  
 مال کوئی رہی۔ پتہ نہیں ان بھولیدوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی کس چیز کی تلاش  
 تھی یا شاید یہ وہی خبر بہ تھا جو لوگوں کو قفسے کہانیوں میں جنسی ذائقے کا متلاشی بنا دیتا ہے۔  
 اور افتخار؟ وہ الہ آباد سے سیدھا بھولا چلا گیا۔ اپنا راج پر و فیسر نے تذکرے  
 طور پر تبادا کہ انھیں بڑا افسوس ہے کہ افتخار ان کے ساتھ نہیں جاسکتا بلکہ وہ  
 اپنے پرانے مرض کے علاج کے لیے سینی ٹورم چلا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے چند  
 عائیر حملے بھی کئے مگر وہ صاف ڈھکوسلا معلوم ہوئے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ  
 واہ اللہ کتنا بھی افتخار پر مہربان ہو، اگر دنیا نہ چاہے تو وہ کبھی بھی بھولا کی صحت  
 کو نہیں نکل سکتا، گو لوگ اس کی موت کا سارا الزام ملک الموت اور نوشتہ تقدیر کے  
 مرتعوب دیں گے۔

افتخار کے بعد سیتل خود بخود دیوندری کی باگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت  
 پر و فیسروں اور نرسوں کی شفقت بھی تو تھی۔ نہ جانے کن بہتہ کھنڈوں کی مدد سے  
 بھرپور بڑبڑ بنا دیا گیا۔ ایسا کچھ شدد کچھ جھلائی ٹیسی بے تکلی بائیں کرنے لگی۔ اس  
 سیتل کی مخالفت نہ کی نہ ہی لڑیں کے کسی جھگڑے میں لکھی لی۔ نہ جانے وہ کس  
 درے کچھ خوفزدہ سی نظر آتی تھی۔ وہ اس کی بزرگی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی نامعلوم  
 کی سے خوفزدہ ہو جاتیں تو وہ بالکل معصوم اور بھولی معلوم ہونے لگتیں، اس کی منسی

میں جھینپ آجاتی اور دانت مصنوعی چینی کے کھٹل ٹکڑے بن جاتے ہیں۔  
سیتل کے عروج لے بجائے مرعوب کرنے کے اُسے ڈرا دیا تھا مگر تو نہیں کی ساری  
مردنی غائب ہو کر نئی جان پڑ گئی۔ ترقی پسند گردہ میں ممبروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔  
برطے جوش و خروش سے مینٹنگ پر مینٹنگ ہونے لگی۔ نئے قواعد بنے، کئی شاخیں  
بنائی گئیں۔ ڈراما سیکشن، آرٹ سیکشن اور گاؤں سدھار کی سکیم بنی اور تنکا سے  
شروع ہو گئے۔

چند روز تو شمن کچھ غیر مطمئن سی رہی، سمجھ میں آیا کہ ایک دم سے افتخار کی جگہ سیتل  
کو دیکھنے کی کیسے عادت ڈال لے۔ کالج اور یونیورسٹی کی زندگی بھی پانی کا بلبلہ ہوتی  
ہے جو چند لمحے تیرتا رہتا ہے تو ہزاروں رنگینیاں اس کے خول پر منعکس رہتی ہیں مگر  
جو نہی ہو پڑا سب کچھ غائب۔ وہی افتخار جس کا وجود یونیورسٹی میں قطبی ستارے کی  
سی حیثیت رکھتا تھا آج آسمان سے ٹوٹ کر نہ جانے گناہی کے کس غار میں جا کر اقلہ  
درود لیا کہ اُس کی کئی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی، گویا خاک کا ایک حقیقہ زدہ تھا جسے  
آئندہ ہی نے اٹھا کر دور پٹھ دیا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دو چار دن تو غلطی سے لوگوں نے  
بجائے سیتل کے افتخار کا نام لیا مگر پھر بہت جلد زبانیں نئے بول کی عادی ہو گئیں  
اور سیتل کی خوش بیانی، حسین اور لمبے چوڑے جسم نے افتخار کی یاد کو دلوں سے ماری  
بھگا یا۔ ایسا سیکرٹری رہی لیکن شمن کو خراچی کی کرسی سنبھالنا پڑی۔ نئے عہدے کی  
دہشت نے اسے کچھ ایسا بدحواس کر دیا کہ سوچے سمجھے بغیر وہ ترقی پسند گردپ کی پڑچوں  
رکن بن گئی۔

بیراجب تک کان کے گناہم اندھیرے میں رہتا ہے بیکار کنکری بنا پڑا رہتا ہے،  
مشک کو حبت تک گھسانا جائے تو ناسد مادے کی ایک گولی سے زیادہ وقت  
نہیں رکھتا، سیتل کے سوا کسی نے بھی تو نہ پرکھا کہ شمن کی اس پریشان اور ڈوری ہوئی  
شخصیت کا اکیس استقلال اور بغاوت کا لاوا دیا پڑا ہے، اس خاموش چٹیل میاں  
کے سپاٹ سینچیل آگ کی تیز چھپی سو رہی ہے، حرف جگانے کی دیر ہے اور پھر وہ ساری

اڑھکتی ہوئی طاقتیں پورے جوش سے ابل پڑیں گی۔ شمن کو اپنی ہستی کے اس انوکھے مکرطے کے وجود کا علم بھی نہ تھا، وہ اس نئی شمشاد کے تخیل کو پہلے تو داہمہ سمجھی مگر پھر اس نے اسے شخصی طور پر دیکھ لیا، وہ خود اس کی جگہ گاتی ہوئی لپک سے آنکھوں میں چمکا چونڈی محسوس کرنے لگی۔ دور، بہت بلندی پر اس نے اس نئی چیز کو کھڑے دیکھا۔ بادِ مخالف کے ضدی تحقیروں کے سامنے دشمنوں کی فوج سے مقابلہ کرتی ہوئی یہ مقدس طاقت اب تک کہاں پوشیدہ تھی: وہ پرانی شمن اس کے سامنے کس قدر بودی اور حقیر معلوم ہو رہی تھی! "کوئی چیر رہے جو عام لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسے بخشی گئی ہے!" اور بہت جلد اس نے اپنے آپ میں ایک پراسرار کشش، ایک خاموش دیدہ اور تپ ہوئی شان پائی۔ سیتل کی رائے سے اس نے اس نئی شخصیت کو، جس کا انکشاف اسے بھونچکا چھوڑ دیا تھا، سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی۔ ادب اور فلسفے کا مطالعہ کرنا شروع کیا، شاعری سے دلچسپی لی اور بہت تیزی سے وہ پرانا خول جھلکے کی طرح جھٹ گیا اور اندر سے مٹوس مینگ نکل آئی۔ اس بھر بھرے جھیلے کے اس نے مسلسل کردار بھانک دیا اور مینگ کو سمجھنے کی کوشش کر مے کی مگر جتنا جتنا وہ اسے پہچانتی گئی، غمگینہ اور پیسیدہ اور غماز ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا نئی شمن اس سے آنکھوں کی کھیل رہی ہے۔ جو عین وہ اسے چھوڑنا چاہتی وہ ہوا میں تحلیل ہو کر پرے چلی جاتی۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا اس نے اسے پکڑ ہی لیا مگر قبل اس کے وہ ٹھیک سے اس کا نامک نقشہ پہچان سکے وہ مانتہ چھوڑا کر غمگینہ مار مار جاتی۔ پھر وہ دو گئے شوق سے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتی مگر بعض وقت اس دور میں وہ کسی ایسے بھیانک اور سنسان گوشے میں پہنچ جاتی جہاں وہ خود اکیلے رہ جاتی اور وہ تخیل کی شمن داہمہ بن کر گھل جاتی۔ اس بنجر اور حیرت بالوس فضائے اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ اسٹیل پیرول تباہ آتی۔ جیسے غلط راستے پر جانے سے انسان پریشان ہو جاتا ہے اسی طرح وہ بھی وہاں سے کبیرہ خاطر لوٹ آتی۔

شمن سیتل کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا! گوشت پرست کے شاندار سپارٹ کی تہوں میں ایک فلسفی شاعر پوشیدہ تھا جس کا دل انسانیت سے بریز اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

جس کی اندرونی زندگی قوم اور ملک کے قدموں پر بٹھا اور ہونے کے لیے بیقرار تھی۔ ظاہر میں وہ دنیا دار اور کھیل کود کا شوقین نظر آتا تھا مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس مسکراہٹوں میں کتنے آنسو جذب تھے، ان قہقروں میں کتنی آہیں ہوتی تھیں مرنے والے کانوں کو ہی سنائی دے سکتی تھیں۔ وہ خوف جو دشمن ہمیشہ اُس کے وجود سے محسوس کیا کرتی تھی قطعی بے بنیاد ثابت ہوا۔ وہ صرف دیکھنے میں بد معاش معلوم ہوتا تھا۔ یوں تو لگتے ہی سناہٹ دیکھنے میں زہر پلے معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سب سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔ وہ بدندان بھی نہ تھا۔ بعض وقت تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے تھے بے تاب ہو جاتے تھے۔ بریز پڑتے ہوئے کی وجہ سے اسے ہر ایک کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ مس ہوگا جو کھلے بندوں اس پر انوکھے تشرکاء عشق برسا یا کرتی تھیں اُس کے سامنے ہر مایہ ندری سے کام کرتیں۔ ہر سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مجھے ہیں اُن کی موجودگی لازمی تھی۔ جب تک سونگھی اور مشکل باتیں ہوتی رتھیں وہ فرمانبردار نہ پختے کی طرح خاموش بیٹھی سنا کرتیں، نہایت ہنسا کے سے وہ مقرر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو سینے کے پچائے دیکھنے کی کوشش کرتیں، ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو پریشان ہو کر کڑی سی کرنے لگتیں۔ اگر سخت ضرورت سے اٹھنا ہوتا تو اپنی ننھی سی گرگابی کے نازک پنجوں پر لڈکھڑکے کو سسے کی طرح بغیر آواز کے محبت کے نہ کوشش کرتیں، کوئی بات کہنا ہوتی تو بالکل کان کے سوراخ سے منہ چپکا کر سہمی ہوئی کھٹس چٹس دیتیں۔ بیکس اُن کی یہ ساری اجنبیاہیں راہروں میں جلسہ کی توجہ کو اور بھی متنبہ کرتیں۔ وہ متنبہ کے مزاحیہ جملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں اور جو بھی موقع ملتا سب سے پہلے مایاں اور قہقہہ شروع کر کے سب سے آخر میں بند کرتیں۔ بعض وقت کوئی عجیب بات سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو انھوں کی طرح پریشان ہو کر دُعا دے کر کے پاس بیٹھنے والوں سے اُس کا مطلب پوچھنے لگتیں۔ اس طرح اُن کا قہقہہ عموماً ذرا دیر سے ظہور میں آتا۔ نیپالی انھیں بڑے پیار سے جھڑکتا تو کم عمر بچہ کی طرح زبان نکال کر شرمائے لگتیں۔ یونیورسٹی میں بہت سے مناقبہ لطیفہ انھیں کی شخصیت سے ایجاد کیے گئے تھے اور ہر جھڑکے پر اُن سے بے تکلف تھا کچھ دنوں سے وہ فرسٹ ایئر کے نئے لڑکوں کی

چرط مقرر کر لی گئی تھیں۔ کتنی ہی فائضائیں مس بوجھا۔ سے وابستہ کر کے ارائی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ بڑا مان جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ روتے میں وہ بڑی تیز انگریزی میں خود اپنی حالت پر حتم کھاتیں اور دوسروں کو شرمندہ ہونے کی رائے دیتیں۔

کچھ دن سے، یعنی افتخار کے زوال اور سیتل کے عروج کے بعد سے وہ عوام کی نظروں میں کچھ گر گئی تھیں۔ افتخار کی اور بات تھی۔ یہ سیتل تو ان کا اپنا آدمی تھا اسے تو

اُن کی عزت افزائی کرنا لازمی تھی۔ اُس کے انتخاب میں سب سے بڑی مدد مس بوجھا کی تھی۔

دوٹ جمع کرنے وقت وہ ہر ایک کی جان کو آگئی تھیں۔ اپنے خرچ سے پمفلٹ چھپوا کر بانٹے اور جب اُسے فتح نصیب ہوئی تو کسی کو خاص حیرت نہ ہوئی۔ یہ وہ خوشی کے مارے بالکل ہو گئیں۔ لوگ چھپنے کو مٹھائی مانگنے لگے تو انہوں نے سچ مچ ہی کھلا دی۔

نرتی پسند گروہ اب اور شدت سے اشتراکی رنگ میں نہجنا لگیا۔ نمبروں کی تعداد بڑھ گئی۔ مس بوجھا نے ایک دم گجراتی اٹلس چھوڑ کر کھدر پہننا شروع کر دیا اور بجادی ہر وقت کھدر اور اپنی پیٹھ پر نکلے ہوئے گرمی والوں کو انگریزی کی گالیاں دیا کرتے تھے۔ دیکھنے میں اُن کا جسم بے مصرف گوشت کا لوتھڑا تھا مگر ذرا سی ٹھنسی سے پھل جاتا اور فرسٹ کلاس لخت عموماً ہر ایک کو کھا ڈا اور بھنسیاں دکھانے میں صرف کرتیں۔ نیز ہزاروں قسم کے پائڈز اور مریموں کے نام اُنھیں یاد ہو گئے تھے۔ اُن کا جسم تو ایک ہی تھا مگر ہندوستان کے خطوں کی طرح زمین اور آب دہوا مختلف تھی۔ اگر ایک مقام کی بھنسی زربک سے اچھی ہوتی تو دوسرے حصہ کی کیرٹی کیورہ سے۔ اگر پیٹھ کے دانے وٹنگ پائڈز سے سوتھتے تو نبلوں میں بورک چھڑکنے سے شفا ہوتی۔ جتنا وہ دیسی مال کی مر پرستی میں بجا لیتے اتنا ہی بدیسی دوائوں پر خرچ ہو جانا۔ بعض لوگوں کی رائے سے انھوں نے نیم کی چھال اور ہندوستانی لمبی وغیرہ استعمال کیے مگر اُن سے اور بھی بدحواس ہونا پڑا۔ اُن کے برخلاف ششی، ایک نئی لڑکی، ہر چیز دیسی استعمال کرتی تھی، یہاں تک کہ اُس کے برتن خالص گوالیا جینی کے اور کمرے کا پورا فرنیچر کمرہ اور میسرور کی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ مرشد آباد کی سلک، میسرور کی جاڑھیٹ اور ملدا

کی ساڑھیاں پہنتی۔ اس کا سارا خاندان بیڈروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے پناہی  
بڑے بڑے کپے قوم پرست تھے اور ہر توی جلسے میں اسے ساتھ لے جاتے تھے جہاں وہ  
مادریوں کے سامنے بندے مانزم گایا کرتی تھی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی اور میاں انگلینڈ  
گیا ہوا تھا۔ باوجود وہیں بھگت ہونے کے فیشن گھر میں کافی تھا۔ انگریزی زبان مادری  
بنی ہوئی تھی، 'ماما، پاپا، اور آنٹی، کارواج تھا۔ سب لڑکیاں فراک پہنتی تھیں اور  
بال گٹے ہوئے تھے مگر ایک تار بھی بدلی نہیں استعمال ہوتا تھا۔ گورنمنٹ پورپ  
زود ہو چکی تھیں۔ مگر خوں دلی تھے۔

اس کے خاندان میں کوئی سرکاری نوکری نہیں کرتا تھا۔ تایاجی نے تو خطاب بھی  
گوا دیا تھا، درکئی بار سبیل میں گئے تھے۔ ممبئی میں روٹی کا بیوپار ہوتا تھا جس میں خاندان  
ممبر کھینچا چلا جاتا تھا، پھر غذائی کی نوکری کون کرتا؟ دوسرے بیوپاری بھارت  
کے مال کی اتنی بھی ہوتی ہے، گو بعض بد مذاقوں کا خیال تھا کہ لالہ جی کو بھارت کی  
انٹی سے زیادہ اپنے بیوپار کی انٹی کی فکر تھی۔ کھدر کے پرچار سے بھارت درس کے بیوپار  
بیشک وزنی ہو گئے مگر مزدور دیسے ہی ننگے جھوٹے رہے۔ وہ پہلے بھی مٹا جاتا پڑتے تھے  
اور اب بھی دمی ملتا رہا۔ ہاں ذرا جاپان کے سستے مال نے ریشم پہنوا دیا، مغرب بھی انگلس  
کے مس سے واقف ہو گئے، بھنگی چار بھی جاپانی کھلونوں سے کھیل لے جپنی کے سائٹ اور  
شیشے کے گلاس چیرا سیدو، کی لڑکیوں تک کو جہیز میں ملنے لگے۔ مگر یہ جاپانی مال ٹیک  
ترقی پسند گروہ کی پرمٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی گئی۔ جتنے ممبر تھے سب ہی تقییلی  
پر جان رکے کام کو تیار تھے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر  
کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخینوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی  
لڑکی سے عشق ہو چکا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی بیوی رہی۔ رحما  
اپنی چوڑا زادہ بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اسے یہ ٹھکرا  
دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کرے گا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا۔ تین  
سال وہ متواتر مختلف مقابلوں میں شریک ہوا لیکن صرف خاندانی دائروں کی زبردستی

سے، قوم کی خدمت سے اتنی فرصت نہ ملی جو ان لغویات کی طرف توجہ دیتا، انور زمانہ کالج کی ایک توشیہ کن لڑکی سے محبت کرتا تھا جس کی خمیدہ اذنیوں اور لمبائی کرنے اسے شاعر بنا دیا تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ بہت جلد وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر ہو جائے گا۔ اس کی شاعری بالکل انوکھی تھی، وہ پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستوں پر گامزن تھی۔ اس کی رومانی میر و بکی و ذہر عشق، و گل بنگا ڈلی، و عنبر کی فرسودہ محبوبہ سے بالکل مختلف ایک کالج کی روشن خیال حسینہ تھی جو بچے نے ظلم و ستم ڈھائے کے خود اس پر پروانہ زوار نہ اٹھائی مگر ظالم سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک آئی۔ سی۔ ایس کے پلے بند چکی تھی۔ لیکن انور کی شاعری پیش گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا، جب یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی، سماج کو میٹ کر رکھ دیا جائے گا، شفق خون بوری لگی اور زمین و آسمان سرخ ہو جائیں گے اور سرخ آنندھیاں چلیں گی۔ پھر اس سُرخ سے شعلوں میں ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی، آزادی کا قرمزى تھنڈا اہرا لے گا، مزدور کا رات ہو گا۔ اس وقت وہ اس لڑکی سے جی نہیں لے کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو بھیلادے گا۔ پھر کیا ہو گا، پھر پتہ نہیں کیا ہو گا! اس کے علاوہ آنندھنا جس پر بھر کی کل طوائفیں عاشق تھیں، وہ ان کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر شکار کے لیے مزدوری ہوتی ہے، اور وہ ایک سچا فنکار تھا۔ اس نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے بعد وہ اب طبعاً کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ باند مرتبہ مصنفوں کی صف میں آئے آئے نظر آئے گا۔ برکت علی عجیب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم۔ اے کر رہا تھا مگر اس کا زیادہ وقت جنیت کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جیسے جو اٹس اور ٹی۔ ایچ۔ لارنس تو اس کے روحانی داتا تھے جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا اور جنسی آزادی کو سوراخ سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔ اس کی زبان میں بڑی رومانی تھی اور عام طور پر لوگ قائل ہو جایا کرتے تھے شمع کو اس سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور اس کے اصولوں کی بھی کچھ شدت سے



مخالف نہ تھی پھر بھی پتہ نہیں کیوں جب اکیلے میں مختلف انضباطی نکات کی تشریح کرتا تو پسینے جھوٹ جاتے :

”انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ جب تک اُسے نہ رہا، رہما اور فنا“  
 ساری کلیت نہ دیا جائے محبت ہی نہ کرے۔ ”لفظ محبت وہ بہت ہی پرمیٰ طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسے پھسپھسے عشق کا قائل نہ تھا جس میں ٹھنڈی سائیں اور شب بیداری شامل ہوتی ہے۔ اُسے تو بے خالص عشق پسند تھا۔ اُسے طوائفوں سے بڑی شدت کی مہرہ روی تھی۔ اُن کی زندگی اور رہن سہن، اُن کی مالی مشکلات، گندے مکانات، مختلف انواع و اقسام کی بھڑکیوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی تو دشمن کو اس سے گھن آنے لگتی کہ محبت نہ جانے کن غلامتوں میں غوطے مار کر رہا ہے اور کبھی اُسے طوائفوں پر غصہ آتا کہ مردیاں کیوں اتنی گندی ہوئی ہیں، کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ اسے بھی بچی پیس، کپڑے سیس اور عزت سے رہیں۔ مگر اُسے خوب معلوم تھا کہ یہ طوائفیں اتنی اتھیں، اگرچہ لہا چل اتنا آسان کام ہوتا تو وہ کبھی کام شروع کر دیتیں

”اس کا علاج؟“ وہ کبھی ابرکت سے پوچھتا۔

”مر رہا یہ داری کا خاتمہ؟“

”وہ کس طرح؟“

”جس طرح روکس میں ہوا“ اور وہ دونوں گھنٹوں روکس کے انقلاب کی پرچیاں ناپا کرتے۔ غرض جو کوئی بھی اس ترقی پسند گروہ میں تھا پہنچا ہوا تھا۔ عشق و محبت، بیوڈائیڈر جفاکاری، مفلسی اور بے کاری نے سب کو مجذوب بنا دیا تھا۔ دشمن ایک دم جو کالچ سے لوٹی تو ایلیمیا کو پینک پر یہ لڑکائے بیٹھے پایا۔

”اسے تم دیر سے بیٹھی ہو؟“ اس نے کچھ جھل ہو کر پوچھا اور پاس بیٹھ گیا۔ اُسکا ضمیر ایلیمیا کو خاموش دیکھ کر ملامت کرنے لگا۔ انتظار کے جانے کے بعد ایسے کیسے دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے مگر اس نئے انتخاب کے راز دونوں کے درمیان فاصلہ

پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ یہ سڑک کے اس کنارے پر تو وہ دوسرے  
پر کبھی جھوٹے ٹیکے لگا رہے تھے یا نہیں بھی تو جلدی سے بچا لیں گویا دیکھا ہی نہیں، یوں ہی وہ ہم سب کو  
مگر آج نہ جانے کیوں سٹیشن نے اس کے گرد بائیں لپسٹ کر چھٹا لیا اور دیر تک اس کے چہرے  
کو کھتی رہی۔

یہ الیما کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ الیما ہی نہ تھی۔ انہیں اور دیا دہ پور بھی ہو گئی تھی جیسے  
ان پر سیلو لٹکا غلاف چڑھا دیا گیا ہو، گالوں کی ہڈیاں زیادہ اُبھرائی تھیں اور بال  
پہلے سے بھی زیادہ گھنیرے معدم ہو رہے تھے۔ جیسے جھنجھٹاتے ہوئے ہتھکڑے لگانے کے  
وہ خاموش مٹی سے مسکرائے جا رہی تھی جو بجائے دلی مالات کی آئینہ داری کے بالکل ایک  
مستحقِ خمول کی طرح منہ بھی ہونٹی تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کرنا اور نہ ہونا تھی نہ مفاسد،  
اور نہ کوئی طنز پوشیدہ تھی۔

پھر وہ باتیں کرنے لگیں۔ دیر تک ایسا۔ دوسرے کے قریب بیٹھیں وہ وقت سے غافل  
بکواس کرتی رہیں؛ افتخار کی باتیں، جلسوں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا۔

”بعض وقت ہمارا برائے الٹا ہی پڑتا ہے“ الیما ایک دم سے بولی۔

”کیا کہا تو نے؟“ سٹیشن نے اس کے قریب جھاک کر پوچھا۔

”میں نے کہا، ہم کیا سوچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”سٹیشن؟“

”یاں؟“

”کیا میں کچھ بدل گئی ہوں؟“

”کیوں؟ نہیں تو؟“ سٹیشن نے الیما کو سر سے پیر تک دیکھا، ایک دھوکا سا ہوا مگر

مرٹ گیا۔

”مگر ڈاکٹر توں کا خیال ہے میں امتحان میں نہیں شریک ہو سکتی۔“ وہ اور بھیل گئی۔

”تم... تم... الیما؟“ وہ ہکلا گئی۔

”ڈورومت، میری بیماری چھوت دار نہیں، وہ تمہیں نہیں لگ سکتی۔“ ایلیانے طنز  
بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ اس عرصے میں صرف ایک بار مہسی اور یہ قہقہہ ایسے کھڑا کھڑا ہوا  
شمن کے کانوں میں گونجا جیسے کسی نے بہت سے پتھر پٹین کے خالی ڈبے میں ڈال کر جھکول  
دیے۔ اس کے دانت بالکل نہر میں جکھے ہوئے کیلوں کی طرح جھکے اور آنکھوں میں سے  
گھٹا ہوا دھواں اُٹھنے لگا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کیوں ابھر  
آئی تھیں اور بال حیر سے کی مناسبت سے زیادہ اگھدار معلوم ہو رہے تھے۔  
”تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟“ اس نے بہت کچھ جان کر پوچھا۔

”بتانے کو ہے ہی کیا، میرے پیٹ میں پتھر ہے۔“ شمن ایسی بری طرح جھکی جیسے اس  
کے سر پر تخت آن پڑی مگر فوراً ہی کھینائی ہو کر سنبھل گئی۔ نہ جانے کیوں سماجی اصولوں  
کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ناقص ہو جاتے ہیں۔ اور نظر غور  
دیکھا جاتا تو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی تھی مگر سماج اس سے پروا نہ رکھتا  
مانگت تھا۔ شمن کو خود اپنی روشن خیالی پر ناز تھا مگر روشن خیال بننے سے پہلے ہمیں عادات  
ڈالنی پڑتی ہے۔ شمن جلد ہی سنبھل گئی، اس کے خیالات جنگلی ہرنموں کی طرح تلاپٹیں بھرنے  
لگے۔ اب سے بہت پہلے جب پٹنک سے واپس آکر دونوں سہیلیوں نے باتیں کی تھیں  
اس وقت شمن اور بھی موقوف تھی مگر اب تو وہ ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتی تھی۔ پھر  
اسے کمپ کی وہ رات یاد آگئی جب اس نے ایک نئے موٹر کی طرف اگھدار اٹھانے گئے۔  
افتخار کے کوٹ کی خوشبو کو شش کرنے سے وہ دوبارہ دماغ میں کھینچ لاسکتی تھی۔ اور  
پھر اسے اپنی وہ رخصانی یاد آئی جو افتخار نے اس سے مانگ لی تھی۔  
”مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو“ ایلیانے ہولے سے کہا۔

”میں؟“

”ہاں، تم سوتی رہی ہو کہ میں بد نصیب ہوں، میں نے پاپ کیا ہے۔ یہ بات  
نہیں۔ میں اسے پاپ نہیں سمجھتی۔ مگر“ اس کے چہرے پر بھورہ سی بے معنی مسکراہٹ لوٹ  
آئی، ”تم نہیں سمجھ سکتی۔ میں نے واقعی پاپ کیا ہے۔“

”ایلیا!“

”میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ میں نے اپنی روح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ

بھروایا۔“

”کیا بک رہی ہو ایلیا؟ کیا مطلب؟“

”ہیں، نہیں، میں بہک گئی تھی۔“ وہ محو طی دیر کو چپ ہو گئی، پھر لبولی، ”تم نہیں سمجھتیں، تم بھول گئی، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ....“

”ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم افتخار کا....“

”ہاں ہاں، یہی تو معیشت ہے، اگر ایسا ہوتا تو....“ وہ ہچکچہ سوچے لگی۔

”اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی؟ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز سے کہنے لگی:

”اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھڑکایا ہے وہ ستیل کا تحفہ ہے۔“

اور۔۔۔ میں نے اپنے جسم کی آرزو پوری کر دی مگر میری روح ابھی بھوکی ہے۔

میں اسی منہ سے نرگھور جا رہی ہوں، وہاں آپریشن کراؤں گی۔“

آنکھیں بھاڑے، سانس روکے شمن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ”کیوں؟“

”تم ان بالوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں۔ کیونکہ مجھے ستیل سے نفرت

ہے اور اُسے مجھ سے، ہم کوئی سمجھنا نہیں کر سکتے۔ بھلا تم ہی سوچو میں اس کا گناہ کیسے

برداشت کر سکتی ہوں؟ آپریشن کے ذریعے سے میں اپنی انتہائی نفرت کا ثبوت دے

سکتی ہوں کہ اس کا قیمتی تحفہ ٹھکرادوں۔“

”بھلا اس کمبخت کو کیا رنج ہو گا۔“

”اوہ، یہی تو تم نہیں جانتیں۔ فرض کرو تم نے میری دعوت کی، میرے منہ میں تر تیر لولا

دیا، اب اگر میں اسے تمہارے منہ پر تھوک دوں تو کیا حال ہو گا تمہارا؟“

”اوہ، ایلیا!“

مگر ایلیا نے وہی زور زور کے قہقہے لگانے شروع کر دیے۔

”مگر تمہارا بھی تو کچھ حصہ ہے اس میں“  
 ”ہاں ہاں، مگر جب کوئی چیز زمین پر گر کر مٹی میں لٹھڑ جائے تو اسے پوچھ کر کھانے  
 کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر غور کر کے اسے چھینک دینے میں ہی مصداق ہے۔“  
 ”سیتل کو معلوم ہے۔“ تھوڑی دیر خاموش رہ کر شمن نے پوچھا۔

”ہاں، جب اسے معلوم ہوا ناول کے ہیرو کی طرح ڈراما بیہ حیوٹا کر کے،  
 کہنے لگا: مجھ سے شادی کر لو۔“  
 ”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا: یہی تم سے چار پیسے کا سودا کرنے کو تو تیار نہیں پھر بھلا زندگی بھر کا پیٹا  
 کیسے لکھ دوں۔ پھر وہ اور وعدے کرنے لگا تو میں نے کہا میں بنگور آپریشن کے لیے جا  
 رہی ہوں، بیمار سے کام نہ اتر گیا۔“ وہ دل کھول کر ہنسی۔

ایلیا چل گئی شمن دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ سیتل کا مزاج کچھ دن سے بگڑا ہوا تھا،  
 کچھ بھنجا لیا سا رہتا۔ اس کا بے اختیار بھی چالاک جا کر اُس کے دل کی باتیں پوچھتے۔ سیتل  
 جیسا لاپرواہ اور برجم انسان کی انفعی ایلیا کے رویے سے کچھ تنگ حسوس کر رہا تھا۔  
 شادی بیاہ کو تھوڑا کر تخلیق انسان کا پہلا فرض ہے۔ خدائے انسان کو یونیورسٹی میں ڈگریا  
 لے کر دفتروں میں جھبک مارنے کے لیے توفیق نہیں پہنچا کیا ہوگا۔ تخلیق خواہ وہ کسی  
 صورت میں ہو، انسان کی بہترین کمائی ہے۔ تو شاید اپنی کمی کو ضایع کیا جاتا دیکھ  
 کر اُسے کچھ دکھ ہو رہا تھا۔ عیش و عشرت اور اوارہ گردی کا زبردست حامی ہوتے  
 ہوئے بھی وہ خصلت انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا۔ شاید اگر ایلیا عام عورتوں  
 کی طرح رہتی بیٹھتی تو اُس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے، تھوڑا سا تکیا اور سمارج  
 کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلیا کے سامنے پیش کرتا مگر اب تو وہ اُس کی  
 غفلت بھری بے رحمی پر تھننا رہا تھا۔ ویسے اُسے اپنے حسے کے ضایع ہو جانے کی  
 پروا نہ ہوتی مگر یوں ایک بد دماغ لڑکی کو اُسے دلیل کرنے کا کیا حق تھا؟ یہ نہیں کہ اس  
 الجھل شے سے اسے کچھ اُنس ہو گیا تھا یا اس کی آئندہ نسل کا انحصار اسی کی ذات

سے وابستہ تھا، پھر بھی وہ سنوٹش نہیں تھا۔ شاید ایلیمیا کی جگہ مس بڑگا ہو نہیں تو اس کی اس قدر بے قدری نہ ہوتی اور پھر شاید وہ اس قدر حساس بھی نہ ہوتا۔

دو تین دن بعد ایلیمیا جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔ شمن کو اس کی جدائی کا بڑا رنج ہوا۔ وہ ایسی کے متعلق اس نے نہایت مبہم سے جملے کہے: نہ ہاں نہ نا، وہ عجیب فلسفیانہ جواب دے گئی۔ چلتے وقت اسٹیشن پر اس نے شمن کو پیسج کر بڑے جوش سے پیار کیا۔

”میں اب افتتاح سے تول نہ سکوں گی۔ اگر اتفاق ہو ملنے کا تو یہ پیار تم میری طرف سے پہنچا دینا۔ نہ جالے کیوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔“  
”کیا نکلتی ہو؟“

”بھئی میرا مطلب یہ نہیں، جسمانی طور پر تو میں واقعی ابھی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے!“

”تمہارے خیالات اور اتنے تاریک!“

”میں جانتی تھی تم اسے کہو اس کہو گی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک مقررہ حد سے آگے بڑھتے تو ہم مسگر فوراً دھکا کھا کر لوٹ آتے ہیں، یہ تاریکی ہمارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ جہاں تک خنیل کی دھڑکا سوال ہے کوئی ہماری گروپا کو بھی نہیں پہنچ سکتا، خوابوں میں تو ہم بڑی آسانی سے پاتال تک کو فتح کر لیتے ہیں لیکن جہاں نمل کا سوال آیا ہم بچھے کرے۔ یہی دیکھو، اختیار کتنا جو شیلا، کتنا سیما ہے! مگر صرف وہاں تک جہاں تک یقیناً ہی کا سوال ہے۔ وہ جو کچھ سترج سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی عمل کی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا، نہ جانے کیا ہو جاتا لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ میں نے...“

”اختیار روشن دماغ ہے!“ شمن نے کمپ کی آخری ملاقات کو یاد کر کے کہا۔  
”کتنا بھی روشن دماغ ہو، یہ سیما ہی ایک دفعہ تو وہاں بھی اندھیرا کر دے گی۔“

میری زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے، صرف اپنے صیر کی ملاقاتیں۔“

”قوم کی خدمت جس کا تم بڑا اٹھا چکی ہو!“

”اس پڑے سے بھی منہ جل گیا۔ کچھ نہیں، دنیا میں ہر چیز ذلیل ہے ہم لوگ ایک چیز بڑی شان سے شروع کرتے ہیں مگر جلد ہی آپس کی پھوٹا، خود غرضیاں، پست خواہشات اور کچھ پورے خیالات درمیان میں اگر سب کچھ میٹ دیتے ہیں۔ سوائے وہابی بکواس اور نالیاں بیٹنے کے ہمیں کچھ بھی تو نہیں کرنا اتنا“

”لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہے؟“

”وجہ؟ ہماری آبائی توہم پرستی۔ ہم خواہ کہیں چلے جائیں، کچھ سیکھ جائیں، اپنے خون سے اس پست مادے کو دور نہیں کر سکتے جو جو جنم جنم سے ہماری تمام تباہیوں کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ ہم پیدا ہی غلامی اور دوسروں کو سجدہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ گاندھی نے ہمیں غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہم نے اُٹا اُسے ہاتھ بٹا کر پوجنا شروع کر دیا، سارا قومی جذبہ ایک دلیونا کی ہمل پرستش بن کر رہ گیا۔ پلیٹ فارم پر پٹلتے پٹلتے ایسا فلاسفر کی، سٹمن حیرت سے جو بڑا خاموش رہی۔“

”جب ہم ایک دلیونا کو لپچتے لپچتے اکتا جاتے ہیں تو دوسرا بنا لیتے ہیں، ہماری بلا سے اُس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ۔ اگر کوئی ہم سے دنیا میں بنیر دلیونا کے رہنے کو کہے تو ہم کبھی تیار نہ ہوں۔ میں نے تمہارے مذہب کے بارے میں بھی پڑھا ہے۔ مگر مشرقی اور مغربی مذہب میں بھی فرق ہے، اتنا ہی جتنا دلیسی اور فراسی سی شراب میں؛ ایک سلجھی ہوئی فلاسفی کا خمار ہے تو دوسرا طہرے کا جنٹلی نشہ، ایک میں عقل ہے تو دوسرے میں سناٹا کا جوش۔ یہاں ہندوستان میں کوئی مذہب سلامت نہیں رہ سکتا، اس پر فوراً بھڑائی مینا اور راکھ سسوں کی حکومت شروع ہو جاتی ہے“

”مگر تم لوگ تو.... میسائی؟“

”سب وہامیات، نیم، تم، وہ۔ سب ایک ہی ناؤ میں جھولتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے جوش سے میلے کپڑے اتار کر نیا چولا پہنتے ہیں مگر دم بھر میں کچھ میں پھل جالتے ہیں۔ ہم ہر نئی چیز پر پھپھتے ہیں، خود نیا بننے کے لیے نہیں بلکہ اُسے بوسیدہ بنانے کے لیے۔ ہم ہمارے مکڑی کی طرح ہیں جو حسین سے حسین پروانے کو اپنے جالے میں لپیٹ کر فنا کر دیتی

ہے، ایسے کہ پہچانا بھی نہیں جاسکتا۔ نمک کی کان ہیں جو کچھ بھی گرجائے نمک ہی جاتا ہے۔

”تو تمہارے خیال میں ہندوستان کا مرض لا علاج ہے؟“

”مرض تو کوئی علاج نہیں“ وہ بھڑوڑی دیر سوچ کر بولی، ”مگر مہارے طبیب ابھی نمک مریض کے سر پرانے کھڑے مرض کی تشخیص کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی نہ گنٹھیا، تجویز کی ہے، کوئی کھینتا ہے صرف فسادِ خون ہے۔ ہاں یہ سچ بھی ہے۔ یہ خون۔ ہندوستانی خون۔ بہت ہی سیاہ ہو گیا ہے!“ وہ اپنی سادھوؤں جیسی آنکھوں سے نہ جانے کس سمت گھورنے لگی۔ گواہ کیا کی صحت، گریہ بھی مگر جسم پر پھل دار درخت کی سی مہاری بھر کم فٹ چھائی ہوئی تھی۔ شمن اُسے خاموش پا کر غور لئے دیکھنے لگی، نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا۔ اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے! آم بولر لگتے ہی پھل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا، اس بنیاد کا حق تو صرف اشرف المخلوقات ہی کو حاصل ہے کہ اگر وہ قدرت کی خدیں پوری کرنے کو تیار نہ ہو تو کوئی اُسے مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بنیاد اُس نے مسکھی کہاں سے!

اہلیا کی طرح روا نہ ہو گئی تو ہزاروں سوال اُس کے دماغ میں گور کو دھندوں کی طرح الجھتے سلجھتے رہ گئے۔ دل ایک بھاری سے بوجھ کی شدت سے دھنسنے لگا۔ وہ پرجسرت بوسہ جو اہلیا انتظار کرے اس کے ہونٹوں پر چھوڑ گئی تھی، انکار سے کی طرح دھنسنے لگا۔ اس کی امانت محفوظ رہے گی؟ کاش انسان اتنا بزدل نہ ہوتا!

واپسی پر اس نے لان کی بچ پر سیٹل کو بیٹھے پایا۔ وہ گھاس کے وہ میدان جھلکتی پھرتی خشک زمین پر گھسی گزر رہے ہوئے کیرطے کے نقش پا ڈھونڈ رہا تھا۔

”گھاس کی جڑ تک کھا جاتے ہیں یہ کیرطے!“ اُس نے زنجیرناہر سے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”کیا بوٹنی کا مطلقہ شروع کر دیا ہے؟“ شمن نے آواز میں طنز کی جھنکار پیدا کر کے



جواب دیا۔

”نہیں نہیں، ابھی میں نے مالی سے پوچھا یہ مینیں کو رٹ کیوں لگوا ہوتا چلا جاتا ہے تو... مگر دشمن کے چہرے پر ردائیں مسکراہٹ دیکھ کر وہ چپ ہو گیا۔  
”اُسے ہنسا کر آ رہی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائیے“ اُس نے ایسے لجاجت سے کہا کہ دشمن کو منہسی آگئی۔ یہ مرد بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں! آگ کو ہمیشہ مجبول میں دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ منہسی منہسی میں جیسے کا پنخ کا گلاس توڑ کر بیٹھا منہ لبسور رہا ہو۔ دشمن اُس کے پاس بیٹھ گئی۔

ظالم اور مظلوم کا فرق بھی بالکل وہم کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا بھی سیتل کو مقررہ مزار سے دیتی تو وہ لبرل خود اپنے ضمیر کی جڑیاں نہ کھاتا۔ اس کی بے نیازی نے تو خاموش گھٹن کو اور بھی بڑھا دیا۔ کاش مزار پر طمانچہ مار دیا جائے تاکہ احساس تو بھوکریں کھالے سے نچے!

”میں نے اس سے کہا بھی کہ میں تیا جی کی دھمکیوں کی پروا نہیں کرتا، میری ماما کی جائیداد کا فی ہے“ وہ شکایتاً بولا اور دشمن کو اس پر ترس آ گیا۔ لوگ ابھی تک جائیدادوں اور والدین کی دھمکیوں کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں گویا پیسہ ہی تو ضمیر کا مول ہے۔ مگر سیتل یہ عذر دشمن کے سامنے کیوں پیش کر رہا تھا؟ شاید خود داری مظلومیت کی پناہ میں شکست خوردہ ریزوں کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی۔

”میں نہیں کھیلے گی؟“ اُس نے دشمن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر رد کا جیسے آہستہ تنہائی سے خوف اُڑا ہوا۔

”میرا ریکارڈ تو مے پر ہے“ گو وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ سیتل کی جی بھر کے گت بنائے گی مگر نہ جانے مامتا کی کون سی رگ پھر طک اٹھی کہ وہ بالکل ہی پھل گئی۔ روتے کو اور کیا بچھڑانا!

یٹنس کے مین سٹیٹ ختم کر کے جب وہ ہلکی پھلکی کمرے پر پہنچی تو اُس کا ضمیر اُس پر ٹھٹھا کر رہا نہ لگا۔ حیف ہے کہ وہ اپنی سب سے پیاری سہیلی کے دشمن کی دلجوئی کر رہی

مختی: وہ زہرا کو بیٹھ گئی، جیسے ایما کی چتا پر ناچ کر آ رہی ہو۔ خود وہ ہو کر اُس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے خواب چھینٹے دیے۔ آئندہ سے وہ سیتیل سے بات بھی نہ کرے گی۔  
لیکن یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ یونین کی اتنی اہم عہدہ دار ہوتے ہوئے اسے سیتیل سے بخت، لینا مشکل تھی۔ وہ جب چاہتا اُس سے ضروری معاملات کے متعلق مشورہ کرنے آئے وہمکتا۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، لائبریری میں، ٹینس لانا پر کھانے، کمرے میں اور یونیورسٹی کے ہر کونے سے سیتیل نے اُس پر یادوں کی طرح ایڈنا شرح کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ننھے سے نکتے میں بھینچتی جلی جا رہی ہے۔ یہ گہرا اُس کا دم کیوں گھونٹ دیتا ہے؟ قوتِ مقابلہ اتنی سست اور بدست کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ سیتیل نے تین گھنٹے لائبریری میں اُسے لغو شاعری سنائی وہ سنتی رہی!

وہ پیرسیکٹ سے آرام کر رہی پر اگر وہ سیتیل پر مختی ہونی تاریکی کو آہستہ آہستہ رنگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ڈوبے ہوئے سورج کی آخری جھلک کمرے کو مسحور کر رہی۔ رنگ میں ڈوبے ہوئے مختی کہ اچانک اُس کے دماغ میں ٹیلیوین اور لٹریچر میں ملی جلی ایک شیریں بسانے چوٹکا دیا۔ وہ اس لٹریچر سے دماغ کو چھڑا کر پیچھے مڑی۔ سیتیل وہ نہ سزا کے بعد اپنے میں نہایا ہوا اُس سے کچھ نہ چھڑا رہا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال بھرے بازو ویراں تھے اور نینڈ لیاں پسینے سے چمک رہی تھیں۔ وہ جاے کیا ہوا کہ شبنم کا دم گھٹنے لگا، معلوم ہوا کسی نے اُسے گوشت دے پست کے انبار میں لپیٹ کر چھپا دیا۔ یہی لمبی سانسیں میرے وہ سنبھلی اور بدحواسوں کی طرح بھاگی۔ غسل خانے کے نل سے اس نے گٹ گٹا کر پانی پیا اور دلدار سے لگ کر کچھ سے ہونٹوں کو سمیٹنے لگی۔ دیر تک ایک ابکاٹی کا سا احساس اُس کے دماغ میں بچھسا رہا اور وہ نڈھال بلنگ پر پڑی رہی۔

کھانے کی میز پر باوجود سیتیل کے شدید اصرار کے وہ دہاں سے اپنے بھاگنے کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکی۔ نہ ہی اُسے کچھ معلوم تھا۔ اس کے وجود نے بھاگنا

چاہا اور بغیر کہے سنے بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں بہت سے حیوان طوفان کی آمد سے پہلے  
پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔

اور افتخار؟ اُس کے خیال ہی سے غور سے اُس کا سر بھاری ہو جاتا۔ کیا بات  
مختی جو افتخار میں سیتل سے مختلف تھی؟ جس نے اُس کے وجود میں اس بلا کی کشش  
پیدا کر دی تھی؟ جہاں تک صورت شکل اور دولت کا سوال تھا وہ سیتل سے میلوں  
میرا ہوا تھا، یہ بھی سوائے اُس کے کیا اس سے سب لڑکیاں چڑھتی تھیں۔ کیا  
عجب جو الیانا نے بھی سیتل کے جسم میں افتخار ہی کی جستجو کی ہو اور نا اُمید ہو کر بوٹ  
پر بیٹھی۔ امتحان سربراہ گئے اور سیتل کی ساری نفرت، خوف اور کشش کو مہل  
کر اُس نے کتابیں سنبھال لیں۔

(۳۳)

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے سستی اور بیکاری کے لمبے چوڑے دن گپ بازی میں  
کاٹنے دشوار ہو گئے۔ بورڈنگ میں رہتے رہتے اُسے گھر سرائے معلوم ہوئے  
لگا تھا۔ بی۔ اے کے بعد ایک طرح تعلیمی جنکشن پر اتر کر ذرا ادھر ادھر گاہ ڈالنے  
کی فرصت ملی، گھر میں بچوں کی تعداد پوچھنی ہو گئی تھی، بھائی کمانے میں جھے ہوئے تھے  
اور بھیا وجہیں پوچھ رہے تھے میں مشغول معلوم ہونا تھا زندگی کو ٹوٹے ہوئے چھکڑ  
کی طرح ہر ایک آگے ٹھیسٹ میں مشغول ہے، کوئی بھی تو مرمت کے لیے دم نہیں لیتا۔  
چوبیس ڈھیل، پھٹے بھاگ نکلنے کو تیار، سچیت غائب، پندے میں چھلنی جیسے چھد مگر  
بیل کی گردن پر جو مضبوط اور لائحہ عمل کے ٹھوکے جاری جو کسی سے روک کر تو چھنا  
چاہو کہ ”بھئی کہاں کا قصد ہے؟ تو مہکا بکا ہو کر جواب ملتا ہے: ”کہیں کا نہیں!“  
اس دنیا میں ایک دفعہ آنے کے بعد سوائے قبر کے اور کہاں جاسکتا ہے؟ گرتے  
پڑتے سب ایک ہی نشان کی طرف دوڑتے چلے جا رہے ہیں اس امید میں کہ  
وہاں جنت ملے گی۔ دفتر سے بے فکر مزے سے گزرے گی، حوریں ملیں گی اور

جو اہرات کے محل۔ جو کچھ سمیٹا اجاسکے وہیں کے لیے اٹھانے کا بندھن تھا اس ایک بار وہاں پہنچ جاتیں تو پھر وارے نیارے ہوتے۔ اگر جنت کی تاک میں دنیا دوزخ جنتی ہے تو کچھ پروا نہیں۔

پھٹیل میں اندر، برکت، عباس اور سیکل بے خط آئے۔ افغان اور اہلیا خاموش رہے۔

ششی کامیابان انگلینڈ سے مغربی بنیابن کر آگیا۔ مس لہگانے فلسفے میں ریسرچ شروع کر دی اور شمن، نتیجہ سننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس شمن کا کیا کرے؟ زندگی کی نگاہی گسٹو لے کے لیے کئی وضع دار پچھے ساتھ دینے کو موجود تھے مگر کسی کا دھڑا کر دیا، کسی کا بال ڈھیلہ۔ ڈیڑھ کلکٹریاں محدود، پولیس کا دائرہ مقرر، جنگلات میں پالہ برنیر۔ زمانے کی افزائش کو دیکھتے ہوئے مس شمشاد نے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول فرمائی۔

اسکول کی عمارت ایک دربادلہ رئیس کی بے کار کوٹھی تھی جو انہوں نے بے زبان لوگوں

کی بکواس سے بچنے کے لیے اپنی منہ چوڑھی طوائف کے لیے آبادی سے ہٹ کر بنوائی تھی

اور جہاں سے ہر گزیر دار چمکلیوں اور چھروں سے تنگ آکر بھاگ چکا تھا۔ اسکول کا باقی

سامان کسی اور گیارے دی رئیس کی نالک کی بچوں اور نیلام کی میزوں پر مشتعل تھا۔ ایک

اور رئیس، جن کے باپ دادا کو ادب سے لگاؤ تھا، لائبریری مہیا کرنے پر مل گئے تھے۔

چونکہ کوڑا کرکٹ چھینکنے کے لیے کوئی گڑاں میسپلی کی زیادتی سے دستیاب نہ ہو سکا

اس لیے دنیا بھر کی واہیات اور لغو کتابیں جنہیں مصنف کے بعد شاید کاتب نے پڑھا

ہو، انہی تمام بھیانک ضعیفی کے ساتھ ان موجود ہوئیں۔ جتنی لڑکیاں رجسٹر میں درج

تھیں اس کی نصف تو شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ چار اسسٹنٹ معلومات تھیں

جنہیں بیس روپیہ مہانہ دے کر بیس روپیہ کی رسید لی جاتی تھی۔ بیجاریاں غربت اور بیوگی

کی لعنت میں گرفتار تھیں درجہ حکم تعلیم سے ان دیکھاریوں کا تو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دو

چیر اسٹین تھیں جو خوشحال دنوں میں نالک کی لطیف خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے

چکی تھیں۔ ایک چیراسی تھا جو منیجر صاحب کا باورچی، براء، فراش اور بچوں کی گورننس کی

خدمات کے علاوہ انسپکٹر اس کے آنے پر بھورا کوٹ اور سفید صاف باندھ کر موب لٹا

کرنے کے کام بھی آتا تھا۔ اسکول کی تمام کارآمد کرسیاں اور میزیں خالی اوقات میں منیجر

صاحب کے ڈرائنگ روم کو زینت بخشی رہتی تھیں۔ چاروں انسانیاں زیادہ تر اُن کے بچوں کی مرضیاں، لحاف اور بیل کے کرتے پہا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں کشیدے کے کام سے بہت لگاؤ تھا اور یہ انسانیاں بچہ لگے ڈوروں سے اُن کے غلافوں پر سویٹ ڈریس اور فوگٹ می ناٹ، بہت صفائی سے کاڑھا کرتی تھیں۔

اُن میں سے ایک استانی رضیہ بیگم کوئٹہ روپیہ کی رسید پر تھیں روپیہ تنخواہ ملی تھی۔ ہر ماہ منجر صاحب یہ زائد پانچ روپیے اپنی حبیب سے ادا کرنے کی دھمکی دیتے مگر پوری نہ کرتے۔ اُن کی آمد پر مسز بیچر نے فین اُٹلی اور ٹیبل آلوٹریں وغیرہ پینے کی عملی دھمکیاں دی تھیں۔ رضیہ بیگم بھاری جسم کی اور بیڑ عمر بیوہ تھیں۔ قرآن شریف کے علاوہ اُردو اور سری فارسی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں کبھی کبھی خواہی قبول صورت سہوں کی مگر برس کے سفید دانتوں نے ذرا بدہیئت کر دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ داغ پرانے تھے مگر مسز بیچر کا خیال تھا کہ یہ اُن کے وطنیوں اور اُن کے پیر کی دعاؤں کا بدلہ سا عکس تھا جو رضیہ بیگم پر بھٹکا رہا کہ برس رہا تھا۔

رضیہ بیگم سے سوائے فرانٹ چراسنوں کے سب ہی مرعوب تھے۔ یہ چراسنیں اُن کی گزشتہ زندگی کی بہترین مازدار تھیں۔ اُن سے بہت بڑے کافی تھیں اور بڑی والی بڑھیا تو انہیں رجوبی ہی کہا کرتی تھی۔ رجوبی کا زیادہ وقت مونگ پھلیاں ٹونگنے اور منجر صاحب کے سویٹ بٹھنے میں صرف ہوتا تھا۔ یہ سویٹ وہ اس قدر عمدہ نمونوں کے بنا کرتی تھیں کہ دامغ اُچھ کر رہ جاتا۔ پڑھاتی خاک تھیں اور کیا لکھتی یا تو اُن سلجھا یا کرتیں یا اُن کے سر میں چٹکیاں بھر کر تیں، اور چیرا سنیں لکھتی انہیں نکلے ٹوٹے کی عاشقوں کے تھے سنایا کرتیں یا بڑی استانی جی، یعنی شمش، کی بدحواسیوں پر مباحثہ کیا کرتیں شمش سے پہلے بھی دو ہیڈ مسٹر سین مبرٹک پاس آئیں مگر تین تین چہینے بعد بھاگ نکلیں شمش کی آمد پر نہ جانے کیوں مسلم گھرانوں کی توجہ تعلیم کی طرف تیزی سے مبذول ہو گئی، دیکھتے ہی دیکھتے دو عیسائی عورتوں کا اضافہ ہو گیا، داخلے بھی تیزی سے ہونے لگے ایک گریجویٹ میڈ مسٹر کالاسہ اور ایک اینجو صاحب اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں بھی پھانس لاسے مگر یہ اعلیٰ خاندان

صاحبزادیاں دواؤں، اناؤں اور ایسی ہی گھنٹی گھنٹا بیڑھیوں کی نگرانی میں کالج کے گلاس بن کر آتیں، چاروں طرف اٹھلاتی پھرتیں اور پھر ان کی موٹریں، بھیاں آجاتیں اور وہ چل دیتیں۔

نیشن کی آمد سے پورا انقلاب آگیا، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے پیڑ صاحب سے عجوبہ روزگار بنائے لیے پھرتے۔

”صاحب مسلمانوں میں ہیں کہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں؟“ اور لوگ بھی اُسے ایسے گھورتے گویا اُس کے منہ پر سونڈ لٹک رہی ہے۔ کام کی بات یہ ہوئی کہ انسپکٹر شمن کے کالج کی پرانی طالبہ نکلیں اور یہ رشتہ اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کی گرانٹ بطور گئی اور پیڑ صاحب گھنٹوں برآمدے میں سو کھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے لگے۔ مگر وہاں بھی اُسے حد درجہ بدحواس دیتے اور انسپکٹر اس یا ان کا کتا آجاتا تو، بیڑا کر کھڑے ہو جاتے۔ ویسے بھی اُس کی قوم پرستی کی دھماک بڑھ گئی۔

ان واحد میں دنیا بدل گئی۔ اسکول میں نیا فریج، نقشے اور تصویریں نظر آئے لگیں۔ ٹاٹا پر بیٹھنے کی عادی لڑکیاں بیچوں پر اکڑاؤں بیٹھنے کی مشق کرنے لگیں اور شمن نے بڑی شد و دس عمارت کی چوندا پار سے لگا کر درست کرنا شروع کیا، چھپکلیوں کے خلاف جہاد بول دیا۔ مس ٹامس اور مس الگزنڈر نیلی اور سرخ روشنائی سے سج سج کے ٹائم ٹیبل بنانے لگیں۔ لائبریری کی بھر بھری بوسیدہ کتابوں کی سنبھالی سنبھالی کر ٹانگہ زنی کی گئی۔ دو چار دن تو بے جبر سینی پر تھوڑا کھ کر چرائیں بھی مقررہ بیچوں پر بارہے طوطوں کی طرح جی رہیں، رضیہ بگم نے بھی منہ بگمیاں ٹالیک میں بھیا دیں اور جہاں نے دفعتاً دروازے کے بیچ میں ٹھکے ہوئے کھٹے کو پیٹ دیا۔ گھنٹہ بجائے وقت شدت احساس سے اس کے کان سرخ ہو جاتے اور گاڑی والے اپنی گپ بازی اور حلیمیں چھوڑ کر ٹپے ہوئے موڑے خانے سے اُسے بغور دیکھ کر مسکراتے لگتے۔ مگر کچھ دن بعد ہی ان بندشوں کا جادو فنا ہو گیا۔ رضیہ بگم کسی پر ہی پالتی مار کر پیڑ صاحب کے پیچھے سویرا بننے لگیں، چرائیں حسب معمول دہلیز پر چھپ کر امار کر پیاری لگا بیٹھیں، گھنٹہ

بہانے کی موگہی فٹیشہ کی کیل مٹو کئے۔ یہ جانی گئی اور پھر قرآن والی انسانی جہا کے کمرے میں اُن کی چھایا کی بلالیاں توڑنے کے لیے محفوظ ملی۔ سٹن نے مغربی بردباری اور بھیدگی سے بھر تے ہوئے شیراز سے کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے نمک سیتہ گرہ شروع ہو گئی، ہر سزاؤں کی آنکھ بچتے ہی پھسل پڑتی اور چل کر قابو سے باہر ہو جاتی، کمرسیاں اور میزوں اور کچے میجر جہاں کے یہاں دعوت میں مستعار گئے اور پھر اڑا کر نہ آئے۔ چہر اسی پھر باقاعدہ اپنے پرانے ہمد سے پردا پس چلا گیا اور دونوں عیسائی انسانیاں برطیس کے قومی اسکول کے اسٹروں سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ لائبریری کی کل جاندار کتابیں مسز پنجر اور اُن کی سہیلیاں پڑھنے کو لے گئیں جو پھر اگر واپس آئیں تو چھٹیڑ سے اور وال سالن میں بھڑکی ہوئی۔

رفیہ بیگم نے تو ایک مستقل محاذ قائم کر لیا جس میں دونوں چرائیں برطیس جوش و خروش سے شریک ہو گئیں۔ لڑکیاں دن بھر کمر اور بیڑ کے درختوں کے نیچے کشتیاں لڑتیں اور سٹن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ اس کے بنائے ہوئے گھر وندے کو ڈمانے پر مصر ہے۔ جتنی جتنی اُس نے سختی برتی عملہ پھیرا ہی گیا۔

رفیہ بیگم اور انجادیوں کی کوشش نے اُسے بدحواس کر ہی رکھا تھا کہ مسز پنجر منع اپنے غلیظ اور نامعقول بچوں کی فوج کے اسکول کے معاملے کو آن دھمکیں۔ پتہ نہیں اُنھیں یہ عہدہ کب ادر کیوں دیا گیا تھا۔ اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ اُنھیں برطیس معیتر ذریعے سے معلوم ہوا کہ لڑکیاں کچی امیاں برطی بے رحمی سے کھانے میں مشغول تھیں۔ قیمتی امیاں علاوہ اجار چلنے کے اُن کے گھر کا سال بھر کا کھانا کا اسٹور مہیا کرتی تھیں اور جو ملجیر حساب کو ان کی حراالت کی فکر گھن من کر کھائے جاتی تھی۔

”یہ تو ہونے سے راکہ میں لیا سا بانس لے کر نگرانی شروع کر دوں“ اُس نے اُن کا دنگڑا سن کر رکھائی سے کہا، ”بچوں کو تو میں نے منع کر دیا ہے مگر استانیوں کو کیا کہوں؟ جو کھانا سکھانے کے لیے توڑتی ہیں؟“

”ہاں یہی تو مصیبت ہے میں نہ کہتی دفعہ کہا ان کبھتوں سے مگر نہیں مانیتیں۔“

یہ رضیہ بگم تو سب سے پیش پیش ہیں۔ مجلاتم ہی بناؤ بہن، مہیلا ان کی عراب کچی امیوں کی ہے؟  
 بدھنی گھوڑی!

”میں نے منع کیا تو انہوں نے کہا وہ آپ کے لیے اچار بنا رہی ہیں۔“

”خاک میرے لیے اچار بنا رہی ہے اس کا بس چلے تو میرا ہی اچار بنا دے۔۔۔  
 آپ کو نہیں معلوم۔۔۔“ وہ راز دارانہ انداز میں پاس سرک آئیں۔

”بہن کیا بتاؤں؟“ بڑی حسرت سے بولیں ”یہ اسکول کا تو الدمار ابھانہ ہے۔  
 چھ بچوں کے باپ مگر گن دیکھو تو اللہ توبہ۔ اس رضیہ کے پیچھے دنیا زمانے کے غنڈے۔  
 لگے پھرتے ہیں اور اللہ کے بندے نے اُس کے سپرد شریف بچوں کو کر رکھا ہے۔ میں  
 نے تو کہہ دیا ایک دن کہ پرطعن و طعننا تو خاک نہیں ہاں دو چار آنکھ لڑا سنے کے گریٹنگ  
 سکھا دیں گی۔“ شبنم ہنسی دبا رہے ان کی باتیں سنتی رہی۔ امیوں کی رکھوالی کا پختہ وعدہ ملے  
 کے مسٹر منیر جلی گیش تو دیر تک شبنم رضیہ بگم ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ اُن کی جوانی دھل چکی  
 تھی پھر ان میں ایسی کوئی سی خطرناک ادا بائی رہ گئی تھی جس نے مسٹر منیر کو بار بار اس کو رکھا تھا۔  
 اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بد صورت عورت  
 میں انہیں کہاں سے خطرہ نظر آ رہا تھا۔

”اچار میں بھی خاصا ڈالتی ہوں مگر ابھیں تو اسی مردار کے ہاتھ کا پسند ہے، اُسی  
 کی چٹنی پہ دم جاتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن ان کی چٹنی نہ بنا کہ رکھو دے تو نام ملے کے  
 رکھ دینا، وہ کس و ثوق سے کہہ گئی تھیں۔ تو کیا منیر صاحب رضیہ کی چٹنی پر عاشق تھے؟  
 شبنم کو ہنسی آگئی۔ یقیناً عشق نہ الا تھا اور چٹنی بھی۔ یعنی اچار چٹنیوں کے ذریعے بھی  
 عاشق چھپتا۔ اُسے جاسکتے ہیں۔ چٹنی کھاتے وقت اسے کبھی شبہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس  
 کا اتنا رومان انگیز مصرف بھی ہو سکتا ہے۔“

شبنم کا کمرہ اسکول سے ملحق دروازہ دار حصے میں تھا۔ سامنے اُس نے چھپا ہوا سا باغیچہ  
 بنالیا تھا جہاں وہ شام کو آرام کر رہی پر لیٹ کر سامنے میدان میں کھیلے ہوئے بچوں  
 کو دیکھا کرتی تھیں۔ بازو کچھ برآمد سے سے گزر کر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو رضیہ بگم



کو دے دی گئی تھی۔ ایک چیراسن دوسرا ہٹ کے لیے اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ اسکول کے بعد وہ کو مٹھی کے سامنے پلنگڑی پر بیٹھ کر بیچیر صاحب کے تکیوں کے غلاف کاڑھا کرتی۔ نہ جانے انہیں اتنے غلافوں کی کیوں ضرورت پڑتی تھی؛ ضرور بیوی پار کرتی ہوں گی۔ رفیقہ بی کے کاڑھے ہوئے سویٹ ڈریم سے اُن کی بیچاری کی اپنی نیند اُڑ جاتی ہوگی۔ اب جیسے آموں کا موسم شروع ہوا تھا وہ امیال پھیل کر چٹنیاں پکا یا کرتی تھیں۔ کتاب اور اخبار کو بھول کر شمع اُن کے افسانے کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ رضیہ گیم صورت سے کافی ہوشیار اور بکلی معاذم ہوتی تھیں۔ اُن کی زندگی کچھ معصوم نہ گزری ہوگی کاش کوئی اُن کی کتاب زندگی کے دو چار ورق الٹ دیتا۔ بیچیر صاحب کو وہ بھائی جان کہتی تھیں مگر اس ننگے سے کہ لفظ رجان، پر بیچاری مسٹر بیچر کی جان ہی تو نکل جاتی۔ کہتے ہیں عورت عورت کو پھان لیتی ہے، مگر پھر یہ کیا چیز تھی جو انہیں ڈرائے ہوئے تھی اور شمع کو دم معلوم ہوتا تھا۔

داخلے اور روزانہ حاضری کے رجسٹر بنانے کے لیے اُسے کسی مددگار کی ضرورت ہوئی تو بیچیر صاحب نے اپنے جان بچان والے دو ماسٹر دلوں کو بھیج دیا جو روز شام کو آکر اُسے اور دونوں نئی عیسائی آستاینوں کو جمع تفریق کی مشقیں از مرنہ کرانے لگتے۔ عورت سے زیادہ بیکار خانے نکتوں سے بھرنا، مہینے بھر کی حاضری جوڑ کر اُسے سال بھر کی حاضری میں سے گھٹانا اور پھر دنیا بھر کی الا بلا کو گٹا کر دینا۔ کتنی لڑکیاں ڈرائنگ لیتی ہیں اور کتنی فارسی۔ چونکہ یہ دونوں مضمون اسکول میں سکھائے جاتے تھے اس لیے یہ خانے نکتوں سے بھر کرنا۔

کبھی تو حبیب اور افرم دونوں آتے اور کبھی حبیب اکیلے۔ اور جب رجسٹر دلوں کا جھگڑا ختم ہو گیا تب بھی کسی نہ کسی بہانے سے پھیرا لگاتے رہے۔ کچھ کتابوں وغیرہ کا لیسن دین شروع کر دیا۔ ان کی ضرورت کی کتاب ساری لائبریریوں کو چھوڑ کر صرف شمع کی لائبریری ہی میں لیتی۔ حد یہ کہ حبیب کی توجہ ناقابل برداشت حد کو پہنچ گئی لہذا آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے ڈھیسے کرنا شروع کیا۔ ایسے کہ وہ محسوس نہ کریں مگر انہوں نے تو نرا پاپا

کی صفت اختیار کر لی اور جتنا اٹھاڑا جتنے سی چلے گئے۔ وہ آتے اور ہکلائے ہوئے  
 بدحواس سے بیٹھے رہتے۔ اُن کی اس قابلِ رحم کھراہٹوں پر شمن مسکرایا کرتی۔ ضرورت سے  
 زیادہ جینے سنگھار کر کے آنا شروع کیا اور شمن کی رکھائی پر مکمل مریضِ عشق بن گئے مگر  
 خاموش اور سکیں ایسے کہ محترم سوال میں مگر زبان بند۔ یہ بکھلا ہوا بھی کچھ کم مصلو کہ چیز  
 نہ تھی۔

اس میں اُس بیچارے کا کیا قصور تھا، جالی خاندان کا تقسیم یافتہ، عمر میں شاید پہلی  
 مرتبہ ایک غیر اور شریف عورت سے آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنا۔ ویسے لڑکیاں تو بہت  
 دیکھی تھیں مگر تاک جھانک کر اب جو یہ جیتی جاگتی، بولتی بھالتی صورت دیکھی تو سوائے  
 عاشق ہونے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سیدھے سادے آدمیوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر حیرت  
 نہیں ہوتی لیکن نرٹ کو باس کی نوک پر تلا لگاتے دیکھ کر ششدر ہونا ہی پڑتا ہے۔ تو  
 شمن نے بیچارے کو بانہ بچر کی طرح مسحور کر کے ٹنگ کر دیا تھا۔ اس اچھے ہوئے جذبے  
 کو وہ عشق سمجھ رہا تھا اور اس بے مصلو کی وجہ کے عاشق ہو جانے سے شمن کو جلد جنسِ عین  
 ہونا معشوقہ بننے پر تو مجبور نہیں کیسکتا اور نہ ہی ہر دمِ عورت پر عاشق ہونے کا حق  
 ہے۔

شمن کو اس پرزرس بھی آتا اور غصہ بھی۔ اُس نے تخیل ہی میں اس کی آئندہ زندگی،  
 ایک مختصر مکان میں معمولی سی بیوی اور غیر معمولی تعداد میں بچے غربت کی گود میں پٹے دکھائیے۔  
 یہ لوگ بس زندگی میں ایک بار اپنے طبقے کو چھوڑ کر عشق رجالتیت میں خواہ وہ ایک طرفہ چیز ہو۔  
 مگر ناکامی لازمی نتیجہ ہے اور شاید ایسا عشق کر کے ناکام ہونا ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔  
 یہ درمیانے طبقے کا کم حیثیت لڑکا چھانرٹ کر اپنے آسودہ حال پر و فیروز کی لڑکیوں  
 جس سیٹھ کے دفتر میں وہ چالیس روپیہ کا نوکر ہو اس کی اکلوتی لڑکی پر عاشق ہو بیٹھا ہے۔  
 اگر اچانک کبھی ایسے عشق میں کامیاب ہو جائے تو بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔ اسے اچھا  
 کر لے جانے سے بھی خواب چوراہا ہو جاتا ہے۔ دریا میں ڈوب کر بھی پیاسا رہ جاتا  
 ہے۔ وہ تو عشق صرف نام رہنے کے لیے کرتا ہے تاکہ اُس کے قصے اپنی نئی دہن کو ٹھنڈی

سانس بھر کر نہایا کرتے۔ زندگی کو اپنی بیوی کا رقیب بنانے میں وہ تنگ محسوس کرتا ہے۔ نچلے طبقے کا ہونے پر اسے بھی وہ عشق جیسے بلند جذبے کو بلند ری ہی پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں کرتا مگر اس کے جننے ہوئے کیڑوں کی پرورش میں انسان سے چرخا بن جاتا ہے، اس کی بیماری پر ہاتھ پیر پھیل لیتا ہے اور ذرا روکھ جاتی ہے تو ہاتھ جوڑ کر منا لیتا ہے۔ اپنی محبوبہ کا رتبہ بہت بلند سمجھتا ہے مگر اس سے اپنی بیوی سے کم محسوس اور پار سا جانتا ہے۔ اس عجیبہ کو وہ روحانی تمازت کہہ بیٹھی شخصیت میں چھپا لیتا ہے۔ اگر اصل نہیں تو خیالی ہی سہی، وہ ہر طرح اس سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے یا میکے چلی جاتی ہے تو اسے بڑی احتیاط سے نکال کر عشق حقیقی سے جی بھلاتا ہے اور یہی بنیادی رقیب دور چھڑی ہوئی بیوی کے سینے میں رشک کی آگ بھڑکا کر اس کی محبت کو اور بھی بجھ کر دیتا ہے۔

جی گھبرا اٹھا تو وہ ٹھہرتی ہوئی آم کے پٹروں کی طرف نکل گئی۔ رضیہ بیگم باپ کے پلنگ پر کھڑی چھڑی سے آم جو باڑنے میں مصروف نظر آئیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس ادھیڑ عمر عورت کو لوہوس لومڑی کی طرح کچی امیوں کی تاک میں چھڈتا دیکھ کر چڑ گئی۔ سچ کہتی تھیں مسز پنجر کہ کچی امیاں کھانے کی بھی ایک بالین کی عمر ہوتی ہے۔ واقعی بڑھی گھوڑیوں کو ایسے ملک کرتا ہوں پر ٹوٹ پڑنا زرب نہیں دیتا۔ لیکن فورا ہی اُسے یاد آگیا کہ وہ تو منیجر صاحب کی جلتی بنانے کے لیے توڑ رہی تھیں!

شمن کو دیکھ کر وہ سوئے ادب پلنگ سے اتر آئیں اور کنواری لڑکیوں کی طرح جھینپ کر سر ٹوٹھانے لگیں۔ ان کی ہر چہرے پر کے آثار پیدا کرنے والی اداس کا مطلب اب تک اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ اتنی بڑی تھیں مگر بہت کم عمر اور چھوٹی سی بن کر دیکھے دیکھے کر کے اٹھلانے لگتیں اور گھبرا گھبرا کر بار بار سر ٹوٹھانچتیں اور کچی نظروں سے شرماکہ مسکرانے لگتیں۔ ان کی اس اداسے آگ لگ اٹھتی تھیں شایدا ان کی بھی ادھیڑ صاحب کے کلچے پر چھری چلا گئی ہو۔

بڑے پیار سے انہوں نے گری ہوئی کیریاں جمع کیں اور اپنی کوٹھڑی کی طرف

چلی گئیں۔ رضیہ بیگم بڑی سنگھڑ تھیں۔ یہ غصہ تھی کہ ٹیڑھی ان کی صفائی اور خوش مذاقی کا  
 نمونہ بنی رہتی۔ سانسے در کے اوپر کلائی ہینڈ لوں کی بیل چڑھا رکھی تھی۔ کیا ریلوں میں راگ  
 اور دھنیا پودہ لہو لیا تھا۔ دو چار گٹے بھی رکھے تھے۔ شام کو چھڑ کاؤ کر کے بکلی پلنگڑی  
 پہ بگم کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتیں اور جیسا اس سے محلے کی بھڑکیا سنا  
 کرتیں۔ گو وہ فیشن ایبل نہ تھیں مگر بھی اچھی حیثیت سے تازہ ترین تراش کے پیر ہیٹیں پہنا  
 ٹنڈ ہی رہتا مگر کہتے تھے بچا سے تھیں یا پیر ہیٹیں۔ تندرستی اچھی تھی کپڑا خوب  
 گندا تھا۔ عموماً ایک خوشگوار ڈھلوانی لہی رہتیں۔ ان کے بڑے خلاف منہ بچا پیری صاف و  
 کی بھڑی اور ہمیشہ بدحواس رہتیں۔ ایک بچہ ہی نہ کسی صورت میں ان پر چھایا رہتا۔ نہ تو  
 انہیں کہتوں کے بجائے جھپٹنے کی ہمت اور نہ اچھا چھینا بنانا رہتا۔ شادی کے  
 بعد سے وہ خود ایک مستقل اچار بن کر رہ گئی تھیں۔ گھر جیسے گودڑ کی لہی جس میں ضرب  
 چلی پڑے اور اچھے ہوئے تارے تھے۔ گو بچہ صاحب نہایت اچھے قسم کے بددفع  
 انسان تھے مگر بھڑی بھی گھبراہٹ اور اسکول کی عمارت کے محاسب کا بہانہ بنا کر رضیہ  
 بگم کی صاف ستھری پلنگڑی پر ان ملٹھتے اور اپنے حسابوں کی شاندار کلب کا لطف  
 اٹھا لیتے۔ رضیہ بگم ان سے پردہ نہ کرتی تھیں مگر عجیب معشوقانہ انداز سے ہمیشہ کسی چیز  
 کی آڑ سے ایسے کھڑی ہو کر بات کرتیں کہ نصف نظر آتیں، نیز کپڑوں کی بھینی خوشبو بھی  
 غصہ ہی بہت پہنچ سکتی۔ منیر صاحب نہایت اچھے اور اپنی صاف گوئی کی بدولت  
 برطیسے غیر مقبول تھے مگر انہیں دیکھتے ہی مذاقہ پھیلنے لگتا کہ شروع کر دیتے :  
 ”کیسے کیا حال ہے۔ آپ کی بدمزاجی کا؟“ وہ ہمیشہ اسی طرح ان کی مزاح پر سی  
 کرتے۔

”کوئی تازہ جھڑپ ہوئی مہ ترانی؟“

”میری کیوں جھڑپ ہوتی؟ وہ ہے ہی آپ کی منہ چڑھی، میری تو بات بھی نہیں سنتی۔“  
 اسکول کی عام صفائی رضیہ بگم کے سپرد تھی۔ منیر صاحب کہتے تھے کہ جب اسکول بڑھ  
 جائے گا تو بورڈنگ کی منظمہ رضیہ بگم ہی بنائی جائے گی۔

”وہ آپ کے کرتے تیار رکھے ہیں، سچر اسی کو دے دوں یا آپ خود لیتے جائیں گے۔“ وہ اٹھ کر پوچھتیں۔

”نہیں میں خود می لے جاؤں گا۔“ وہ نہ جانے کیوں سٹپا جاتے۔  
 ”وہ اچار دانی آپ کے گھر میں تو پڑھ لی گئی، اب اگر اچار کھانا ہو تو گھر سے برتن بھجوا بیٹے۔“

”ہاں وہ بچوں نے تو پڑھ لی، میں دوسری بھجوا دوں گا۔“  
 ”پرانا سویرا بھیج دیجئے گا، ادھر طکرنا نمونہ ڈال دوں گی۔“  
 ”میں بنا بنایا ادھر طکر دوں گی!“ وہ حیرت سے مسکراتے۔

”تو کیا ہوا، کام ہی کیا ہے اور مجھے؟“ وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہتیں حالانکہ چند روز پہلے شمن نے اُن سے لائبریری کی کتابوں پر غبرگائے کو کہا تھا تو کام کی زیادتی کی شکایت شروع کر دی تھی اور آج کس مرے سے سویروں کی ادھر طکر کو نیا بقیں! ادھر حبیب کار ویر صبر آ رہا ہو گیا۔ اب اگر وہ طحال دیتی اور دل نہ سکتا تو پرچہ ہی دے جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پرچہ کی صورت چند لائنوں سے صفحوں میں تبدیل ہو گئی اور علاوہ دستی آنے کے ڈاک سے بھی آنے لگے۔ کئی بار کی شدید کوششوں کے بعد اگر کبھی ملنے کا موقع بھی ملتا تو غریب بدحواس اور مہبوت سا بیٹھا رہتا۔ شمن کو اس سے کوفت ہونے لگی۔ نہ جانے دل کے کس کو نے کی خوشنودی کے لیے اُسے طکر کھا تھا۔ اس سے کسی قسم کا لین دین کرنے کا قصد نہ تھا مگر اس کے وجود سے ایک طرح کی قلبی طمانیت ضرور حاصل تھی۔ جب وہ آتا تو نہ ہی اُس کا دل اُٹا سیدھا دھڑکتا اور نہ خون میں سنسنیاں پیدا ہوتیں پھر بھی بعض وقت تو اُسے ملاقات سے محروم کرنے کے لیے ہی اُس کا انتظار کرتی۔

”کہہ دو آرام کر رہی ہیں۔“ وہ آتا تو کہا دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی انتظار میں بیٹھنے کی دھمکی دیتا تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ اسے یہ ربط کی گیند کی طرح ہمارا چوڑا کپڑا کر لورٹ آنے والی خاصیت سے اور بھی نفرت تھی۔ ایسے چاہیے تھا کہ فرمانبرداری سے

سر جھکا کر۔ خیر اس کی حماقت کی مزادہ یوں دیتی کہ اُسے بٹھا کر دوسرے دروازے سے سینیا یا خرید و فروخت کو چل دیتی۔ وہاں سے آتے ہی وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتی کہ جلیب کتنی دیر انتظار میں بیٹھا رہا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھیں پتھر گئی تھیں، ہاتھ پیریں ہو گئے تھے تو وہ اطمینان سے مسکرا کر دو چار پیار بھری ملا متیں اپنے آپ کو سالتی، ورنہ بات ہی ٹال جاتی۔

ایک دن چیراسی نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ملے آئے ہیں۔ وہ حسب معمول کہنے ہی والی تھی کہ کہہ دو نہیں مل سکتیں کہ چت مٹی اور ماتھ میں کبلی کی تہہ پکڑے افتخار کھڑا تھا۔ نہ تو وہ چونکی اور نہ ہی حیرت کے بے پناہ طوفان کو اپنے کسی انداز سے ظاہر کرنے دیا۔ اس زبردست بھونچال کے جھٹکے کو اُس نے ایک معمولی ارے کے ساتھ سہہ لیا۔ افتخار پہلے سے زیادہ دلا اور بے درستی ہو گیا تھا۔ اس کے بال رُو کھلے اور بے نیگے پن سے بھرے ہوئے تھے جسم پر گھسی گھسی قمیص اور روٹی کی ترخی تھی۔ گلے میں ایک میلا سا مقبلہ لپٹا ہوا تھا۔ بہت بدل چکا تھا اگر اُس کے بھاننے والوں کے لینے چھپانا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔ اُس نے اب وہ چھلکا اپنے چہرے پر سے اتار دھینکا تھا جو یونیورسٹی میں مجبوراً چڑھا رکھا تھا۔ اس کے نقش و نگار دلی جذبات کا عکس بن کر رہ گئے تھے۔ وہ باغی آنکھیں اب کھلے بندوں لہجیاں بھیرتی تھیں اور ہونٹ مستقل ملن بہہ مسکراہٹ میں ڈوب چکے تھے۔ نسبتاً زیادہ بیمار اور چڑچڑا ہوا تھا۔ ہنسی میں کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی برسنے لگی تھی جسے وہ قطعی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

”تم اب بھی ویسی ہی ڈرپوک اور دلموڑ“ اُس نے بزرگانہ انداز سے پوچھا ”میرے کپڑوں میں بار بار آ رہی ہے اور شاید جو میں بھی ہوں، تمہارے پینگ پر بیٹھ جاؤں“ مگر وہ بغیر اجازت ہی بیٹھ گیا۔

”آپ کب آئے پہاڑ سے؟“

”ایں؟ پہاڑ سے؟ اوہ... ہاں بھلا۔ میں پہاڑ پر ہی اپنی صحت درست کرنے گیا ہوا تھا نا۔ اُن... وہ ہنسنا، ”تو تمہیں کچھ نہیں معلوم؟“

”نہیں!“

”مگر مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہوتی رہی۔“ وہ کچھ جھجھک کر کہہ لایا، ”میں نے اخبار میں تمہارے یہاں آنے کی خبر بھی سُن لی۔ سوچا چلو تم سے مل آؤں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اب تمہارا چہرہ نہ تانیں تمام ہو گیا ہے جہاں دل میں چھ گھنٹے چکی چار گھنٹے۔۔۔“

”ہائیں؟ آپ بیل میں کھتے؟“

”اود کیا ہوتا؟ خان بہادری کا خطاب ملتا؟“

”اور سب کا کیا ہوا؟“

”سادا گروہ پکڑا گیا۔“

شمن سیرت سے منہ پھاڑے رہ گئی۔ کیسا گروہ؟ کیوں گروہ پکڑا گیا؟ یہ اسے ٹھیک سے معلوم نہ تھا مگر خود داری نے اُسے پوچھنے بھی نہ دیا۔ اتنا وہ جانتی تھی کہ افتخار آشر کی تھا اور مشتبہ مگر یہ اُسے آج معلوم ہوا کہ وہ دہشت پسند بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ کو اُس کی بزدلی فطرت دہشت پسندی کے خیال سے جھک گئی مگر پھر فوراً اس کی بھاگتی ہوئی بہمت لوٹ آئی۔ افتخار اپنی قوم اور ملک کی خاطر مٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی اور زندگی کی بازی لگا کر آزادی چھین لینے کا عہد کر لیا تھا۔ اس کے ہم خیالوں کا حلقہ بون بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور یہ خوشحلقہ سارے ہندوستان کو اپنی انگوش میں لینے کو تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بیداری بڑھتی جا رہی تھی، اُردو زمیندار کا پرانا رشتہ نیا چولا بدل رہا ہے، اس کے سارے خواب عملی جامہ پہنتے جا رہے تھے مگر اس قدر سست رفتاری سے جیسے جوں کی چال۔ یہ ہندوستان کی ہر سحر رنگی کی کیوں غادی ہے؟ صدیاں چاہیں ایک طرف سے دوسری طرف گروہ پھرتے کے لیے؛ کھانے پر افتخار نے بڑی تیزی سے سونگھ سونگھ کر نکلنے اور بچانے کی کوشش کی مگر اُس کی جھوک سر چکی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“

”شملہ گوشت۔“

”شلم؟ اور مجھے یاد ہے کہ کبھی یہ میری رزغوب ترین غذا تھی، میری اماں تاج نے  
کی رکابی میں آموتی گھی کی روٹی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ ہم چوڑے کے پاس بیٹھ کر کھا یا  
کرتے تھے اور جب گھی جھنکے لگتا تھا تو چوڑے میں سے سٹکے ہوسٹے اُپلے کا ٹکڑا نکال کر  
اس پر رکابی رکھ لیا کرتے تھے۔ میری بہن کو نیبو ”بہت پسند تھے۔“ وہ گزرے ہوئے  
زمانے کی سوئی ہوئی یادوں کو بھونچ کر بنگانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

”نیبو منگواؤں؟“

”نہیں نہیں مجھے نہیں میری بہن بنو کو پسند تھے۔“ پھر وہ خاموش ہو کر بڑے  
بڑے نوائے نکلنے لگا گویا کہ رہا ہے نیبو منگوانے سے رہ بٹھا ہوا زمانہ تو واپس نہیں  
لایا جاسکتا۔ بنو قبر کی مٹی سے ہم آغوش ہو گئی، اب شلم اور نیبو کیا کر سکتے ہیں؟  
”ایمانے کوئی خط لکھا؟“

”نہیں تو۔“

”وہ ایک اسکول میں کچھ الا بال پڑھانے پر نوکر ہو گئی ہے۔ پہلے تو ایک اسکول سے  
کچھ اٹلی سیدھی تعلیم دینے کی وجہ سے کال دی گئی تھی۔“ وہ مسکرایا۔ ”پیٹ کی پکارنا تھا پیر  
کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی توجہ دیتی ہے۔ جب تک کالج میں رہے والدین کسے پیسے یا  
تعلیمی وظیفوں سے عیش اُڑا لیے پھر یا تو کلر کی کر دیا بھوکے مرساری ہیکلڑی ختم جانتی  
ہو دلیپ کہاں گیا؟ پکڑا گیا اور اب اُسی دائرے کے دفتر میں نوکر ہے جس کی موٹر  
پر ہم چھپنے کی کوشش کی تھی۔ جب دائرے کی موٹر گزر جاتی ہے تو وہ پیہوں کے  
نشانوں اور دھول کو سلامی دیتا رہ جاتا ہے، مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ خاک اس کی لغات  
کو دفن کر سکے گی۔ نہیں، یہ جذبہ اندر ہی اندر چلتا رہے گا، جب وہ مرجائے گا تو یہ  
نامکمل آرزو اس کی اولاد میں خصلت بن کر باقی رہ جائے گی۔ محبوب کو اس کے  
باپ نے نہ جانے کیسے بچا لیا اور اُسے سرکاری وظیفے سے بیروخبات بھیج دیا گیا۔ وہاں  
سے وہ پروفیسر بن آیا ہے اور کسی کالج میں پروفیسر ہے۔“

”کچھ مں لوگا کا حال معلوم ہے؟“



”اوہ، ہاں بھول گیا، انہوں نے نرسنگ کا کورس لٹک بھارج ہاسپٹل میں لے رکھا ہے۔ جیل کے ایک حسین تختے کے سلسلے میں مجھے بھی پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ذرا بھی نہیں بدلی ہیں، برطانیہ ہی سے کورس پورا کرنے میں لگی ہیں۔“

”سنا تھا شادی کر رہی ہیں؟“

”ایں؟ شادی، ارے وہ شادی نہیں کرے گی حبت تک...“

”کیا؟“

”کچھ نہیں، یہی کہ حبت تک کوئی رحمدل اُن کا کنوارا پی نہ ختم کر دے۔“  
”تو بہ؟“ شمن کچھ نہ بولی۔

”ہاں ہاں تم نہیں سمجھتی، وہ... وہ... وہ... چہ عجیب چیز ہے۔ وہ اُن عورتوں

میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی ماں ہی جاتی ہیں مگر شادی سے بچتی ہیں۔“  
”ارے! یہ کیسے؟“ شمن کچھ نہ بولی۔

”ماں بننے سے میرا مطلب ہے کہ جذبہ ماوری ان میں شدت سے موجود ہونا

ہے مگر شادی کو ایک گھناؤنا فعل سمجھتی ہیں، حبت تک کہ...“

”اچھا اچھوڑ لیے۔ نہ جانے کیا لے کر بیٹھ گئے مہر یہ بتائیے کیا پروگرام ہے؟“

”شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا، حبت تک کے لیے تم ہی بنا دو پروگرام!“

”سینما چلے گا؟“

”کہہ دو یا کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر سینما سے ذرا کم دلچسپی ہے۔ سوائے جذبات

کو بھر دکانے کے اور تو کوئی مصروف نہیں اُن کا۔ میں دیکھنے ہی گرم مزاج ہوں۔“

”چہ آج نہ جانے کیا ٹھکان کر آئے ہیں جی میں۔“

”جتنی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ بھلا خود ہی سوچو کسی کو عشق لڑاتے دیکھ کر مجھے

کیا طمانیتِ قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو کامیڈی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ وہ

سالامیرو کوڑی کام کا نہیں مگر عیش اڑا رہا ہے اور ہم ہیں کہ...“

”خیر چلے ٹیڑھی بھی دیکھ لیں... دلہو اس پسند ہے؟“

”داسیات، ٹریٹی پی پرتو ادھی جھنجھلاہٹ آتی ہے، اور دیواس کو توڑ ٹھوکنے کے  
دل چاہتا ہے۔“

”یا اللہ یہ کیوں؟“

”لیچر کجھت، بھاگ جانا لڑکی کو لے کر“  
”اُدھہ، تو نہ جانیے، یہ کیوں نہیں کہتے“  
”یہاں ایک پارک بھی تو ہے۔“

”ہاں“

”اگر تمہارے ساتھ میرے جانے سے تمہیں اسکول سے نکال نہ دیا جائے تو چلو  
ذرا کھلی ہوا ملے گی، نہ جانے کب سے مقبروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔“  
”مگر ایک فائدہ تو ہے ان فلموں سے۔“  
”شکر ہے کہ کچھ تو ملا آپ کو۔“

”ہاں تمہارے پوشیدہ امراض کی دواؤں کی تو خوب ترقی ہو رہی ہے۔ یہ دیکھو  
کہ ہر فلم کے اشتہار کے ساتھ اس کی دوا موجود ہے۔۔۔ جنہیں سمجھیں؟ شمن کے اکتائے  
ہوئے چہرے کو دیکھ کر منہا، ”تم لوگ ہنسی ہو یا واقعی بے وقوف ہو۔“  
”جو کچھ بھی سمجھ لیجیے۔“

”اسے بھائی فلم کا آخری شو دیکھ کر سچائی کا ٹھٹھا اچھڑھانے کے بعد مراکے  
کٹارے نالیوں میں کیا ہوتا ہے، مزے سے لیٹ کر فلمی ڈراما دہرایا جاتا ہے۔“  
شمن چپ رہی۔

”بعض خوش نصیب تو باز ارجن میں اپنی سلوچنا اور مادہ دہوری ڈھونڈ لیتے ہیں  
اور بعض۔۔۔“

”کیسا؟“

”کچھ نہیں، تمہیں کہاہٹ آئے گی۔ جانے دو ان باتوں کو۔ دوسرے یہ باتیں یا  
تو ضرور سنتے رہے یا وہ ختم ہوتی ہیں یا فحش کہ ان کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نہ جانے ہم

اپنے محبوب کا ذکر سن کر اس قدر پورا رخ پاکیوں ہو جاتے ہیں ؟ اور نہ جانے دلوں...  
ہاں بتاؤ کچھ اپنے اسکول کا حال، اساتذہ کی پرستش اور عجب لکھتے ہوئی۔  
”نہیں تو، بیکار۔ انرا نے کی کچھ عادت نہیں۔“

”جیسی دیکھی چاندنی پھیلی ہوئی تھی اسے پوری اور بھی پرانے بنا رہی تھی۔ پاؤں میں چادر  
طرفہ زندگی کا احساس موجود تھا مگر خاموشی اور دھندلا ایسا معلوم ہوتا تھا نیم خفتہ  
روحیں مگر کشمکشیں کر رہی ہیں۔ چاندنی اور خاموشی نے مل کر آوازوں کو بجا رہی اور دیکھا  
کر دیا تھا۔“

”تمہیں تعجب ہوگا؟“ فضا سے محو رہ کر انہی نے کہا۔  
”کس بات پر؟“

”اگر میں کہوں کہ مجھے تم بہت پسند ہو۔“  
”نہیں!“ دشمن نے قلابازیاں کھاتے ہوئے دل کو دلورج کر کہا۔  
”اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم پہلی لڑکی تھو جس نے مجھے اس حد  
تک متاثر کیا ہے؟“  
”لیکن یہ سب کیوں؟“

”پتہ نہیں!“ وہ مختصر سا تھا۔ ”پتہ نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں تمہیں معلوم  
ہے کہ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار محبت کی ہے، کم از کم یقین تو یہی کیا ہے اور یقین  
دلانے کی کوشش بھی کی ہے مگر تمہیں؟ تمہیں میں کچھ یقین نہیں دلا نا چاہتا۔“  
”اور نہ ہی مجھے کچھ یقین کرنے کا حق ہے؟ دشمن نے خاموش دیکھ کر بولا۔  
”شاید۔“

”اور یہ بھی ایک وہم ہی ہو۔“  
”ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر میں جیل سے چھوٹ کر سیدھا تمہاری طرف کیوں بھاگا؟ جیسے میرے بہنوں  
کے سوا کسی بلے زخموں کا مرہم تھا۔ سہی باس ہے تم سے ملے ہی شفا ہو جائیگی۔“

”شاید یہ بھی درست ہو“  
 ”اُدھ، مجھے جلاؤ مت۔ شمن خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور کچھ سمجھ  
 میں آجائے تو مجھے بھی سمجھا دو۔ میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟“ وہ بھولے بچوں کی طرح  
 التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شمن کا دل بھر آیا۔ وہ کیا دے سکتی ہے اُسے؟ اس  
 کے پاس افتخار کے دکنوں کا علاج کہاں ہے؟ وہ اس سے کچھ مانگ بھی تو نہیں رہا۔  
 اُس کی حالت۔ لاوارث پنچے کی سی ہے جو گھر سے بھٹک آیا ہو اور والدین کا نام و نشان  
 بھی نہ دے سکے۔ کون کر سکتا ہے ان گم شدہ لوگوں کی رہ نمائی!

”شمن، نہ جانے کیسے میری آرزو سے میں کسی سے محبت کر دوں، جی بھر کے محبت  
 کر دوں۔ مگر میرے دل سے ہر چیز کا اعتبار اٹھ گیا ہے، مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا  
 کے وجود پر مبنی کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے کھن آتی ہے اور خدا پر عرصہ کہ وہ کیوں  
 ہے؟ اُس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اُس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا ہے  
 اُسے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے؟ اور جو نہ کر تو دوزخ میں جلاسنے کی دھمکیا  
 دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبڑی جینگی دنیا تمہیں پسند؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ  
 پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو یانی ہی چلا گیا ہے اور پھر خشک ہے تو وہ بھخت  
 بے تکی۔ جی چاہتا ہے اس دنیا کے گوشے گوشے کو دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر  
 اتنی سبک اور نفیس دنیا بناؤں کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔“ شمن کو اس کے  
 بچپن پر ہنسی آئی۔

”مگر آپ تو کہتے تھے ہر مرض کا علاج ہو سکتا ہے۔ آپ اشتراکی ہو کر سمیت رہا جاتا  
 ہیں۔“

”میں اشتراکی تو ہوں مگر میری روح تو فاشنزم کی عادی ہو چکی ہے۔ اشتراکیت  
 ابھی ہم سے اتنی دُور ہے جتنا یہ آسمان زمین سے۔“

”کیا یہ فاصلہ کبھی کم نہ ہو گا؟“

”ہمیں یہ کسی دن ہو جائے مگر میں کہاں زندہ رہوں گا؟“

”ارے تو وہ آپ کی سیکم؟“

”دو چار جم بچھے، تین چار ریلیں لڑائیں، واسرائے کی موٹر میں نیچے ہوتے ہوئے تھے کیا؟ وہ زور سے ہنسا، ”نصف سے زیادہ کام کر لے واسے جیل میں چٹکیوں پر جٹ گئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگے۔ یہ گئے دیکھو اس نے ہاتھ پھیلائے۔“

”چھ۔ اسے ہے، نہ جانے کیوں، جاتے ہیں جیل میں۔“

”کہتے ہیں بغیر جیل میں گئے عوام کو قوم پرستی کا یقین نہیں ہوتا۔ جیسے یونیورسٹی کی بھر کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی، اسی طرح جب تک جیل کا سارٹیفکیٹ نہ ہو تو فی سٹیج پر نہیں ناچا جاسکتا اس لیے بعض وقت تو بڑی کوششوں سے جیل جانا پڑتا ہے۔“

”چھ۔ بریکار ہو؟“

”جی ہاں بریکار کا ڈکوسل۔ بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کے پاس سوائے جیل خانہ کے کوئی عملی ثبوت ہے بھی تو نہیں قوم پرستی کا۔ اب یہ لکھتی دو چار مہینے کی جیل نہ کاٹ آئیں تو عوام تو کیسے نہیں اور ان پر پھیل مار کی بارش کیسے ہو۔“

”مگر سب تو لکھتی ہیں۔“

”ماں، اور ان کے پاس کوئی حربہ بھی تو نہیں جیسے انتہائی گریہ۔ واسے سڑک پر چل جاتے تھے اور اس کی سزا میں، اماں جہان، تو بھڑی میں بند کر دیتی ہیں۔ اسے یہ باتیں زبانی نہیں سچیں جاتیں، سمجھنا ہے تو آجائو میدان میں۔ پر کدھر پینا ہوگا، یہ مل نہیں چلے گی۔ وہ اس کی سارٹھی کے آچل کو جھٹکنے لگا، ”تین پڑ جائیں گے۔“

”ابلوں نے نہ ذکر سے اسے مس بوجھایا داکھیں۔“

”بہنس بوجھائیں کیوں بن رہی ہیں؟“

”دل کی بڑاسن کا لٹنے کو، میا لہا اور پٹے نہ سہی مرلیں ہی ہیں۔“

”ہیئے اود تو پاک عیت کی ہمیشہ سے قائل ہیں۔“

”کے بہنس سے تمہارا کیا مطلب؟“ ال اور بیٹے کی محبت۔ آج افتخار لکچر بازی

پہننا ہوا تھا۔

”رہنیں، بلکہ دوستی، ایک دوسرے سے ہمراہی!“  
 ”دوستی کوئی ٹیڑھی نہیں، ایک عورت اور مرد کی صرف ایک مقصد کے لیے دوستی  
 ہو سکتی ہے اور وہ...“

”اور نہ جانے بھی دیکھیے۔ دنیا میں ہر عورت کو بیوی نہیں بنایا جاسکتا!“  
 ”تم سچ کہتی ہو... ہر عورت کو بیوی تو نہیں بنایا جاسکتا... مگر...“ وہ الفاظ  
 ڈھونڈنے کے لیے بانوں کو انگلیوں سے لٹپٹا رہی تھی۔ ”مگر مس بودا کی محبت نہیں۔ نہ تو  
 اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پرورش کرنی۔ وہ تو ایک بچے ہوئے  
 شعلہ کی بے حقیقت گرمی تھی، برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان ہے۔  
 کچھ بوسیدہ اور کھسی ہوئی سی دشت ہے۔“ ایک دم سچ ہو گیا۔

”اور میری... میری محبت کسی قسم کی مس ہے؟“ اس نے سرگوشی میں خود سے پوچھا۔ یہ  
 میں کسی قسم کی محبت کرتا ہوں؟ یہاں اس قدر حسین اندھیرا ہے، تم ہو اور میری صدیوں  
 کی پیاسی روح مجھے ایک لمحے کو بھی نہیں یہ گواہانہ کہ سکوں گا کہ تم کو اس بلندی پر سے  
 گھسیٹ کر نیچے لے آؤں جہاں میرے تخیل نے تمہیں بٹھا رکھا ہے۔ کیا میں اتنا شریف  
 ہوں؟ ”نہ!“ اس نے لفظ شریف کو حقاقت سے ”قولا“۔  
 ”یہ آپ اپنی ہر خوبی کو کمزوری اور طقوتوں کو غلطیاں کہہ کر گویا بڑا سبھا رہی  
 انصاف کرتے ہیں۔“

”الاحول والاقوة، مگر میں شرافت کو اپنے لیے تو نہیں سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو  
 میں تم سے اپنی پارسائی کا سٹریٹیکٹ لینا چاہتا ہوں؟“ وہ واقعی جھلا اٹھا۔ ”ابھی  
 یہاں اس سنسان کوئی نہیں اگر میں چاہوں تو...“

”آپ کچھ نہیں کر سکتے۔“

”کیوں؟“ ”افتخار کا منہ اتر گیا۔“

”اس لیے کہ آپ اتنے بڑے نہیں جتنا آپ کے بہم نے بنا رکھا ہے۔“

”کیوں؟“

”اطمینانِ قلب کے لیے۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خود پر ٹھیکار بیچ کر یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس طرح ان کے گناہ دُبل گئے۔“  
”گناہ؟ مگر کون بیوقوف گناہ و ثواب کا قائل ہے؟“

”آپ کا ضمیر!“  
”ہشت، غلط۔ سید ایک غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں میں جو کچھ کرتا ہوں....“  
”بڑا سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھا ہو جاتا ہے۔“  
”ایں؟“ وہ چونکا۔

”آپ مانیں یا نہ مانیں، مگر آپ دل کے برے نہیں۔“  
”یعنی زبردستی۔“  
”جی ہاں، اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ کبھی نہ بیٹھی۔“

”بڑی تنگ خیال ہوا!“  
”جو کچھ بھی سمجھ لیجیے! جیسے اب خشکی بڑھ رہی ہے، آپ کو کچھ ہو گیا تو....“  
”تمہاری بلا سے!“

”جی نہیں۔ آپ کی زندگی میری نظروں میں اتنی مستی نہیں جتنی آپ نے بنا رکھی ہے۔ اچھی آپ کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، اور دنیا کے لیے مجھے آپ کو زندہ رکھنا ہے۔“  
”ہوں، دنیا کے لیے؟ اور کسی لیے نہیں؟ وہ مردہ دل ہو گیا۔“ دنیا کے لیے جیتنے جیتے تو اب دل اُچاٹ ہو چکا ہے۔ ہمیں کیا غرض مجھے دنیا کے لیے جلانے کی؟“  
”میں بھی تو دنیا ہی میں ہوں۔“ شمع کو اپنی مہمت پر سخت حیرت ہوئی۔

”اوہ! اوہ! وہ دیر تک خاموش رہا۔ کچھ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔  
افتخار چلا گیا تو وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اُس نے امتحان کے دو پلڑوں میں افتخار اور سیتل کو تو لٹا شروع کیا۔ ایک کے تختے ہی سے سجھے کو دھکا لگتا تھا اور دوسرا ایک مست کن، اخبار کی طرح چاروں طرف سے اُسے محو کر رہا تھا۔ اتنی دیر سا مٹھ بیٹھی مگر ایک مرتبہ بھی تو اُسے نہ ہرچیا نہ احساس نہ ہوا جو آخری

مرتبہ سیتل سے مل کر نوا تھا۔ یہ کیا تھا جس نے اُس کی زندگی میں اتنی خاموشی چلی مچا رکھی تھی۔ یہ نامعلوم سی بے چینی کک، جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور تلخ بھی۔ وہ اُس کے ہر اشارے پر سب کچھ دے ڈالنے کی زبردست آرزو اس کا ہر لفظ جھوٹے کی پکار بن کر دماغ میں پیچھے گھولتا، ہر سانس فقیر کی صدقہ کی گورننگ اٹھاتا تھا۔ یہ سب کیوں؟ کیوں؟ وہ کوئی جواب نہ پاسی!

(۳۳)

اسکول کے کھرے چرے شیراز سے کودوں یا مٹوں سے سیٹھنے کی کوشش میں وہ باہر چلا گیا۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گروں سے کھانا آتا اُس سے ایک اور آنکھ بولی چلتی تھی۔ نکال کر اڑا جاتیں، باقی میں ستائیاں، حسد نکالتیں، بیچا پڑی بچیاں، عین کی کرتیں، پیچھے تو چپراسنوں نے سنا ان سنی کر دی، پھر کچھ کی گئی تو ایک اور چال چلی، لڑکیوں سے کہہ دیا ”خبردار جو پورا کھانا کھایا۔ ہمارا حصہ ضرور پیٹنا“ لیکن یہ بات بھی زیادہ دلچسپ نہ تھی۔ چھپ سکی اور ایک دن چپراسنوں کے مظلوم کی پھر کسی نے شکایت کی۔ باز پرس پر پھر انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر روناشروع کر دیا۔

”کیا کریں مس صاحب، پھر روپیہ اور تین بچے، ایک اپنی مال اور کھانا مچھائی کیسے گزر رہا ہے اللہ مارا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔“

”جیسے تیسے تو ہم پر چھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو، اپنے ہی پیٹ کے خیر تو ان چپراسنوں کا کہاں سے گلہ گرم کریں؟ لڑکیوں کے والدین نے دلائی چھاؤ۔“

”میس روپے میں مکان کا کرایہ اور اپنا اندر پیرا بنوں کا کھانا نا کپڑا کیسے پورا کریں؟“ استائیاں جنیں شمع کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی دنگڑا تھے یہ کہہ پڑی تھیں۔ وہ نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل پیغم خانہ تھے بہاں اوپر سے یہ کہہ بھیجے تاک ہر ایک مڑھال ہے۔ اُس نے دونوں چپراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کیے، سب کچھ ممکن ہوتا استائیوں کی دعوت کر دیتی، ہر ماہ دو چار عزیز لڑکیوں کی لیس بھی ادا کر





چلن بھی کوئی مقام پر مقبرہ ہے کہ اس کے آگے مانتا ٹیکر کر بنات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک انسانی زمانے بھر کی آوارہ جہ مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس منہ پر مٹی کی بنی ہوئی منکم سے ہزار درجے غنی تر ہے جو خود تو بیچارہ دنیا سے مگر لڑائی کا ماں اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے۔

”دو بجے صاحب سندس لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں“

”ایسی چٹھیاں؟ دشمن نے ضبط سے کام لیا۔“

”ابھی جو خرافات پر مجھے غلط سے سمجھتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجیے۔ ایسی چٹھیاں

جن کے پاس غلط آتے ہیں، جمع کر کے انہیں ڈال دیجیے۔“

”میری کیا یہ معلوم ہے کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جاسکتے ہیں۔“

”تو نہ اس سبب کہ یہ لڑکیاں چٹھیاں بھی کمبوتر ہیں کہ چھاپہ مار کہ لڑائی یا لڑنے کو نہ

یہ چڑی مار ہی تجربے سے آتی ہے۔ ایسے غلط لڑکے سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک

دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرہیز بازیاں جاری کرنا ایک عام بات

ہے۔ میں لوہیہ پانہ والی استانیال اور چھوڑ دے گیو کہ نہ نہ پیر پیر نہیں لگا پان لگا پان

کا خرچہ اس پر چھاپنا ہے۔ لڑکیاں تو لڑکیاں ہیں، لڑکیوں کو ڈانٹنا تو والدین پر

والت پر ہے۔ بھلا اب کی صورت میں چٹھیاں یہ سمجھ گھڑ سے کیا جائیں اور ان معصوم بچیوں

کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں، حصار و جبر کی ہوشیار ہوتی ہیں۔ کہ ان کو وہ گرجن کی روانائی

میں یہ فعل کرتی ہیں، مصلحت میں نہیں ہوتی۔ ہزاروں چالیس پل کے خط لاسے جاتے ہیں، مگر

تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام پر ہوتا ہے، یہاں پر باز پرس کی نہ گئے، یہ عجیب و غریب

پر تاتا ہے۔

”ماتحتی امتیاز اٹھنے بچیں، گوانا اس پالا کی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی

نقل نہ کر سکیں۔ کلپ ڈالگووان اور پیر سے دلی پوکیداری کرنا سب پیش کا زور نہ بھی

آگیا۔ اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر جھوٹی سچ کیسی بھی فضول معلومات سے پڑھیں یا نہیں

لاٹریز کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو بیخبر صاحب اس کی اپنی

ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لینا پوتی میں کون سے گز استعمال کیے جائیں۔ بخر صاحب بھی کچھ مکر سے رہ گئے۔

”اچھا صاحب یہ کیجیے کہ لکھ دیجیے رجسٹر میں... کہ گملے اور پھولوں کے بیج خریدیئے گئے۔ چیلے چھٹی ہوئی“ رائے دینے لگے۔

”مگر میں کہاں گملے اور بیج۔ انپکٹس نے مسائنہ کیا تو؟“  
 ”کہہ دیجیے گا کچھ بیجیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں چنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگو آلوں گا۔ باغ عام میں بہت بیکار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا اور آپ... آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟“

”اپنے تو میں نے تقسیم کر دیے۔ کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا؟“  
 ”اے لیجئے غضب کر دیا آپسے تو... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔“

اور بیج؟

دادہ، لکھ دیجیے اگے نہیں، خراب تھے۔ اور یہ کبھت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے

واہیات۔ کیسے تو میں کچھ نپساری کے یہاں سے منگو آؤں؟

”مگر یہ پورے روپیہ کا تو حساب نہ ہوا؟“

”کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھیجواؤں گا۔“

”بہت اچھا؟“

”اور کچھ کتی میں بک اسٹال سے منگائے دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں، نہایت

احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی کچھ چائے پانی کا انتظام؟“

”وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ، اُس کا کیا ہوگا؟ اس کے لیے باقاعدہ

رقم ملتی ہے؟“

”آپ فکر نہ کیجیے۔ ایسا ہے کہ اس کا میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی

بازار کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چار پائیاں ڈلوادوں گا لیستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تیکے ہوں تو آپ دیدیکھے گا۔“

”مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقت رہ جائے گی۔ اگر اسے کسی طرح پتہ چل گیا“

”اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے... خیر... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کے لیے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے کیا کیا جائے صاحب مجبور رہا ہے۔ بروکھیے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ پریشاں نہ ہوں، میں سب کچھ محنت لوں گا۔ بس جس وقت آپس تو آپ... اسے ہاں وہ نظم؟“

”نظم؟“

”جی ہاں نظم... تیار کی آپ نے؟“

”میں نے؟ کیوں؟“

”یہیے صاحب۔ اسی انسپکٹرس کی شان میں... بخدا قبول کیا۔ دیکھیے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری لڑکی سے گلے میں بار ڈوبا دیکھیے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔“

”مگر وہ تو یہاں پر ہوتی نہیں؟“

”اجی سب چلنا ہے، کوئی نام بہ نام مقصوری ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ لیجیے گا کہ صبح سے بلوائیجیے گا... ہاں“

”جیسی آپ کی مرضی ا“

”اور وہاں پھر مار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم... چہ، الاحول دلاقوہ، آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی“

”میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی“

”چہ تو یہ، البی شکل ہی کیا ہے! کچھ مرتبہ رضیہ بیگم لے بنا دی تھی، اگر ملجائے تو وہی چلا دیکھیے۔ دو چار لفظوں کا میر پھر کرنا ہو گا... وزن بھریے میں ہی کچھ سوچوں گا“ اور وہ پھر سے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے لگی کوشش کرنے لگی۔ ”ایں؟... میں؟“



ایک اور ہوشیاری کی گئی: وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لٹکھ کر پہلے سے گردا دیا تاکہ اگر انسپکٹرس لڑاکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگالنے پر یقین نہ ہو اور کسی کو ساتھ سے آئیں تو ان میں ایب فاضل کی یاقوت کے جوابات حل کیے ہوئے نہ پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے تھکنڈوں سے اسکول والوں کی کو واقف رہنا پڑتا ہے، کوئی چال ان کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں ”لڑاکیوں کی کشیدہ کاری“ کے نام سے بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانتے تانتے کے جہیزوں کے میز پوش، پاندالوں کے کور، سلمہ کا بنا ہوا تان نخل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کارڈ سے ہوئے، سوئیٹ ڈرم، اور گڈ ٹائٹ، سجاد یے کئے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور برہنہ تجارت کی صنعت کبریٰ کا نمونہ تھیں مگر ایسے پینتروں سے یہ سب سامان لکھا گیا کہ صرف لڑوؤں کی تعداد بڑھا رہا تھا، مگر ہنچ سے ڈرتھا۔ یہی نہیں بچو نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگاکر سجاد یے تھیں۔

بورڈنگ بھی ایس تھا۔ چار پائیوں پر خالی غلافوں میں الاباد ٹولس کرکے لٹکائیے گئے۔ اوپر سے چادریں اور پانگ پوش ڈال دیئے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجاد یے گئیں۔ لیجے کرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں، تو وہ تین چار کلاسوں سے پن کر مقرر کر دیں کہ جب انھیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح دوشور سے انسپکٹرس آئے۔ گھٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈا لٹکائی ہوئی تھیں۔ میجر بیڈ مسٹرس نے مع پراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا یہ انسپکٹرس بھی دنیا کے تعلیم میں خدا کا سرا درجہ رکھتی ہیں، جو شان لاٹ صاحب کی سوان کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ٹائٹ ڈیسٹ کرنا ہے۔

”یہ جالاکیوں؟ یہ انیٹ کیسی؟ یہ گریڈ یا کیس لیے؟“ اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کون سی قیامت آگئی۔

سیدھی طرح آؤ، مار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو، تادہ تازہ پھل اور مٹھائیاں بھینٹ،  
کے لیے منگا رکھی ہیں، وہ چھوٹے کچھ تمہارے ساتھ چکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے، وہاں  
اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل و معقولیات کی فہرست میں داخل کیا فائدہ  
بڑی رپورٹ سے اچیف انسپکٹر سب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے! اس سرسری  
معائنے کی سرسری ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔  
اول تیمم ہندوستانی ہیں، بدانتظامی، دھوکا، جعل سازی ہمارا پیدائشی حق؛ دوسرے  
ہمارا شمار لپٹ اقوام میں ہے۔ اب تو چڑی اور دو دو رقم بیکار مغز پاشی کر رہی ہو۔  
تمہاری بلا سے جو رسیدیں پر تھوڑے دستخط ہیں، جو منیجر صاحب نے خود اٹے ہاتھ سے  
کر لیے ہیں اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چیراسنوں سے لگوا لیے ہیں۔  
تم کیوں پڑاتی ہو ان جھگڑوں میں!

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعے تمہارے چال چلن، خفقت  
رشتوں اور سیرول کا پول لکھول کر رکھ دیا جائے گا، تم فرقت پرست الگ مشہور  
کردی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے، سحرالبیان ایڈیٹر تمہاری سا  
پشتون تک کی دھجیاں بکیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جھالے تم کو دے رہے ہیں بس  
عیس میں بھی لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معاملے کے اچھے شکریے  
کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا کبس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں اس میں سے  
کچھ اپنے افسر کے کبس میں پہنچا دو۔

سپرٹنڈنٹ صاحب کی نواسی کے ہاتھوں مار پھول پہن کر انسپکٹر اس نے ذرا ہٹ  
راستہ اختیار کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ پیار سے پوچھا۔

”اول، مہٹ!“ لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور منیر صاحب کی روح قبض۔

”راؤ ہو ہو... شرماتی ہے... بولو... بیٹی نام بتاؤ... بولو...“ بیچارے

مدد کو دوڑے۔ اصل میں وہ خود بھی کا نام قبول گئے تھے۔

”وجیدہ! کسی نے سہارا دیا۔“

”کس کلاس میں پڑھتی ہو وجیدہ!“

”بولو... بولو بیٹی وجیدہ... بچے... ہاں ڈرو مت.... ڈرتی کیوں ہو“  
حالانکہ سچی نہایت گستاخی سے الیکٹرکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی  
اور ادھر مارے خوف کے دراصل مینجر صاحب پیلے ہوئے جا رہے تھے مگر سچی ٹس  
سے مس نہ ہوئی۔

”ابھی یوں نہیں آتی ہے۔ کلاس دلاس میں تو کچھ نہیں... بڑے آدمی کی لڑکی  
ہے، یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے مینجر کو تمام گریو دیتے۔  
چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیے ہیں۔  
گزشتہ سال جو الیکٹرکس آئی تھی بچاری کتنی اچھی تھی۔ مرے سے مٹھی نظم سن سن کر  
گائے کی طرح چارہ سائی کرتی رہی، پر یہ تو پوری وہ تھی۔“

”ہیں... ہیں... آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر مینجر ادوں... جی... مینجر اپنے  
سوکھے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دو نمبر سے گرو دینے لگے۔  
”یہ چنگی کے گلے ہیں!، صاف تاڑ گئی۔“

”ہیں چنگی! چنگی والہ! مینجر صاحب مصنوعی حیرت اور خوف کے لیے جلتے حملے  
سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھا، سہٹ چھپانے کو گلے کے پند سے میں  
لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے کبخت چیرا ہی نمبر مٹانا بھول گیا!

”اوہ! جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی“ وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے، ”سکتے  
صاحب نے امداد کے طور پر عوط فرمائے ہیں“ نیچے ایک مداور رجسٹر سے کم ہو گئی  
دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُر اسرار طریقے سے رجسٹر میں  
لگلوں کی مدد کے آگے لکھا تھا: ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہو گئی، مگر الیکٹرکس تو  
آج صبح پہلے سے صبح کے منتظر تھے۔



”یہ گئے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں۔۔۔ دوپہر واپس لے لیا جائے۔“  
اس نے گلوں کی بار پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر بیٹے بیچ دار میں اسپیکٹس کو گھر کر بدحواس کر لو تو بیٹگی بی کی طرح ہر بات پر میاؤں کر دالو۔ اگر ہاتھ اوجھا پڑا اور نکل گئی پھٹکی سے تو بس ست ماتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیاں کر دے گی۔ اور یہ نئی اسپیکٹس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں ڈالنے لگی، مگر بیٹھ صاحب بڑے بڑے جن کھلا چکے تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتا ہیں اڑا دیں، کچھ رہ گئیں، وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی۔ دست کاری اس نے باوجود شدت سے نبی کر نے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوجھا پڑا۔ پہلے تو دو پیارے کاپیاں دیکھیں، منشی سے کھینچ کر لی، پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے تعلیمی معائنہ پھر ہو گا۔ کس دن؟ یہ تو نہیں، بے کچے گو لہ آن کرے گا۔

اس کے بعد اس نے قطعی ہلا کو خال والی پالیسی اختیار کی۔ بجائے لڑائیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب رسے کا بیٹھ صاحب کے پیروں نے کی زمین سرک گئی اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مار سے بوکھلا ہٹ کے بد کے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے اس گبراہٹ میں کئی گئے، جو سبھی دھڑکے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پر نازک سے بہا رسے سے ٹکارتے تھے، پھر پل پر پڑے اور۔۔۔ بیل کم، مع تمام بانسیوں اور تختوں کے ان پر سے بچا ور ہو گیا۔ رضیہ بیگم کا سپٹ کی خرابی کا پرانا مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگھڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی ازبک لورڈ ہو گئیں۔ صرف عیسائی استانیاں بچیں، مگر وہ بھی قیمتی۔ اسی عرصے میں گھر گھا۔ کے بیٹھ صاحب نظم خوانی کے لیے لڑکیاں بلا لائے۔ شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریڈ کی کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں سکیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے، کبھی ہوئی شمعیں تل اکھٹی نہیں، بدست ماتھی ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ مگر غضب ہو گیا۔ نظم کے بند لیر تبدیل کیے لڑکیوں کے سپرد کر دیے گئے اور تعلیمی مجلس

کا ہاتھ اسنے بدلے صوبے کے کشر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدست ہو گیا، مگر بجائے عفتہ ہونے کے وہ برط سے زور شور سے تہقے لگانے لگی۔ بیجو صاحب جواب تک بے نالیوٹا انگوں کو حرف قوت متحید کے ذریعے روکے ہوئے تھے بے طرح لہڑنے لگے اور خود بھی بدحواس ہو کر مہینے لگے۔

”کوئی دوسری چیز گاؤ؟“ رسائیت سے حکم ملا۔

دہائی ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ۔ وہ گاؤ لب پہ آتی ہے... چلو بگھنٹو منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ شروع کرو۔ ”بیجو صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر مہدیا بات دینے لگے: ”گاؤ... ہاں لب پہ!“ مگر لڑکیاں مہبوت اور شرمائی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

”یہ... یہ دیکھیے مس صاحب، میں تو بارگیا ان سے۔ آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر سستی میں گری ہوئی ہے۔ یہ سب عزیز اور بچے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو ہلک گیا سمجھاتے سمجھاتے۔ اوہ... ارے خدا کے واسطے...“ لڑکیوں نے ان کی رقت آمیز آواز سے ٹکر کر لب پہ آتی ہے، ”شروع کی مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لاسکیں۔

”اچھا وہی گاؤ! سارے جہاں سے اچھا... چلو شروع کرو“

برط سے جوش سے ایک لڑکی نے پنجم سر کو گھسیٹ کر سر کی رے پر گلے کی آخری پھینکا ختم کر دی۔ شہریت اونیختا، ایسا معلوم ہوا چیل اٹھا چھوڑ کر اڑی اور منڈ لاکر واپس گر پڑی۔ پھر لاکھ خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر دوڑ پڑی۔ میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سر نو نانی کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستانی کے سارے جہاں سے اچھے ہوئے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا، دم بالا اٹھا۔

”نہیں کرو“ البسٹرس اٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بچوں میں الجھتی گرتی بھاگیں۔

”ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر سبست

اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے، سرکار کی یہی پالیسی ہے درندہ اسکی دودن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں، رپورٹ پر اس نے اطمینان بخش، لکھ کر حقارت سے کہا اور منیجر صاحب کے کھل کر سانس لی۔ خیر سے بلا ٹی، اور بڑی نہیں ٹی۔ جلدی سے انہوں نے گلاب جامنوں کی پٹی سنبھالی جو انپکڑس نے چھوٹی بھی نہیں تھی۔

راجی یہ اُچھڑ گیا جانیں ان لقموں کا مزہ، انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سا دون کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نیچے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے۔ کم زور ہیں، جاہل ہیں، ناکارہ ہیں اس لیے حیرات کے حقدار ہیں۔ تو پھر ان لپٹ قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلانے دیکھنے کا حق ہی کیا ہے؟ کیوں نہیں انہیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دینے۔ لیول نیچا رکھ کر اور لپٹی میں گراتے جانا تو سرسری رعایت ہے۔ کہتے ہیں اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر بیاں وہ طوفان کب اُٹھے گا جو ساری لپٹیوں کو کچے نمک کی طرح ہلکے کیڑے کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ پھر لوگ لیول لپٹی کو اور لپٹی کی طرف ڈھکیٹنا تو پھر دین گئے۔

(۳۴)

انپکڑس نے رپورٹ تو نہایت معصوم دے دی مگر کچھ درباری گفتگو ہو گئی کہ گمراہی ختم میں مہینے لگ گئے نئے معائنوں کی آئے دن دھمکیاں آئے لگیں، منیجر صاحب کا دوتے دوتے برا حال ہو گیا۔ اس سال جڑ اول بھی بچوں کی نہ بنی، بیوی نے لاکھ جو شامہ کی کہ چوہے میں ڈالو یہ قومی خدمت اور دی اپنی پرانی دکالبت صنبھالو جو کچھ آئے گی تنگی ترشی سے گور تو ہو جائے گی، یہ تو نہیں کہ اپنے پیچھے دیرانی، سوا لگ، دوسرے لوگ چاروں طرف سے بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ استانیوں کی چارٹھ کی تنخواہ تیرہ لاکھ کی پڑھی

نہ ایک دم بغاوت کر کے استفادے دیا اور پیشہ ہی بدل کر اینٹیں ڈھولے پر نوکر ہو گیا،  
چوکیدار، بہتر اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والا نوکر بھاگ ہی نہیں گیا بلکہ کچھ  
فریخچ بھی غائب کر گیا۔ وہ لے دے مچی کہ تو یہ بھی پیچھے صاحب بیچارے ہٹکا لگا چاروں طرف  
منہ بھاڑ بھاڑ کر لپکنے لگے، جیسے جنگلی چوڑیلوں کی ٹھٹھکی لگا یکا یک کھل جائے تو چوڑیاں کبھی ادھر  
اور کبھی اُدھر چھپتا ہے اور جب ایک بھی چوڑیا یا مٹھ نہیں آتی تو تنہا کر نہایت اطمینان  
سے پالتی ماد کر بیٹھ جاتا ہے اور مزے سے اُن کی پر فاذ دیکھتا ہے۔ "اُڑو، میری بلا سے جہاں  
جی چاہے اُڑ جاؤ اور مجھے بھی اُڑا لے جاؤ" پیچھے صاحب بھی تنہا کر ریشہ سیم کی پلنگری  
پر لیٹ گئے اور مزے سے اسکول کی بربادی دیکھتے رہے۔

مختوڑی دیر تو شمن اس طوفان کی بدحواسی پر بھونچکی کھڑی سمت طو لتی رہی گو اُس کے  
لیے اس سے بہتر اسکول بہتر مشاہرہ یہ موجود تھے مگر جہاں ایک ہی بار سر اُسے ہی کی طرح تھوڑی  
دیر کو قدم رکھا وہاں سے آگ لگتے ہی بھاگ نکلتا انتہائی بزدلی معلوم ہوتی۔ اُسے کچھ معلوم بھی  
نہ تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیونکر کرنا چاہیے، بغیر سوچے سمجھے وہ الہ آباد ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ  
چل دی۔

محکمہ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی منو پاشی نظر نہ آئی۔ تعلیمی کام ہے  
کو کوئی کاروباری ڈپارٹمنٹ ہے۔ ایک حق پر مستقبل کا نشہ ہوتا تھا۔ گیلری میں ایک قطار  
سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امید داری میں آئی تھیں۔ سب کی  
سب نہایت لاغر، بیمار، دکھیا اور نادار نظر آ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبے  
میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمہ تعلیم ہی میں ملتا ہے۔ یا تو بد صورتی  
اور غربت کی وجہ سے میاں نہ ملایا بیوہ ہو گئیں اور جن پر جاکے پڑیں انہوں نے نکال دیا،  
بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کر رہی ہیں۔ چاہے تعلیم کا رتی بھر شوق نہیں، دماغ گودڑ ہے،  
پرٹھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آ رہی ہیں۔ ادھر محکمہ تعلیم کو بھی کسی نہ  
کسی طرح تعلیم نسواں کو ترقی دینا ہے، پہلے گھان میں یہ انسانی میل کچیل اور گودڑا ہی سہی  
اچھا مال بھی آنے لگے گا۔

ان میں سے ایک ٹیٹھی اپنے بچے کو دو دھ پلا رہی تھیں اور اُدھچی آواز میں اپنے سسرال والوں کے دکھڑے ستانی جا رہی تھیں جنہوں نے انہیں کچھ دے دے کہ اس کام پر مجبور کیا۔ دوسری ٹیٹھی اپنے بچے کی اصلاح کر رہی تھیں اور پاس ٹیٹھی ہوئی تیسری عورت سے زمانے کی تنگیوں کا دکھڑا درد رہی تھیں۔ تین چار اُدھچی آواز میں ملنے والی نوکری میں میں میکھ نکال رہی تھیں۔ اور یہ سب استانیاں بننے آئی تھیں۔ اور دوسرے معنوں میں آلے والی نسلوں کا نقشہ کھینچا ہوا تھا۔ کچھ ہو جائے، کیسی بھی تعلیم دی جائے، برسوں ٹرننگ پلائی جائے یکٹھی میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نسل بعد نسل چلتی جا رہی گی۔ شمن کا جی چاہا ایسی تعلیم کے لیے کوشش کر لے سے تو بہتر ہے کہ لڑکے چلے، گھر جائے اور شادی کر کے تنگیوں بھوکوں کی تعداد بڑھانے لگے جو اُس کا قومی ورثہ ہے، کیا حاصل اس مغز پاشی سے؟ جب بیچ ہی کھنا ہوتا ہے تو پورے کے اگنے اور پھل دینے کی آس لگانا مفصل ہے۔۔۔ مگر۔۔۔

وہ اتنا ہی سوچنے پائی تھی کہ چیرا سی لے آکر اس سے چلنے کو کہا۔ کئی گھنٹے کی مغز ماری کے بعد بیٹے ہوا کہ اسکول کو گورنمنٹ اپنے سایہ عاطفت میں لیے، ہیڈ مسٹرس وہی رہے باقی اسٹاف بدل دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ منیجر صاحب جو اپنا اردو پیر قومی اسکول کی ترقی کے لیے لگا چکے تھے اس کا کیا کیا جائے۔ رسیدوں سے توان کا کافی روپیہ نکلتا تھا۔ خیر یہ سوال بعد کے لیے اٹھا رکھا گیا، اسکول پر سے قومی ٹیچر ہٹا کر گورنمنٹ کا بنا دیا گیا۔ اسکول نیا چلا اپن کر جو اٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کی توجہ بھی اُس کی طرف مبذول ہوئی۔ داخلہ بڑھا، منیجر صاحب عرصے تک اپنا اردو پیر وصول کرنے کے لیے عجاگ دوڑا کرتے رہے عجیب کشمکش میں پڑ گئے معلوم ہوتا تھا ان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا، بیوی نے اور زندگی لانچ کرنا شروع کی۔ اسی مدوجوب کی رو میں گڑا بڑا کر انہوں نے رضیہ بگ سے نکاح کر کے مستقل محاذ قائم کر لیے جہاں انہیں آم کی جٹنی سے بھی زیادہ چٹنی زندگی سے دست و گریباں ہونا پڑتا۔ پھر سنا ان پر پالینجی لیا کے مرض کے خفیف سے چلے ہوئے شروع ہو گئے۔

اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد طیرطھی منگر مسلمان لڑکیاں اور کم بونگٹیں۔ اسکول حب تک اسلامی نہ ہو اسلامی پانی کی طرح اس کی ہمارت پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

استانیوں کا نیا گروہ کچھ اس شان سے وارد ہوا کہ پہلے تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کاہل ہیں یا جُست، اچھا طیرطھی ہاں ہیں یا بڑا؟ کینہ کہ یہ استانیان گرگ باران دیدہ تھیں۔ ایک محکمے میں بیس بیس سال سے جی ہوئی تھیں۔ ایک چھٹی ہوئی رئیس جن کا بیس سال کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں گزارہ نہ ہو سکا۔ چونکہ گورنمنٹ کا معاملہ دھپسٹ ہی ہوتا ہے، بس ایک اسکول سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، اور جو دہاں بھی بہت جو قم پزار ہوئی تو پتہ تھے اور پانچویں میں۔ ایک جگہ جم کر ہنسنے کی نہ تو عادت اور نہ شوق باقی رہ گیا تھا۔ جب ایک اسکول میں مہیٹھیں سے لے کر پھر تک سے صاف لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی اور صفت سوادینے والے مارے لٹھانوں سے جینا دو بھر کر دیتے تو یہ روتی پٹپٹی انسپکٹر اس کے پاس جاتیں اور تبادلہ کروالیتیں۔ بھلا وہ دشمن کو کس گنتی میں شمار کرتیں!

اُن میں سے ایک باقری جم تو بس معلوم ہوتا تھا کہ چھوڑا اور بھری۔ عمر کی لگی تھیں اور کئی انسپکٹر لیں جگتا چکی تھیں۔ کسی کا کہا ماننا تنگ سمجھتی تھیں اور پابندیوں کو بیکار کی زیادتیاں۔ بہت جلد بڑوں نے کنایوں اشاروں سے جادیا کہ اگر ذرا بھی چول چرا کی لاپسٹس سے جڑ دیں گی۔ انہیں اپنی قسم پر بڑا نا ز تھا اور جس کو ہمیں ہنس کر نہ کی قسم کھانی پوری ہو گئی۔ دوسری مں سارے عجیب پٹی ہوئی رونی سی ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذمہ سی بات پر پھوٹ کر دیر تھیں اور پھر گھنٹی مناد نے کہ وائیں۔ ایک دوست مسز شرما ہر اسکول میں اُن کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ مسز شرما انہی ہوئی عمر کی مرثیہ لکھی غصہ و عورت تھیں۔ یہ دونوں ہمیشہ انگریزی میں ایک دوسرے سے پیار محبت کرتیں۔ کتیں اور لڑکیاں بھی انگریزی میں۔ جونہی لڑائی شروع ہوئی مسز شرما مفت رہنے کا ہاتھ دے کر فوراً کھانے پینے کا خرچہ دینے کی دھمکیاں دیتیں اور مسز سارے روتیں۔ دینا

میں معلوم ہوتا تھا ان دونوں کا کوئی اور نہ تھا۔ ساری محبت اور غصہ ایک دوسرے پر اتار تیں۔ ان لڑائیوں کے چرچے دور دور پھیلے تھے اور محبت بھی کچھ کم مشہور نہ تھی۔ باوجود انی تمام باتوں کے اسکول کا رہٹ روں روں ایک لطیف شخص کی روائی سے چل رہا تھا۔ داخلہ اطمینان بخش، نتیجہ اطمینان بخش، تعلیم اطمینان بخش۔ اس اطمینان بخش نفا کے دل میں ایک نہایت ناقابل اطمینان کانہ رستی اور مردہ پن پیدا کر دیا معلوم ہوتا جیسے پریشوری دور تے دور تے سیدھے اور سپاٹ میدان میں رنگنے لگی، اس گھسٹتی ہوئی دنیا میں سب اچھ بند کیسے عمر کی لکیر نہ بناموش چلتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکڑے ہو گئی تو بھی کا ندھا بھا کر آگے گھسٹ گئے۔ زندگی دھیرے دھیرے گھسٹ رہی ہے وہی نیم خفتہ ٹن ٹن۔ گھنٹہ رفت مقررہ پر جاگ کر انگوٹھی لپکتا ہے اور میرا نہ کھتا جاتا ہے اس کی ہر کردٹ دتدم آگے یا دتدم پیچھے گھسیٹ لاتی ہے۔ وہ اواس سویا ہوا فرح جس پر جھامپیاں لیتی ہوئی استانیان، جن کا بس نہیں چلتا کہ اس سست رفتار گھنٹے کو بھجھوڑ کو جلدی جلدی دوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ منڈ کی سوئی اتنی بچھل کیوں ہے! کیا عاقبت کا توبہ ساتھ لے جانا ہے! اور اگر یہ سیکنڈ کی سوئی ذرا الپک کر چلے تو دنیا اس کے ہلکوروں سے جاگ اٹھے۔ یہ وقت اس قدر ہوئے ہوئے پوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کابل کبھی نہ ہوتا، ٹکٹ ٹکٹ وہ بھی جلدی جلدی مشین کے پرزوں کی طرح چلتا۔

اور دھما بھی تو بھاری بھاری ہے! جیسے کوئی سونہ فٹاک طوفان تلا کھڑا ہے، تھیس لگی اور بند ٹوٹا۔ پھر کوئی نہیں جانتا کہ امرت برے کا یا شعلے مگر ایک خاموش بے اختیار سے انتظار نے ہر ایک کو تھکا رکھا ہے۔ ایک نامعلوم بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں۔ کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم! مگر ہوگا ضرور کچھ کچھ اچھا سستا، اناج کوڑیوں کے مول۔ مگر کوڑیاں خوں کے مول بھی نہیں! یہ آفر دنیا میں پیسہ انشاکم کیوں بنایا جاتا ہے؟ یہ جو گھر دل میں تانبے کی پتیلیاں ہیں انہیں کھلا کر پیسہ بنایا جاسکتا ہے!

دنیا سستی، انسانیت سستی، حیوانیت سستی پھر بھی یہ کنگالوں کی تعداد میں کمی کیوں نہیں آتی؟ معلوم ہوتا ہے اناج کے ہر دانے کے ساتھ دس بھوکے لپٹے ہوئے زمین ہی سے آگے تھے ہیں اور ان کی ساری عمر اسی ایک دانے کی چھلچھپٹ میں بیت جاتی ہے۔ انادقت کہاں جو کسی اور چیز کے لیے بھی ہاتھ پیرلاہٹیں۔ کہتے ہیں اور لوگ ٹوٹ کھوٹ ٹر و جواہر اور عزت کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں، مگر یہاں تو عزت چھوڑ اپنی کچرا بھی نہیں جس کے لیے یہ بھوکے بھی کسی سے لڑیں۔

فضا کی گھٹن اور بڑھ گئی۔ لوگ ہوا کو سونگھ سونگھ کر معنی خیز انداز میں سرلاہنے لگے۔ جیسے طوفان کی لُپا کر کیرے مکوڑے سے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں اسی طرح بازار میں بھگڑا دھڑکی پڑ گئی۔ بنیوں نے سونا چاندی سمیٹ کر دھڑکی ماتا کی چھاتی میں چھپانا شروع کر دیا۔ طوفان کا دھماکا اتنا گہرا نہیں ہوگا کہ ماتا ان کی امانت بھی اگل دے۔ آسمان پر سرنے ستارہ یکا یک نازہ زخم کی طرح بھوٹ نکلا اور لوگوں نے اس میں سے لہو سیکٹا دیکھا۔ چاروں طرف سے غیر مرئی گھٹائیں اُٹنے لگیں اور خاموش گرج نے دل در مار غملا دیے۔

ہکا بھوڑا بھوڑا اور مواد کا دیلا بڑ نکلا۔ دیکھنا ہے اپنی رہ میں کس کس کو گھسٹتا ہے اور کون بچ رہتا ہے جو مٹی نے پو لینیڈ پر حملہ کر دیا۔ بنیوں نے جلدی جلدی ٹنگ اٹھ سونا سمیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ کہا نہ سنا یہ بیٹھے بٹھائے جرمنی کے دانتوں میں کیوں کھجلی اٹھ کھڑی ہوئی؟ فرانس اور انگلینڈ کے دروں کے طرفدار، صلح کے پرچم لے کر دوڑ پڑے۔

و آج سے ہما دی تنہا رہی کٹی جرمنی کو صاف تباہ دیا۔ مگر وہ تو مجھے ہوئے بچے کی طرح کچھ تیار ہی چلا گیا۔ ادھر دوسری بھی پسلی پھر ٹوکی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ میاں شکر کو منجلی دنیا نے پوچھ کر رکھ دیا۔ دیکھتے دیکھتے دندیر سے چوٹیں نے پو لینیڈ کو بیٹھی نکلیا کی طرح بانٹ کھایا، چلیے چھٹی ہوئی۔ جرمنی نے پو لینیڈ پر قبضہ کر لیا۔ اور یہ تو بڑی بڑی بات کی۔ دنیا بھر کا نقصان



ہو گیا۔ یہ لوگ بقتہ کرنے کے اتنے کیوں شوقین ہیں حالانکہ یہ بالکل اچھی بات نہیں۔ گلوب پر کتنا حصہ گلابی ہے، جیسے تازہ تازہ کوڑھ پراب یہ تجربی کوٹار کا ڈبرے کر چلا ہے نہ جانے یہ لوگ لیب پوت کر اس گول مولی کا کیا حال کریں گے!

اور پھر کیا ہوگا؟ پولینڈ بھی غلام بن جائے گا۔ ہندوستانی تو خیر صدیوں سے غلامی کرتے آ رہے ہیں۔ مجھ کے رہنے سے روح بڑھتی ہے اور موسکم اثرات جسم کو توانائی بخشتے ہیں۔ یہ کھٹی کھٹی آنکھوں والے سڑک کے کتے جنہیں ہر راگبیر کی ٹھوکر دی اور فاقہ کشی کی چٹکیوں سے لیا فی بنا دیا۔ یہ تو اسی میں مگن ہیں۔ گوشت پوشیت تو بیکار کا فصد ہے اصل چیز ہے ہڈی اور اس سے سیٹھ رہنے کیلئے اور پر سے کھال کا غلاف۔ یہ انسانی پیچہ سیاہ اور ٹیڑھے بیگے کھلی اور پھریلوں سے لدے ہوئے مرقعہ جنہیں قدرت تلے اپنے دست خاص سے گھڑاتا ہے اور پھر جلتی دھوپ اور سور کے تعظیموں سے دہکا کر خاک اور دھول میں تقیر کر کے کٹی کھرچنے کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔ ان پر غلامی بھی اثر نہیں کر سکتی۔ مگر یورپ کے وہ کامل بدن جو تیرنگا بھی کہلا جاتے ہیں، وہ کیسے تابندہ الایٹس کے ان مظالم کی؟

دفتر کے بیکار کاموں سے سرشار تھے وقت شمن کے خیالات دور دور ٹھٹک جاتے۔ کھڑکی میں نیل زین کا پردہ لٹکا ہوا سڑک پر چلنے والوں کی نظر بازیوں سے پناہ میں لیے ہوئے تھا مگر اس کے خچے حصے سے چلنے والوں کی ٹانگیں نظر آتیں اور وہ گھنٹوں بیٹھی ان ٹانگوں کی رنٹار دیکھا کرتی۔ کالی سیلی، طیرطھی اور خشک ٹانگیں، کچھ سیلی پھٹی دھوتیوں میں لٹکائی ہوئی کھلی ٹانگیں، کچھ اور سیلی میں تقیر کر کے کٹی کھرچنے کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔ ان پر غلامی بھی اثر نہیں کر سکتی۔ مگر یورپ کے وہ کامل بدن جو تیرنگا بھی کہلا جاتے ہیں، وہ کیسے تابندہ الایٹس کے ان مظالم کی؟

سے کوئی نہیں بچتا، دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا۔ یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلبہ بکائے ہیں اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آتی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک کہتیا کر لے والے محکمے قائم ہیں پھر مکھن، دودھ، درگھی نے جو انسانوں کو چرنی کی پٹیلیوں میں تبدیل کر دیا ہے اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیے۔ دولت کا جتنا حصہ گوشت اور چربی پھرنے میں صرف ہوتا ہے کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشینیں ایجاد کر لے میں صرف ہونا چاہیے جو موٹاپے سے عاجز بیماریوں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے بزرے کی بات ہے جو یہ کہ دنیا کے ایک حصے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے دوسرے حصوں میں ذہنی عناصر کی زیادتیوں کو کل پرزوں سے پھیل پھیل کر دور کیا جاتا ہے۔ کاش اُن خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیل ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے جو یہاں گھوم رہے ہیں تو ترانہ کے دریلروں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے۔

روز در پیر کے بعد ٹانگوں کا نیا طوفان ہنا شروع ہو جاتا۔ یہ طوفان پاس کی ہل سے اٹھ کر تانھا اور شہر کی طرف برس جاتا۔ یہ بدبودار شیرے اور سرطی ہوئی راب میں سنی ہوئی ٹانگوں کا تھکا ہوا ریل اپنی انتھک نڈھال روانی سے روز بہا کرتا چھٹی ہونے سے ذرا پہلے ایک یکہ دہنا ٹانگ ایک لکڑی کی ہراسی میں کئی جھمتی کا پتی پھر پھرتی گزر جاتی۔ شمن کا معمول تھا کہ وہ اس ٹانگ کی ہمد کاڑھی کی مسلسل ٹھک ٹھک کو قریب آتا سن کر ایک پیسہ کھڑکی سے نیچے پکا دیتی اور منتظر رہتی کہ ایک سوکھے ہوئے مردے جیسا سیاہ پاتھ اُسے کس عفا سے غلاظت کی نالی میں سے نکال لیتا ہے، جیسے اُسے نالیاں ہی ٹٹولنے پتی ہو۔ اور پھر وہ سست اور مکدر اس ٹانگ کو دور جاتا دھتتی رہ جاتی۔ کیوں؟ آخر کیوں پیدا ہوئی ہیں یہ بھیانک ٹانگیں اور کائے سیاہ ڈھانچے؟ پھر اُسے خیال آتا اگر یہ ڈھانچے اتنے سوکھے نہ ہوتے تو تاج محل دنیا کا اٹھواں عجوبہ کیسے نظر آتا، اگر جان مسجد کی سیڑھیوں پر اتنے فیز اور مکھیاں نہ بھنبھنا میرا تو شاہان مغلیہ کی شان و شوکت کا ثبوت کیسے ملے؟

اگر خدا بخواتیہ جبر متوں کا دماغ چل نکلے اور وہ پولینڈ کی طرح ہندوستان پر بھی  
ناخون تیر کرنے لگیں تو شاندار عمارتیں، یہ نادار الوقت مقبرے اور یہ مقدس مٹی، جہاں  
ہم صرف بونے کے شوق کو پورا کر لے کے لیے ہری بھری کھیتیاں سجاتے ہیں، یہ لمبی لمبی سڑکیں  
جنہیں ہم موٹر دل کی دھول بھانکنے کے لیے خون پسینے کی نمی پہنچا کر کھاتے ہیں، کہاں جا میں  
گئے؟ کا رخانے سے نکل کر گرم کباب اڑانے کے لیے یہ جامع مسجد کی سڑھیاں کہاں غیب  
ہوں گی! اور جب بادل اٹک گھٹ کر آئیں گے، ابراہیم رحمت رحم جہم برسنے لگے گا، کوئلیں پکار  
اٹھیں گی اور پیسے پھنڈی سانسیں بھرنے لگیں گے تو زنا ری عیم کی پیاس بجھانے انہیں  
عظیم الشان مقبروں کی آغوش میں چھپ جائیں گے، لیکن یہ فاسسٹ ہمارے ان حشر  
کا ہوں کو نفس ہنس کر کے رکھ دیں گے۔ ہمارے باپ دادا کی مقدس ہڈیاں اکھاڑ کر  
لے جائیں گے، وہ ہڈیاں جن کی خاطر ہم جہم جہم سے خون کی ندیاں بہاتے آئے ہیں، وہ  
مانک موتی سے بھی زیادہ انمول ہڈیاں جن پر منہ کو ناز ہے۔ ہر خدی کا فرض ہے کہ وہی  
کی حفاظت میں خون اور پانی ایک کر دے۔ یہ ہڈیوں کا بچاری خود بھی تو ہڈیوں کی ایک  
مالا ہے اور درختے میں ہی مالا اپنے بچوں کو بخش جاتا ہے جتنے ہی تو کچھ نہیں مگر مرنے کے بعد  
اُس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہاتھ کو بیٹا اور مردے کو زندگی بانٹنے لگتا ہے۔ گوزندگی  
بھر جسم کا کوئی کونہ مستور نہ رہ سکا مگر مرنے کے بعد اطمس و کمخواب کی چادریں چڑھائی  
جاتی ہیں اور صندوق لکیر خرق کلاب اور کیوڑے سے غسل کرتا ہے۔ زندگی بھر جو میل کی  
پڑیاں اور جو میل اُس پر چھائی رہیں اُن کا کچھ تو بدلہ مل ہی جاتا ہے۔ زندگی میں جسم  
کو نہ سہی مرنے کے بعد ہڈیوں کو سہی!

یہ ہڈیاں! کیا مرنے کے بعد ان ہڈیوں میں دل نہیں رہتا! کاش دل بھی بڑی کامضبوط  
ٹکڑا ہوتا جو صدیوں زندہ رہ سکتا۔ تو اگر ہندوستان کی زمین پر جہم لینا ہے تو درجوں  
کو چاہیے ہڈیاں بن کر جہم لیں اور اگر جینے کی خواہش ہو تو جینے کی ہڈی ہو سکے مر جاؤ  
اس قبرستان میں زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔

پولینڈ کا قلمہ ترادونٹ کی ماٹھ میں زیرہ ہو کر رہ گیا اور فرانس کی حسیفہ بھی

جھپٹ میں آگئی۔ شرم نہیں آتی ان حیوانوں کو عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتے۔ رانی جھانسی بھی تو عورت تھی کس قدر نسوانیت تھی اس جی دار حسینہ میں بھی ہوئی چتا کی آخری چنگاری! مگر ابر رحمت لے ایک بار ہی برس کر اُسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس ہڈیوں کے دیش میں ان چنگاریوں کا کیا کام؟

گھٹائیں برسیں اور خوب برسیں۔ بند کھل گئے، سوتے جا رہے ہو گئے، لیکن یہ ہندوستان کیوں خشک پڑا ہے؟ کیا ہندوستانی خون کی بوا بھی تک اڑو ہے کی ناک میں نہیں پہنچی؟ یہ سیاہ خون یہ بھی بہت بساندہ۔ گو سفید فرات نے مل کر کچھ خالی حسن پیدا تو کر دیا ہے، مگر ابھی اسے بہت سے انکشتوں کی ضرورت ہے۔ یہ دسارے جہاں سے اچھا، ہندوستان سواستلا کے چکر سے کیوں بچا ہوا ہے؟ ہر قوم کو اس پر پار آچکا ہے۔ سب ہی کو اس کے سدبار کی فکر نے ستایا۔ سیاہ درادڑوں کو انسانیت کھلتے آریہ آئے، سکندر تک کی پسلی پھڑکی، ایران و افغانستان کو محبت چرائی، تاتاریوں نے دانت لچکی کر بوسے دیے، مغلوں نے عشق و محبت کے میدان گرم کیے اور پھر یورپ کے بلیوں کی ترازو کے پلڑے سے جھولنے لگے۔ ہندوستان کی ہمان نوازی ہر ایک کی خدمت میں خزانہ نعمت بچھا ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، "یہ سب کچھ جائز ہے، کھاؤ پیو اور بھوڑے کا حصہ باندھ کر لے جاؤ۔ ہم جھوکے سو رہے ہیں یہ تمہاری کھتی بھر جائے ہمیں تو بس اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے بیرے اور آبا کا عہدہ پا کر تمہاری سفیدی کے آگے اپنی سیاہی کا ماتھا ٹیک دیں۔"

موسم بدلنے لگا۔ شمع جی پر خفقان سا اٹھنے لگا۔ یہ ابھی ابھی فضا جس نے دم گھونٹ رکھا تھا کچھ اور بھی غلیظ ہوتی جا رہی تھی۔ جی بُری طرح گھبراتا۔ عقدہ آتا کس پر؟ یہ اسے نہ معلوم تھا۔ استانیوں کی سستی پر ایشیائی میں بدل گئی تھی۔ کون جانے کسی ہوا چلے، کدھر سے چلے۔۔۔ اور کس کس کو اڑا لے جائے۔ بے چین بھاگ بھاگ شروع ہو گئی تھی۔ جنگ کو سوں و درہتی مگر خطرہ دلوں میں چھپا ہوا تھا۔

گھبرا کر اُس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دور جانے کا ارادہ کر لیا۔ کہاں؟ یہ اُس نے اسٹیشن پر پہنچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ تھی۔ اُس نے وہی پکڑ

لی۔ کہاں جا رہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اُس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی؟ جب جانا ہی ٹھیکر نہ پھر کیا حاجت ہے کسی مقررہ لیکر نہ چلنے کی؟ اُس کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا۔ ایک ہندوستانی کے نقطہ نظر سے سفر کو مکمل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی سامان ہے۔ ریل کی افراطی نے حقوڑی ہی دیر میں سفر آخرت کا مزہ پہنچا دیا۔ بیمار ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم انسان میلے اور بدبودار چتھڑوں میں اُلجھے ہوئے تپ نہ نہیں کہاں اور کیوں جا رہے تھے؟ شاید انہیں بھی منزل کا پتہ نہ تھا۔ اُسے غصہ بھی آ رہا تھا اور تنہی بھی۔ کیا حماقت ہے سفر کرنا اور وہ بھی حقوڑا کلاس میں! کبھی تو اگلا کرجی چاہتا لوٹ پڑے یا اتار کر ریل کی پٹری پر لیٹ جائے، تاکہ ایک بار ہی یہ لمبا چوڑا تھکا دینے والا سفر ختم ہو جائے، مگر پھر سوچی اس میں بات ہی کیا ہے؟ آواگون کا کیا ٹھیک عجیب اُدٹ پٹانگ سلسلہ ہے۔ دنیا میں بار بار حقوڑی ریل کے دھکے، بیچھڑ، یہ سڑ سے بسے کھانے اور بدبو سن گھنے کو آنا نصیب ہو گا۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے اسی زندگی میں دونوں ہاتھوں سے لپک لو۔

گٹاری بدلتے میں بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا لطف آگیا کیونکہ حقوڑ کلاس والوں کے لیے سیلوں کے باڑے سے بھی بدتر جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ اُسے پلیٹ فارم پر بستر سے لگ کر چار بسے آہستہ آہستہ رہتے ہوئے گھٹنے گزارنے پڑے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں تالا پڑا ہوا تھا اور فرسٹ میں کوئی انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ سوائے اسی ایک سفید انسان کے باقی سارے کالے پیلے نیلے جانور تھے اور پر پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پلیٹ فارم بھی ایک قسم کی گورنمنٹ ہوتی ہے جہاں چند فرسٹ کلاس انسانوں کے علاوہ ساری رعایا کو ڈر ہی نظر آتی ہے حالانکہ آمدنی اسی بیسے درجے والے سے ہوتی ہے مگر آرام کبھی کبھی مجبوراً سفر کرنے والا آدمی ہی لے جاتا ہے۔

ہر سودے والا سارا سودا اُسی کے ہاتھ بیچنے پر تل گیا۔ منہ کر کے لکھتے بھی تو ہتھک لگتی۔ فیکروں کے علاوہ یتیم خانوں، میوہ آشرموں اور گھوڑ کھشا کا پوتر کام کرنے والوں نے بھی ہتھ بول دیا۔ وہ جل اُٹھی یتیم خانوں میں جاؤ تو یتیم لکھ میں لگانے کو کمرے پر بھی

نہیں ملتے اور بیوہ آشرم اتنے مردوں کی موجودگی میں حد فاصل سے زیادہ نہیں۔ اور ان پناہ گاہوں کی ضرورت بھی کیا ہے! جب تک یتیموں کے لیے کوٹھے موجود ہیں ان بیکار جھگڑوں میں پڑنا ہی حماقت ہے۔ یہی یہ گامیں توجب بچوں کے لیے مائیں اور مٹھائی میں ڈالنے کے لیے گھاس کا گھی اور سنگھارے کا آٹا موجود ہے تو پھر یہ گامیں کس کی چربی بڑھانے کو پالی جائیں؟

بار بار اس کی نظر ایک بچے کی طرف بہک جاتی جو بڑے غور سے کبھی ان کیلوی کو تک رہتا تھا جو اس کی ٹوکری سے دلکش ملبسواؤں کی طرح جھانک کر لہجہ دے رہے تھے اور کبھی ان کتوں کو جو چاروں طرف نہایت ضروری کام سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بچہ نہایت چیلدا تھا۔ اس کی بوڑھی آیا قابو میں کرنے کے لیے برابر اس سے کشی لڑ رہی تھی۔ بار بار اس کی منی سے دھار رہی تھی جو نہ جانے کس کام کو گئی ہوئی تھی مگر بچے میں بلا کی پرواز تھی۔ بیٹھے بیٹھے اچھل کر لوٹ لگتا اور پاس رکھی ہوئی ہر چیز کو جھنجھوڑ ڈالتا۔

دبیری بات بابا: ”آیا کہتی اور وہ ہتھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا مگر پھر اس کے جسم میں روانی کی لہر اٹھتیں؛ پہلے ٹانگوں کو استرے کو اتار، پھر تھیلیاں تسموں سے جھوننے لگتیں، سر کو ت بھرے کھلنے کی طرح آگے پھیرے، دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور ہتھوڑی ہی دیر میں وہ ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا۔

کیدوں کو وہ پیار بھری حسرت سے مکتا: ”بری بات“ کی ہر نے انہیں اور بھی دلکش اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے شہری اور لذیذ کیدوں کی پاک خواہش میں ”جڑی بات“ جیسی تلخی کہاں سے آسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا آیا سدا کی جھوٹی ہے اور ہمیشہ اسے اپنی ناگوار قسم جھانے دیا کرتی ہے۔ کتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر اٹھ کر طرف گیا۔ یہ گو گو کرنا دیوہنگی بھوت اتنی بہت سی گاڑیوں کو گھسیٹ لے جاتا ہے اسے نیا بیاہتا جوڑا بھی بہت باذب نظر معلوم ہوتا تھا۔ آگے آگے دو لہا اور اس کے پیچھے دو لے کوٹنے سے بندھی ہوئی عودت۔ اگر آیا اجازت دیتی تو وہ ایک بار ذرا اس دف سے پٹے کے جھونے میں دو ایک پیکیں لے کر دلچھنا۔ آیا نے اسے وزن کرنے کی مشین پر بھی نہیں

کوہنے دیا اور صندوق کی قطار پر لفٹ مارٹ کرنے پر بھی معروض ہوئی۔ مارٹھک لکھ بھی وہ ساکت ہو کر آنے جانے والوں کے منہ کھنکھاتا اور بے خبری میں اُس کا منہ اُن کی نقل میں نئی نئی شکلیں بناتا۔

”کیلا لڑکے؟“ شمن نے تہائی سے اُٹا کر بچے سے پوچھا۔

”نہیں!“ اُس نے چپکے سے آیا کی طرف دیکھ کر کہا، ”پرائی چیز بُری ہوتی ہے۔ ہیں نا آیا؟“ وہ جوش سے بولا اور کھیلوں کی طرف اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر فوراً اپنی توجہ پاس رکھے ہوئے سامان کو بکھیرنے میں لگا دی۔

کتنی ہی دیر سے کئی وق مارے نوجوان گنگنا تے لطیف اشارے کرتے شمن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ دلی کچی خواہشات غمگی ہو ہو کر اُن کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ ایک دوسرے کو قطعی ناممکن اعمال گالیاں دے رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کئی برقعہ پوش گھڑیاں یاں بیٹھی اُن کے مفلوج دماغوں سے فٹ بال کھیل رہی تھیں۔ پاس ہی ایک قبول صورت پھیل سی وہیں گھونگٹ کا ٹھہرے اُن پر ہم باری میں مصروف تھی۔ ایک مجروح شکل لڑکا ایک انگریزی کا کوک شاستر اس رخ سے لیے بیٹھا تھا شمن کی نظر پر اس کے با تصویر عنوان پر پڑتی۔ گھنٹہ بھر سے وہ اسی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو وہ یہ تصویر نہایت انجان طریقہ پر دکھاتا اور جو نہی کسی سے نظر مل جاتی عجیب برہنہ سی مسکراہٹ آنکھوں میں پیدا کر کے نڈھال ہو جاتا۔ اسی خاموش لاسکی میغام کے ذریعے وہ ساری گھڑیوں سے بھی راز و نیاز میں مشغول تھا۔ جواب بھی مل رہے تھے، کچھ پریشان، کچھ نفرت میں ڈوبے اور کچھ حد درجہ متحیر! اس جگہ لی وہیں کا منہ تو چھپا ہوا تھا مگر تھکن سے نڈھال انگڑائیاں تو دہری تھی۔ بچے کی معصوم آنکھیں جو کھیلوں سے کشش لپٹانے میں مشغول تھیں اُن نوجوانوں جیسی بخش اور گستاخ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پڑ پڑتا تھا اور غصے سے زمین پر تھوک رہا تھا۔ کئی بار اُس نے آیا پر بھی تھوکا اور پھر اُسے جلانے کے لیے خوب ناک میں آنکھیاں اٹھکھولیں، سوسٹ کے بٹن چوسے اور جوتے کے بند کھول ڈالے۔

مچلے نوجوانوں میں کسی بات پر شتم کشتا شروع ہو گئی۔ بگالیدوں کی جدت میں ترقی ہو گئی۔ کیلوں کی ٹکر ماری اور کئی صراحیاں لپیٹ میں آ گئیں اور بدحواس ٹانگیں مختلف زاویوں میں پھینک لگیں۔ بچہ یہ منگامہ دیکھ کر پیٹے تو ششدر رہ گیا پھر اس کی آنکھیں جھجکا اٹھیں، گال سُرخ ہو گئے اور چیخ چیخ کر مہینے لگا۔

”کیلے کیلے... آہا کیلے...!“ وہ کچلے ہوئے کیلے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور کشتی میں حصّہ لینے دوڑا مگر آیا نہ اُسے پکڑا کہ بستر پر بٹھا دیا۔

جب ذرا سکون ہوا اور بچہ بستر پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا تو بلیٹ فارم بھی سونا ہوا گیا۔ شمن نے ڈب کھول کر کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ نکالے۔

”برری بات!“ بچہ بغیر بلاستے چلا آیا۔

”آیا بچے کو میسے پاس سے آؤ؟“ شمن نے حکم دیا۔

”میم صاحب بڑا ناٹا ہے۔ اس کا تمی شاپننگ گیا۔ بولا دو کلاک سے آئے گلے پن کون جانے کبی آئے گا؟“ چچرا آیا نے بچے کو آنے دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ شمن نے بہت سے چاکلیٹ اُس کے دونوں ہاتھوں میں بھر دیے۔

”میم صاحب اکھا دل مستی کرتا... پڑھتا کو چھ نیٹ... ناٹا... دیری ناٹا۔“

بچے نے چاکلیٹ کھائے نہیں بلکہ انہیں صندوق پر قطار میں جما کر تالیباں بجائے لگا۔ آیا اس کی شرارتوں کا ردِ ناروئی رہی۔ شمن بغور بچے کو دیکھتی رہی۔ چاکلیٹ کی برجیا بنا کر درد سے ایک تھپڑ مار کر کھیر دنیا اور اپنی اسی فاحشانہ تخریب پر قہقہے لگانے لگتا۔

”جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کیا بنو گے؟“ شمن نے ایک ٹیچر کا مرغوب ترین سوال

بچے سے پوچھ ہی لیا۔

”ہم... ہم سپائی بنیں گے!“ اُس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر کہا جو تھوڑی

دیر ہوئی فساد فر کر کے مرے سے کھنے سے پیٹھ لٹکائے دو مرے فساد کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اگر یہ فساد نہ ہوں تو دنیا کتنی سونی ہو جائے۔ پھر کانسٹیبل سو اُسے کھبول



سے بیٹھ لگا کر اونگھنے کے کیا کریں گے۔ اگر بچے چالاک بیٹ کی برہیاں بنا کر نہ ڈھائے تو سوائے اسباب کی توڑ پھوڑ اور آیا پر حقو کھنے کے اور کیا کرے۔ کاش ان کا نسب لہو اور بچوں کو بھی کچھ کام ہوتا۔

”تمہیں مٹی مارتی تو نہیں؟“ نہ جانے اسے کیوں خیال آیا کہ بچے کو پٹنے کی اشد ضرورت ہوتی گئی۔ کٹی بار اس کا خود جی چاہا اس کے پیارے پیارے سُرخ گالوں میں چٹکی بھرے اور بے اختیار اسے بھینچ ڈالے۔ یقیناً وہ بڑا گدگدا اور گرم ہو گا۔ اس کی آغوش میں اسے جکڑنے کی ناقابل بیان تھکی ہوئی سی خواہش جاگ اٹھی۔ بچے نے مٹی کے نام پر فکر مند ہو کر تیریاں چروٹھالیں۔

”وہ بڑی ناٹی ہے... مٹی!“ بچے نے جھلا کر کہا تو اسے ایسا معلوم ہوا وہ اس بچے کو بہت دن سے جانتی ہے۔ اس نے پیسے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ کتنے شگفتہ تھے۔ بعض انسان پھلوں اور مٹھائیوں سے کتنے مشابہ ہوتے ہیں اور بچتے ہی بچتے ہوئے چنوں جیسی سوندھی سوندھی خوشبودار مٹھائیوں میں آنے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تازہ انگوروں اور اناس کی قاشوں کی طرح ہلکے دیتے ہیں۔ یہ دلکش گوشت کا لطیف کھانا جسے دیکھ کر بے اختیار نادانگی کی پھانک کی طرح جھنجھنے کو جی چاہنے لگا۔

”ہمارے پاس بندوٹی ہے۔ بستر میں لیٹ دی آئیے، دیکھو گی؟“ بچے نے مستعدی سے بستر پر بٹلہ کیا۔

”نایٹ۔ نایٹ۔ بابا بیڈنگ کیسے کر کے کھولنے کا؟“ انگلیں پھٹے لگی ہوئی آیا نے بغاوت کی۔

”ہم پھاڑ ڈالیں گے۔“ بچے نے آنکھیں نکالیں۔

”کیسا پھاڑ لے گا؟ مٹی غم کو اتنا کر کے مارے گا کہ بس!“

”ہم مٹی کو گولی سے مار دیں گے... ٹھائیٹ“ شکست خوردہ سپاہی نے سُرخ گالوں کو پھلا کر کہا۔

”چہ... بری بات!“ شمن نے چہکارا بچے نے اس پر بھی ایک سے اعتباری کی

نکاح ڈالی۔

”تم بھی ناٹی ہو... تمی اور آیا سب ناٹی... ہم سب کو ٹھائیں ٹھائیں مار دیں گے“ بچے کے غصے پر شمن کو سار آگیا۔ اتنا سا بچہ اور اتنے دشمن! چہ بجا برا! کاش یہ ٹھائیں ٹھائیں مارنے کی دھمکی میں کچھ اصلیت رہے اور یہ جذبہ پیردان چڑھ سکے۔  
 ”آئی ایم سوری!“ بچے کی آواز گلے میں بھنس گئی۔ آنے والی خاتون کو اس لمے ڈانٹ کر کہا اور غصے اور لجاجت کا ٹھکانا دیو لیٹر پر سر بلند ہو کر ڈٹ گیا۔

”وہیں! تم!“ بھرے پلیٹ فارم پر دو بار جو اس سہیلیاں شنٹ کیے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کی آغوش سے ٹکرائیں۔

”ایلیا! تم!“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

”چھپی گزرنے، اور تم؟“ شمن نے پوچھا۔

”گھر جا رہی ہوں... تو چلو میسر ساتھ...“

”میرے خطوط کا جواب...“ اتنے میں ریل آگئی اور شتم لہتم دوڑنا پڑا۔ ایک گارڈ سے کہہ کر شمن ایلیا کے ساتھ انٹر میں بیٹھ گئی۔

بچھڑی ہوئی سہیلیوں نے بالکل نئی بچیوں کی طرح بہت سادقت ایک دوسرے سے سوال پر سوال کرنے میں صرف کر دیا۔ جواب سننے کی کسے مہمت تھی! ایلیا بانگی پور جا رہی تھی۔ شمن نے چھٹیاں وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریل میں نہ اتنی فرصت اور نہ کہانیاں اتنی مختصر کر سنانے والا سناٹے اور سننے والا جی بھر کر سنے۔

چٹاخ سے ایلیا نے بچے کے کال پر تھپڑ لگایا، وہ کپڑے بدلنے میں پیر پڑھے کر رہا تھا۔ ایک بار زور سے اُس نے منہ پھاڑ کر دھاڑ نکالی اور چیپ ہو گیا۔ ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ سُرخ نگاروں جیسی دیکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار جمائیت گتاخ آنکھوں سے کچھ کہا۔ شدت ضبط سے تھکے پھڑکے کان سُرخ ہوئے مگر دودھ اُبلتے اُبلتے ہم گیا۔ خاموش اُس نے کپڑے اُتر دیا یہ مگر گویا کوئی اُس کی کھال اُتار رہا ہو۔

شاید کھال اُتارتے ہیں بھی اتنی شدت سے جذبات نہ دکھتے ہوں گے۔

”ہمیں بھوک لگی ہے“ بچے نے ڈانٹ بتائی۔

”آیا بسکٹ دے دو“

”ہم بسکٹ پھینک دیں گے، چا دل کھائیں گے“ دانت کچکچا کر ایلینا نے پھر پھڑپھڑاٹھا یا مگر شمن نے اُس کا ماتھ پکڑ لیا۔

”کیوں مارتی ہو“

”تم... تم نہیں جانتیں... یہ... یہ...“ ایلینا کا گلا گھٹ گیا اور وہ پٹے

ہوئے بچے کی طرح لبسو روی۔ شمن نے کچھ نہ کہا۔ خاموش سر موڑے کچھ سوچتی رہی اور ریل فرارے بھرتی رہی!

(۳۵)

”تم کہتی ہو میں اُسے کیوں مارتی ہوں؟“ ایلینا نے سونے سے پہلے اپنے مختصر کمرے میں ٹھہنا شروع کیا۔ بچہ آیا کے پاس سوتا تھا۔ گھر صاف ستھرا تھا مگر نہ جانے کیوں قید خانے کا سا جیس تھا۔ کمرے کچھ پرانے اور برسوں سے بند پڑے تھے۔

”میں اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں۔ جانتی ہو میں نے اُسے ختم کر دینے کی پوری کوشش

کی۔ اسے پھینکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کئی بار موت کے کنوئیں میں دھکیل دیا مگر

میری تندرستی سخت جانی بن کر اڑے آگئی۔ میں نے ایک گھنٹہ ڈنڈے مرض کی طرح اسے

شکم میں برداشت کیا۔ ہر لحظہ میں نے اس کے وجود پر ٹیٹکار دی اور بدبھمی کی تے

سمجھ کر جہنم دیا۔“ وہ برط سے جوش سے کہتی رہی۔ اُس کی آنکھیں اب بھی اتنی دہکتی ہوئی اور

سیاہ تھیں مگر ان پر ہلکا سا لکان کا پردہ پڑا تھا جو بہت غور سے کبھی کبھی ایک

جھلک سی دکھاتا تھا۔ جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ اور جیسے جیسے کھینچی ہوئی کڑھکڑی

پڑ گئی تھی سوہ سبک شایع گل اب پھل اتری ڈالی ہو گئی تھی۔ وہ بے رونق کے دھندلے

نقوش جو مٹ کر بھی بیکریں چھوڑ جاتے ہیں! پھر بھی اُس کا دماغ ابھی کنڈارا تھا۔

اور کنوارا رہنا چاہتا تھا گو جسم ماں بن چکا تھا۔

”میں نے اس قصور کے پودے کو سیخنے سے انکار کر دیا مگر دودھ کی زیادتی سے اندیشہ پیدا ہو گیا اور جبراً... اوہ... وہ مہم کرشمین کے بالکل قریب بیٹھ گئی جیسے اُس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہو۔ یقیناً لوٹن میں نے رک کے دکھ بھوکا لیسے، جیسے سانپ کو چھانی سے لگایا کہتے ہیں کہ جب بچے کے پوتہ ہونٹ ماں کے جسم کو کھوتے ہیں تو سوزگ کی اپسرائیں رشت کی آگ میں جل جلتی ہیں کہ وہ ماں نہیں بن سکتیں۔ پوتہ شمن لوگ برطے بھوٹے ہیں۔ جیسے اس سفیدی کے پیٹ کی آگ میں لے بجھائی میں ہی جانتی ہوں۔ جتنے دن یہ میرا خون چوستا رہا میری اتنا جہنم میں قصور کتنی رہی!“

”اتنی پریشان نہ ہو گئی!“ شمن نے پیار سے اُسے پاس گھسٹ لیا۔  
”تم نہیں جانتیں... اوہ تم نہیں جانتیں!“

”الہیا تم اتنی پریشان ہو... کیا یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ناجائز ہے؟“  
”ہشت بگلی، اگر سیٹل کا بچہ دیوتاؤں کے اپنے ہر دے کی جلائی ہوئی آج سے بھی پوتر ہو کر آتا تب بھی مجھے سولی جیسا دکھ دیتا... کوئی منتر کوئی پوجا اسے پاک نہیں کر سکتی... جب میرا ضمیر ایک حیوان کے جسم سے چوٹ کھا گیا تو...“  
”مگر اس میں معصوم کا کیا قصور ہے؟“

”قصور؟ منہ، تم نے دیکھا نہیں، یہ وہی ہے؟“ — وہ خوفزدہ ہو گئی جو وہی بالکل وہی سانپ! اور شمن کو یاد آیا کہ بچے کو دیکھ کر جو اُسے دھوکا دینا تھا کہ وہ اُسے کہیں دبیچ چکی ہے وہ دہم نہیں تھا۔ بچہ بالکل چھپا ہوا سیٹل تھا۔ وہی تنومند جسم اور مشانہ چال، وہی زندہ دلی اور کوشش! تو پھر الہیا حق بجانب تھی۔ قدرت اُسے چڑا رہی تھی۔ اگر بچہ الہیا سے مشابہ ہوتا تو شاید خود پرستی اُسے آجاتی مگر وہی شخص جو ہمیشہ اس کی نفرت کی آماجگاہ بنا رہا بغیر اختیار طور پر ایسا چھپا رہا کہ اس کے خون میں بھی رچ گیا۔ محبت اور نفرت اپنی بلندی پر پہنچ کر ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ انہیں بھی اپنا مشکل ہے۔ دیوتا اور شیطان دونوں کی پرستش ایک نکتے پر جا کر ٹک جاتی ہے کتنا باریک ہے یہ نکتہ

تخیل کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

”نیکین ایلیا، تم تو بڑی ترقی پسند ہو اور اگر سماج ایک ایسے بچے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے تو تم اس سے ظالم کہو گی“

”سماج ایسے بچے کو صرف اس لیے برا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منترؤں کے چھینٹوں میں نہ اٹھے بغیر دنیا میں آجاتا ہے اور میں ....“

”نہیں، سوسائٹی کی اجازت بغیر دنیا میں آجاتا ہے۔ تمہیں رولی سے اس لیے نفرت ہے کہ وہ تمہارے حکم بغیر دنیا میں آیا۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی ....“

”مگر کیوں؟ سوسائٹی کو کیا مطلب؟“

”اس لیے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن و بارش کے ہوں .... تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے۔ باپ کے منہ پر کوئی مہر نہیں پڑتی .... اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لکھایا جائے تو عورت، جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے، کیا کرے ....“

”ہوں تو تمہاری رائے میں ناجائز بچے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دو بھر معدوم ہوتے ہیں؟“

”اور کیا، خود سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے کیوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں؟ دینے والے نے نعمت دی اور لینے والے نے پائی۔ پھر باپ کیوں ڈرے اور ماں کیوں تمترائے؟ صرف اس لیے کہ اس کا پالنا پوسنا ”درود سر ہے“

”اور شادی کے بعد؟“

”تب مرد اسے اپنا مرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے“

”سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض؟“

”ہاں .... مگر اس کا اب وہ اس درجے تک عادی ہو چکا ہے کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے لفظ اپنا، اس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے“

”اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟“  
 ”مجبور نہیں... قانون بھی تو وہ اُس کا نہیں... قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غریب سوتلی“  
 ”لیکن ماں... ماں کیوں نفرت کرے؟“  
 ”کیونکہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا، اُس کی پرورش کا بار اُس کی زندگی کے  
 پیروں میں بیڑی بن کر اُلجھ جاتا ہے“

”مہشت، یہ سب داحیات ہے... میں ایسے بچوں کو صرف ایک دہرے سے خاکہ دینا  
 چاہتی ہیں کہ وہ اُس کے لانے والے سے نفرت کرتی ہیں۔ اس نفرت کا انتقام وہ اُس کی  
 گردن مردہ کر لیتی ہیں“

”تو بہ تو بہ، میں تو ایسی عورت کو حیوان سمجھتی ہوں!“  
 ”تم بیوقوف ہو... حیوان اتنے پر رحم نہیں ہونے اور نہ بیوقوف۔ اُن کے یہاں نہ  
 بھادریں پڑتی اور نہ بیاہ رہے... سنا ہے تم نے کسی گدھے کو سہرا باندھنے؟“  
 ”دونوں کھلکھلا کر منہس پڑیں، سیاہ بادل چھپٹ گئے۔“  
 ”ایسا تم بھی سرٹن ہی ہو... وہ کسی کا ہو، ہے تو اتنا پیلا ہوا!“  
 ”خاک! دماغ تو ہے ہی نہیں بس جیسے گشت کا دھمکہ۔ میں تو اس کی پڑھائی کی طرف  
 بھی نہیں دیکھتی۔ نہ جانے کیا جھک مار کر آتا ہے“

”کیا ارادہ ہے تمہارا اُس کے مستقبل کے بارے میں؟“  
 ”میرا ارادہ...“ اُس کی آنکھوں میں پھر آگ سٹکی۔

ایک فلک شگاف چیخ بچے کے کمرے سے آئی اور پھر پے در پے آواز دلی سے سنسان  
 گھر کو گونج اٹھا۔ دونوں لیکیں، اٹھیا آگے اور شتمن چمچے۔

”نہیں... نہیں...“ بچہ مسہری پر اوندھا لیٹا رہا تھا۔ جیڑی سے ایلٹانے سے  
 اٹھالیا۔ تھوڑی دیر کو شتمن کو شبہ ہوا کہ اُس کی آنکھیں نرم نرم روشنی سے چمکیں مگر فوراً ہی ایک  
 دردناک چیخ مار کر اُس کے بازوؤں سے چسپس پڑا۔

”آئی ایم سوری... سوری...“ وہ ہیبت زدہ ہو کر چلائے لگا۔ ایک لمبی سی پریشانی

ایسا کہ چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔

”جپ... خاموش... چپ“ اس نے پتھر دلوں کی بارش کر دی اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا اگر دشمن اور آیا اسے دھکیل کر کمرے سے نکلے جاتیں۔ شدت جذبات سے وہ دیر تک لرزائی معلوم ہوتا تھا ایک بچہ سے نہیں کسی دیو سے کشتی لڑ کر آ رہی ہے۔

”میں ایک دن اسے ختم کر دوں گی۔ میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ عمر قید... میری زندگی...“ جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وہ بل کھا کھا کر مختصر سے کمرے میں ڈھک بھر نے لگی۔ بگڑ بگڑ کر وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں جکڑ لیتی اور پھر خود ہی اس گرفت سے زور آزمائی شروع کر دیتی معلوم ہوتا اس کے دماغ کے گرد بھی کسی نے جال بن دیا ہے ایسے کہ جتنا جتنا وہ زور لگاتی ہے بندش کستی ہی جاتی ہے۔

”مگر اس بچے کا...“

”یہ بچہ نہیں ہے... اس نے بلند آواز سے کہا، ”یہ وہ خود ہے... مجھے آزار پہنچانے بنا کر نہ لے گئے تھے وہ خود جنم لے کر آیا ہے۔“ اس نے اسی ذلت کو کافی نہ سمجھا اور بڑھے ایڑی تلے مسلنے...

”تم پاگل ہو گئی ہو، تم اس کی ماں ہو“

”نہیں، میں اس کی ماں نہیں۔ اگر جنم دینے سے ماں ہو جاتی ہے تو... تو... ہرگز نہیں۔ اگر جنمیل کی بیل سے حقوہر کا پودا لپٹ جائے تو غم اسے بھی حقوہر کہنے لگو گی؟... اگر اس گلدان میں کہیں سے سانپ گھس آئے تو وہ باغی بن جائے گا؟“ اس نے آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں میرے دکھ کو“ وہ دور سے مڑائی اور گلدان ایک غمگین چھناکے سے زمین پر آ رہا۔ ایسا وحشت نده ہو کر ان پریشان کیراؤں کو دیکھنے لگی جو اس میں سے نکل کر چاروں طرف کونوں میں پناہ لینے بھاگ گئے۔

”نہیں، نہیں، یہ نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی اور گہرا گہرا گلدان کے بھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی۔ دشمن کو اس سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اس نے چاہا اسے گھسیٹ کر لپٹک پر بٹھائے مگر وہ بگڑ گئی۔

”اس طرح ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے میں اُسے خاک میں روند کر پھینک دوں گی۔“  
آہستہ آہستہ دانت پیس کر اُس نے کہا۔ اُس کی شکل بالکل مکار چڑیلوں جیسی ہو گئی۔  
شمن کو اس سے کراہت آنے لگی۔

”تم بن رہی ہو ایلیما!“ اس نے عقارت سے کہا۔

”ایس؟“ وہ غصہ سے مڑی۔

”ہاں، تمہیں ایلیما میں مڑا کر رہے، تم جھوٹ بولتی ہو۔“

”شمن!“

”بس اتراؤ مت، مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم اُس سے سامنے اتنی عجیب باتیں  
کر دو گی۔ تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے اور مجھے اونیباری ہو یہ  
دیکھا، محبت؟“ ایلیما پھری۔

”مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ اتنی سی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ تمہیں ردِ کف سے  
شدید محبت ہے مگر اسے جھوٹی نفرت کے بھیانک روپ میں لپیٹ کر دکھانا چاہتی ہو۔“  
”تم!“

”چپ رہو۔ میں تمہیں اتنا کم سمجھتی تھی، افسوس تم نے میرے سارے حسین  
خواہوں کو آج اس گلدان کے دیروں کے ساتھ پکنا چور کر دیا۔ تم بزدل اور دھوکے  
باز۔ بڑی روشن خیال ہو نا جائز کو جائز کہہ دیا لیکن تیل کے بلے ہوئے ڈھکوسلے  
کی آڑ لینے لگیں۔ مجھ سے جھوٹ بول بول کر اپنی عزت اور کم نہ کرو۔ سچ بتاؤ تم نے اپنی  
امانت کو تو ہاتھ نہیں نبا ڈالا۔ بڑی آئیڈیل والی بنتی ہو مگر یہ تمہارا آئیڈیل، تمہارا.....  
تمہارا ضمیر، تمہاری ذہانت، تمہاری امانت کے آگے مات کھاتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے  
کہ تمہیں کبھی بھی سبق سے نفرت نہ تھی!“  
”شمشاد.....“

”دیکو مت۔ تم اس کی پرستار تھیں لیکن تمہاری خود پرستی نے کبھی تمہیں اقبال نہ  
کرنے دیا۔ تمہارا یہ فلسفہ بالکل بے بنیاد اور اُپرچ ہے کہ جسم اور روح جدا ہیں۔ یہ



کیسے ہو رہا ہے کہ سبیل کو تھارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔ بچگی دل و دماغ دھوکا کھا سکتے ہیں مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا، وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے مگر قسم نہیں مانتی کہ تم سبیل سے محبت کرتی تھیں اور اب بھی تمہاری آتما اس کی خواہش میں نہیں یہ سزا دے رہی ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں نہیں آتما اس لیے اس فراق کی جلن تو اس کے بچے سے اسی نام لے کر بھانپا چاہتی ہو اور یہ بھانا چاہتی ہو کہ یہ تمہارا بھی ہے۔ اری دیوانی ذرا غور تو کرو اس

طاقت کے مظاہرے میں کتنی کمزوریاں پوشیدہ ہیں۔  
”مجھے کسی بلاؤں سے بچنا چاہیے کہ چھپاتی ہے نہ ایلیا کی آواز شکست خورہ ہو کر بھرا گئی۔“

”خود پنا۔ ایلیا جتنا تم اپنے آپ سے ڈرتی ہو کسی سے نہیں ڈرتی۔ تم کو خود اپنے سامنے سچ بولنے کی محبت نہیں۔ اس کے علاوہ تمہاری ایک اور زبردست کمزوری ہے جسے تم کبھی تسلیم نہ کرو گی۔۔۔ تم دیسے بڑی مضبوط بنتی ہو مگر۔۔۔ تم سماج سے بھی ڈرتی ہو۔“  
”نہ نہ، تم کہو اور دنیا مارے۔“ ایلیا نے دھوکے سے کہا۔

”تم جھوٹ بہت بولنے لگی ہو۔ زندگی کو جینے میں مت رونا کھا ہے۔ سچ بتاؤ تم نے بچے کا کیا نام لکھا یا ہے اسکو لیں؟“

”رولف۔۔۔ کیوں پوچھا تم نے؟“

”نہیں پورا نام بتاؤ۔“

”کیا کرو گی؟“ ایلیا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”دیکھا باپ کے نام پر کھینچا گئیں؟“

”مطلب کیا ہے؟ یہ میری نجی باتیں ہیں۔“

”بالکل، اور مجھے دخل دینے کا کیا حق؟ معافی چاہتی ہوں، اب کچھ نہ کہوں گی۔“

”اُس کا باپ اس لائق نہ تھا۔۔۔ دوسرے۔۔۔“

”دوسرے تمہارے پاس اُس کے نام کا ٹریڈ کیٹ بھی تو نہیں تھا۔“

”ہاں!“ ایلیا کچھ خوفزدہ سی خاموش ہو گئی۔

”بس اسی کا سارا غصہ ہے۔ آگیں نا اپنی اصلیت پر دکھیا اپنے ایدیل کا حشر ہے۔  
مختصر طری دی رہتے مگر خاموشی اچھائی رہی جس میں درجے میں سہیل دیوں کی نقلی ہوئی سانسوں  
گوجن لگیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا دونوں تھک گئی ہیں۔ باہر درجے میں ہے چاند ایک سدا دل  
کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا اور ہوا ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ رات کافی  
گزر چکی تھی۔ صرف دور، بہت دور جنگلی سیار خواب آلودہ تھپتھپ لگا رہے تھے۔  
”میں ہمیشہ سے بزدل تھیں، جبھی تو سر ایک پر پڑا اگر تھپتھ پڑتی تھیں۔ اور اپنے  
سے متعلق جو تمہارے خیالات ہیں یہ کچھ نہیں سوسنے تمہاری مفروضہ مانتا کے انتقام کے۔  
تم اس جذبے سے زور آزمائی نہ کرو، بُری طرح شکست کھانا ڈالو گی۔“

پلنگ پر خاموش بیٹھی ایلما اپنے ہاتھوں سے کشتی لپٹی رہی۔ اس کے تھکے ہوئے پہرے  
پر کرب اور لاچار دی طاری ہو گئی۔ سادھووں جیسی گمانی آنکھیں بسورتے ہوئے پلوں  
کی طرح درپر طیں۔ سیاہ تھے ہوئے کانوں پر سے لمبے لمبے خاموش آنسو بھلائی نالیوں  
کی طرح رسنے لگے۔ عضلات کی کھینچناں سے اس کا بالائی ہونٹ دانتوں پر سے سرک گیا۔ وہ  
اب بھی اتنے ہی دھاردار تھے مگر زہریے نہیں!

”اس وہم کو دماغ سے نکال دو، ایلما کا سر تھکے سے لگا کر اس نے کہنا شروع کیا۔  
”اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ رولف کتنا پیارا بچہ ہے۔ میں تو کبھی سوچتی بھی نہیں کہ اس  
کی تخلیق میں کچھ سبیل کا بھی حصہ ہے۔ مجھے تو وہ میری پیاری ایلما کا ننھا منا لھو نامعلوم ہوتا  
ہے۔ سنو ایلما۔“

مگر ایلما سننے والی دنیا سے بہت دور گہری نیند میں غرق تھی۔ شمن کی لوری نے اس کی  
برسوں کی اچاٹ نیند کو بلالیا اور وہ معصوم بچے کی طرح ایک ہی تھپکی میں غافل ہو گئی۔ مگر  
شمن کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ آہستہ سے اس نے ایلما کے پریدہ جھکے کیے اور خود جا کر دیوان  
پر لپٹ رہی۔ خیالات کے گھوڑے لگائیں تڑا کر بھاگ نکلے۔

ایک ہی پلٹنے نے ایلما کو بوڑھا کر دیا تھا، ایک ہی پردے کی بینائی میں وہ سب کچھ  
ڈال بیٹھی تھی۔ مگر وہ خم جسم کا وہ ٹھوس پن سر جھانچا تھا۔ شمن نے اپنے جسم پر نظر ڈال۔

چمکتے ہوئے تیار انگوروں کی تیز خوشبو اس کے متفضول میں بھگئی اور اُسے وہ انگور یاد آ گیا جو بہت دن ہوئے ایلیا نے اُس کے گال پر کھینچ مارا تھا تو اُس کا سارا منہ نہا گیا تھا۔ اور ایلیا؛ اُس نے گردن گھما کر دیکھا، جیسے چوسسی ہوئی گٹھلی، اُس نے اپنی کیا گت بنالی تھی؛ دو چار انگور اُپیاں لے کر اُس نے ہونے کی کوشش کی مگر بچے انگوروں کی خوشبو نے اُسے بے چین رکھا۔

اُسے سیل کا خیال آیا جب وہ پکنک میں سوکھی ہوئی پتیوں پر اینڈر لہٹا، اور پھر اُس نے ایلیا کے سر جھانپے ہوئے گالوں کو دیکھا۔ اُس کا جی دکھ گیا۔ چاہا پیچھے سے اٹھ کر ان شبنم میں ڈوبے اور اُس گالوں کو چوم لے۔ سوتے میں وہ ایلیا، جس پر جانتی ہوئی ایلیا ہر وقت بھتی کی طرح فچی پیسے سوار رہتی تھی، گتھی معصوم لگ رہی تھی۔ ابرودوں کا طنز آمیز کھنچاؤ ڈھبلا پڑ گیا تھا اور بجائے اُتار کی دیو داسی کے وہ بالکل معمولی عورت لگ رہی تھی۔ اسکا سیدھا سا داسینہ معصوم مقلد سے بھڑک رہا تھا۔ شاید وہ خواب میں اس بچے کو چوم رہی تھی جس پر بھاری میں خود اس نے اپنے دھم کا پاس بان بٹھا رکھا تھا۔

تبصر اٹھ کر شمن نے رولف سے دوستی شروع کر دی۔ بچہ بلا کا ذہن تھا اور شاید ایلیا کو جالانے کے لیے اُس کی ذہانت چرائی تھی۔ بات کرتے میں وہ بالکل اُس کی طرح بھبھکیں چڑھا کر گہری گہری آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ ماں کا ٹھکرا یا ہوا بچہ شمن سے پورے جوش سے لپٹ پڑا۔ ایلیا کی طرح وہ بھی جھکتی تھا اور جس بات کے نیچے پڑ جاتا عاجز کر دیتا۔ ایلیا خاموش کن آنکھوں سے اُسے دیکھتی مگر محبت جلاتے ایسی شرماتی جیسے بھرے بازار میں لنگی ہو گئی ہو۔ چار سال کی دلی ہوئی گونسل زرد اور بیانی ہو چکی تھی۔

شمن آہستہ آہستہ شرم بھی ٹوٹی۔ بچہ پہلے اعتباری سے بھڑکا اور غصے ہوا پھر پھر ہر دگر مانوس ہو گیا۔ ندی کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ اُٹارے ہوئے طوفان کو جسے برودوں کی روک نے اور بھی شہزادہ بنا دیا، ہو، روکنا انسان کام نہیں۔ دن بھر ایلیا کی آنکھیں چھپے چوری روک کے پیچھے بھاگتیں اور ذرا دور جاتا تو اُس کی تلاش میں بیٹھنے لگتیں۔

جب شمن دو دن چھٹیوں کے علاوہ رہ کر چلنے لگی تو ایلیا اُس سے لپٹ کر رو دی۔ وہ برطی نرم دل ہو چکی تھی۔ ندی کا دھارا جب خشک زمین پر پورے زور سے گرتا ہے تو

اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتا ہے۔ ایسا کی پاسی مانتا ہے یہ محبت کا دھارا  
اس شان سے لگا کہ کوئی بن گیا اور وہ اُس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگانے لگی۔ ماں بیٹیاں  
تک اُسے الوداع کہتے آئے۔ جب ریل چل دی تو شمع نے اطمینان سے سانس بھری۔ وہ  
خوش تھی اُس نے دور رونٹے ہوئے بچوں کا میل کر دیا تھا۔

(۳۴)

گرمی شباب پر تھی۔ معلوم ہوتا تھا سورج گھومتے گھومتے راستہ بھول کر قریب آتا جا رہا  
ہے، دنیا چکرائی جا رہی ہے۔ جرمی نے فرانس کو بھول کر رکھ دیا۔ صدیوں سے آزادی  
کا جھنڈا اُسے کربڑھنے والی جینہ کان میں کوری ڈال کر جھک گئی۔ ادب اور فن کی دیوی  
زہرہ پر نازی عتاب کچھ پھیلا کر ٹوٹ پڑا۔ یہ کسی مجنوں لائن تھی کہ الٹی اپنے پیروں میں ٹیری  
بن کر اُچھو گئی۔ وہ تیکہ جس سے پیٹھ لگا کے نرے سے لپٹے تھے اُٹا دم گھوٹنے لگا۔ غلام  
فرانس کو نازی چنگل میں سسکتا چھوڑ کر آزاد فرانس انگلستان میں جا بیٹھا۔ جتنے ملک  
نازیوں کے پنجے کے نیچے دبے گئے اُن کے آزاد واسے انگلستان میں جمع ہوئے گئے۔ کیا  
ہی اچھا ذہن جو یہ فرزندِ بلندِ دولتِ انگلشیہ، یہ ہندوستان بھی ایک بار اس جان  
چھوڑنے والی ماں کی گود سے چھوٹ کر آزادی کی انگریزائی لے سکے اور اس کے کسی کو  
میں آزاد ہندوستان پیدا ہو جائے۔

اسکول کے ربڑ سے عاجز آکر اُس نے کلب جانا شروع کر دیا مگر وہاں بھی جی  
کچھ اکھڑا سا رہتا۔ سکولِ قلب نہ جانے کہاں جا کر سو رہا تھا۔ عمر بھر تھی بھلتی جیتی جا  
رہی تھی۔ اسی زمانے میں اُس کی ملاقات منصور صاحب سے ہو گئی۔ منصور کھاتے پیتے رئیس  
تھے مگر دل میں قوم کا درد بھرا تھا۔ کھدے پیتے تھے اور شہر میں کئی کھدے کی دکانیں تھیں۔  
اُن کے ساتھ کچھ گاؤں سدھار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا، پُر لطف کانک  
کا فرما لیا۔ زمیندار صاحب خود ترقی پسند تھے اور منصور کے بچے دوست۔ شکار کی عادت  
دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ گاؤں والے تاجر انھیں پھاڑے اپنے مکتی دلائے والوں کو

جوتی درجوتی دیکھنے آئے لگے۔ مارے عقیدت کے بدحواس ہو گئے تھے، جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو کہ سدھار بھی کوئی چیز ہے۔ اس کی ضرورت انہیں کسی طرح محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ جیل سائی کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ احساس بھی ٹٹن ہو گیا تھا۔ یہ کسان، جن کی دولت ہل ہے اور بیل، جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج نکالتے آئے ہیں اپنے پیٹوں کے لیے نہیں بلکہ غاروں میں جھونکنے کے لیے۔ یہ تو بس ہوں کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے میں مکتی ہے۔

لیکن یہ بھولے بھالے گنوار بھی عجیب خصلت رکھتے ہیں۔ یہ بہت جلد ایک مالک سے اکتا جاتے ہیں اور جب ایک رُخ سے ناک رگڑتے رگڑاتے گھس جاتی ہیں تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رُخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں، سمجھی تو ان کی ناکوں میں اتنی گھڑی دھار ہے۔ انہیں رتی بھر بھی تو احساس نہیں کہ جرم پیچھے ٹکاپ کر گھوما تو کیا ہو گا۔ پتے رہنے کی عادت نے انہیں بالکل نڈر بنا دیا ہے۔ انہیں ذرا بھی تو نہیں معلوم کہ جرموں نے انگلستان پر بمباری شروع کر دی ہے۔ سمجھتے ہیں۔ کے عادی نازک طبع کیسے جھیل گئے اس آگ کی بارش کو؟ کیا سال ہو گا ان کا جب انہیں معلوم ہو گا کہ دنیا میں آرام دہ کمرے ہی نہیں سورج کی تپش، برف کی ٹھنڈک اور ہوا کے بلبولے بھی رہتے ہیں مگر یہ ننگے بھوکے فیکر کسی کے نہیں۔ ہندوستان کی دولت اور دولت مند فتح کیے جاسکتے ہیں مگر اس کے سسکے ہوئے گداگر اور ان کے خاموش متنفردوں کوئی ہنسیس جیت سکتا۔

شام کو سرکار کی طرف سے سارے گاؤں کو سرکار کی جیت کی دعائیں مانگنے کا حکم ملا۔ مندروں میں گھڑیاں بھینچنا اُٹھے اور مسجدوں میں اذانیں گونجیں مگر ان مردہ دل کسانوں کے دل خاموش رہے۔ وہ کیا کسی کے دشمن کو کو سیں جو خود اپنے دشمنوں کی دہلاؤ عمری دعائیں مانگتے آئے ہوں۔ رات کا کھانا پیر لطف رہا۔ زمیندار صاحب نے شکار بھیندا لیا تھا اور تازہ کھی لگی روٹیاں موجود تھیں۔ رات گئے ٹمک گراؤ موٹوی بھارا اور صبح ہوتے ہی واپس لوٹ آئے۔ پہلی قسط قوم سدھار کی جیڑی نہ رہی۔

تہائی نے اخبار کو رفیق بنا دیا۔ ویسے اخبار ہر بھی تو گئے تھے دلچسپ۔ یورپ میں جو اکھاڑا جتا جا رہا تھا اس کے بارے میں چھوٹی سی خبر بھی مل جاتی تھی۔ جرمنی کے لیے چوڑے دھانے میں ملک پر ملک پھیلنے جا رہے تھے۔ سرکار کی کلابی افشاں پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ٹھلکے کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا کی بھی خواہ سرکار گھر اعلیٰ تھی۔ اتنے برسوں میں جو کچھ کیا دھرا تھا اس پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔ کسی کا بھر دینا نہیں۔ یہی جرمنی جس سے بیس بائیس سال پہلے حتیٰ پسندوں نے ناک رکھ دالی تھی آج مسرت ہاتھی کی طرح روندنا چلا آ رہا تھا۔

سہ ماہی امتحان سر آگئے۔ نہ جانے یہ امتحانوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا۔ طالب علم اور محقق دونوں کو نیند بھی مار دینے کا آسان طریقہ۔ اور کچھ نہیں بس نیند رہے ہیں دن کی پڑھائی اور کاعز کی ڈھیر اور کاستیا ناس لگ جاتا ہے۔ تکیں بلوینچے کچھ نہ کچھ لیکن ان کا فرض اور اس پر مبنی دنیا تھی کاکام نہ جانے ان نبروں کی لین دین کا مقصد کیا ہے!

امتحان کے کمرے میں چکر لگاتے لگاتے پہنچ گئے۔ اسے پانی پلاؤ تو اسے سیاہی لاکر دو۔ ایک قلم بھلی آئی تو دوسری کا نبٹا پڑھا ہو گیا۔ سارے وقت مسرور چاقو، جاذب ادھر سے ادھر پہنچاؤ۔ یہ عاریتاً مانگنے کی عادت بھی خوب ہے نیچر ہے، لوگ قلم و دات، کاغذ پسل کے ساتھ ساتھ آنکھ کا ان ناک ادھار نہیں مانگ لیتے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو اپنا سارا ان درست کر کے آرام کرسی پر جمایا۔ لینے لیت گئی کہ کب شام ہوا در کب چرطیا بلبل لینے اڑ جائے۔ اس دفعہ گھر کی یاد کچھ زیادہ سنار سی تھی۔ پورا سال گزر گیا تھا۔ نہ جانے گھر کا کیا حال ہو گا اماں کے کتنے ذانت اور لڑے گئے ہوں گے؟ مصنوعی لگ جہا میں تو بھٹی ہو۔ منجھوٹی کے کتنے بچے ہوں گے۔ چھٹا تو شاید لڑکا کا تھا یا لڑکی۔ چار سال کی بابت کسے یاد۔ اور نہ جانے اتنے میں کتنا دکھاں سے کہا نہ بچی ہو۔ منجھوٹی بھی تو لڑکی کی زرخیز منجھلی نے کتنے جنم کر ڈالے چورے کا بچہ نہیں نہ جن سکی۔ اب تو اس کامیال بھی سوکھ کر مر چکا ہے۔

بھاد میں بھی کسی سے کم نہیں۔ میاں سے گھڑی مہر کو نہیں بنتی پڑ پڑوں کا سلسلہ دلا دیر کو نہیں رکتا! خیر آج کل تو بچوں کی ضرورت بھی ہے۔ جنگ کا زمانہ ہے لڑکے پیاسی بن کر گھائل تیار کریں گے اور لڑکیاں ان گھائلوں کی سرچشمہ بن کر رہیں گی۔ نہ جانے اس لڑکے پھوڑا اور مرمت میں کیا لطف آتا ہے انسان کو۔

چپراسی نے ایک تار لا کر دیا اور شمن کے خیالات منتشر ہو گئے۔

”آں ملو۔“

افتخار

بے اختیار دل دھڑکا۔ دو لفظوں نے دفتر کے دفتر کھول کر سامنے بھیر دیے گئے بار پڑھا کہ کوئی لکیر کوئی نقطہ نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ جی جلی گیا۔ پیاسے کے منہ پر چھینٹا اور وہ بھی اس بچل کے ساتھ کہ اور پیاس بھر پڑا اٹھی۔ اسی شام کو وہ بھولاوی روانہ ہو گئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ بہت جلد بھولی گئی۔ پتنگ کی ڈور کھینچ رہی ہے اور قدرت کے ہاتھ کی تھمکیوں پر لڑاتی وہ چرخہ سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے جیسی ہوتی اور زور اور بندھے ہوئے خواب رسیاں تڑا کر طراد سے بھر لے گئے۔ ان چند سالوں کی خشک زندگی نے اُس کے جذبات پر کاروباری سیمینٹ کی ایک تہ چڑھا دی تھی۔ سوائے سادہ بھدی ساری اور بدو وضع جہیز کے اُس نے لباس بھی تو کوئی نہیں رکھا تھا۔ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ فیشن سے پرہیز کر لے تھی۔ اُس کی زندگی مسلسل اُداسی اور خشکی میں ڈوب گئی تھی مگر آج اُسے اُسی محسوس ہو رہا تھا کہ سیمینٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دیباہ پایا کھدے سر اٹھا رہا تھا، مرنے والی ہوئی زرد و کوہل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی۔

گزشتہ چند ماہ میں اُس نے افتخار کو کچھ قسم اور گرم کپڑے بھیجے تھے، کچھ طاقت کی دوا بائیں جیب کا ذکر اُس کے خط میں بے خیالی سے کر دیا گیا تھا اور اپنے ہاتھ کا بٹنا ہٹا سو بیڑ تو حال ہی میں بھیجا تھا۔ اُسے وہ وقت یاد تھا جب افتخار کی کھانسی کے

دھماکے اُس کے دماغ میں گونج اٹھے تھے۔ اُس کے درجہ بے ہوشی بسم کو گورم کرنے کے لیے اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی کھال اتار کر دے دیتی۔ اب تو ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے، اُس نے طے کر لیا کہ اس مرتبہ وہ پوری کوشش کرے گی کہ مقلوڈ اس اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا دے۔ اور اس کے بیک بند کر کے تخیل میں افتخار کی نسوں میں خون بن کر بھاگنے لگی۔ کثرتی ہوئی سرخ پوش دلہن! وہاں کس آزادی سے وہ یک جا ہو سکتی تھی۔ یہ خونی جوڑا پہنے دلہن دے پر اُس کے دل میں ریگ جاتی، پھیل پھیل میں پھیل جاتی اور گالوں کو چومتی ہوئی ہونٹوں پر ناز اٹھتی، افتخار کتنا ہند تھا اُس نے تبھی اُس کا ہاتھ بھی تو نہ چھوا۔ ایک مقناطیس کی کشش سے وہ اپنی طرف کھینچتا ہر در تھا مگر حرف تسخیر قریب کہ جھمی جھمی مدھوش کن آہنچ لگے پر دماغ نہ پڑے۔ اور پھر ڈھیل دے دیا ایسے کہ کھینچنے والا دبر کا کھا کر پرے جا گرتا۔ اگر وہ بھی دست دراز ہوتا اور سبیل کی طرح اُس کا جسم بھی طاعون بن کر چھا جاتا تو وہ گردن پھر کر مٹی اُس کی طرف نہ دھکتی۔ یہ مدھما مہر کا گھر اُس کے اوپر کٹ دیا جاتا تو پھر یہ خفا کہاں سے آتا!

کتنا مقدس تھا ان دونوں کا ناٹ! اس دن الہ آباد کے کیمپ میں جب اپنی رشتہی رضائی افتخار کو سوچی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا کو بھی لپیٹ دیا تھا۔ تنہائی کی اتھک لمبی راتوں میں چاروں طرف سے مہیب آوازیں پکار پکار کر قہقہہ لگاتیں اور کہتیں ”اکیلی“ ”اکیلی“ تو وہ اپنی ٹھٹھرتی ہوئی لادارٹ روح کو نیچے سے دور اس رضائی میں سرکا دیتی۔

اُس کے پاس افتخار کی ایک پرانی تصویر تھی جس میں وہ دو کہیں غیر فانی بلند یوں کی طرف گھور رہا تھا۔ بالائی نصف حصہ روشن تھا اور دھندلے رخ تاریکی میں تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر استقلال ناز رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کا مقطر اُس کا منہ مورتا چاہتا ہے مگر وہ استقلال سے دھارے کے بہاؤ سے متبادلہ کمر رہا تھا۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کے بہت قریب ہوتی۔



ابھی حال ہی میں افتخار نے اُسے چند اشعار بھیجے تھے۔ جلتے جلتے باغیانہ اشعار کے ساتھ اُس کا دل محبت کے شیریں لغمے بھی گا اٹھنا تھا۔ اُن رنگین اشعار میں اُس نے شمس کی اُس بسنتی ساری کو لہرانا دیجھا تھا جو اس کے دل و دماغ پر ایک رنگین خواب بن کر چھا گئی تھی، جس میں مصوّر نے توں قزح کو بکھر کر دایس ایک نقطے پر سمیٹ دیا تھا اور اس دن سے سونی سونی راتوں میں وہ اپنے ٹمگین دل سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کے خوابوں میں نور برساتی آچکی تھی۔ یہ گیت اُس نے اتنی مرتبہ گنگنائے تھے کہ لوح و دماغ پر گہری گہری لکیروں کی طرح کھینچ گئے تھے، کاغذ اُس کے دھڑکتے ہوئے سینے کی نمی سے بھر بھرے ہوئے تھے۔ اسٹول کی اس خشک اور چٹیل فضا میں یہ آبِ حیات کے چند چھنٹے اُس کو نپل کو تازہ دم بناتے رہے جو نا قدری سے مرہا چلی تھی۔ افتخار کے خطوں نے اُس کی لسانیت کو جلائے رکھا اور نہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جس کے رعبے دوسری انسانیاں لرزئیں اور لرزکیاں کانپ اٹھتیں۔ کامیاب معلمہ وہی ہے جو مٹوٹ اور مذکر کے سوال بھول کر لکیریں کرنے کا مسطر بن جائے۔ اقلیدس کے اس غیر شاعرانہ آئے کو دیکھ کر منسی لڑکھڑا جائے، پہرے موڈ ہو جائیں اور کندھے نہ جھکیں، قلم دھڑنے لگیں اور کاپیاں سیدھی ہو جائیں، ہر جہاز طرف فوجی نظام قائم ہو جائے اور قواعد حکمران ہو جائیں۔ مگر ان گیتوں کی دھیمی دھیمی بھپواری نے پورے کو سو گھنٹے سے بجا لیا۔

کسی تہوار یا میلے کی وجہ سے دیر کچھ بچ بھری ہوئی تھی۔ تیسرے درجے میں قیامت جیسی بھپڑ اور غل تھا۔ لوگ مکھیوں کی طرح چھتے کے چھتے بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ریل ڈریٹھ گھنٹہ لیٹ تھی اور بالکل گھریلو حساب کتاب سے چل رہی تھی۔

سینی ٹوریم کے روشن برآمدے میں افتخار اُس کی دی ہوئی رضائی پیروں پر ڈالے اور اُس کا ہی بٹا ہوا سویٹر پہنے بیٹھا تھا اور بہت سے کاغذ اُس کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ نہایت کلاف سے اُس نے شمس سے ہاتھ تلایا۔ یہ پہلی گستاخی تھی جو نہ جانے آج کس رو میں اُس نے جائز سمجھی۔ جلدی سے اُس سے ہاتھ چھڑا کر وہ پاس

ہی بیٹھ گئی اور کاغذ دیکھنے لگی۔

”تمہارے کام کے نہیں“ شمن نے دیکھا وہ ہسپتال کے بل اور نسخے ہیں۔

”کیوں؟“

”کہتے ہیں عورتیں جو بھول تک سے ڈرجاتی ہیں۔“

”میں ان عورتوں میں سے نہیں۔“

”مگر ان میں جو یہاں نہیں اتر رہے ہیں۔“ مگر شمن نے نہ سنا۔

”رہاں بھی وہ نیا بل اور توڑ چکا ہم اسی پچارے پر آنے دوست کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔“ افتخار نے پیار سے بل اور کوڑ سہلایا۔ یہ وہی سو ٹیڑھا تھا جس کے ایک ایک مہندے کے ساتھ شمن نے اپنے ہزاروں سپندوں کو بن دیا تھا۔ کس شان سے اس کے سینے سے چسپاں تھا۔ وہی سوکھا مارا نحیف سینہ، پیارا اور لطیف جذبات کا لب لباب خزانہ جس کے قریب سے ہی اس پر لپکا ہٹے طاری ہو جاتی تھی۔

”مقہوڑا دن کم ہو گیا ہے، یہاں سے جا کر پارسل کروں گی۔“

”دق کے مریض کی چھوٹی ہونٹیں چینیوں کھانا نہیں چاہیں مگر پھل بالکل تازہ ہیں، تم خرد اٹھاؤ۔ مجھے بھی دو۔ چا تو دراز میں ہو گا۔“

”میں اس قدر وہمی نہیں۔ اگر آپ کو مہمانوں کی خاطر کرنی نہیں آتی تو رہنے دیجیے۔“

”اچھا، تو آپ مہمان ہیں۔“

”جی۔“

”ہنہ! اُس نے اٹھ کر میز سے چا تو نکالا اور نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا، جو ہر لمحہ دل و دماغ پر سوار ہیں، خوابوں میں بھی بچپانہ چھوڑیں، نیندیں اڑا دیں موقع ملے تو کیا مزے سے مہمان بن بیٹھے ہیں۔ نفرت ہے مجھے ایسے مہمانوں سے! افتخار نے مصنوعی غصہ سے کہا اور شمن کا دل اچھل پڑا۔

”میں نے ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ تازہ پھل کھانے کا مزا تو حسب ہے کہ انہیں

دانتوں سے بھنبھوڑا جائے اور دودھ کے بجائے چار ہونٹ ایک ساتھ رس چوسیں۔“

افتخار آج شاعری پر تلا ہوا تھا۔

”سنا کچھ؟“

”کیا۔“

”مٹلہ نے کتنے ملک پر پٹ بیسے، اب ان کی باری آئے والی ہے۔“

”تو بڑھے، انسان انسان کو چبائے ڈالتا ہے۔“

”یہی ہوگا، اگر شیر کو بھوکا رکھا جائے گا تو موقع پاتے ہی پہلے اپنے سدھانے والے کو چبائے گا۔ یہ نازی شیر منہ پر ڈھیللا پرٹ لے کے انتظار میں تھا، اب موقع آگیا۔“

”مگر بھارا لو لہند۔“

”گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی اپنا پرٹتا ہے۔ مگر اب ان کا وقت آگیا ہے۔ ان کی دنیا

بھی مٹی کا تو وہ نہ بنا دے تو بات نہیں بہت پس لیا بے گناہوں کو اب ذرا چکی کے

دور گر پڑے خود بھی آزمائیں۔ وہ بھول جو سالہا سال سے یہ اوروں پر برساتے آئے تھے

قدرت نے جمع کیے آتشیں گولوں کی صورت میں انہیں کو لٹا دینے کا فیصلہ کر لیا تو بڑی

کیڑوں کی طرح بلوں میں گھسے ہمارے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھ ہو، ان سے

ہمدردی ہو، ان کے دشمنوں کو کوسیں۔ اسے ہم اپنے ہی دشمنوں کی دمازی عمر کی دھما

مانگتے آئے ہیں، تمہارے دشمنوں کو کیا کوسیں گے۔ مگر نہیں، ہمیں کوئی نہیں جانتا، ہم

بہت جلدی ایک مانک سے گھرا جاتے ہیں۔ اور اب مہٹری نئے فرمان بنا رہی ہے،

نئے سرے سے جھٹے بانٹے جا رہی گے۔ جو لو یا ہے اس کا نتیجہ بھوکنا پرٹے گا۔ اوروں

کے خون سے ہولی کھیلنے والے ذرا خود اپنے خون کی سرخی بھی تو دیکھ لیں۔ اس مغرور

کو بھی مقوڑی سی نکیر ہانی پرٹے گی۔“

”مگر یہ کجبت برٹ سے طاقتور ہیں!“

”خاک نہیں شہی نذر سے خالی ڈنگیں مارتے ہیں۔ ننگے ہیں سر پہ بھی تو چچا جی

کے آگے ماتہ پھیلا رہے ہیں۔ دیکھ لینا ناکیں رگڑ دیں گے ایک ایک ڈالر پر۔ اور

چچا بھی معصوم نہیں۔ چچا جتھے ملی تھکت سے تو یہ راجہ قائم ہیں اور جب تک یہ زندہ

میں بھوکے اور لگوتی رہیں گے۔“

اب اس کے یہ درد نہیں کریں گے۔“

”اگر اسے کریں گے کیسے نہیں، آخر کو بیٹے ہیں۔ روٹی کا پیو پار نہیں ڈالو، ان کا پیو“

سہی۔ وہ میرے چپٹے سے خوف سے خود ان کا پیو لے لیا۔“

دھپٹے کیا رکھا ہے جاپان میں۔ کھجور کوئی پتھر بھی تو ڈھنگ کی نہیں بنا تیرے۔“

”اسے تو تم اس جاپانی مال سے ان کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ دیوانی۔“

تو ہندوستانیوں کے لیے ہے، اگر بہت ہے ان بچاؤں کے لیے۔ تم نہیں جانتیں کیا حال ہے۔۔۔“ وہ جاتے سے صدمہ کے چھلکے کا قیام کر لے اگا۔

”اندر تم دیکھنا آخر میں مزدور کا مچھا ڈرا ہی جیتے گا، اور یہ بچاؤ ڈرا اس بچہ سے

نظم کو بچھنا جو رکر دے گا۔ بے گناہوں کا خون ضائع نہیں ہوا۔ اس خولی سندھ آگئی

ہوئی روٹی چا کر سرخ قوم پیدا ہوگی، سکول کا دامن پک ہو جائے گا، ایک ننگا مہرہ یا

ہوگا، سب سے گنتی شت ہو جائیگا اور دھڑکا ہوگا! اس کا جواب میسجرباس نہیں لیکن شاید

کبھی میں اس کا جواب دے سکوں جو شش کی شدت سے افتخار کا زرد چہرہ بنی اٹھا۔“

”ظلم کے علمبردار آج ہدیہ اور انصاف کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہی جتنی

۵۷ میں کسی حسینہ کی گود میں سو رہا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور شکر فو لادیتے۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ان کی طاقت۔۔۔“

”شیر کے آگے گیدڑ کی بھبکیاں! صفحہ چہتی سے مسٹ جابیٹں گے۔ تم خود دیکھ لو گی۔“

”مگر ہندوستانی کو کیا واسطہ ان باتوں سے ایرپ والے تو ہمیشہ یہی بات سے۔“

بات جوتی پرانہ میں مشغول رہتے ہیں ہم تو کیا ہم تو دیکھتے ہیں غلام کے غلام

”ٹھیک لکھی ہوئی کیا ہم کیوں۔۔۔ میں لائیک اٹھ لیکن تم تو بڑا لڑائی، سو ہم

غلام ہیں اور آقا کے ساتھ بلکہ آقا سے پہلے ہیں اپنے غلام کی پیٹ پیٹ کرانے ہو گی۔

لیکن وہ دن جلد آنے والا ہے جب لفظ غلامی ہمیں لغت میں بھی نہ ملے گا۔ میں نے

تجربہ کیا کس لیے بلا یا ہے۔ یاد ہے وہ کیمپ والا معاہدہ یا بھول گئیں!“

”اتنی کندھیں نہیں ہوں۔“

”معاذِ حق ہے مجھے، جسبھی میں لے سب سے پہلے تم ہی کو چنا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری قربانی کی مالک کو کتنی ضرورت ہے۔ اور تم میں سمیت بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ تم مضبوط دل و دماغ کی مالک ہو۔ بولو کیا دے سکتی ہو؟“

میر سب سے پاس پہنچ گیا۔

جو کچھ بھی ہے ایک ہیسیہ ایک بھونکی کوڑی سنواری جماعت کو غنڈہ کی مزدور ہے۔ چاروں طرف برے میں ہے کام جو تیزی سے ہماری تھا بکھرا جا رہا ہے مگر ڈر ہے کہ رک نہ جائے۔ کانپور سطر سخت مصیبت میں ہے، تمام کاعادات ضبط کر لیے گئے ہیں۔ ہمارے بہت سے کام کرنے والے جیل میں سڑ رہے ہیں مگر پھر بھی جو آزاد ہیں چمکاؤ کی طرح کھنڈروں، کونوں کھنڈروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جانتی ہو سب سے بہتر نیا مکان کہاں قائم ہیں؟“

”خیریں!“

”رندہ لویں کے کوٹھوں پر۔ تم ٹری فیکر ہو رہی ہو کسی شریف عورت میں نہ ایسے ملازمین کو چھپانے کا سلیقہ ہے اور نہ ہمت۔ رندہ لوی کے کوٹھے پر شراب میں دہشت انسان کو کون پہچان سکتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں غنڈہ ہے پر لے دیجھے گا۔“

”لیکن نقشہ کیا ہو گا آپ کے کام کا؟“

”یہ ایک شہر بارہ ماہ ہے۔ میں جو یہاں چکا بیٹھا ہوں کس لیے۔ یہاں کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ میری خیریت پوچھنے میرے سامنے بہ آسانی آسکتے ہیں۔ میرے رشتہ دار... معاف کرنا میں نے تمہارا نام بھی رشتہ داروں میں لکھا دیا ہے، گناہی تو نہیں ہوتی؟“

”بس بیسے مت۔“

”شکریہ، اور غنڈہ کی قلت کی وجہ سے یہاں...“ وہ ایک دم چپ ہو کر کاغذات چھپانے لگا۔

”وآپ میری ہتک کر رہے ہیں!“

”کون ہیں؟“

”جی“

”تو بہت ہے، چہ... ارے بابا کمال ادب پر دو دو مگر ایسی بیڑاھی نظروں سے نہ دیکھو“  
شمن سنس بیڑاھی۔

”تو لایٹ وہ کاغذات“

”مبارے کام کے نہیں، افتخار نے ٹاننا چاہا مگر شمن نے چھین لیا۔ پورے  
دوسو پچتر روپے کا بل اگر داد نہ ہوا تو جو نہیں گھنٹے کا نوٹس۔  
”اب پتہ چلا آپ مجھے کیسا رشتہ دار سمجھتے ہیں۔“  
”تو بھی...“

”رہنے دیجیے، مجھے آپ کے ادب پر اعتبار نہیں۔“

”کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟“

”جی“ شمن نے اس کی دھیمی آواز کی تپش سے پھل کر ربروستی کہا۔  
”کچھ جرم نہ نہیں ادا کیا جاسکتا۔ کان پکڑا کتا ٹھک بٹھک“  
”جی نہیں۔“

”تو سچر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا۔ پوچھ کیا؟“

”نہیں پوچھتی۔“

”چہ... جی چاہتا ہے مالش کی دوا پی کر اس جھگڑے کو ہی ختم کر دیں۔“

”برطے اتھے معلوم ہوتے ہیں بچہ بنتے؟“

”تم مذاق سمجھ رہی ہو مجھ سے دنیا خفا ہو چکی ہے اور اب... اب اس نئی دنیا  
کی خفگی... نہیں تباؤ ایک بیلا انسان لوگوں کی نفرت کی آماجگاہ بن کر کیوں  
تھک سکتا ہے جسے جائے۔“

”تو... پھر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔“

”غلطی ہوئی... بس“ کان کی لوائیٹھ کر کہا ”معاف کر دو۔“

”ایک شرط پر“

”او ہوا کوئی شرط ایسی بھی رہ گئی ہے تمہاری جسے ماننے نہ مانتے کا اختیار میں نے عہد کر رکھا ہے۔“

”جی ہاں، ورنہ یہ کاغذ میرے تجسس سے چھپا ئے نہ جاتے بلکہ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیے تھا مجھے بل پکڑا کر حکم دیتے کہ انہیں ادا کرو۔“

”اوہا!“ افتخار نے ہنسنے ہوئے گلے سے کہا۔ ”اس کا سر جھک گیا اور باوجود ضبط کے آنکھوں میں بھی جھلکنے لگی۔“ لیکن۔۔۔۔۔

”پریشانت؟“

”سنو تو۔“

”جی نہیں۔۔۔ آداب عرض، شمن جل کر اٹھی اور جانے کو مڑی۔“

”بلٹیو۔۔۔ بخدا اس تکھے پن پر کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔۔۔“ افتخار نے ہلکی مہولی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”تم آگ سے کھیلنے کی کیوں اتنی شوقین ہو۔ کہیں خود ایک آدھ چرکانہ کھا جاؤ۔“ افتخار نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ شمن نے سہارا ہو کر واپس کرسی پر گر پڑی۔ ایک دم بے مکی خاموشی چھا گئی جسے دد دلوں کی دھڑکن توڑتی رہی۔

”تو سنو کے چند نوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیے۔“

”میلز قرض رہا، مع سود واپس کر دیجیے گا۔“

”اچھا تو یہ سلسلہ بھی جیتا ہے؟“

”کیوں نہیں، آپ جیسیوں کو کیوں چھوڑا جائے؟“

”جو نہ ادا کر سکا تو؟“

”تو حشر کے دن ایک کے ستر وصول کر لوں گی۔“

”مذاق نہ کرو۔۔۔ میرا کام اور پھر یہ بیماری۔“

”بلکہ اس کجخت بیماری کو چھوڑیے۔“

”میں اسے بہت چھوڑنا چاہتا ہوں پر یہ بھی مجھے چھوڑے۔ مہوٹوں کے لھانوں اور فٹ پاتھ پر سونے کا اس سے زیادہ حسین تحفہ اور کیا مل سکتا ہے؟“ اس کی مر جانی ہوئی آنکھوں میں پھر وہ پرانی سلگتی ہوئی بغاوت چھا گئی۔ ”انتقام۔ انتقام۔ اس کے چہرے کی کمرخت سلیوٹیں لپکار اٹھیں۔ سنبھل کر اس نے دویائی اور سرخام کر لیا۔

”یہ کمبخت جراثیم، قدم قدم پر بریاں...“ اس نے حسرت سے شمع کے تیرے کو گھورتے ہوئے کہا، ”اب کب آؤ گی۔ ویسے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں، تمہاری عنایت کا محتاج نہیں۔“ شمع کا منہ اتر گیا، ”کیونکہ جب چاہوں تخیل کے زور سے گھسیٹ لانا ہوں۔ اور اس وقت نہ تم اتنا جھجکتی ہو اور نہ مجھے جراثیم کا خطرہ ہوتا ہے۔“

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

(۳۷)

واپسی پر اسے ایک تار ملا، ”فوراً آؤ،“ اہلیانے ملکا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ڈاک کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دے گئی تھی، بارادہ تھا بھوآلی سے لوٹ کر سامان لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جائے گی، تار کی دلی دیر سے ملا۔ پھر بھی وہ فوراً روانہ ہو گئی۔ روکف کے بیٹاس نے ایک بندوق، رنگین گولیوں کا ڈبہ اور تھوڑے سے چاکلیٹ بے بیس۔

وہ برآمدے ہی میں تھی کہ بڑھئی آیا نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر روک لیا۔

”اندر جانے کا نہیں! ابھی کر کے سویا ہے۔“

”سویا ہے تو سونے دو میں اسے جگاؤں گی نہیں۔ میم صاحب کہاں ہیں؟“

”اوہی سوتا... اگھا دن ایسا ایسا کرتا۔“ آیا غم کا مجسمہ بن گئی۔ بقیٹنا بڑھیا سٹیا گئی تھی۔ اہلیانے کہہ کر نئی آیا کا انتظام ہونا چاہیے۔ وہ اگلے بڑھئی۔

”بولتا کہ بائی نہیں جانے کا۔“

”کیوں؟“

”کیوں؟ اوہ کیوں؟“ اندر سے مردہ آہوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی، ”کیوں؟“



یہ سب آخر کیوں؟ ” پردہ ہٹا کر ایلما باہر آگئی۔ عجیب وحشیوں کی سی حالت آکھیں  
 مچھٹی ہوئی، بال بکھرے مردے سے بدتر انجاریں جل رہی تھیں۔  
 ” ایلما کیا ہوا؟ ” پہلے تو وہ مچھٹی مچھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ لیکن شاید اب بھی  
 دماغ کی کوئی رگ سلامت تھی۔

” تم اتم آگئیں؟ اُسے بھی لے آئیں... میں نے اُس کے لیے دودھ ابال دیا  
 ہے اور... ”  
 ” کیا ہے ایلما؟ ”

” سچ چہ... بولا تمہارے کو... کیسا پھر نیڑے... ڈاکٹر آوے تبی بے  
 گاہم اُس کو... ” ایلما نے پھر ڈانٹنا شروع کیا۔ ” بائی کو شوک لگ گیا۔ ” اس نے کان  
 پیس چلنے سے کہا۔  
 ” تمہ کیوں لے گئیں میرے روتی کو؟ چلو ادھر لاؤ، بڑی شریرو تمہ... ایلما  
 شرمناکہ مسکرائی۔

” ایں؟ ” شہمن چپکرائی۔  
 ” اُوہو... بندوق بھی لے آئیں اس کی... اچھا کیا... بچا روتنا... ”  
 ” ڈیو تھو گیا ہے بی کا! ” ایلما نے روتی آواز سے کہا اور سر ہلا لے لگی۔  
 ” کیا... روتنا؟ ”

” جھوٹ... بالکل جھوٹ... یہ سب جھوٹے ہیں... دھوکا دیتے ہیں  
 مجھے... میں ان سب پر کس چلا دوں گی... بٹھائیں... بٹھائیں... وہ مارا... ”  
 ہوائی بندوق داغ کر وہ کلکاریاں مارنے لگی۔

” لمونیا ہوئے... تبین روت میں... کھلاں! ” چندھی بچہ جیسی آنکھوں والی  
 بڑھیا اپنی سکرٹھی ہوائی ٹاک چڑھا کر بسو روتی۔ ” اذہنک ایمیم صاحب انیک دم  
 پاگل سری کا ہو گیا۔ ہم بولا کوئی خبر سنی نہیں۔ لیسوسی کا بیوڑا۔ اوتے ہلا لیا۔ پن ہم  
 کو تو دھکا مارنے۔ بے لے۔ جاؤ نہیں مانگتا تمہارے کو... ہم بولا کہاں بی جائے

پہن مانتا بی نہیں... اکیس... بولو کو کون دے رہا ہے اپنا... صاحب بھی مر گیا...  
 ”اور جو باسو میں صاحب ریتا... بولا مسیح یال ان کی... ایک دم کیسے ان کی...  
 ”اؤنہ... ذرا جا کر اسباب از دوا... آیا... شمن نے آیا کی بکواس سے بول کھلا کر  
 کہا اور اٹھیا کو تھسیٹ کر اندر لے گئی۔

”لاؤنا، کہاں چھپا دیا ہے اُس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔  
 ”الیا... شمن کچا جی چاٹا کھینچے لگا کر جی بھر کے دوئے...  
 ”تم بولتی کیوں نہیں؟ دیکھو مجھ سے کوئی چال مت چلنا، در نہ یاد رکھو میں  
 نے وکیل کر لیا ہے اور سب کے ادیر کیس چلانا... اؤ...“ وہ کچھ سوچ کر رک گئی  
 اور منہ پر ہاتھوں کا کٹورا دھک کر پکارا۔  
 ”... یو... آ... یو...“

”آئی میم صاحب!...  
 ”آیا... ہڈیٹ وارٹر مانگتا۔ جسے بی کے واسطے ایک دم اسجیا بننا... گسل بننا...  
 ”کیا میم صاحب بولتا ابلی پی کا گسل کر لیا۔ اب... اس نے ٹانگہ ماسٹر بھر  
 کر کیا۔

”اس کو اینجل پیلی وارٹر کا گسل دیا۔ کیسی...“  
 ”غارت ہو گئی... چلو یہاں سے... اہلما نے ڈانٹا اور تھپٹی اس پر رگڑا یا تھا  
 لا پرواہی سے کھڑی کچی رہی۔ ”ایسا ایسا کیا چلا تا میم صاحب... ہم ڈاکٹر کو بولنے لگا...“  
 ”چپ رہو آبا... ایسا صبر کرو یہ کیا حال بنا لیا ہے؟ وہ پیا سے اُس کے بال  
 مندار نے ہی۔

”تو پھر لاؤ اُسے“ ایسا نے بچنے کی طرح اُس بھری آواز میں التجا کیا۔  
 ”کوئی مانتا... ہم کتنے کٹا بولتا پر... جب بی بی مر گیا تو کیا مونا پر اس کا کھانا  
 ... دے ماری کرتا...“

”تو پھر لاؤ اُسے“

”اب یسوی کی بات کو چھوڑنا بولتا... کیا ہونا ایسے!“

”ہاں...“

”یسو کا گنتہ...“

”بہر چلو... نکلو...“ شمن نے اسے زبردستی باہر گھسیٹا

...جاتا ہونا جاتا تو... پن یہ دیکھنے کا کہ اپنے کو یسو بلاوے تو... اور میں صاحب کو اتنا پتیا کر چھ میٹس... کھڑا باب گنتہ ہوتا۔“ شمن نے دروازہ بند کر لیا۔

”یہ مہیں، اولو بکھلائے دیتی ہے۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟...“

”سب کہتے ہیں ادا چلا گیا۔ تم۔۔۔ گئی ہو؟“

”نہیں۔“

”ایمان سے!، ایسا سمجھ گئی۔“

”یہ دوائی کی پیٹنہ کا... پن کم تو تھا ڈیوٹھ کا کوئی دوائی بی نیں۔ آیا دوا کی شیشی کے پہانے پھر اندر آگئی۔ برطانیہ کو دیکھت ہو رہی تھی اور تنہائی سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔“

”کیسی دوا ہے؟“

”ڈاکٹر تیا... فرسٹ کلاس ڈاکٹر... ہم ڈوائف کا کام کیا اس کے اندر۔“

”میں۔۔۔ چھپے آکھی بگڑا۔ ہم بولا ہمارے کو دیکھا بی نیں۔ بولا آیا تم اب کوئی اور کام کرو۔“

”ہم بولا ڈاکٹر کیسا کام کرتا۔ بولا نرس کا کام ہونا۔ بیبی کا نرس۔ ہم بولا کوئی بات۔“

”نیٹس جبرور سے کرتا۔ بولا یسوی بیبی۔ جو ڈیوٹھ ہونا... ہسپتال میں دور وچ لیبر ہوا...“

”ایسا... ایسا ہنگامہ لکڑی کے مافک ٹیرٹھا بیبی۔“ آیا اپنے چپکے ہوئے پیٹ پر آڑے

بچے کا نقشہ کھینچنے لگی۔ ”اکھا وارٹھ کھلاس۔ ایک دم دوسرا راج!“

”اسے۔۔۔ ہے جب رہ کیمجنت برٹھیا۔ چلو یا بیٹھو میں دوا پلا دوں گی۔ دوا پلا کر

شمن نے ایٹما کو کھل اڑھا دیا اور وہ بخار سے بیہوش ہو کر سو گئی۔

اکوڑ دن ایٹما موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہی۔ نویں روز بخار ٹوٹا کمزوری

دیر تک قیاض رہی۔ دونوں نے بیٹے ہوئے حادثے کا حال جان بوجھ کر نہ ذکر کیا حالانکہ

سارے وقت اپنی احساس رہتا کہ وہ دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ اہلیا نے اسے وجود میں لا کر پالا پالا ساتھ میں شمن کو بھی اس سے کچھ کم محبت نہ تھی۔ گزشتہ دس برس کی چھٹیوں میں دونوں نے بڑے جوش و خروش سے مل کر اس کے لیے تعلیمی کھارے خریدے تھے۔

”ہوں... آنٹی کہو“ اہلیا اسے ڈانٹتی۔

”نیلش... چمن!“ وہ شرارت سے آنکھیں چپکاتا اور دور بھاگ جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے چمن، سن کر اسے اسے صاحب یاد آ جاتے۔ وہ بھی تو ایسے ہی دہمیر تھے اور سر رہی۔ یہ چلیے انسانوں سے خدا کو کیوں اتنا سیر ہے!

جب سے ماں بیٹے میں ملاپ ہوا تھا اہلیا نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ بیچ کی غلاظت کو سمبول کر لپڑے کے سبب اس میں مست تھی۔ اس کی ہزاروں تصویروں پر خود کھینچی اور کچھ انٹریٹیں جن کا ایک کافی شمن کو ملی تھی۔ دور رہ کر بھی وہ اس کی پرورش میں مصروف رہی تھی۔ جہاں کوئی نہ تھا کیا بیا کھلنا نظر آجائے تو فوراً خرید کر یا رسل کر دیتی۔ خاص اس کی خاطر بچوں کی نفسیات پر کت بین پر بڑھیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی اسے دلچسپ پہیلی کی طرح بوجھنے کی کوشش کر کے لطف اندوز ہوتی۔

اور جب تک اس کھلنے کو مٹا دینے کی کوشش کی بال بھی بریک نہ ہوا لیکن جونہی اس سے چاہنا شروع کیا اس کی ہمت کا خون کرنے کے لیے وہ رو پھٹ گیا۔ بخار اتر آیا اہلیا کی وحشت بھی کچھ دب گئی۔ رولف کی زندگی سے ناامید ہو کر اس نے شمن کو بکار لیا تھا۔ اسی نے تو رولف سے مایا تھا۔ سمجھتی تھی وہ اسے موت کے چٹائی سے بھی چھین لے لی۔ کہتے ہیں ناساٹرنیکے بڑے۔ سمجھت جان ہوتے ہیں۔ تو پھر رولف کیوں سیر کے ایک تھوٹکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا؟ کوئی دوسری ماں ہوتی تو نفسی دی جاتی کہ صبر کر و خدا اور دے گا مگر ناجائز بچے کی ماں کے لیے تو کالی ہوئی۔

”اہلیا شادی کر ڈالو۔“ شمن نے سمجھا نے کہ کوشش کی

”نہ نہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لیے۔ تم کیا جانو اپنے جسم سے گوشت

کا حکم ڈاکا رکھ کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اودھشمن وہ دکھ جو اسے جنم دینے میں  
میں نے سہا آج اس کی موت سے دس گنا ہو گیا۔ اُف وہ موت بڑھو کہ دم گھونٹے  
والا دکھ۔۔۔

”شاید تمہارا دکھ اس لیے بہت معلوم ہوا کہ تمہاری پوزیشن اور ماڈل سے  
مختلف تھی۔ اگر کسی کا بچہ خجبت بھر ہی نگہانی میں لہجہ لیتا تو شاید اتنا دشتہ ارنہ ہو۔۔۔“  
”مہو سکتا ہے، ممکن ہے ایسا وقت آئے اور میں اتنا نہ ڈروں۔ بیال ایک  
پروفیسر میرے پیچھے بہت دن سے پڑے ہیں۔ انہیں رولف کا حال معلوم ہے  
بچا رہے اُسے بہت پیار کرتے تھے اور بڑے روشن خیال ہیں۔ ویسے میں ایسی  
بزدلی نہیں جو طمنہ نہ سہا سکوں اور نہ ہی اب مجھے رولف کی ماں بننے میں شرم آتی  
تھی۔۔۔ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتیں۔“

”اس لیے کہ مجھے ڈرتا کہ میں رولف کے ساتھ پھرنا انصافی نہ کر لے سکوں۔ ماں  
بن کر میں نے ڈرائی کے سے سلوک کیے، مگر بقول تمہارے اپنے کو بھول کر اب دوبارہ  
میں یہ بھول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے پھر بھی اسے اتنا نہیں دیا جتنا اس کا حق تھا۔  
ایسا سے رخصت ہو کر وہ سیدھی گھر روانہ ہو گئی۔ اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے  
وہ بالکل غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی طرح اس کی بھی آؤ بھگت  
کی جاتی مگر کوئی خاص جگہ اس کی مقرر نہ تھی۔ یہ دو مہینے کی چھٹیاں وہ اُٹھنے بیٹھنے کے  
کمرے میں گزار دیتی۔ وہ جو گھر کی سہولتیں مہتی ہیں وہ نہ مل سکتیں۔ اپنے حسابوں کو وہ  
بیاہی جا چکی تھی۔

یہ کمرہ بھی بالکل ڈینیگ روم معلوم ہوتا۔ اس کی چیزیں عجائبات روزگار سمجھ کر دیگی  
جاتیں اور بالکل شاد عام پر رہنے کا لطف آجاتا۔ ہزار بندشوں کے بعد بھی وہ خلوت نہ  
لصیب ہوتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ لوگ بھی اسے غرضی رکاوٹ سمجھ کر اپنے  
دلوں پر جبر کرتے اور اپنی عادتوں کی لٹکائیں روکنے کی کوشش کرتے۔ اُس کا وجود بار

بھی گزرتا تو بالکل مہمان سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ قدرتی طور پر اس کا کمرہ گھر بھر میں سب سے  
 غنیمت ہوتا لہذا بچوں کی ساری دلچسپی اسی طرف مبذول رہتی۔ کوئی مہمان آتا تو اسی کے  
 کمرے میں مہمان نوازی کی جاتی، اسی کے پیڑ، لفافوں اور نلم سے گھر بھر کی حاجتیں پوری  
 کی جاتیں۔ دنیا اتنی ترقی کر گئی تھی مگر اس کے گھر میں وہی افرا تفری مچی تھی۔ قسمت سے  
 سب مجاہد ہیں بھی ایسے ہی گھرانوں کی بھی نہیں جہاں کھانے کی میز پر بچوں کے پوتے سے  
 سکھائے جاتے ہیں اور کھانا باورچی خانے میں اکڑا کر دیا جاتا ہے۔ غلغلہ انوں  
 میں اناج کے ٹکے رکھے جاتے ہیں اور انکی پر پودہ ڈال کر غسل کیے جاتے ہیں نشست  
 برخواست کا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں ٹوٹی چار پائیوں، ردی کی سیڑیوں، بے کار بندھوں  
 اور دنگ گاتے اسٹول رکھتے تھے۔ کام آتا۔ الماریوں میں چینی کے برتن اور چائیلٹیاں وغیرہ  
 بھی ہیں رکھی جاتیں۔ جب وہ اتنی گوجارٹو بچہ کر دو چار تخت کرسیاں بیٹھنے کے قابل نکلتی۔  
 جب سے باوا کی پنشن ہو گئی تھی گھر کی ہر چیز درجہ امتداد کے لیے رہ گئی تھی۔ جو انکی  
 بیکار ہو جاتی کوئی ضرورت نہ کرنا اور لاوارست بنا کر کوڑے میں تھج کر دی جاتی۔ ان  
 پنشن یافتہ چیزوں سے گھر بھر ہوا تھا۔ سب کچھ کا گھر کوڑا خانہ بنا ہوا تھا۔ ناگفتہ بہ حالت  
 دیکھ کر اُسے ہندوستان کی عام حالت کا اندازہ ہونے لگا۔ جیسے سرکاری راج میں دفتر یا  
 میں چار پائیاں والے افسر گپتیں مارا کرتے ہیں، میزوں پر دسی بڑے کی چاٹ، ریکڑیاں  
 اور چائے کے خوان لگتے ہیں، سالن اور کئی کئی دھبے لگے اوٹ پٹانگ رجسٹر ہونے  
 دوایتیں، لٹے نب، مرطے، ہونڈر جن سے کچھ سے زیادہ ازار بند ڈالنے کی خدمت  
 لی جاتی ہے۔

ادھر سر برمنی نے دنیا کو خون سے نہلا کر پوتر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولینڈ کا بطورہ تہ  
 ہو گیا، رہ گئی باقی کی دنیا تو کتنے دن کی ہے۔ یہ مثلث بھی پرکار کے ایک چکر میں ہوا اسکا  
 بنا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگ مفاقیں کرتے رہ جاتے ہیں گے۔ ہندوستان ٹوٹے  
 یا سالم ہے، بات ہی یہ ہے۔ اس سالہ دنیا میں کیا کم بھڑ ہے۔ کبھی تو چچا جانتا کوئی بری  
 سی موٹر ہی کے کراسنگوٹے کے برچھے اڑا دے اور اس کے بھی ایسے ہمارے کچھ جاتیں جیسے

برطانی جزائر اور جاپان کے۔

خود اُس کے گھر کو ایک زبردست چوٹ کی ضرورت تھی یہ ایک اندکھا خاندان نہ تھا جہاں کھانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کھانے والے تنگ کر لو پڑھے ہوئے جا رہے تھے۔ امان روز بروز ڈھیللا اور بیکار ہوتا جا رہا تھا۔ بیڑھیاں خطرناک حد تک ٹوٹ گئی تھیں اور سمیٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ کاش اس کنڈر کے کابل باسیوں کو کوئی سائز گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جانتی جہاں اس گھر کی اندھیری پناہ سے آزاد ہو کر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہر چیز کو تخریب کی ضرورت تھی۔

جرمنی نے لندن پر آگ برسانی شروع کر دی۔ جن محلوں کا خون پھوٹ کر شہر شہر سجایا گیا تھا اُن کے کچلے ہوئے دلوں میں مسرت کی ہلکے سے شعلوں کی طرح دوڑ گئی آگ کی آواز آ رہی تھی۔ یہ جو پرست حبسی ادبچی اور جنت حبسی عمارتیں نظر آتی ہیں محبوس کی گھڑیوں کی طرح کبھر جاہلی کی نالاک اندام میں اور پھول جیسے بابا آدم تصانی کی دکان سے پھینکا ہوا مضمون بن جائیں گے۔ جنہیں کتنے جھنجھوڑیں گے اور گردہ فوجیں لگے۔ آسمان سے خدا کا قہر برے گا اور زمین لاد اُگلے گی۔ بڑی بڑی سرطیں رنگستان اور ہوٹل کنڈر بن جائیں گے۔ شہر کا خون چھلکے گا۔ اور یہ سیاہ خون اندھیرا بن کر چھا جائے گا۔

ہٹلر بھی تو آ رہی ہے! وہی آ رہی جنہوں نے ہندوستان بنایا۔ اب پھر وہی آ رہی یہاں آئیں گے۔ جیسے ہندو مان جی دم میں آگ لگا کر لڑکا کو پھونکنے کے لئے اسی طرح یہاں بھی آگ برے گی جس میں سارے راکھش بھسم ہو جائیں گے اور دلوں کو سونے کی مورتیوں کی طرح تپائے ہوئے نکل آئیں گے۔ پھر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے میں پھولوں کے مار ڈالیں گے۔ ہندو مجبوروں کو پھینک دیں گے اور مسلمان ہندوؤں کو سجدہ کریں گے۔ دو بھائی گلے مل کر جی کا غناز کیا کریں گے۔

اس بیماری سے گھبرا کر کیا سب خط اور بیماریوں کے سامنے مغربی اور لاچارہ کی مار

مجھے ہوئے کیرطوں کے سامنے ان پٹاخوں کی کیا حقیقت ہے۔ آئے دن موٹروں ہی سے اتنے کچل کر خاک راہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ راکھ مردہ نہیں بلکہ بن بن ایک بے قرار روح کی طرح برسوں رقصاں سہنے گی اور دنیا کی آنکھ میں کھٹکے جلنے کی کتنی بار یہ ہندوستان کا شہدائے فتح ہوگا لیکن اس کے دکھے ہوئے مفلس دل کسی کے نہ ہو سکے۔ یہ دل ان جی حصاروں کے سیسے میں نہیں جو جاکوں کے دربار میں ان کی اُترن پہننے جاباب ہو گا رہنے بیٹھے ہیں، یہ دل ان سرطانی سبھی جھوٹیلوں میں ہیں جو آریوں کے راج میں ٹپکتی رہیں، مغلوں کی حکومت میں بھی رویا کہیں اندر اب بھی ان میں ان گنت سوراخ ہیں۔ ان پھیلنیوں میں کوئی حال نہیں لگا سکا۔ یہ دل کیا متاثر ہوں گے کسی چوڑے سے جنھیں صدیوں کی ٹھٹھ کر خدوئی، نے بے حس چٹان بنا دیا ہے۔ اب تو انھیں یہ بھی فکر نہیں کہ ٹھٹھ کر سید شاہی جوتی سے زیادہ لگتی ہے یا فرنگی لہڑ سے۔ دکھ کا اثر ہی زائل ہو چکا ہے۔

سیاسی انجینئرز زندگی پر خاموش جنگ بن کر بھاگتے ہیں مگر اس شدت سے نہیں کہ برسوں کی رچی ہوئی معیسی غنودگی سے جگا سکیں۔ جب مغرب ٹینکوں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سے گونج اٹھا ہندوستان نے امنسا کا ڈراما کھیل دیا۔ جی جلائے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گلا پھار پھار جو گائے اور سونے والے افریکان اٹانکل کر کر دے بدل میں۔

اسکول کا میدان بھی سیاسی اکھاڑہ بن گیا۔ آپس میں بحث مباحثے ہوتے پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کو کو سا جانا اور آنسو بہائے جاتے۔ ہندو لڑکیاں دل و جان سے امنسا کی قائل، عیسائی ایسی پریشان گویا اسلام اور ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ اب ان کی صلیب کو بھی خطے میں پرانا آگیا۔ اگر سرکار کا ساتھ نہ دیا اور یہ سفید راج اُڑ گیا تو کیا ہوگا! صرف رنگ ہی کا تو فرق ہے در نہ یہ کالی پٹی بھی سیورج مسیح کی بھیڑ میں ہیں اور ویسے بھی لباس، رہن سہن کے ساتھ ساتھ بچے ماما، پاپا، آنٹی اور سسر کتنی شستہ زبان میں بولی بیٹھتے ہیں۔ ہندوستانی کسی کو اتنی کب ہے۔ خواہ تھیلوں کی شکل کی ہوں مگر ہیں تو فرامیں۔ کالی بکری جیسی مانگوں میں پھسلے ہوئے نیلام کے جوتے ہیں مگر اونچی



ایڑی موجود ہے۔ مانگیس ٹیرٹھی اور نیچے ہوئے گھونگر عین میں مغربی افریقہ کی ہے اگر حساب لوگ کو سندھ وستان سے جانا پڑا تو پھر یہ برا لوگ اور آیا لوگ کو کیا کریں گے؟ بھلا کالا آدمی اتنی اونچی تنخواہ دے سکتا ہے! دو تو بادرجی خانے ہی میں پھسکر مارا کر لیخ اور ڈنر منگل لیتا ہے اور نیچے نائیاں دادیاں پال لیتی ہیں۔ دو چار ریشیں ہیں سودہ بھی الیسا ہی کھولی کر نہیں دیتے۔ دوسرے جب یہ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون آئے پھر؟ میرے اور آیا کا فیشن رہے نہ رہے؟ یہ چرنے کی بات اور کبھی ٹیرٹھی کیر ہے۔ کہتے ہیں گاندھی جی سب کو ایک ایک بکری اور چرخہ بکڑا کر کہہ دیں گے: جادہ سموت کا تو اور دودھ پیو نہ ٹی نہ چاکلیٹ اور نہ لیسٹ!

مسلمان لڑکیوں کو نہ بکری سے دلچسپی اور نہ چرخہ کاٹنے کا شوق، ان کا تو پاکستان الگ بننے والا تھا۔ مع تاج محل، موتی مسجد اور لال قلعے کے ساری پاک دنیا وہ پہلے چاند کے سنگس مزے سے روزے نماز میں غرقِ جنت کی طرف کھسکتی چلی جائے گی۔ کوئی دم میں حصہ بچو، ہٹنے سی والا تھا۔ پتیل کی رپی، توہرپان والے کی دکان پر کھنے ہی لگی تھی، بس خاموش بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

مگر یہ کانگریسی حصہ دینے میں نجل کر رہے تھے۔ اگر پاکستان کی جرس میں سکستان ہما سہستان بھی بن گئے تو چٹاخ سے بھارت درش کٹے بکڑے ہو جائیں گے اور یہ ہمالیہ کے ماتھے پر لٹکا ہوا انکو ناچھو مر موتی موتی ہو کر بکھر جائے گا۔ اور پھر کہیں پاکستانی ادھر سے خان بھائیوں کی دعوت کر کے پھر محمد دغز ندی جیسی چھیر غایاں شردع کر دیں! زمانہ تیزی سے ترقی کا پرچم لے کر آگے دوڑنے لگا۔ جلسہ فی میں نیا جوش پیدا ہو گیا۔ پروگرام بنے، پرجوش نظمیں پڑھنی گئیں، کھانے اور شرابیں اڑیں، ترقی پسند اخبار، ترقی پسند انجمنیں، ترقی پسند ہسپتال اور شاعر پیدا ہوئے اور پورے زور شور سے انقلاب ہونے لگا۔ آزاد زندگی اور آزاد محبت، آزاد موت اور آزاد میدان کے حقوق کی حمایت ہونے لگی۔ پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے زاویے کھینچ گئے۔ ہر وہ انسان ترقی پسند بن گیا جس کے بال بے تنکے اور آنکھیں وحشت انگیز نہ ہوں،

لباس ذرا انوکھا اور رنگا ہوا، ہاتھ میں اچھی کسب جس میں پھونکتی ہوئی نظمیں اور سگتے ہوئے  
افسانے، دہکتے ہوئے مضامین اور لطیف نوٹ، کچھ معصوم یادگاریں اور شیریں مخطوط  
مہوں بات کرتے ہیں کچھ کھوسا چائے، لٹ کیوں سے انتہائی بے تعلقی، قدرے لاپرواہی  
اور سخی سے بات کرے، چھوٹے ہی پیارا کام لینے لگے، مجھ سے زمانہ کپڑوں پر ہاتھ  
ڈال دے۔ پھر ان کو ایسے دیکھئے کہ یا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے، پھر معنی خیز مسکراہٹ  
کے ساتھ بھلنپ جائے۔ ان کی ساخت اور اہمیت پر گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر  
کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابل ذکر لڑکی کا ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش اور جسمانی  
ساخت پر روشنی ڈالے، اس کی لطیف جنبشوں پر ہنسی اور سچے پکا ہور اس کے تمام گزشتہ  
سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد، اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے  
اور سالم بچوں کی تفصیل جانتا ہوں۔ تمام انقلابی روی، ذرا نیسی، امریکی ادیبوں کے  
نام اور ان کے تراجم ازبر ہوں۔ ان کے تراجم پیش کر کے ادب کی خدمت بھی کر چکا ہوں  
لازم ہے کہ وہ خود بھی فنکار ہو، یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو۔ نام کو جوڑ توڑ سے کھسا  
پھرا کر لکھتا ہوں۔ احساس کمتری، جس نے پینٹین اور ہلر جیسے مذہب مدد کیے، بخوبی رکھتا  
ہوں۔ ساتھ ساتھ لازمی طور پر دکھی ہو، بھوکا اور احساس ہو۔ دوستوں کے خرچ سے  
پیٹ بھر شراب اور نفیس کپڑے پہنتا ہوں۔ ٹھٹھائی سے میزبانی پر مجبور کرتا ہوں اور  
ان حسابوں انتشار کی ہو کہ ”جو کچھ تمہارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا... نہیں!“  
یہی نہیں بلکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری  
کا بھی تجربہ رکھتا ہوں۔ مٹی ہوئی عورت، جوتیوں میں مسل پہنی رنڈی کا طر فدا ہونہ و بلند  
شریف زادوں کے جسم میں غور کے گہرے اسی رئیس زادوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجھ و بیت  
کا درجہ پا چکا ہوں۔ والدین کی نا سمجھی اور غلط طریقہ تعلیم کی وجہ سے کوئی دلچسپی نہ حاصل  
کر سکا ہوں۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر مفت پینے اور کالیوں میں گرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔  
ایک اور شاخ بھی ترقی پسندوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ بیچارے جو مجبوراً لمبی چوڑی  
جامدادوں کے مالک بنا دیے گئے ہوں۔ تمام مقابلوں اور انتخابوں میں باوجود کی

سفارش کے ناکام رہ گئے ہوں سمجھ میں نہ آتا ہو کیا کریں، کیسے وقت کاٹیں۔ باب دادا کے بنائے ہوئے محلوں میں جبراً رہنا پڑے، اعلیٰ قسم کا فرنیچر استعمال کرنا پڑے، برطے برطے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں کی شرکت لازمی ہو جس کیسے۔ پیش کے لباس کو چھوڑ کر مغربی وزیوں کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہننا پڑے۔ وقتاً فوقتاً عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اٹلی کے چائے کے سیٹ میں چائے پی کر انتہائی انقلابی ادب اور شعرا کی پرورش کرتا ہوں۔ ان کی ہینافٹ کر کے ان کی بدحواسی سے لطف اٹھائے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں حسین لڑکیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے اور انقلاب کے برسنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا بھی ایکے بل سے نہیں گھسٹے صنفِ نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی نبواس کا خیال نہ کرے۔

یہی وجہ تھی کہ دشمن پر ہر جہاں طرف سے ترقی پسند برس پڑے۔ گو اُس نے اب تک کوئی کارنامے نمایاں نہیں کیے تھے پر نہ جانے اس کی قوم پرستی کی دھاک کبھی ہوتی تھی۔ جیسے چوٹیوں کا مٹھاس کی خوشبو نہ گھونچ جاتی ہیں اسی طرح قومی جذبے کی مہک چھپائے نہیں پھٹی اور لوگ ڈھونڈ ہی لاتے ہیں۔ پہلے روز نوا بزاوہ صمدیچ چند چیلے کارکنوں کے تشریف لائے۔ دیر تک چائے کا بے تکلف دور چلا اور پرجوش مباحثے ہوئے۔ پھر چند روز بعد ہونے والے جلسے میں شرکت کا وعدہ لے کر حضرت مولے نوا بزاوہ صمدی نہایت جوشیلے اور سچیلے جوان تھے۔ بیچارے کو مجبوراً یہ غیر انقلابی لفظ اپنے نام کے ساتھ لگانا پڑتا تھا۔ ورنہ اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں تو کامیاب صمدی ہی کہلاتے تھے۔ دوسرے کوئی انقلابی شاعر تھے جنہوں نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر لٹریچر کے بجائے نرس، ڈاکٹرانی اور اسکول مٹس سے ناکام محبتیں کی تقیاس اور بجائے گھوڑے اور شیر کے ریل اور موٹر کی شان میں فحشیدہ خوانی کی تھی۔ تیسرے ایک پروفیسر تھے جن کی تحریک میں حکومت نے خرب اخلاق قرار دی تھیں۔

وہ نہایت فخریہ بناتے تھے کہ ان کے مضامین پر پڑھ کر لوگ لڑاٹھتے ہیں۔ عربانی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ عورت پر نظر ڈالتے ہی ان کے تخیل میں اُس کے کپڑے دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور نگاہیں سات پردوں کو چپ کر آپا رہتی جاتی ہیں۔ شمس کو بھی یہ سن کر پھر ری آگئی اور اُس کا جی چاہا کاش اُس کے کپڑے ذرا موٹے اور مضبوط تاروں سے بنے ہوتے ہوتے۔

ایک انجینئر تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بیمار تھے چھپ کر انقلاب لاتے تھے۔ مدھی گاؤں کا آمدنی سے عاجز تھے۔ حبیب ناک انگلستان میں رہتے برابر وہاں کے قومی منظر ہروں میں کھد رہیں کہ اور جھنڈا لے کر نکلتے رہتے۔ خاص طور پر وہ ہندوستان سے کھد کی شردانی اور چوڑی دار یا جامنہ لے گئے تھے جو ان پر بے طرح سجتا تھا۔ گو جلوس میں ہوتے اور ان کی روح تنگ مری کے مارے تنگ ہو جاتی مگر اس دن وہ بالسی چٹرنہ پہنتے۔ واپسی پر ان کی لینڈ لیڈر کی گرم پانی کی بوتلیں اور چائے تیار رکھتی۔ وہ خود بیچاری ان انگریزوں کو گالیاں دیتی تھی جو بیچارے ہندوستانیوں کو خدا سے بدراج کے لیے اتنی تکلیفیں دے رہے تھے۔ اسے ان لڑکوں سے خاص ہمدردی تھی جن کی بدولت اُس کی تین لڑکیاں مانا گیری سے بچات اپا کر ہندوستانی رانیاں بن گئی تھیں۔ اُسے کتنا ارمان تھا کہ ان کا لے دامادوں کے کا لے ملک میں جا کر لے محبتوں پر سوار ہو کر اڑد ہوں اور ہر شیر دل کا شکار کھیلے، سرنے چاندی کی رکابوں میں پلاؤ اور کباب کھائے اور کوٹھڑیوں میں بھرے ہوئے سیرے جو اہرات اپنے لے محبتوں سے چھوٹے۔ جسے کے دل کا مریض صدمہ مع چند جیلوں کے آکر اپنی موٹریں اُسے لے گئے۔ مجمع خاصہ تھا اور روداد دلچسپ۔ انقلابی عشق کی پر زور نظمیں پڑھتی گئیں۔ ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں درمت ذہانت اور خنکاری کا محسم بنا جھک رہا تھا۔ نظم کا ایک ایک بند شہ بن کر لیک رہا تھا۔ زوردار مضامین پڑھ گئے جن میں ظاہر کیا گیا کہ موجودہ ادبی عربانی قدیم عربیوں کی تحریک کے آگے صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب باپ دادا اتنے دھمکیاں دے کر کیا وجہ ہے کہ بدلت سچھے یہ جا میں اس ادبی ورثہ کی قدر نہ کرنا محض

زیادہ نام حقودیت کا ثبوت ہوتا۔ اگر کوڑھ بھی باپ دادا سے درختے میں ملے تو کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہیے۔

ویسے تو کئی خواتین موجود تھیں مگر ان میں سے ایک قوم پرستی میں بلند مرتبہ رکھتی تھیں اور کئی نقصانی ان کی ناک تراشنے کی فکر میں تھے۔ حسن پر بجائے حذرزدہ ہونے کے بھینس اور فخر تھا۔ نو بزدادہ کی شمع محبت کا خاص شعلہ تھیں۔ کچھ سنائی نہ پڑا کہ انہوں نے کیا کہا کیونکہ پورے حال میں کھسکھس کر رہی تھیں۔ لہذا ان کے متعلق اڑی ہوئی افواہوں پر سر نافذ نہ مباحثہ کرنے میں غرق تھے۔ ان کے بعد دوسری خاتون آئیں مگر یہ کچھ بھینسی سی رہیں بھاری اس شعلے کے سامنے صورت شکل کے لحاظ سے بھی مٹی کے تیل کی کپی معلوم ہو رہی تھیں۔ ابھی ہوئے پریشان بال اور ہلکی ہلکی نظریں۔ انتہائی چوٹ کھانگی اور ٹیسی صورت نہ جانے انہوں نے کیا کہا مگر مواد یقیناً انقلابی تھا۔ نہ وہ ہاں کی طرف دار تھیں اور نہ نہیں کی۔ ایک سرے سے انہوں نے ہر چیز کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ خود اپنی مخالفت کی مخالفت کر دی۔ لوگ انہیں جیسی اور بدحواس کہتے تھے۔

جیسے کے بعد انہیں صاحب اور کامریڈ محمد کی طرف سے ہر تکلف ڈنر ملا۔ گھر والیں پہنچنے پہنچتے مس شمشاد کئی ہونٹوں پر شمن بن گئیں۔ کامریڈ محمد نے تو کئی مرتبہ اس طرح اُس کے کان میں کچھ کہا کہ اُن کے جلنے ہوئے ہونٹ اُس کے کان کی لوسے چھو گئے۔ انقلابی شاعر مرع اپنے بدلہ دار کپڑوں اور عقاب جیسی بھوکی آنکھوں کے اُس کے قریب آتا رہا۔ جیسے کی تھکن نے ہی تھیک تھیک کر سلا دیا مگر قریب ایک بجے اُس کی آنکھ کسی نامعلوم کھٹکے سے خود بخود کھل گئی۔ چوروں سے اُسے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت تو وہ سنا ہو کا دلی سے بھی کلیجہ کا نپ اٹھتا۔ سمیت کر کے اُس نے زور سے لپکا رہا، کون! کوئی جواب نہ ملا۔ خاموش لیٹ کر بغیر سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالنے سے جسم بھی تن کر معلق سا ہو گیا۔ ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح شیشے پر سرسرا رہی ہو۔

شمن! ہوا سرگوشیاں کرتی اُس کے کان کے پاس رہی، جیسے کسی کی جانی پہچانی

سی آواز اسے پکار رہی تھی۔ مگر یہ آواز تو اُسے بار بار دھوکے دے چکی تھی۔  
 ”شمن!“ اس بار شبہ سمٹ گیا۔ واقعی تو کھڑکی کے اُدھر سے اُسے پکار رہا تھا۔  
 ”کون!“

”میں! ڈرو نہیں، میں ہوں افتخار۔ کھڑکی کھولو۔“  
 ”ایں!“ شمن نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی مگر اُس کا دہم جسمانی صورت میں  
 موجود تھا۔

”آپ؟“  
 ”اندر آسکتا ہوں۔“  
 ”آئیے،“ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔  
 ”مگر سوچ لو، میرے پیچھے خطرہ ہے۔“  
 ”خطرہ!“

”جلدی بولو... تاکہ میں اور کہیں۔“  
 ”آئیے اندر!“ اُس نے جھلا کر کہا اور کھڑکی کے پٹ پھیل دیے۔  
 ”پھر کھیتا نامت!“ اُس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رک کر کہا مگر پھر اندر آ گیا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ شمن نے مصیبتی سے کھڑکی بند کر کے کہا۔  
 ”ذرا سانس لینے دو“ وہ خاموش کورچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شمن بباؤ اور ڈر کر  
 کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ کجنت پھیل چڑھے!“ اس نے کلچر بھینچ کر کہا، ”دو قدم نہیں چلنے دیتے۔“  
 بال بال بچا۔  
 ”کیا ہو رہا؟“

”دہی، دہی... اور کون اس بُری طرح بھگانے کا شوقین ہے۔ زندگی ایک  
 مسلسل دوڑ بن کر رہ گئی ہے۔“  
 ”پولیس؟“

”ایں؟“ وہ چونکا مگر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔  
 ”تمہیں میں نے آج تک نہیں بتایا۔۔۔ اور نامہ بھی کیا۔۔۔ تم گریڈ اسکول کی ہیڈ  
 مسٹرس ہو تمہیں۔۔۔“  
 ”میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے۔ نوکر ہوں غلام نہیں!“  
 ”مگر۔۔۔“

”رہنے دیجئے۔ یہ بتائیں کچھ کھائیں گے؟“ جواب میں افتخار نے اسے ایک بار  
 دیکھا اور خاموشی سے جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شمن باورچی خانہ مٹولنے چلی گئی۔  
 ”جانتی ہو یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اُس نے جلدی جلدی لہجے میں جانتے ہوئے کہا، ”روس  
 کو کھانے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔ یہ پینس کیوں کر داسے؟ روس فن لینڈ سے ڈبک کیا نا کجست  
 یہ دانت نکلوانے پڑیں گے، بیکار ہو گئے۔ یہ امپریسٹل کر روس کو نکلنا چاہتے ہیں۔  
 اگر کہیں پانسہ پڑ گیا تو تیس!“ وہ تخیل میں بھینانک شیلیں دیکھ کر پھر سیریاں لینے لگا۔  
 ”مگر جرمی۔۔۔ جرمی اتنا اتنا نہیں کہ ان کے گھسے میں آجائے۔“ اُس نے جیسے خود  
 کو سمجھایا۔

”مگر پینس؟ اس کا ہتیس کا کیا کریں گے؟“ شمن خود اپنے بچوں جیسے سوال پر  
 جھینپ گئی۔ ”یہ سیاست ہے بھی تو عجیب کھیل۔ گھڑی میں بڑی بڑی اہم سرگرمیاں  
 اور گھڑی میں بچوں جیسی شراکتیں!“  
 ”میں جا رہا ہوں۔۔۔ شمن۔۔۔ مجھے یاد رکھنے کی کوشش کرنا۔ اگر بھول بھی جاؤ  
 مجھے نہ بتانا، میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ نہ جانے کیوں میرا یقین ہے کہ تمہارے  
 جملائے سے جی رہا ہوں۔ نامہ ادبوں میں تمہارا ہی خیال سہارا دیتا ہے۔ اب تو ایسا  
 معلوم ہوتا ہے میں نے تمہاری ہی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ اوہ یہ کیا  
 بک رہا ہوں!“ اُس نے نگاہیں زمین پر گر ڈالیں۔  
 ”کہاں جا رہے ہیں؟“  
 ”کئی سال کے لیے شاہی جہاندارمی۔۔۔“

”مگر کس قصور میں“

”اجنار میں پرہیز لینا، وہی پرانا کیس ہے... کانپور کی اسٹریٹ کے بعد کا۔ چھوڑو  
ان ناگوار باتوں کو... میں ان لغویات سے ہمتیں پریشان کرنے نہیں آیا بلکہ...“  
وہ خاموش ہو گیا۔

”جانے سے پہلے مضبوطی اور ہمت مانگتے آیا ہوں... دعا کرنا کہ کہیں بدھیلا ہاتھ  
ہی میں نہ لپیٹ جائے“ شمن کا گلا گھٹنے لگا۔

”ذرا سی چھال لیہ دو“

”اچھا تو میں جاؤں؟“ مگر وہ کھڑا پس و پیش میں ہاتھ ملتا رہا۔  
”خدا حافظ!“ مگر وہ پھر بھی غیر فیصلہ کن انداز میں پریشان کھڑا رہا۔ شمن کا دل  
بے ترتیبی سے دھڑکتا رہا۔  
”اچھا خدا حافظ!“ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف مڑا اور سست ہاتھوں  
سے پیٹ دوڑ کیے۔

”میں جا رہا ہوں... تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ... ڈاکٹر لوں نے کہہ دیا ہے اب  
میرا مرض خطرناک نہیں رہا... اب جراثیم...“ وہ بری طرح لڑ کھڑا کیا اور ایک  
دم کھڑکی میں سے غوطہ مار کر تارکی میں غائب ہو گیا۔ شمن نے ایک جھبک اُس سے  
متمنائے ہوئے چہرے کی دیکھی۔ وہ آنسو روکنے کے لیے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اُس کے  
نہتے چوڑے ہونٹ گھٹے اور گردن کی گہیں شہرت ضبط سے تھیں۔  
دولوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ خاموش کھڑی رہی، پھر ہلکے پر اندھنی  
گر گر گہری گہری سبکیاں لینے لگی۔

(ختم)

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آگئی۔ دو چار جلسوں کی  
صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصہ لیا لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو



اس کا حصہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لیے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے، ریزولوشن تجویز کرتے، اور تمام کاغذات تیار کرتے اور یہ وہاں جا کر کچھ قلمیوں کی طرح تیار ہوتی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں، وہ بھی ایسے ڈمکھاتے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مرد کا رکو اگر ٹپسل اور گھوٹا ہوا اشد ضروری پر چہ مہیا کرنا پڑتا۔ یہ عورت ذات بھی کس قدر غیر ذمہ دار جنس ہے۔ وہ پھر دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی عین وقت پر لوگ اسے لینے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسچ اسے تیار کرنے کو دی گئی تھی اس کا سرسری طوطا پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

”کیا بتاؤں، بالکل بھول گئی“ بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد مسکرا کر کہہ دیتی۔ یہ اس کا جنسی حق تھا جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنا ہی ضروری مرحلہ ہوا ان کا رویہ نہیں بدے گا۔ بس سمجھیں گی با واجی کا گھر ہے۔ مزے سے بیٹھی ہیں، کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا کیکے باورچی کا قصور، گھر میلا ہوا لوکر دل کا قصور، کپڑے گندے ہوں دھوئی کا قصور۔ کسی بات میں بھی توان کا اپنا قصور نہیں۔ زندگی بن جائیں، سماج کا قصور، دھوکہ کھا جائیں، نسوانیت اور بھولپن کا قصور، لٹ جائیں، چوری چلی جائیں، بھگا لی جاتی جائیں، لوندی بنا کر بیچ دی جائیں۔ سب ظالموں کا قصور!

کئی اصحاب نے اس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ کر چھپو ایٹس۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے مگر اس خشک تحفے کی طرف اس نے اتنی بھی توجہ نہ دی جتنی چاندی کے بندے پاکر ہوتی۔ نئے زمانے کی نئی انجمنوں نے لوگوں کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے سوائے حساس دلوں اور بے چین دعاغلوں کے۔ پہلے دوگ ساڑھیاں، بندے، جھومر، ٹیکہ تحفے میں دیا کرتے تھے، اب اشعار، مضامین اور افسانے حاضر ہیں۔ دولت سے مطلب! سودا پٹانے کے لیے کچھ تو چاہیے۔ کبھی ان سب پر ترس آ جاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے، جوان تھے، خواب دیکھنا جانتے تھے۔ قصور یہ تھا کہ بٹوارے کے وقت ان کے حق میں احساس زیادہ اور وسعتیں کم پڑی تھیں۔ اگر امیر پیسے کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے تو قلم والا قلم کو کیوں رنگ لگائے۔ قلم بھی تو ویسے شمشیر کا توام بھائی ہے، وہ کیوں

نہ ملک گیری کرے ؟

تجوتی کا دن تھا اور فرست غنی۔ ویسے ہیڈ مسٹر اس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں، اُس میں تھا نہ داری کا مادہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ چار استانیوں سے گھما پھرا کر آٹھ لاکھ کامے سکے تو وہ بھی معنوں میں محکمہ تعلیم کی بھی خواہ ہے۔ مختلف تقصیریاں چپکا کر اونیٹا کر زیادہ سے زیادہ بیگار لینا، وقت مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساس کمتری پیدا کر دینا کہ انہیں اپنے دماغ اور قوتِ تخیل پر بھی بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی پس کردہ جانیں مگراف نہ کریں، سارے الزامات ان کے سر بٹھوینا اور سرخروئی اپنے لیے رکھ لینا۔ بد انتظامی، جنگی رٹا کیوں اور نالائق استانیوں کے حصے میں، قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طایامت ہیڈ مسٹر اس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ !

چیر اسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوادیا نہیں مل سکتی۔ ان عورتوں کی آمد بھی کئی قسم کی آفتیں لاتے ہیں۔ کہیں دشمن کی جاسوس تو نہیں کہ جا کر لگائی بھجائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی تو یا تو فیس معاف کر دے گی یا نہ بردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی۔ نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بالاس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنہیں پار کرنا ہیڈ مسٹر اس کا کام ہے۔ جہاں سالانہ امتحان شروع ہوئے اور کمزور اور بد شوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹر اس کی محبت چرائی۔ مٹھائیاں چلی آ رہی ہیں، تحفے نازل ہو رہے ہیں۔ نامقہ پر چوڑے جوار ہے ہیں۔ اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چیر اسی نے آکر کہا کہ عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے، نہیں مانتی۔ ساتھ ساتھ وہ خود ہی آگئی۔ مجبوراً ملنا پڑا۔ برقعہ اتار کر گھر کی طرح ہو بیٹھی۔ ”آپ کس گیتا ہیں ؟“ چھوٹے ہی سوال کیا۔

”نہیں !“

”نہیں تو شاید مسرور رانی ہے“

”جی نہیں!“ ذرا سختی سے کہا گیا۔

”کامنٹی دلیوی؟“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں....“

”تو آپ یقیناً زہرہ ہوں گی... کیوں؟“

”جی... نہیں! مطلب کیا ہے آپ کا؟“ جل کر کہا۔

”وہ یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں؟“

”آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو....“

”راری بہنو کہنا تو بہتر ہے پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو... چہ... اچھا...“

”آپ... اول۔ رہ... دمی... ابے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا... چہ...“

”ہاں سنیم... تسنیم... خدا کی مار اس یاد پر“

”جی نہیں۔ میں نے کہا نا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی...“

”نہیں جی، ایسی بھی کیا غلط فہمی۔ اس حلقے میں تو... یہی نام ہیں۔ اچھا جانے دو،

یہ تباؤ کوئی سن نہیں رہا ہے۔“

”جی نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیے اور براہ کرم تشریف لے جایئے۔“

”ہاں ہاں گھبراؤ مت۔ تشریف بھی لے جاؤں گی مگر... خیر جو کچھ بھی ہو تمہارا نام

خاک پر سے، مجھے کیا، تم اسے تو جانتی ہوگی۔ افتخار احمد کو۔“

”ابن؟“ سنسن سنبھلی سی۔ آئی۔ ڈی سے پالا پڑا، مگر وہ بچہ نہ تھی۔

”مگر نامت، متعین قرآن پاک کی قسم، پاک بچہ تین کا واسطہ۔ دیکھو بہن خدا کو بھی

منہ دکھانا ہے۔ اپنے پیاروں کی قسم!“

”کیا مطلب ہے تمہارا! فوراً چلی جاؤ ورنہ...“

”بیوی مجھے ان گیلڈ رجسٹریشن سے نو دھکا دے مت۔ تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے

اور بھگتا بھی ہے جو ان جملہ نصیبوں میں لکھا تھا۔ پھر کیا فائدہ۔ یہ تو تباؤ اس نے متعین

ماں بنایا تھا یا بہن یا محشوقہ!“

”تم دلیوانی معلوم ہوتی ہو... جاتی ہو کہ پھر...“  
 ”اندازہ سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ... کہ... بہن خوبصورت نہیں پر مائل

غنیمت ہو“

”تم نہیں جاؤ گی؟“

”جاؤں گی کیوں نہیں، پر اپنی کہہ کر اور تمھاری سن کر... تو میرے خیال میں  
 معشوق ہی ہو گی... ڈھنگ بھی بتاتے ہیں۔ اللہ رکھے شرم آگئی!“ وہ طرز سے مسکرائی۔  
 ”تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟“

”کچھ بھی نہیں۔ مجھ اجڑا ہی ہوئی کہ کیا واسطہ ہو تا بس یہی کہ میں اس بد ذات  
 کی بیوی ہوں“

”تم... تم!“

”ہاں میں۔ یقیناً آئے تو لوبیہ ٹریفیٹ دیکھ لو۔ میں جانتی تھی کہ تم بھی کہو گی  
 جھوٹ۔ تو لوبیہ... حسین بی زوجہ افتخار احمد... قوم سید...“  
 تم کیا جانتی ہو؟ انھیں جھک گئیں۔

”لوں کہو... ہاں تو رہن بیاہی ہو یا ماشاء اللہ...“

”تم اپنی کہو... کیا کہنا ہے“

”تو ماشاء اللہ کنواری ہو۔ منہ سے تو یہی نکلتا ہے رنجیب کا حال اللہ جانے۔

آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے“

”بکواس بند کر کے اپنا مطلب بیان کرو“

”تو بہن مطلب یہ کہ تمہیں اس کیرطولی بھر سے کباب میں کیا دکھائی دیا جو رکھ

گئیں۔ برانہ مانا اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو چودہ برس کی عمر سے تو میں اُسے تھکت

رہی ہوں، ایک گھڑی بھی سکھ چین کی گزار ہی ہو تو بارہ اماموں کی مار۔ دلیدار نصیب

نہ ہو۔ تین بچے ہیں... نیر سے میرے گھر میں اتنی عمر گزار دی... باپ کے حقے بھر سے،

بھینجوں کے گوشت کیے، بھاجوں کی پھٹکا دیں سہیں۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا

مکھتا... پر اب بہتر میری... شمن کے ہاتھ پر پھول گئے اس کی ہچکیوں نے  
اُسے حواس غائب کر دیے!  
”میں ہار گئی، پر تم ماشا اللہ ٹیڑھی لکھیاں اُسے جھکت رہی ہو۔ تمہارا اس  
میں قصور نہیں، وہ ہے ہی ایسا۔ خدا کی پٹکار اُس پر۔ صورت نہ شکل، اللہ جلنے  
پر عورتیں اُس پر کیوں لٹو ہو جاتی ہیں۔ اسے اور تو اور لور لورھی لورھی ڈھڈو۔ کوئی  
یڈیا بنا کر کلیجے سے لٹائے لیتی ہے، کسی کا بیرن بنا ہو اسے سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر  
رہا تھا۔“

”تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟“  
”ایسا دلیہ نہ سمجھو۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ کالج میں پڑھنا تھا تمہارا مکھ...  
شمن شاید سے نام تمہارا نام... خوب یاد آیا۔ فوٹو بھی ہے اس کے پاس اور... تم  
جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سن لو۔ یہ جو نواب... میں نا ائی کی  
بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے۔ اور میں ننھی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے تھل بٹے  
نہ پہچانوں۔ اللہ ماریاں اماں بہنیا کے رشتے کو شر ماتی ہیں۔ اسے کام کر دو تو کھلے بندو  
کر دو جب جانیں...“

”خیر... آپ کیا چاہتی ہیں؟“  
”یہ بتائیے آپ اسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟“  
”نہیں!“

”جھوٹ نہ لولو... میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیے گئے  
ہیں۔ یہی نہیں ہیں، معاف کرنا، آپ نے اُس کے لیے بیٹھ کر سویر بنے ہیں، ہاتھ جلا  
جلا کر حلو سے تیار کیے ہیں... اور...“  
”میرے خط دکھا سکتی ہو...“

”مجھے بچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر سے شاید...“ وہ مداری کی طرح تھیلے  
میں کچھ ڈھونڈنے لگی اور خطوں کے بندال نکال کر گود میں رکھ لیے۔

”میں... آپ چھینے کی کوشش نہ کرنا...“ اُس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑا کر کہا اور شمن شرم سے پانی پانی ہو گئی کیونکہ ایک ثانیدہ کو اُس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیوں نہ چھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بیوقوفیاں چھپیں۔ اور... ”یہ... نیلے لٹافوں میں... آپ خود دیکھ دیکھ لیجیے۔“ شمن نے کپکپاتی انگلیوں سے لٹافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی!

”خاطر جمع رکھو... میں نے کوئی خطہ نہیں پرٹھا۔ میرے پیچھے میں کہاں آنا بورتہ کہ چھیلے کے محبت نامے پرٹھوں۔ اور ہنو شروع شروع میں چرائے بھی، پرٹھے بھی، جلائے بھی، پراب تو سب چیزوں پر خاک ڈال دی۔ اسے لکھنے والیاں نہ تنقیدیں پر میں تو مار گئی!“

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ شمن نے بھیگی لب کی سی میاؤں کی۔

”راہی ہنیا میں کیا چاہوں گی۔ تم خود سوچ لو۔“ لینگ پر پالیتی مار کر کہا۔

”یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے اور مجھ دکھیا رہی کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے دیتے! چلو چلو، ہٹی کٹی بھیک مانگ رہی ہو، لو بھیجی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکر ہی کھائے گا، لوگوں کے آگے ہاتھ پیرانے کا۔ کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ سسر کی آنکھیں ٹپم ہو گئی تھیں، کوڑی کوڑی پھونک دی۔ اور یہ کنکال بیٹا میکے میں ٹنچ خود کل کھڑا ہوا۔ دل سے بچے دلائے برس کے برس پہنچ جائے۔ ابھی گئے پہنچے تمہارے پاس آیا تھا۔ رات گئے میں نے اسٹیشن پر کپڑا اور وہ ڈھینگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی پھاٹک کے پاس چھپ گئی۔ جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ تیرے لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا۔ جب وہ تمہاری کھڑکی میں کودا تو میں سنگ تھی۔ وہ تو میں اسی وقت آجاتی پر فائدہ کیا تھا۔ دوسرے سنا ہے یاد کے ساتھ مل کر عورتیں کام تمام کرنے سے بھی ہیدج ہوکتیں۔ وہ تو خاک بچاتا مجھے۔ اس کا بس نہیں جو کلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا، پراب معلوم ہوا اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھر لے کی بیٹی

معلوم ہوتی ہو، آنکھوں میں شرم ہے۔ شمن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی چھوٹے ہوئے ہوتے! "تم کیا جانو اُس کے کتنے سسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ حکومت کو الگ گنگنی کا ناچ بجا رکھا ہے۔ یہ جو بھوالی گیا تھا یہ بھی کوئی چال تھی۔ میں تو خوش ہو گئی تھی کہ اللہ ماما اب تو مرے گار، بلا سے راند ہو جاؤں تو خیر خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں، بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

وہ آپ فرمائیے بھی کچھ... شمن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

وہ اللہ اتنا جو فرمایا تو کچھ بھی نہیں۔ ماشا اللہ اتنے دن باپ کو بھرا مقطورا بہت بچوں کا حق بھی تھا۔ اگر نہیں تو تنہا ہی مرضی۔ تم سے ملی، جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو، شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گئی۔ یہ نہیں کہ سپوڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح لگیں غرے ڈبے دکھانے جس نے کہا ہوش میں رہ کر بات کر و بگم کس بھلاؤ میں ہو۔ پر اسٹے مرد سے آنکھ لگاتے شرم نہیں آتی؟ اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر بخورچی دے بیٹھیں۔ پھر اوپر سے اٹھو تو بند ہی بھی ایسی ایسی نہیں۔ صاف کہہ دیا کہ خطوں کا بندل جاتا ہے سپوڈنٹ کے پاس کہ میاں دو مردوں کے ہنکریاں جڑواتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مزے سے خود اپنی عزت پر ڈاک ڈالوا رہے ہوں۔ آستین میں سانپ پال رہے ہوں۔ بس نکل گئی ساری ہیکڑی، چٹ ہاتھ کے کڑے اٹاؤں سے دینے لگیں۔ میں نے کہا بیوی ایسی کچی گولیاں کسی اور کو کھیلوانا۔ انہیں ہوں۔ البیابھی کیا کڑے لیجاؤ جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھروادو تو کیسی ہو۔ ذرا پانی منگوادو... خدا کی مٹھکا ر حلق بھی تو کسو کھ گیا، شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

وہ جگ جگ جیو بہن، دکھاری کی خاطر داری کا اجر ملے گا۔

یہ میری نیک کی کتاب ہے، یہ بندے اور چوڑیاں... اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آ رہا ہے... آپ کو جو کچھ چاہیے لے جایئے، دیر تک حسدیں بی بیٹھی

لتا ب کے ورق الٹا گئیٹں۔

”کچھ تم نے جنت ہی نہیں کیا۔“

”جو کچھ بھی ہے ہی ہے۔“

”ہوں،“ وہ سوچنے لگی، ”مگر میں تو کل جا رہی ہوں۔“

”آج تو قحطی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔“ شمن نے سولہی آواز سے کہا۔

”یہ بند ہے تو اچھی وضع کے ہیں، بہن لوکان بوجھ لگتے ہیں۔ چوڑیاں دلی کی

بنی معلوم ہوتی ہیں، کیوں؟“

”ہاں،“ شمن نے جبراً کہا۔

”اچھی ہیں، قد سیدھے ایسی ہی بنوائیں گی۔ بن باپ کی بچی ہے، پردہ لکھ لکھنا

جو کچھ بھی کی رہ جائے۔ اُسے تو وہ خدائی خوار بھی چاہو سے ہے۔ یاد سال سوراہے

رے گیا تھا۔ دے کیا جاتا میں نے اینٹھ لیے سوہ زندگی اجیرن کی کہ اگلنا ہی پڑے

دوسرے بڑ بھی دیے تھے کہ ادھیڑ کر چوڑی کے بنا لے، تو میں نے منے اور اسلم کے لیے

بنا دیے۔ انا سا ادن پج گیا۔ خدا کی سنوار ان عورتوں پر کیا دریا دلی سے اس نصیب

کے لیے بنتی ہیں۔ اُن بھی تو مہنگا ہے۔“ شمن خاموش سنتی رہی۔

”اچھا بہن تو میں چلی۔ یہ لو اپنے خط پتر گن لو سنبھال کر۔“

”اور روپیہ۔“

”اب جانے بھی دو روپے۔ میرے آگے بھی کنواری بیٹی ہے، بیری کی طرح

بڑھ رہی ہے۔ بیوی دنیا نہیں دیکھی تم نے، ایسا ہی ہے تو کچھ اوپر پرٹا ہو تو دے

رو۔“ شمن نے بڑھ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیے۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو بنو، باپ دادا کا نام اچھا لے سے

بیا فائدہ! یہ منہ یہ مہا سے نکل رہے ہیں، سرسوں دودھ میں گھس کر لگاؤ، اللہ نے

چا ماچٹی کھا ل نکل آئے گی۔۔۔ تو میں چلی۔“

دروازہ کھلا اور وہ تیز قدم مار تی نکل گئی۔ شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان



بیٹھی خطوں کے لاوارث بندل کو نکلتی رہی۔ تو یہ تھی اُس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمانی،  
چہرہ سی نے اکر تبا یا کھینچنے کا کارانتظار کر رہی ہے۔ اسے آج ایک ضروری لکچر دینا  
تھا۔

”کہہ رہی نہیں ہیں!“  
اور واقعی اس وقت اس کی حقیقت وہ نہیں، سے بھی کم ہو رہی تھی۔

(۳۹)

چونک کر اُس نے دیکھ تو شام کی دھندلی سیاہی کرے کو مختصر بناتی جا رہی تھی۔ دہشت  
ہو کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ یہ بتنی پر وہ کہاں رہی؟ جب حسین بی اُسے چھوڑ کر گئی تو  
خاصی دھوپ تھی۔ تو پھر یہ تین بار گھٹنے اُس کے وجود نے کس طبقے میں ڈوب کر گزارا  
احساسات کے ساتھ اس کا دل نہ بھی سنی ہو گیا تھا۔ نہ ہی نہ جلی مگر دل دھڑکا رہا،  
چھینچھینکے پھولتے پھولتے پھولتے رہے، خزان کا دوران قائم رہا۔ مگر خود نہ سوئی نہ جاگی۔  
نہ ہی اتنی دیر کچھ سنا دیکھا اور سوچا نہ ہی کوئی خواب دیکھا۔ تو پھر کیا کرتی رہی؟  
ضبط کئے تناؤ سے جملہ حواس معدوم ہو کر کسی نامعلوم گہرائی میں غوطہ مار گئے اور  
اب وہاں سے آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے۔ دفعتاً ان کی رفتار تیز ہوئی، جیسے سطح کی  
کوشش برہم ہو گئی اور وہ اُپر کی طرف دوڑنے لگے۔ سڑک پر لالٹینیں جل اٹھیں،  
تانبے آگے بچھے دوڑنے لگے۔ دودھ کیس ریڈ کی سیٹی بھی گونجی۔ گنکر کوٹنے کا انجن دن  
بھر کی جالفتاشی کے بعد بھاری قدموں سے ڈسے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اس کی پھولی  
پھولی سالیس دھونکی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے قبضوں کی طرف جانے والی ٹھنڈی  
لاراں ہانپتیوں کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھیں۔ نئے نئے سڑاؤ نئے کانوں میں شتم  
پشتم گھسنے لگے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ زمین کی سانسوں کو آج پہلی بار سُن رہی ہے۔ اتنی  
دیر مردہ رہنے کے بعد کانوں کے پردے ان آوازوں سے نا آشنا ہو چکے تھے اور بالکل  
غیروں کی طرح پراگندہ ہو کر ہر نئی آواز پر چوٹ کھا کر چڑب اٹھتے۔

تو دنیا موجود تھی! لمبی ہی جاندار اور مٹی کی۔ صرف وہ گم ہو گئی تھی۔ اُسے بڑا دکھ ہوا کہ اُس کی غیر موجودگی سے کچھ بھی تو نظامِ دہم بہم نہ ہوا۔ مشین کے لکھو کھا پرزوں میں سے اگر ایک ننھا سا بے حقیقت پیچ مٹوڑی دیر کو دھنیلہ ہو کر گیا تو مفرک نہیں گیا۔ کچھ بھی تو نہ ہوا۔ جملہ عناصر کی موجودگی میں صرف اس کی خاطر یہ کاروانِ حیات کیوں سُست پڑ جاتا! روزمرہ کا بھیانک انجن تو اسی طرح سیٹھی بجاتا، پڑیاں بدلتا دندنا تا رہا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ امتحان کے لیے دو چار دن م اٹھائے۔ ہاتھ پیر پلا کر دیکھے، ہر ٹکڑا سالم تھا، پرزے چل رہے تھے، کلیں درست تھیں۔ کھوتے وقت تو پتہ نہ چلا، کھٹ سے اچلی کا بٹن دب گیا ہو گا مگر پاتے وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، کس طرح اس کی جھٹکی ہوئی ہستی جھجکتی، شرما تی واپس لوٹ رہی تھی کسی نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی۔ ادب کی وجہ سے کوئی اس کمرے میں آ بھی نہ سکتا تھا۔ اور جیوسی طرح وہ بالکل ہی کھو جاتی؛ تو یہ مودب خادم اُسے ڈھونڈنے بھی آتے، اور شاید ڈھونڈنے بھی تو اتنی دیر سے کہ پانے کا وقت گزر چکا ہوتا۔ یہیں اُس بستر پر رہ کھو جاتی۔ کیرے کوڑے اپنا حصہ بٹورنے پہنچتے۔

مارے دمشت کے وہ کانپنے لگی۔ جی چاہا اُس گھٹے ہوئے ننھے سے ڈبے میں سے بھاگ کر جم غفیر سے لپٹ جائے۔ انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لے اور کہے: ”مجھے خود میں جذب کر لو، چھپا لو۔ چاروں طرف سے گیر کر اس ڈراؤنے اکیلے پی کو مار بھاگاؤ اور اب مجھے نہ کھوئے دنیا!“ اور پھر شاید ان کی زندگی کے مس سے یہ مردنی چھپٹ جائے گی جو اس پر برسوں کی پڑی خاک کی طرح ذرہ ذرہ گر کر جمع ہو گئی تھی۔

یہ اس کے کمرے میں قبرستان جیسی پرانی اور ٹھنڈی بو کیسی، جیسے برسوں سے بند پڑا ہو۔ چڑا سی نے آج لوہان بھی تو نہیں جلایا۔ مگر میرے ایک دم لوہان کی خوشبو سے ڈر گئے لگا۔ اُس کی مردہ خوشبو سے تو یہ کمرہ بالکل پرانی قبریں بن جائے گا۔ وہ کیا کرے؟ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس کے پاس؟ دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ لپ اپنے اس

ٹوٹے پھوٹے وجود کا کیا کرے، کس طرح بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ کر جوڑ دالے؟  
 ”ماں... ماں“ وہ خاموشی سے بکا رہے لگی۔ اس کا جی چاہا سوچ سوچ کر ماں کو بکا رہے  
 اس کاں کو نہیں جو اس کے باپ کے گھر میں بیٹھی اس کی خواہشات کو تسکین پہنچا کر تھی تھی۔  
 اور جس نے اسے جنم دے کر دوسرا جی پیٹ میں ڈال لیا تھا پھر اسے فراموش کر دیا تھا؛  
 بلکہ وہ ماں جس کی پیار بھری گرم آغوش میں گول گول ہو کر وہ روح کی اس مٹھن کو  
 دور کر کے جس کے نرم دنا زک ہاتھ اس کی تھکی ہوئی لکڑ کو سہلا میں اور دیکتی ہوئی آنکھوں  
 کو بھینچ کر اُن آنسوؤں کو نکال دیں جو مٹی جون کے بادلوں کی طرح اُس کی کینٹیوں میں پھنسے  
 ہوئے تھے۔ گرم گرم گوجیسے مٹھن سے کانوں کے پیچھے سے اُٹھ کر انہیں جھلا رہے تھے  
 پر برسنے نہیں دیتے تھے۔

”ٹھنڈو... ٹھنڈو... ذرا دیر ٹھنڈو“ اُس نے خود کو نرمی سے چمکا دیا۔ ”ذرا سی دیر  
 ٹھنڈو، سب کچھ گزر جائے گا۔ یہ دھول بھری آندھی بیٹھ جائے گی، طوفان اُتر جائے  
 گا۔ ایک گلاس پانی پی لو۔... ٹھنڈا ٹھنڈا!“

فرما بزدار بچے کی طرح چل کر اُس نے احتیاط سے ہتھکڑیاں کھولا، برف کے ٹکڑے  
 ہیر دی کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی کزور روشنی  
 انہیں آگینیوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ خود اس کی سانس ہتھکڑیاں کے خالی حصے سے  
 ٹکرا کر ہیر دی کو چومتی ہوئی واپس اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چہرے کے عضلات خود  
 بخود مسکراہٹ میں ڈوب کر ڈھیلے پڑ گئے۔ جان بوجھ کر اُس نے ہتھکڑیاں سے منہ لگا  
 کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنا شروع کیں۔ ٹھنڈی ہوا کی چادریں سی حلق میں اتر گئیں۔  
 ڈرتے ڈرتے اُس نے ایک چمکیلی شفاف ڈلی کو جھوٹا۔ اسے ایک ٹھنڈا بوسہ  
 سارے جسم میں بھجھو کے زہر کی طرح چھڑ گیا۔ اور مہلت بڑھی، انگلی ہٹا کر اُس نے  
 ایک ڈلی کو کچڑ لیا جو مہلتی مچھلی کی طرح زور مارنے لگی، مگر تھک سے اُس نے مچھلی پر  
 ڈال دیا۔ جلد میں سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدی کہنی تک پھیل گئی۔ شفاف  
 ڈلی آنسوؤں میں تیرنے لگی۔ مچھلی کی گرمی سے بے چین ہو کر وہ ادھر ادھر مچھلنے لگی۔ نہ

جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے برسوں کے پیار سے ہونٹ اس پر چپکا دیے۔ اتنی دیر بیکار پڑے رہنے سے زبان بے مزہ ہو گئی تھی سارا منہ کڑوا ہو گیا، جسے کسی نے کچی کچا خون لے کر حلق میں پوت دیا۔ ہاتھ ڈال کر اُس نے مہا گتے ہوئے ٹکڑوں کو مٹی میں مٹھ لیخ لیا اور منہ میں بھر کر چاٹا لالہ یہاں تک کہ اُس کا حلق زبان اور خوراک کی نالی پر بھی مٹھ گئی مگر وہ برفیلے چنے چباتی رہی۔ ڈلیاں ختم کر کے اُس نے گدلا پانی گلاس میں اناڑیا۔ ندی سے شرابی کی طرح وہ ایک ایک جڑ بھر چھوڑ لینا چاہتی تھی۔ مقرر ماس چھوڑ کر اُس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ذرا اوجھاپڑا اور۔۔۔ گلاس ایک شیریں چھینا کے۔ سے اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ ٹکڑے مائل جاندار پر نرندوں کی طرح محیط محیط اسنے گئے۔

وہ پچ پچ بسور دی جیسے کسی نے تھپے سے پتھے کا دو دو لٹہ بھادیا۔ اور وہ اس وقت بہت حساس اور نفیسی بن گئی تھی بچپن اور ماما کے سارے جذبات گلاٹھ ہو کر نہ جا۔ نہ کیا بن گئے تھے غم و غصہ کا جوش سوکے کی اُبال کی طرح فوراً بجھ گیا۔ ایک بار بے اختیار جیڑیا کہ گلاس کے بلور ٹن کڑوں کو بھی ٹھنڈے چوڑ کی طرح چبا کر کھل جائے، مگر کڑی بات کہنے اندر سے ٹوکا اور وہ چڑے ہوئے پتھے کی طرح باگڑا کھڑی ہوئی۔ دانت پس کر اُس نے پوری طاقت سے ٹکڑوں میں ٹھوکر مار کر انہیں سارے کڑے میں بھیر دیا جھکیلے ذرے ہوا میں نیم مرہ چنگاریوں کی طرح چٹخ کر تیز گئے۔

بڑا اطف آیا! جیسے کپٹیشیوں میں اُسے ہوسے بادل ڈھیلے ہو کر اڑ رہے ہوں۔

سے اس نے دوسرا گلاس اٹھایا۔ پہلے روشنی کی طرف کر کے اُس نے آنکھ جھپائی۔ پوندوں کے چاروں طرف توں قزح کی گوٹ، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے رنگوں کے ڈورے دور دور لکھی ہوئی میز کتھی تھی سی بالشتیوں جیسی لگ رہی تھی۔ پانگ اور کرکری بھی اڑے وہ خود بھی تڑاتی ہی مٹی سی ہو گئی، جیسی تو ان چھوٹی چھوٹی کھلواؤں جیسی جیروں پر سوتی اور بھیتی ہے! اور یہ ساری دنیا اس گلاس میں آکر بس گئی ہے۔ وہ خروخوڑے سے کسے میچوں برابر کرتا ہیں مٹن برابر اسٹول اور کپڑوں کی کھونٹی! کیا اچھا ہنر ناجوہ خود بھی تھی سی گریبا کی طرح کرسی پر دراز نظر آتی۔ یہ باریک دنیا اس کی رسائی سے کیوں دور تھی ادھ کس دروازے سے کسے اندر؟ جل کر اُس نے گلاس چھوڑ دیا۔ الماری کھول کر جلدی سے بیاسٹ

ہلکے آسمانی رنگ کے گلاس اس نے ایک ایک کر کے روپلی قہقہوں میں غرق کر دیئے۔  
تو کیا ہوؤں وہ کھلی ادریا سٹپے آئے گی۔ نیلا پیلا گلابی ہر رنگ کا گلاس اور  
پھر ان کے ٹکڑوں کے ساتھ خود بھی قہقہے لگائے گی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ در  
کر وہ ٹکڑوں کو چھپائے لگی۔

”تار ماسٹر آئے ہیں!“ چیرا سی نے کہا۔

”بھگائی کجھت کو!“ اس نے کہنا چاہا مگر خیال بدل دیا۔

”اچی ہوں۔“ اس نے اپنے کھوئے ہوئے رعب کو ڈھونڈ کر کہا۔

جہلدی جلدی ساڑھی کی شکلوں کو ماسٹروں سے دور کیا، چل پہن کر آئیٹنے کے  
پاس گئی، روئے ہوئے شریر کچے جیسے جہرے کو جلدی سے پاؤ ڈر مقبوع کر دھندلا کر  
کر دیا، زاید پاؤ ڈر تو کیر سے پوچھ کر، اس نے بال کنکھی سے اونچے کیے، بائیں آنکھ کے  
پیوٹے پر سے پاؤ ڈر گر کر وہ ایک دم کھلکھا کر منہس دی۔

تار پر جسے ونٹی کی نئی گت کے ٹوڑے لیتے وقت اس کی نظر پر کے انگڑھے پر

پڑی۔ خون سے ڈر کر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔

دو ٹھوکر لگاتے وقت مضبوط ٹوکا جوتا پہننا چاہیے۔ اس نے خون کو فالین پر گر دیا

سونے سے پہلے اس نے دونوں دروازے احتیاط سے بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔

کھڑکی کا پردہ بھی کھینچ دیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ دبے پرینگ کے پاس آئی۔ آہستہ  
سے بستر گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا۔ چھت کا پنکھا کھول کر چیت لیٹ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی  
خاص خنوں میں جھکنے کی عادی سیدھے فرش پر لیٹنے لگی۔

”نہیں... نہیں ہر جم مٹا دیا جائے گا۔ اس لہریے کو سیدھا ہونا پڑے گا۔“ اس

نے حکم دیا اور ایسی گہری نیند میں ڈوب گئی جو بھروسوں سے صرف آرزو بن کر رہ گئی تھی۔

(۴۰)

کے قہقہے کی طرح کھنکھاتا رہتا ہے۔ خبروں کا وقت نکل چکا تھا، ریڈیو پر

کوئی دھیسے سروں میں کسی تازہ دم ماگ کا الاپ کر رہا تھا۔ اطمینان سے چائے کی پیالی ختم کی اور صبح کا اخبار اٹھالیا۔

جرمنی نے روس پر قبضہ کر لیا۔

وہ جلدی سے نیکے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور دوبارہ ان موٹے موٹے حروف کو پڑھا جو تاریخ کے ماتھے پر خونی لیکروں کی طرح کھینچے تھے۔ اُسے حسین بی کو دیکھ کر اتنا تعجب نہ ہوا تھا جتنا اس خبر کو پڑھ کر ہوا، مگر نہ جانے وہ کیوں مسکرا دی۔ خبریں اگر نئی صورتیں اختیار کر کے آئیں تو انسان مسکرا ہی پڑتا ہے۔ کل تک روس اور جرمنی گلے میں باہنیں ڈالے ایک دوسرے کو چمکا رہے تھے اور آج یہ جو غم پیراز شروع ہو گیا ہے شہر تو تھا مگر اتنا قریب نہیں۔ ۲۷ جولائی بھی تاریخ میں یادگار ہے گی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ روس کس علاقہ کسی اور کی سلطنت کو بھی تاراج کر دیا گیا تھا۔ آلے والی پود اس تاریخ کو رٹتے وقت اس سلطنت کی شکست خوردہ رانی کے خواب بھی واقف نہ ہوگی مگر پھر بھی یہ دن کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے دماغ میں بسا رہے گا اور اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلی ہوگئی۔ جو کچھ بھی کیا بیٹلر نے ٹھیک کیا، در زیادداشت کے لیے اُسے اپنی ڈائری خواب کرتی پڑتی۔ اس حسین خوابوں کی ڈائری میں یہ دھبہ کتنا بدنام معلوم ہوتا!

اوسے اُسے اٹھنا چاہیے۔ دکانیں کھل گئی ہوں گی۔ جنگ کا یہ نیا رخ ضرور قیمتوں پر اثر ڈالے گا۔ جاٹے! اماں بھی اگر خرید لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ فوراً اسکول کی لارمی میں بازار چل دی۔

آج اُسے ذرا شہخ رنگ پسند آ رہے تھے۔ اس دن نہ جانے کس سے کہا تھا کہ سانوسے رنگ پر گدلا بنرنگ بہت زیب دیتا ہے، کاسنی نفاست کا پتہ تھا ہے اور سُہرا شاہی کہلاتا ہے۔ جاسی فیتے آگے چل کر ضرور منگے ہو جائیں گے ساٹھن بھی چوڑھ رہے ہیں۔ دو کوٹ جلد ہی بیکار ہو جائیں گے ہر چیز دینی خریدنی چاہیے۔

باقی چند منٹے سلیط، کٹہری اور...

پٹ میں اڑ گئی۔ اُس نے ایک خاتون کو رو بہ پہل روغنِ ناخنوں پر حیرتِ صائے دکھا تھا۔  
کالے سیاہ ہاتھ رادوں کی بہن جیسے خوشخوار لگ رہے تھے۔ سیرِ باقی کے چار پانچ رنگ  
اسے پسند آئے۔ ٹینی ردی ہوتی ہے، بلیک میجک کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مگر میکس  
فیکٹر کا پورا اسٹ کیا برابر رہے گا! عمر میں پہلی مرتبہ ایک ماہ کے کل خرچ کے برابر  
روپیہ اس کے انہیں لوازمات میں جھونک دیا۔ سنگھار میں دیسی بدلیسی سب چلتا  
ہے اور کپڑوں میں بھی کون پوچھتا ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ پہلے کا خریدنا ہوا بڑا ہے۔ ترقی  
پسند بننے سے پہلے کا ہے۔ جلانا بھی بے وقوفی ہے مجبوراً بہن ہی ڈالا جائے۔

بغیر آستین کے بلا ڈز میں کتے ہی فائدے ہیں۔ کپڑا کم، گرمی کم، اور آرام زیادہ۔  
جاڑوں میں بھی کوٹ کے نیچے بہن تو نہ کندھے بہت نہیں پھوکتے، باد و دُلوں کی عالت  
نہیں اور جلد بھی دورنگی ہے، گھنٹی تک گرمی اور جہاں چھپی رہی وہاں ہلکی۔ ٹھیک ہو  
جائے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ نیا نیا سیکھتا ہے تو بلا سے کر کیا لیں گے!  
دہی کا مریڈ صمد کی پانچ سیٹ جس میں ہمیشہ دم ٹھٹھاتا تھا آج ضرورت سے زیادہ  
وسیع معلوم ہوئی۔ ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف شاعر انقلاب پھر بھی کافی جگہ  
تھی۔ اور اسے خدا بھی اعتراف نہ پہنچا! جب وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کی سگریٹ  
جلانے یا کسی اور بہانے سے اُسے دونوں طرف بھینچنے لگتے۔ ان کی گرم سانسیں گردن  
اور بازوؤں کو سینکٹیں یا ان کی بکلی پسند لیاں اُس کی ساری سے ٹکراتیں تو وہ بالکل انجیل  
بن کر باہر دیکھنے لگتی، ایسے کہ اُس کے دونوں رخِ حسین زاویے پیش کر سکیں۔

ساتھ کی صدری میں یہ بڑا عیب ہے کہ آنچل بہت مھسکتا ہے اور انقلابی  
شاعر کی آنکھیں لٹو کی طرح ناچتی ہیں۔ صمد کی گردن میں بار بار کیا چیز زنگتی ہے کہ  
جسے مٹالے کے لیے اُسے اپنی کہنی شمش کے پہلو میں اڑانا پڑتی ہے۔ اور شاعر کی  
رادوں میں کھجلی ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم سے زیادہ قریب بٹھینے والے کے جسم کو کھجا  
التا ہے۔ آگے جھبک کر وہ پروفسور رحمان سے وقت پوچھنے لگی۔ گو کامریڈ اور شاعر  
دونوں گھڑیاں باندھے تھے مگر رحمان کے سر پر جا کر نئے قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

جلے میں زور شور کا مباحثہ رہا مگر سب کچھ بول کھلاٹے سے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسے برا کہیں اور کسے اچھا۔ جتنے منہ اتنے بول۔

”بیوقوف ہے، روس کو چاہیے تھا جرمنی سے مل کر امپیریلزم کا خانہ کرتا۔“  
 ”دکھاوے کی ہے، لڑائی، لڑادی ہے دشمنوں نے۔“

”نہیں جی خبر سچی ہے، پڑوس میں رات بھر گورے خوشی سے ناچتے رہے۔ اپنی بلا دشمن کے سر سے پڑنا دشمن ہے۔ اب دیکھو جرمنی کے ساتھ مل کر خود بیٹیں گے اسے۔“

”ارے آج تو یہ امن کے ٹھیکے دار درونی چڑھا بیٹھ گئے۔ برسوں کی مراد برائی۔“

”نہیں جی روس کا ساتھ دیں گے، عملانہ سہی زبانی ہی سہی اور خود چمکا دے گی طرح دور کھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کریں گے۔“

”آخر میں پٹے ہوئے روس اور جرمنی کو سب مل کر بانٹ کھا دیں گے۔“

”فی الحال تو یہ روس کی طرف داری کریں گے اور کرنا بھی چاہیے۔ روس کی موت

انسانیت کی موت ہوگی اور معلوم ہوتا ہے انسانیت کا بڑھا پیا آن پہنچا۔“

”زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے روس کو پٹنے میں۔“

ادھر سواستکا لٹو کی طرح گھومتا اپنا دائرہ بڑھاتا رہا ادھر شمشاد نے بڑے بازی

شروع کر دی۔ آج کامریڈ صمد کی موٹر میں کل انجنیئر صاحب کے ساتھ ایک دلی شاعر کے

شعروں میں رچ کر کسی بوسیدہ سٹور ان میں تو دوسرے دن پر دفیسر رحمان کی نیم

تاریک لائبریری میں ایک ہفتہ سپرنٹنڈنٹ کے شیمے میں تیتروں کا شکار تو دوسرے

ہفتے ہنر کے کنارے تھی سی چھو لاری میں کافی کے گھونٹوں کے ساتھ اویچے اُنچے

تھپتھپے نمہ بڑی ڈرپک ہو گئی تھی۔ کم خوری سے جسم بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ انگلیاں دراز

اور لوچدار ہو گئی تھیں اور بیروں کے چوڑا نکسہ ذرا اسی دور چلنے سے ٹخنوں میں ٹیسیں

اٹھنے لگیں اور مسلنے سے اتنی گدگدی ہوتی کہ وہ اپنے روغنی ناخنوں سے میچا کے

ہاتھ کی کھال اتار لیتی۔ کامریڈ صمد ان گہرے نشانوں کو تنہائی میں چومتے تھے۔ انقلابی

شاعر نے ان ننھے ننھے گڑھوں کو کندہ میس سے تشبیہ دی تھی جہاں ان کا اداس دل شام



کی تنہائیوں میں ڈوبا اچھلا کرتا تھا۔ انجینئر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نشان، بہت  
 دن بعد جب زندگی انہیں ایک دوسرے سے بہت دُور بٹھکا لے جائے گی تو، صحر  
 میں گرے ہوئے ڈھانچوں کی طرح کسی شاندار کارروائی کی یاد دلائیں گے۔ پروفیسر  
 ادیب تھے اور ان کے ہر جملے سے ادب ٹپکتا تھا۔ وہ انہیں ایک گمراہ روح کے قدموں  
 کے نشانوں سے تغیر کرتے تھے۔ کہاں کہاں پہنچ چکے تھے یہ اچھوتے چھاپے نگاہ تخیل  
 بھی تو ان کا پیچھا کرتے کرتے بٹھک جاتی تھی۔ دورانِ خون بھی اپنی گرمی سے انہیں نہیں  
 پگھلا سکتا۔ یہی سارے کھرپٹے ان کے دل و دماغ پر بھی تو کھینچے ہوئے تھے۔ مرنے کے  
 بعد ان کی ہڈیاں بھی ان داغوں کی گواہی دیں گی۔ وہ ان سب سے بے تکلف تھے۔ وہ اُس  
 کے کمرے میں بغیر اجازت گھس آتے، پھر اُس پریشانی پر جھینپ جاتے۔ اس کے ستروں  
 پر مہینوں کا طرح کلیلیں کرتے۔ مذاق میں اُس کی ساڑھیاں اوڑھتے۔ اس کی چوڑیوں  
 سے جوا کھیلے۔ ایک ایک چوڑی دس دس روپیہ کا ٹوٹ بن کر ایک جیب سے دوسری  
 جیب میں جاتی۔ اُس کے کپڑے ناکوں سے پھینچ کر اس کی غصہ منہ خوشبودار داغوں میں  
 محفوظ کر لے جاتے تاکہ اس سے بچھڑ جائے کے بعد وہی خوشبو سنو گد کر اُس کی یاد میں  
 بے چین ہو سکیں اور گھر سے زمانے کی یاد تازہ ہو جائے۔

اپنی گھنڈاڑی بچیدہ کالکس اس نے کتنی ہی تراش کر اُن کے سینے کے تعویذوں کے  
 لیے دے دیں، یہاں تک کہ اُسے بالوں کے لندڑے ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔  
 جہاں کہیں اُس کی چوڑی ٹوٹ جاتی تہرک کی طرح بانٹ لی جاتی۔ اشعار میں آند کے  
 لیے شاعر انہیں ہونٹوں پر لپٹک کی طرح پناہ کرتے اور گوہر منظر بے رنگ رہتے  
 دل و دماغ قوس قزح کے رنگوں میں ڈوب جاتے۔ جوڑے کے پھولوں کی آمادہ  
 پنکھڑیاں، میلے رومال اور ایسی ہی ایک غیر شاعرانہ دماغ جو کو اہنیاں نظر آکھ دلی  
 چیزیں کتابوں میں نشانی کے طور پر رکھی جاتیں۔ نہ جالے اُس نے کتنے ہی لال، سفید اور  
 پیلے پھول لوگوں کو اپنا کنوارا تحفہ بنا کر دے دیے، کتنے ہی سید اور شربت کے  
 گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چوسے۔ مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔

انتہا کرنے اُسے ایک نایاب نسخہ سکھایا تھا۔ اگر شیر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو۔ حکومت کمزور ہو تو بھوکا رکھو۔ جو کشتی کے سفید کپڑوں کا لوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھوک کی پالیسی کی بدولت۔ نکتہوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پر طے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھائے والا لقمہ کا مزہ دوبارہ نہیں یاد رکھتا۔ حلق سے اتر اسو گیا۔ پس ہونٹوں تک بات کر د، حلق سے دور!

وہ اُن سے اوندر سے سیدھے کام لینے سے بھی نہ چوکتی۔ رات کو دس گیارہ بجے اُسے یکایک ناریل کے خوشبو دار تیل کی ضرورت ہوتی، موجودہ تیل یا بدبو دینے لگتا یا جی سے اُتر جاتا، وہ اسی وقت انہیں موڑ میں دوڑاتی۔ پٹرول کی قلت کے باوجود اگر جوہی کی خوشبو کا ناپسند ہوتا تو واپس کر داکے ہولسری کی مہک کا لاتے اور گورنمنٹ سے ضروری کاموں کے نام سے پٹرول لیتے یا پھر کالا بازار چوٹ کھلاتھا۔ نئے رنگوں کی جارجٹ کی تلاش میں، سفید دلی ٹکے تک پہنچا کر دیتی۔ اس کے علاوہ اُن سے ٹیکوں کے غلابا بدلاتی، لگے جھٹکواتی، پردے نکلواتی، ننھے سے ہیر پنا سے شلواریں کر بندر لواتی اور اُلجھا ہوا اُون سلجھائے کو دے دیتی۔

سر میں تیل سوانے شاعر کے کسی سے نہ ڈلاتی کیونکہ: خیں چپی کرنی بہت مزے کی آتی تھی۔ ساتھ ساتھ کدھرے بازو اور کمر بھی بڑی اچھی دے تھے۔ وہ انہیں اس معاملے میں چھوٹی موٹی محدود رعایتیں بھی دے دیتی۔ اور کنگھی کرتے میں جب وہ ہریال کی شان میں فی البدیہہ آزاد نظر کہتے تو وہ حیرت مند وہ ہو کر داییں گال کے تل کے قریب جھٹکلیا کا روغن ناخن رکھ کر مٹیجھ جاتی۔ اسے آئیٹے میں بغیر دیکھے اس تل کے پاس ناخن پہنچانے کی مشق ہو گئی تھی، اس صفائی سے کہ چھپ نہ جائے اور یہ حرکت بالکل غیر اداری معلوم ہو۔ اگر وہ کسی سے جل اٹھی تو شاعر پر اپنے لاڈ کی بارش شروع کر دیتی۔ وہ بے چارے سب سے کمتر سمجھا جاتا تھا لہذا اس کو یوں چڑھتا دیکھ کر لوگ ضبط کے دائرے سے پھسل پڑتے، لیکن اگر منظر بہت دور سے پڑ جاتا تو وہ لبوڑنے والے کو منالیتی۔ باوجود ان مظالم کے اُس نے ہر ایک کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ انتہائی درجہ

کلبے رحم، سخت دل اور غصہ ور ہے، جب چلبے بیماری کا دل توڑ کر دلا سکتا ہے۔ لہذا وہ سب یہی شیخی مارا کرتے تھے کہ جب چاہیں اُسے تڑپا تڑپا کر دلا سکتے ہیں۔ اور یہ تھا بھی ٹھیک۔ ذرا سا کنپیٹیوں پر زور ڈالتی اور آنسو چھلک پڑتے۔ سب کا یہی قول تھا کہ اُس کی آنسوؤں میں تیرتی ہوئی آنکھیں بالکل جل پڑیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور جب روتے روتے اس کا بُرا حال ہو جاتا تو وہ خود بھی رو پڑتے۔ پھر دو محبت بھرے دلوں کے آنسو ایک ہی دھمال میں جذب ہو جاتے!

جو اصول اُس نے بنا رکھے تھے اگر کسی بے صبرے نے توڑنے کی ہمت کی تو وہ ایک دم باسی مار کی طرح اُناڑ کر پھینک دیا گیا۔ اگر چاہتے ہو تو جتنا ملتا ہے کچھ سے لگاؤ اور صبر کرو، نہیں چاہتے تو ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سدھا دو۔

کون کہتا ہے کہ بے پیسے نشہ نہیں ہوتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جو صرف سوکھ کر مست ہو جاتے ہیں، بعض اور دل کو بتیا دیکھ کر جھوم لیتے ہیں، کچھ ایسے ہیں کہ شراب و کباب کے اشعار پڑھا کر ہی مدہوش ہو لیتے ہیں۔ یہی حال جنسی زندگی کا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں قصے کہانیوں ہی سے چین پڑ جاتا ہے۔ چند کندھنوں کو قصو بیروں اور فلموں سے مدد دینی پڑتی ہے۔ اور اچھے بھلے تجربہ کار بھی ان چیزوں کو ہلکھ کر نہ جانے کون سی بچی ہوئی ضرورت پوری کرتے ہیں، تو بس یہ لوگ بھی اسی ٹیٹھے کے متھے جو پانے کی امید میں گمنڈل لیے دروازے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ کچھ خوب جانتی تھی کہ وہ خواہ انہیں کتنا بھی آلو نالے آج یا پھر کبھی وہ خود اپنے منیر سے بھی اپنی بے وقفیوں کا اعتراف کیا کریں گے۔

مگر ایسے لوگوں کو ٹھکرا دینا برطمی حماقت ہے۔ نا اُمید ہو کر تو وہ فوراً ہی جو کچھ نہ پاسکے تخیل میں پالیں گے اور وقت آنے پر اصل جیسی نقل کر کے ڈنٹکیں ماریں گے، ہزار باتیں دل سے جوڑ کر دکا دیں گے۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کی مجال نہیں جو وہ جدا ہو کر اُسے قبول سکلیں۔ کہاں کہ اُس کا خیال اُن کے اکیلے ہی کو تو دد رہی کر دیا کرے گا۔ اس کا ذکر کرے وہ بیوی اور دوسری

معشوقاؤں کو حسد کی آگ میں جلا لیا کریں گے۔ جب جی چاہا معشوق پولیس کے ڈنٹے کی طرح بیوی کی چاند پر دے مارا۔ موقع بے موقع کسی کی یاد میں ایک کھولتی ہوئی پھنگار مار کر نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ دکھ بھری رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سب کو چھوڑ کر دور رومان کی گود میں اڑ گئے۔

”اُہ کیا ساری پہنٹی تھی! اس رنگین شام کو رگ رگ مہک رہی تھی۔ بالوں میں نہ جانے کیا نشہ اور عطر چھڑک رکھا تھا کہ دل پھلا جاتا تھا۔ کئی بار میں نے چپکے سے جھپک کر بالوں میں ناک گر دمی!“ بس کافی ہے ایک بدبو دار اور بد شکل بیوی کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے۔

وہ ان سب پر یہ بھی ظاہر کیے رہتی تھی کہ اوروں سے تو صرف مروت کی وجہ سے ملتی ہے اصل چوٹ تو اُس نے لگائی ہے۔ اگر ایک سے بے تکلف ہوتی تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چوہے پر کھانا کیسے تو پیلے کی آغ بیکار نہ جائے، کچھ نہ کچھ دیاں بھی بھنتا رہے۔ یہ بڑا کارگر رہتا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا ازاں وہ اب کیسی کہیں نہ جاتی۔ ان پناہ گاہوں کے بغیر اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ بازار بھی جاتی تو انھیں کامیاب مڑوں میں۔ وہ فخریہ سمجھے تھے خرید و فروخت کی پوٹلیاں، جوتوں کے نمڈل، بسکٹوں کے ڈبے، تازہ ترکاریوں کی تھیلیاں لا کر چلتے۔ ٹہینے کی جنس موٹوں میں پہنچا جاتے۔ دھنیا گھنا ہوتا تو دوسرے پھیرے میں بدلوا لاتے۔ یہی نہیں وہ سیکڑوں ایسے کام کرتے جن کا اگر ان کی بیویاں ذکر بھی کر دیتیں تو مارے مٹم کے ڈوب کر مرنے سے بچتے۔

شاعر بچاڑے کے پاس اپنے شعروں کے سوائے اور رکھا ہی کیا تھا جو اُس کے قدموں پر نچاؤ کر دیتا، لہذا اُس نے اپنی نئی تصنیف اُس کے نام معنون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس انوکھے نکتے میں اُسے بڑی دلچسپی نظر آئی اور بڑے سوتج بچار کے بعد اُس نے خود نہایت رسیلے اور چپے چمکے ڈھونڈ کر نکالے؛

”اُس کے نام۔ جس کا نام میں نہیں لے سکتا“

”شرارت بھری آنکھوں کے نام“  
 ”اس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانے میں برداشت نہ کر سکا“

یا

”اس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانوں نے میرے دل پر گہری لکیریں  
 کھینچ دیں“

”اُس شعلہ رخ کے نام جس نے میری زندگی کے تاروں کو اپنے حسن کی مضرا سے  
 لکر ڈال دیا“

”اُس سیما بوش کے نام جس نے میری رگوں میں پارہ بھر دیا“  
 گو اُسے قطعی یقین تھا کہ وہ نہ ہی برق صفت ہے اور نہ ہی سیما بوش بھر بھی  
 اُسے بڑا لطف آیا، مگر آخری جملے سے نہ جانے کیوں وہ خود ہی چوڑی بیٹھی۔ ایسا معلوم  
 ہوا کہ کسی مشہور درواخانے کا لمبا چوڑا اشتہار ہے۔ اُسے شاعر سے خواہ مخواہ کا بیر  
 ہونے لگا۔ وہ ان سب کے اتکا چکی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا اب اُن سے کس رنج ناک  
 گھسوائے۔ وہ ان سب کو جلد از جلد سونگے پتوں کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی، مگر  
 اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اُسے بھول نہ جائیں۔ پھر یہ ہنڈ کوڑے سب فراموش ہو جائیں  
 گے، یہ گہری لکیریں دھندلی پڑ جائیں گی اور رگوں میں بھرا ہوا پارہ ٹھنڈا پڑ جائے  
 گا۔ پھر وہ لوگوں سے اُس کا ذکر بالکل بلیو کی طرح کریں گے۔ ناکامیاں انہیں گندہ  
 ذہن اور دروغ کو بنا دیں گی۔

پروفیسر سے اُس کی عموماً کٹی چھنتی رہتی تھی۔ وہ بے رحمی کی حد تک صاف گو اور  
 پھکڑا انسان تھا۔ کبھی کبھی تو شتم کو شبہ ہونے لگا کہ وہ شکار ہے یا خود شکاری ہے  
 بدلے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں جب وہ خاموشی سے اُسے گھورتا تو اُس کا جی چاہتا  
 وہ لوہے کی چادر میں لپٹ جائے۔ بار بار اُس نے بھولے سے اُس پر نیر اندازی کی مگر  
 معلوم ہوتا تھا تیروں کی نوکیں کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ پڑتی تھیں۔ اس پر پروفیسر  
 کی عقابی آنکھوں کی طرز پر مسکراہٹ ابدہ چراغ پا ہو کر پلٹ آتی اور پہلے سے زیادہ

محتاج ہو جاتی۔

مگر اُس نے ہار تو نہ مانی، غنیم کی کمزور رگ ٹٹولتی رہی۔ ایک بار پورا اثاثہ داؤں پر لگا دینے کی ٹھان لی۔ جی دھکڑا کر دیکھتا تھا کہ اگر اس نے اس بھال میں بھٹو کر مار دی تو وہ دو چار جگہ چپڑی باتیں کر کے ایک دن پروفیسر کو ٹٹولا،  
 ”آپ اپنی نئی کتاب کس کے نام معنون کریں گے؟“ مگر پروفیسر نے بدک کر دیکھا گویا کھانے سے پہلے سو گھتا ہے۔  
 ”جو بھی امتحان میں پورا اترے۔“

”کیا فیس داخل ہے؟“

”کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ۔“

”اؤ نہ بھئی آپ لوگوں سے کون جیتے گا۔ بھلا یہ جواب مجذوب کی بڑھم کوڑ مغزوں کے کیا سمجھ میں آئے۔“  
 ”پھر وہی بنانے کی....“

”تو یہ ہے، آپ تو بڑے بے اعتبار ہیں۔“ پروفیسر نے ایک گہری سی نگاہ اُس پر ڈالی اور ستمن جلدی سے کھسک کر شاعر کے پہلو میں ہو رہی۔ نابابا، یہ سانپ کھیلنے کا نہیں، مگر ققوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پروفیسر بھی کندھے پر آن کھڑے ہوئے۔  
 ”کیا بلکڑ گئیں؟“ انہوں نے اس کے پیر میں چٹکی بھر کر پوچھا۔  
 ”نہیں تو۔“

”پھر اس طنطنہ کا مطلب! کتاب تو واقعی چھپ رہی ہے اور معنون....“  
 ”کس کے نام معنون کریں گے، اپنی مری میوٹی ماں کے نام؟“ جل کر پوچھا۔  
 ”میری والدہ زندہ ہیں!“ پروفیسر رُمان گئے۔  
 ”اوہ، معاف کیجیے گا، تو باپ کے نام؟“  
 ”وہ مر چکے!“

”چہ، کیا مصیبت ہے! جسے مردہ سمجھو وہ زندہ اور جسے زندہ سمجھو وہ مر جاتا

ہے۔ تو پھر اپنی بیوی کے نام ”

”بیوی نصیب ہی نہیں“

”دور نہ کرتے ضرور آپ یہ حقاقت“

”سننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل۔ میں کہتا ہوں بیوی ہی برا سر حقاقت ہے، اور اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب سے ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے“

”اؤ نہ، شوق سے کیجیے۔ بیوی چھوڑ ساس کے نام کر دیجیے“

”بگڑتی کیوں ہو، مجبور کر کے نام کیوں نہ کر دوں“

”بیٹے“ اُسے اپنے کالوں پر اعتبار نہ آیا۔

”مگر بھی میں شاعر جیسے جملے سخت نالپسند کرتا ہوں“

”آپ نہ سے گوڑ ہیں“

”ہو سکتا ہوں مگر بھی نہ تو میری خشک اور اجڑی زندگی میں تار اور نہ اُن

پر کوئی مضامین مارے، باعاف کرنا اگر برا لگے تو... وہ مکاری سے مسکرایا۔

”مجھے کیوں برا لگتا۔“ حالانکہ اُسے سخت برا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اُس

کا منہ کھسٹ ڈالے۔ ”اچھا وہ دوسرا پھلانگ“ اُس کا ڈیڈ بلیش، وہ تو پسند ہے۔

”راجی لا حول ولاقہ۔ خور شید تا باں فرسودہ اور نازیاں... نہ خطا پسند ہے؟“

”جائے میں ایسے نہیں بولتی۔ کیا لگاڑا ہے اُس نے آپ ہر وقت بجا پرے کا

مذاق اڑاتے ہیں۔ مانا کہ وہ آپ جیسا مکار نہیں“

”میں مکار ہوں“ پر دنیسر نے چپک کر کہا۔

”اور کیا، اتنا تو سیدھا ہے“

”تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب... کی بگم صاحبہ کا کتنا

منہ چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ پٹتا ہے“ ایک دیکھنے کے ساتھ چپک کر رہے

ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر شمع نے دونوں باتوں سے انہیں دور جھٹک

دیا۔ شکر خدا کا کہ اُس نے شاعر پر کبھی رحم نہ لکھایا تھا۔  
 ”وہ دن یاد ہے جب آپ نے میری سامی چوڑیاں توڑ دی تھیں۔“ وہ تیزی سے  
 بات طحال کی بولی۔

”یاؤ ہے؟“ پروفیسر نے جواب دیا کہ کیا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔  
 ”آپ کو رنج ہوا تھا؟“  
 ”تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال میں  
 جمع ہیں۔“

”اب تو دھل گیا ہو گا۔“  
 ”نہیں، دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے۔“  
 ”بجڑ تو... سنیلے آپ کے نئے تجربے کو... دیکھیے ایسے لکھیے... لکھیے معلوم ہو  
 ”اُن ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام، نہیں صرف ”ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام“ ہی تیار  
 بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کو کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات چیت پلٹ دے گی مگر نہ  
 جانے آج وہ کس موڑ میں تھا۔

”پرٹی تیز ہو تم۔“  
 ”اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں۔۔۔ کیوں؟“  
 ”ادھر ہو، مصوری میں بھی دخل ہے؟“

”کیوں نہیں؟“ اُس نے بات بٹنے دیکھ کر پورے زور سے ہلہ بول دیا۔ ”لایٹ  
 آپ کی تصویر بنا دوں۔“ اُس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اُس میں اپنے سینے کا  
 گہرود لیے اور قبل اس کے کہ اُن کا بلبلا تا ہوا تھا اُسے پکڑتا وہ تڑپ کر باہر  
 روش پر نکل آئی۔ جہاں عام لوگوں کے سامنے انھیں نہایت ہندیک ساتھ اُچھی  
 آواز میں موسم اور سیاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بیچارے دیر تک پیاسے  
 بیل کی طرح ہانپتے رہے، پھر چل دیے۔

”ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام“ چھپ کر ابھی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی



کر وٹ لے لی۔ شاعر فوراً کھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت ضروری باتیں کر لے آئے گئے تھے۔ وہ غریب اور کوئی تحفظ نہ دے سکتا تھا تو ریگیتوں کی مالا ہی اپنی دلہوی کے چرنوں پر چڑھا دی تھی مگر سب ہی ایرے غیرے تھے خیرے رو مانی بننے لگے، یہ تو زیادتی ہے۔ بھناکا ہوا آیا، تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کیے بیٹھی رہی، پھر جل اٹھی!

”نقصان تو نہیں مگر تم کو ہر ایک کو ایسے سر نہ چڑھا نا چاہیئے۔ گویا... گویا“  
”کچھ نہیں گویا گویا۔ ادھر نہ، جل گئے آپ کہ باریکی خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے۔“

”وٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام... وہ کتنا حسین تھیل!“

”شہ، بالکل نکما اور بے معنی!“

”ادھر نہ، آپ خود نکمے اور بے معنی، جی!“

”آپ کا یہ حرجن ظن ہے میرے متعلق... چوٹی کے شعرا میں میرا نام ہے...“

”اؤہ نہ، سب انور میں چوٹی کے شاعر...“

”مس شمشاد!“

”ماسٹر شاعر!“

”آپ کو میری تنک کر لے کا کوئی حق نہیں...“

”اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اندر سے“

”پسند سے شعر ملتے سنتے...“

”میں... میں... آپ...“

”کیا میں... آپ... کچھ نہیں... کوئی بات بھی ہو... اچھی عاشقی میٹری کہ“

”گزر گز میری غزلیں سنو... سلام ایسی محبت کو... ہم لٹو درے ہی بھلے!“

”حرم میں آپ کو ادب پرست اور...“

”جی معاف کیجیے میں کچھ ادب پرست نہیں بلکہ آپ کے آئینہ کے لیے“

سُن لیتی تھی۔ تشریف لے جایئے اور آئندہ گرنز کالج کی چھار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ تشریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی بچہ نہیں یہ.....“  
 ”اور اب تک...“

”اب تک میری مرضی!“

”میں نے... میں نے خود اپنا گلہ گھونٹ لیا...“

”بہت اچھا کیا آپ جایئے، خود اپنے آپ کو دفن بھی کر دیجیے... جایئے...“

”چار ماہوں... مگر آپ کو اتنا انحطاط پسند نہیں سمجھتا تھا... مگر...“

”جایئے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے تھوڑے پر ڈال دیجئے گا۔“

جایئے اور دنیا والوں سے کہہ دیجئے کہ میں بد معاش اور آوارہ تھی.... اور آپ کی داشتہ رہی... جایئے“

شاعر کے جانے کے بعد منہسی کا دورہ پڑ گیا۔ شکر ہے اس دن اور کوئی ٹپنے

نہ آیا ورنہ وہ تو شمشیر برائے نبی بیٹھی تھی۔ ویسے فرصت بھی لوگوں کو نہ تھی۔ کام بڑھتا

کی ریاست میں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی لہذا وہ کام بڑی چھوڑ کر نئے

سرے سے نوا بزاہہ بن کر خان بہادری کا پلو واسٹینجے گئے۔ ادبی اور ترقی پسند جلسے

بھی پھیلے پڑ کر درم برسم برسم ہو چلے تھے۔ دو چار کہ جیل میں بھرا اور پالیسی بدل گئی۔ زیادہ

تر قومی جنگ کے متعلق کام کر لے گئے۔ روس کی جنگ دنیا بھر کی جنگ بن گئی اور

اس لیے انسان کی جنگ ہو گئی تھی۔ انجینئر صاحب بیروت چو گئی تھوڑا پر سدھار

گئے۔ دنیا کچھ سوئی ہوئی گئی۔ ٹیبلر چھلانگیں مارتا دوڑنے لگا۔ ادھر جاپان کو بھی چھینکیں

آئے لگیں۔ مشرقی جزائر میں خشکی بڑھ رہی تھی، الاڈ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

بے بات جلی بیٹھی تھی۔ پروفیسر آن پٹنے۔ وہ کچھ حد دوسے بڑھنے لگے تھے اور

اب منڈی شاخ کی طرح ہی رہ گئے تھے۔ یہ شاید چھٹی بار اس کی زلف کے بال یا

اور کوئی دوسری نشانی مانگنے آئے تھے۔ اصل میں رازد فیاز کے سب کل پر رزے

گھس گئے۔ ایک ہی۔ دو ان کی۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے گھر سے پٹر دیا

تھا۔ جیسے چھپا اُٹھتے تھے۔ سیاسی گُرمی بھی کچھ مردہ ہو چکی تھی۔ بھوک کا سوال تیزی سے اُٹھتا جا رہا تھا۔ فوجی بھرتی اندھے لوٹے لنگڑے کانے سب سمیٹ کر بڑپ کیے جا رہی تھی۔ جو کل تک کوڑی کوڑی کو محتاج تھے آج درمی ہینے رعب کا ہتھ پھرنے لگے۔ جسے دیکھ کر لفٹنٹ بنا کر ڈراپ ہے اور جب بھوک کم ہو گئی تو تناؤ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اور یہ زندگی کی دوڑ بھاگ ہے بھی تو اس پیٹ کے بھاڑ ہی کی خاطر زیادہ سے زیادہ پیٹ بھر دو اور ان پیٹ بھرے ہوئے پیٹوں کو توپ کے آگے دھرو۔ چہیں بھی نہ کریں گے۔ اس کے باوجود ایک بے عرضی اور لاپرواہی چھائی ہوئی جیسے ۔۔۔ لڑائی نہیں سٹے کا بازار لگا ہوا ہے، جتنا ہو سکے پیسہ کسیٹا کر جادو موقع ہے، لوگوں کو ضرورت ہے، خریدنے کو بلیسہ ہے، کوڑا کرکٹ بھر دو ان کی جیبوں میں ویسے وار فنڈ بھی جمع ہو رہے ہیں، زناچ نمائش کے ذریعہ پیسہ بھی جمع کیا جا رہا ہے، سب کچھ حاضر ہے۔ مگر دل حاضر نہیں۔ کیوں دل لگا میٹ؟ کس کی خاطر لگا میٹ؟ اتنی بار جو خون کی ندیاں بہا میٹ تو اس کا کیا اجر ملا؟ یہاں تو بھوک اور بربستی دہلی کی دہلی ہی رہی۔ جہالت ایک قلعہ بھی نہ مٹی، مرض ایک انخ دور نہ ہو سکے۔ جرمی مرے یا رتس، جاپان مرے یا فرانس ان ان لی سسکنے والوں کو کبھی کے دکھ کا کیا اس اس! دکھ سے گھبرانا کیسا؟ یہاں دکھ بھوک کو تو وہاں جنت ملے گی۔ خیر ویسے حرام کا حکم اپنے بس نہیں بھوک کے ڈنڈے کے بس ہی ہے۔

پروفیسر کے لاڈ ضرورت سے زیادہ ہو چکے تھے، ہر چیز سے کچھ بھی کھا لیتا تھا سب مل گئے تھے مگر نہ جانے کس آس میں یہ تعینات تھے۔  
 ”نئی کتاب کے لیے کوئی نام تجویز کرو“ ایک دن اٹھلا کر بولے۔  
 ”نام؟ کیا ضرورت ہے نام کی؟ کیا بے نام کے کتاب نہیں چھپ سکتی؟“  
 جلی تو بیٹھی ہی تھی۔

”نام سے میرا مطلب ہے ٹائٹل!“  
 ”جی اتنی اُردو جانتی ہوں، کچھ بھی ہو ایک ہی بات ہوئی“

”تہا را مطلب ہے، بے نام...“

”ہاں کیا حرج ہے! ایسی گناہم رہنے والی کتاب کا نام رکھنا بیکار“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ لوگ چرائے ہوئے خیالات لفاظی میں ڈبو کر مصنف بننے کی کوشش

کریں تو...“

”یہ کس کے متعلق کہہ رہی ہو؟ میرے خیالات تجربات پر مبنی ہیں۔“

”مذہور... ذرا بتائیے تو کتنے گاؤں دیئے ہیں جا کر! لسی پی ہے اور چنے کا ساگ

کھا کر آگ کے ڈوڑے سو گئے ہیں؟ کتنی معصوم دیہانتوں کی عزت لونی اور حرام کے بچے پیدا کروائے ہیں؟ سب بکواس! بیٹھے بیٹھے بڑا کھٹے لگے۔ بڑے قوم کو سدھانے چلے ہیں، تہہ...“

”میں قوم سدھار کا قطعی قائل نہیں۔ میں لیڈر نہیں ہوں۔“

”تو پھر فائدہ کا غد کالے کر لے سے! سوائے زندگی کی حمایت کے اور منظور ہی

کیا ہے آپ کو؟ یہ آپ زندگیوں کے کیوں اس شدت سے طرف دار ہیں؟“

”میں...“

”آپ دہاں جاتے ہیں تو طبیعت مکتدہ ہو جاتی ہے اور چاہتے ہیں گورنمنٹ

بجائے جنگ سے سہارا دینے کے زندگیوں کے کمرے سجاوے، دہاں ٹمٹاتی رالیوں کے

بجائے بجلی کے مہڈے لگائے، سستے تیل کی جگہ پیرس کے کنٹرولڈ پٹرول“

”کیوں نہیں...“

”گمراہ آپ کو اپنا گھر قبول کر زندگیوں کی بہتری کی کیوں پڑا لگتی۔ دنیا میں اور بھی ٹھیکے

ہیں، سب کو چھوڑ کر بس ان بیچاروں پر رحم آتا ہے۔“

”کچھ بھی کہو وہ دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہیں اور کسی عضو کو سرتے دیکھ کر میری حساس

طبیعت...“

”کچھ نہیں، بڑی بیچاریاں! منہ نہ جلنے کتنی اس سے بدتر بیچاریاں گھروں میں پڑی

سر پر ہی ہیں۔“

”بھائی، ان کے بارے میں کیا لکھ یا جان سکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے کتنے رند ہی خلعے قائم ہیں اور کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے بھی نہ ہی مجھے اس گھریلو عورت سے کوئی دلچسپی....“

”کیوں ہوگی۔ بس آپ کی ساری دلچسپی رند ہی میں جذب ہو گئی۔“

”بلے شک وہ میرے کام کی ہے.... وہ میری ہے.... یہ پردے میں بھی ہوتی پری یا وہ عورت جسے ہم غلط سے تعلیم یافتہ کہتے ہیں، ان سے مجھے کیا ملتا ہے؟“

”خیر یہ بھی مانا مگر آپ تو حقیقت نگار بنتے ہیں۔“

”پھر؟ کوئی اعتراض ہے؟“

”جی مجھے اعتراض کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں ان رندوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں، کیا مرد ایسے ہی نہیں ہوتے؟ ذرا انہیں بھی تو ڈھونڈ کر سامنے گھسیٹ لائیے۔ یا بس انہیں ہمیشہ ظالم، بے رحم، دغا باز، حرام کے نیچے پیدا کرنے والا ہی دکھاتے ہیں۔ برطے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے، مردان فضولیات سے پاک ہے....“

”ایں؟“

”جی، اور آپ اپنی دانست میں عورت کی حمایت کرتے ہیں، یعنی اُسے یقین دلاتے رہنا کہ وہ چیز جو مرد کے لیے باعث فخر ہے اُس کے لیے گناہ ہے، بس یہی ہے آپ کے انصاف اور ترقی پسندی....“

”ہر بات کو ایسے دیتی ہو، سنتی کم ہو۔“

”کیوں کہ سنوں، کوئی بات بھی ہو سننے کے لیے۔ کچھ نہیں سب زبان کے چٹی اسے کہے جاتے ہیں۔ لیوں صاحب آپ کی عریانی عورت کے سینے تک کیوں رہ جاتی ہے۔“

”ایں؟....“ پر فریسنے سے ہنسنے۔

”نہیں، مگر کبھی اپنی عریانی پر بھی تو نظر ڈالیے۔ بس مجھ کے کتوں کی طرح....“

”تج بڑا مزاج بگڑا ہوا ہے... پانی پی لو، غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“  
 ”میں تباہوں کیوں لکھتے ہیں یہ عریاں چیزیں؟“  
 ”میرے منع کرنے سے کیا مان جاؤ گی.... تباؤ؟“  
 ”سینہ مرکز حسوس ہے، بس اس سے کھیل کر جی ٹھنڈا کرتے ہیں.....“  
 ”اچھا بابا، کیا بات تھی اور کہاں پہنچ گئیں۔ معلوم ہوتا ہے....“  
 ”کیا؟“

”کوئی نمازہ چوڑی کھائی ہے؟“  
 ”چوڑی! ہنہ، آپ نے کیسے جانا۔“  
 ”تمہاری کھانسی کی صورت اور ریت کی آواز توں سے یہ تم کو آگے لے چکی ہے۔“  
 ”میرے سر پر دیاں چھوڑ دی ہو، کیا بدی چپ کا بر لوٹو۔“  
 ”ہم نے مجھے تو بہت سنا چکے۔ کچھ سننے کی بھی ہمت ہے۔“  
 ”لردو گی؟“

”میں بزدل نہیں، دوسرے آپ سے تو....“  
 ”تو سنو مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے۔“  
 ”شکر یہ! مگر وجہ اس دریا دلی کی؟“  
 ”رحم بعض وقت بے وجہ بھی آتا ہے...“  
 ”تو مجھے آپ کی عقل پرز....“

”ہاں، شاید ہم دونوں قابلِ رحم ہیں۔ تم اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش میں  
 لکھ بھیجی ہو اور میں نے تیرے پہچاننے کی کوشش میں اپنا بہت سا قیمتی وقت برباد کر  
 دیا۔ ایک بار بازار کی صورت کو دیکھ کر کہہ دیتا ہوں کہ یہ تو میری صورت کا عکس ہے۔  
 لی کوشش کی تو قدر تم پر ہے۔ میں نے زانک بھونکی گئی اور اسے لڑکھکھا ہوا  
 لے اچھلتے چلے کہ صورت کو دیکھ کر کہیں ہو گا۔ اس سے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا  
 ہے۔ وہ سمجھنے کے لیے نہیں استعمال کے لیے ہے۔ ہاں اسی انداز میں کہہ تم غولی

قسم کی عورت نہیں مگر بڑے رنگین مغالطوں میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو انتہائی ذہین سمجھتی ہو حالانکہ قطعی نہیں۔ صرف ضرورت سے زیادہ چرب زبان ہو، بیڑھی لکھے دار بانیں کرتی ہو۔

”ہنہ... اور۔“

”اور زیادہ جس سے بننے کی کوشش نہ کرو۔ میرے خیال میں جتنے دکھ سپہہ کر تم ڈھٹائی سے منسب سکتی ہو قابلِ دار سے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہادر اور مضبوط ہو۔ انتہائی بردل ہو۔ سوئی کے زخم کو بھالا بنا لیتی ہو۔ تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا رویہ جو ہم سب کے ساتھ رہا ہے۔ نہ طاقت کا ثبوت ہے قطعی نہیں۔ یہ خوف، یہ تمہارا اپنی نفسانیت کو چھوٹی مرنی بنا کر رکھنا یہ تمہاری سب سے بڑی مزدوری ہے۔“

”اپنی بیڑھیوں کو میری بزدلی بنا رہے ہو۔“

”بیڑھیوں کیا؟ تم اسے بیڑھی کہتی ہو۔ تم جیسی دیکھتی ہوئی ارجح کے سامنے سے برف کے ٹکڑے کی طرح صلیح دسالم لکل آنا بزدلی اور بیڑھی نہیں بلکہ بہادری کی انتہا ہے۔ اور جو ہم نے تمہارے کانچے کے گلاس کی قدرتی سپائے جی پر بیڑھی کر کر تو تم سمجھتی ہو جو ہمیں انونیائی میں سٹالانکہ ہم جان بوجھ کر اویسنے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم جو کچھ تم سے لیتے آئے تھے۔ مل جانا تھا۔ بخدا موصول ہیں۔ ایک بھی اس سے آگے قدم ابرہا نہ کرنا کہ خواہش پیدا نہ ہوتی۔ اور کیوں ہوتی؟ کون سی نایاب شے تم ہمیں دے دیتیں جو ہمیں باہر سے سستی نہ ملتی۔ دلیسے تم خود جانتی ہو کہ تمہاری کشش اتنی شدید نہیں کہ مثلاً احمد کو خان بہادری کے خطا سے زیادہ تم عزیز نہیں۔ انجینئر نہیں

چھوڑ کر بدلت چلا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو تم اسے روک سکتی تھیں؟ تم جیسی نہ جانے دو میل پیش پر کتنی چھوڑ گیا ہو گا۔ نہیں وہ رتبہ نہیں حاصل ہو سکتا جو اس کی جابل اور بے وقوف بیوی کو ہے۔ تم شعلہ ہو مگر مال کے سینے جیسی بر سکون گرمی تمہارے پاس نہیں۔ تم جلا سکتی ہو مرم نہیں لگانا جاتیں۔ توڑ سکتی ہو بنا نا نہیں آتا... ماہا... یہ سچ بتاؤ تمہارا مال باپ نہیں بہت ہی چاہتے ہیں؟“

”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔۔“

”مجھے یقین ہے بالکل نہیں چاہتے۔“ پروفیسر نے سختی سے بات کاٹی، ”یقیناً تم ان کی پھوٹی آنکھ کا اتارا نہیں جبھی تو ملک میں اتنا خطرہ پھیل رہا ہے، لوگ اپنے پیاروں کو دھڑلے جا کر چھپا رہے ہیں مگر کسی کو معلوم بھی نہیں کہ تم بھی جاندار ہو، تمہیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔“

”میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔“

”ہاں یاں یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ تم اتنی ہوشیار ہو کہ اپنے ساتھ اور چار چھ کو بچالے جاؤ گی۔ ناقدری اور دوسروں کی بے مردی کی تم اچھی طرح عادی ہو چکی ہو۔ دینا نے تمہارے زخم کو دکھا کر بے حس بنا دیا ہے اسی لیے تمہارا وار زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ضرور شاعر سے تم نے اپنے کسی عاشق کا بدلہ لیا ہے جو تمہیں نامراد سمجھتا چھوڑ گیا۔“

”بڑے عقل مند معلوم ہوتے ہیں!“ جیسے شمس کی زبان سو گئی تھی۔  
”چھوڑو میری عقل کو اور مجھے پھلانی تھلانی بڑے آسان ہے۔ بالکل اس سڑک کی طرح جس کے سینے پر رات دن راگیر چلتے ہیں پھر بھی وہ خود اکیلی، خاموش اور بے جان ہے۔ معاف کرنا، میں نے بار بار تمہارے چہرے پر مجمع میں تنہائی کا کرب دیکھا ہے۔ جب تمہیں دکھ ہوتا ہے قہقہے لگاتی ہو، جب خوشی ہوتی ہے تو آنسو بہاتی ہو، ہر چیز کو غم نے دھوکا بنا رکھا ہے۔ یزید یا کو دھوکا دینے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا کہاں کی عقلمندی ہے!“

”جی، شاید اپنی نئی کہانی کا پلاٹ بنا رہے ہیں۔“

”میری کہانیوں میں انسان ہیں مردے نہیں۔ میں زندہ یا قدرتی موت مرے ہوؤں پر لکھ سکتا ہوں مگر تمہارے جیسے خود کشی کیے ہوئے غیر انسانی واقعے کے متعلق میں سنجیدگی نہیں رکھتا۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ تم جیسے مرنے کیلئے مردے بہت کم دیکھے۔ بڑا نامنا، جو کچھ کہا ہے جذبہ رحم سے مجبور ہو کر۔ کل جا رہا ہوں، بی بی سی سے



دعوت نامہ آیا ہے۔ کاش میں اس سے قبل تمہیں سچ بول سکتا۔  
 ”تو آپ مانتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں؟“

”اور کیا! جھوٹے کے سامنے سچا ہمیشہ مانتا جاتا ہے، اس لیے جھوٹ ہی  
 چمکا یا پھر آج جب تم سچ بولنے لگیں تو میرا حجاب بھی ٹوٹ گیا۔ اچھا می بیو اسیے سچ  
 بات تو یہ ہے کہ...“

”کہیے، کہیے۔ آپ لوگوں کی دردِ بانی نے اتنا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کسی کے  
 ہونٹوں سے سچ سنوں کہیے، خواہ وہ سچ میرے منہ پر جوتا ہی کر ہی سکے۔“

”تو سنو... بات یہ ہے کہ... میں نے... معاف کرنا تمہاری تو بہن ہوتی ہو تو  
 تم سے کبھی شادی کی درخواست تو نہیں کی، اور نہ ہی ایسے بے اصول بھکڑا انسان  
 سے کوئی لمبا چوڑا معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ کم از کم اپنے پیش و حواس میں تو تم  
 حبیبی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دلچسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے  
 کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چر ہے، میں تو تمہارے پڑوس میں بھی  
 نہیں رہ سکتا۔ دیکھتی ہو تمہاری ایک منٹ نہیں بنتی، ہم ایک دوسرے کو  
 خطرناک حد تک تار جکے ہیں!“

”اچھا تو یہی تھی آپ کی صاف گوئی جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا ڈر تھا۔“  
 ”ہاں، مگر تو تمہیں نقصان پہنچا اور نہ ہی دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں تم احساس  
 کی حدود سے باہر ہو چکی ہو، تمہاری خود داری کو اتنی تھوکریں لگی ہیں کہ وہ ایک  
 بے حیا گلیا بن گئی ہے۔ تم سے اتنا چھینا گیا ہے کہ اب تم خود ہی سب کچھ اٹھا  
 کر پھینک دیتی ہو۔“

”تو برا جمع کرنے سے فائدہ؟“  
 ”ہمیرے بھی تمہاری نظروں میں پتھر بن چکے ہیں۔“  
 ”اُن میں سے ایک درخشاں ہیرا تو شاید آپ ہیں۔“ شمن نے انتقام بھرا  
 ہنسنے لگایا۔

درمیرا ذکر چھوڑو، ہم تم ایک دوسرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، مگر تم نے شاعر کو ٹھکرایا، برا کیا۔ معلوم ہے وہ چھ سو روپیہ پروا میرا سینڈے کے سلسلے میں نوکر ہو گیا ہے۔“ پروفیسر شرارت سے مسکرایا۔

”تو آپ کا خیال ہے چھ سو روپے نے ان کی ساری کٹافتوں کو دھو ڈالا ہے۔“  
 ”کٹافتیں صرف غنیمت سے ہوتی ہیں ورنہ تم کیا جانو ان لوگوں میں بسے ہوئے سینوں میں کیا کیا گھناؤنی گندگیاں پوشیدہ ہیں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جنگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، ہر چیز ہنگی اور امانوں ہوتی جا رہی ہے، اچھا ہے ایک کارندہ پھانس لو، وقت بے وقت کام آئے گا۔ میں تو بیکار انسان ہوں، ویسے میں تو شدت سے طوائفوں کا حامی ہوں۔“  
 ”کبھی ان کے ہمدرد بن کر۔۔۔“

”ہاں ہمدرد بن کر ہی تو چاہتا ہوں کہ ان کی حالت پیرس کی طوائفوں جیسی ہو جائے۔ جیسے تم تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہو میں۔۔۔“  
 ”تو آپ ان کے وجود پر مصر ہیں؟“ شمن نے بات کاٹی۔

”میں بیچارہ کون مصر ہونے والا دنیا مصر ہے اور رہے گی۔“ اٹھیں دنیا سے مٹانے کی کوشش کر کے تو دیکھ لیا، مرض مٹا نہیں دب کہ پہلے سے زیادہ سڑاندا بھوڑا بن کر سوسائٹی کی جبرط میں چھپ رہا۔ جس کی لپیٹ میں صد ہا آچکے ہیں، اور آتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زخم کو کم سے کم کھول کر مرہم پٹی تو کریں، شاید صاف ہوا سے عفونت کچھ کم ہو جائے۔“

”ایک طرف اشتراکی ملتے ہیں دوسری طرف طوائفوں کے پیغمبر۔“  
 ”اشتراکی دنیا میں ان باتوں کا جھگڑا ہی نہ ہو گا۔ ہر ایک کو حسب ضرورت راشن۔۔۔“ پروفیسر مسکرایا۔

”غلط، بالکل غلط۔ یہ آپ نے نہ جانے اشتراک کو کیا سمجھ رکھا ہے، خوب، آپ کا خیال ہے وہاں عورتیں مفت دال چاول کی طرح بٹا کر دیں گی۔ غلط۔ آپ

لوگ بڑے زبردست مغالطے میں ہیں۔ سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی ویسے ہی اشتراک عودتیں بخشے رنگے گا۔ مٹھ، بس مقصورہ پر پڑھ لی اور اشتراک کی بن گئے۔ ایسے اشتراک، ہندوستانی اشتراک بیشک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراک کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی کس بات کا یقین کیا جائے۔ اتنے بڑے اشتراک بنتے ہیں اور اتنی زبردست تنخواہ سمیٹنے جا رہے ہیں۔

تیری قابلیت کے دامن ہیں۔

”جب آپ سے زیادہ قابل اور محنتی آپ کی تنخواہ کا پچاسواں حصہ بھی نہیں پاتے آپ نے اس بہبودہ نظام میں شرکت ہی کیوں قبول کی؟“

”مصلحت وقت ہے، دیکھنا کیا ہوتا ہے!“

”کچھ نہیں، بڑے بڑے دعویٰ اور دلوں کی ڈھیر لوہ میں دب کر گم ہو گئے تو آپ کی کیا حقیقت ہے۔ اپنے کام سے کب فرصت ملے گی جو کچھ سوچیں۔ یاد ہیں وہ دن جب آپ گورنمنٹ انسپکٹریں کو نکالیاں دیا کرتے تھے، انہیں غلام کہتے تھے اور اسی گورنمنٹ کی نوکری کی سٹیجی میرے سر پہنچنے آئے ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب تک آپ کو چالیس روپے کی نوکری ملی آپ غصہ رہے، جو نہی یہ قاروں کی دولت ملی حکومت کے پیارے میں بیٹھے۔ مٹھ یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت کا خلاصہ۔ یہ ساری باتیں ہائے یہ کسان پرستی، یہ گاؤں سدھار اپنی نوکری تک رہے۔ اب تو ہر طرف آپ کو شانتی نظر آتی ہے۔ کوئی خون آشام آندھیاں نہیں اٹھاتا، کوئی مسخ بارش نہیں برساتا۔ یہ نئی سرخی اتنی زرد کیوں پڑ گئی! روس کو مار کھانا دیکھ کر سبکے مڑا تر گئے ابھی روس جیتنے لگے۔ انت نکال کر منسنا شروع کر دیں۔“

”روس نے حماقت کی جو ٹپکڑ سے اڑا بیٹھا۔ جانے دو سیاست میں ٹانگ اڑانا سورتوں کو نہیں بھاتا۔ مرنی اذان دینے لگے تو ذبح کر دینا مٹیک ہے۔ ہاں تو میرے خیال میں سارے کام چھوڑ کر تم جیسے معصے حل کرنا چاہیں۔ تم جیسی عورتیں ہی اس لپٹی کی ذمہ دار ہیں۔ جب پیٹ سے ہی بچہ تمہارے جیسے توڑ پھوڑ اور خود غرضی

کے منسوبے باندھ کر آئے گا تو دنیا میں اس کے علاوہ اور کیا کرے گا۔ مگر تم کیا کرو؟ تمہارا قصور نہیں، قصور بس چلنے نظام کا ہے جہاں تم جیسے بچے پیدا ہونے پر مجبور ہیں۔ بھلا سوچو اس ذہنیت کے ساتھ ہمیں کیا احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارا ملک خطرے میں ہے۔ اس سے قبل کہ دوسرے کا قیام کریں ہم خود ہی مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہم کیوں اپنے ملک کو ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بچھے آئے؟ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں یہ ہمارا نہیں ہمارے مالکوں کا ہے اور ہم بس افلی خادم ہیں۔ پھر مالکوں کی چیز سے محبت کیسی اور اس کی تباہی پر دکھ کیسا؟ کیوں نہ اُسے بہتر داملوں اُٹھا دیں۔ بھلا فرق ہی کیا ہے اکالے نہیں پیلے، پیلے نہیں سفید۔ کیسے ہی ہوں ہمیں تو اُفاق سے مطلب ہے۔ ہمارے ملک کی حیثیت ہمارے نظروں میں کبھی بھی ایک بیسویسے زیادہ نہ رہی۔ خود غرضوں کے ہاتھ ہمیشہ بکبار ہا۔ مال گائے اور زمین کی جتنی بے قدری یہاں ہے کہیں نہ ہوگی۔ پھر بھی ہم ان کی پوجا کی ڈنگلیں مارتے ہیں۔ چیز تو مجھے اعجازِ مسیحائی کا یقین نہیں مگر سوچتا ہوں شاید جبرط کا ایک آدھ تار زندہ رہ گیا ہو اور بارش سے جاگ اُٹھے۔ اور وہ پورا جسے انیدھن سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔“

”انیدھن؟“

”ہاں۔۔۔ تم جیسی مسیتیاں دنیا کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے سوائے انیدھن کے اور کس کام آسکی ہیں۔ یہی ناکہ مرنے سے پہلے دو چار سولہ کیوں کو جوڑ لویں گے جوڑ ملانا اور ساراھی باندھنا سہا جائے گی کی بھی ہوگی تمہاری قومی خدمت، لیکن شاید ایک بات چھوڑ دو۔“

جلدی سے پوچھے اور.....“

”تمہیں کبھی کسی نے پیار کیا؟ اور جواب دینے کی ضرورت نہیں، تمہارے مقدس ہونٹ تمہاری پارنائی کی گواہی دے رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں تمہارے اوپر تجربہ کیا جائے تو کیسا ہے۔“ پروفیسر نے سگریٹ پھینک دیا اور عجیب نظروں سے دشمن کو دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکے انہوں نے اس کے

سر کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر نرمی سے اُس کے باغی ہونٹوں کو چوم لیا۔  
 ”بھئیے... بدتمیز... جنگلی....“ مگر وہ کسے دھکا دے رہی تھی، ایسے مجھے قدم  
 رکھتے وہ باہر اپنی سائیکل سے کہ سرٹاک کے موٹر پر غائب ہو گئے۔ ”مٹھیرو... مٹھیرو...“  
 اُس نے اپنے دماغ کے اندر کسی باغی گھوڑے کو تاپس مارتے پا کر چمکا را۔ سب  
 ٹھیک ہو جائے گا... کوئی بات نہیں... ایسی کوئی برطمی بات نہیں، سب  
 ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اب کیا ہو؟ کیا ہو؟ بگڑے ہوئے رہا اور لے لگا میں  
 تڑپاٹے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں... اس وقت جانے دو... سوچنے کی بالکل گنجائش نہیں۔ گریں بہت  
 دور سے تن رہی ہیں... ذرا دباؤ ڈالا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائیں گی... چلو چیکے سے  
 پلنگ پر لیٹ جاؤ... نیند پاس ہی کھڑی ہے، زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔  
 پھر اچھی نیند کی طرح وہ پراٹھاتی پلنگ کے پاس پہنچی سنبھال کر کیسے پڑ  
 رکھا اور انھیں پوٹوں سے ڈھک لیں۔

”آج تو اُس نے کہنا مان لیا اور جو آئندہ نہ مانا تو؟ مشکل ہو جائے گا اس  
 بگڑے ہوئے دماغ کو منانا!“ اُس نے سونے سے پہلے فکر مند ہو کر سوچا۔  
 ہاتھ پر آرام سے غنودگی میں ڈوب گئے۔ مگر دماغ سختی میں بھی سہمی ہوئی سبکیاں  
 بھرتا رہا۔ دور، اپنے مجھے اُس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ لمبی چوڑی سرٹاک، جس پر  
 معلوم ہوتا تھا کسی اژدہ سے کے گھسنے کے ہر بے کھینچے ہوئے میں، اُس کے پیچھے  
 دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر اُس نے چاہا لوٹ پڑا سے اور اس  
 بھیاںک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لیکر کھینچ دے۔ مگر یہ خم تو فولاد کے  
 تار کی طرح ضدی ہو چکے تھے، ایک ہی چوڑی میں چٹ جائیں گے امنہ پھر کر اُس  
 نے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑنا شروع کیا اور ناک کی سیدھی میں آنکھیں بند  
 کیے مہکتی چلی گئی۔

(۴۱)

رو یہ اُٹا، یہ سیدھا، اس نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھاتے وقت کپڑا فرش پر پھیلا کر انہیں مگر وہ فیصلہ نہ کر سکی، کاش اُسے معلوم ہو جاتا۔ کوئی ایسی طاقت جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کبھی دھوکا نہیں دیتی اُس کے کان میں آ کر نہ دیتی کہ کپڑے کا رُخ کونسا سیدھا ہے۔ اگر غلط رُخ پر کشیدہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جنگ کی امداد کے سلسلے میں جو مینا باز اڑ لگا یا جانے والا تھا اس میں یہ چیزیں بیکار ہو جائیں گی۔ ویسے ہی اس کا کام کتنا سُست پڑ گیا تھا! معلوم ہوتا تھا مشین میں پورے پورے رنگ لگتا جا رہا ہے، بیچ اڑ گئے ہیں اور ہنڈل نہیں گھومتے۔ لائبریری کی نئی کتابوں پر ابھی مندرج نہیں ہو سکے تھے۔ رجسٹر ادھورے پڑے تھے۔ حاضر لوگوں کو جوڑ کر میزان نکالنا، کام لگنا جاتا تھا اس جمع لفز لقی سے۔ رسید کی کتابیں بغیر دستخطوں کے جمع ہوتی جا رہی تھیں اور فرنیچر کی سالانہ جانچ نہیں ہوئی تھی۔ کیا ہوگا؟ یہ مشین کیسے گھسیٹ لی جائے گی؟

اور اوپر سے یہ کپڑا! صبح سے کئی بار وہ کام رکوا کر اسی غور میں ڈوب گئی کہ کپڑا سیدھا ہے یا اُٹا۔ کئی اُستانیوں نے ایک رُخ کے بارے میں رائے دی اور کسی نے دوسرے رُخ کو سیدھا بتایا، مگر وہ رائے عامہ کے اوپر اس وقت بھروسہ نہیں کر سکتی۔ عوام کچھ نہیں جانتے، آٹھ بند کر کے ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ کئی بار اُس نے سب سے چھپ کر بندر لچہ قرعہ بھی صحیح رُخ معلوم کر کے کی کوشش کی۔ چپکے سے دو پرچیاں لکھ کر نیوں کے ڈبے میں ڈالیں، ہلٹیل کیا۔ اُونک، اُطینا نہیں ہوا۔ اتنی بار دھوکا کھانے کے بعد اُسے کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ کیا تیرہ جوہر قرعہ بھی جھوٹ بول رہا ہو، اُسے پھنسانے کے لیے کوئی چال چل رہا ہو۔ اور اتنی باریک کشیدہ کاری غلط رُخ پر کر ٹھہ گئی تو کیسے ادھیڑی جائے گی؟ تمام کپڑے کا قلمہ ہو مگر سوراخ ہو جائیں گے اور پھر ان گڑھوں کو کیسے پر کیا جائے گا؟ یہ ننھے ننھے ہلے آنکھوں میں کھٹکیں گے اور اس کی میندیں تلخ کر دیں گے!

یہ آنا گھر پر کام مہند و نشان میں کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یورپ والے کیسے بڑے بڑے پھول کاڑھتے ہیں؛ دلکش بھی، آسان بھی اور صوفیانہ بھی لیکن یہاں تو سر چیز ایک دوسرے سے چپکی ہوئی، ایسے کہ سانس بھی نہ لی جائے۔ ایک جان اور اُس کے ساتھ یہ بیباکاری! ہر چیز اکٹھی جاتی ہے۔ الجھے ہوئے دماغ سے نکلی ہوئی ساری چیزیں آپس میں گتھ مگتھ ہوئی جاتی ہیں۔ کوئی اسٹین کیسے پکھیرے؟

جوں جوں فروخت کا دن قریب آتا گیا؛ اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ غارت ہو یہ دار فناء اور مینا بازار کیا ہو گا اس پیسے سے لڑائی میں جائے گا اور مر مر پٹی سے کام آئے گا۔ ایک طرف زخمی کرنے کے لیے نئے نئے آلے ایجاد ہونگے، دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نرسیں دوڑیں گی۔ یہ خونِ بصورت کشیدہ کاری لاکھوں ٹینکوں اور بموں کی صورت میں انسان کی طرف سے انسان پر سبائی جائے گی۔ جسم پسیں گے، خون کے دھارے بہیں گے ظالم اور مظلوم سب ہی ایک ہی دٹی سے متھ دیئے جائیں گے۔

اور یہ بھولے بھالے سپاہی! جنگ شروع ہوئی اور ان کے دام بڑھے پھر تو سب ہی کچھ ان کا ہے۔ ملک ان کا۔ عالیشان عمارتیں ان کی۔ قوم خطرے میں، ان کے باپ دادا کی ہڈیاں خطرے میں۔ شاندار عمارتیں، یہ مندر اور مسجدیں سب ان کی۔ جب تک سکھ چین رہا، انہیں بے موسم کا پھل سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آج جنگ کے بھوکے دیو کا منہ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ جھوٹے جاؤ کھان پر گھانا اس کے بعد! جب کھیل ختم تو پیسہ مضم۔ تو میں پگھلا کر ریل کی پڑیاں بنالی جائیں گی، بندو قوں کے دراڑے بھرتے موٹر بنیں گے۔ تھوڑی سی دھات ان کے حصے میں بھی تمنوں کی صورت میں آ جائے گی جن سے آنے والے بچوں کے تھنچنے بنائے جائیں گے۔ جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے، ملاپ ہو جائے گا سپاہی اپنا کٹا ہاتھ پیرے کر گھر جا بیٹھے گا اور جب تک منچلے پھر نہ کرطیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی طرح پڑاڑنگ کنایا کرے گا۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی اسکولوں میں چھٹیاں ہوں گی، گورنر پارٹیاں ہوں گی اور سپاہی؟ اس سپاہی کا کیا ہو گا؟ اسے پھلکا کر چور اُچکے اور ننگے ٹھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے!

کوئی ان سے پوچھو کیوں لڑتے ہو کجتنو! ماکہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور تمہیں کچھ سوچنا نہیں، ذرا یہ بھی تو سوچو کہ جن ماڈل نے جنم دیا ہے ان کے جی پر کیا گذرتی ہوگی! خوش قسمت ہیں وہ مائیں جو بامعجزہ ہیں۔ یہ سب ان مردوں کا کیا دھڑ ہے، انہیں یہ سپاہی جننا پڑتے تو پتہ چلتا کہ کیا سبتی ہے جی پر!

مینا بازار کی کامیابی کا سہرا باندھنے سے پہلے ہی سرعہ اُٹھا، طاقت مضبوط ہار گئی، توازن دماغ ڈگمگانے لگا لہذا جھپٹی لے کر گھر آرام کرتے کے ارادے سے چل گئی یہ جنگ کے زمانے میں انہوں کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے! جی چاہتا ہے کسی میں جذب ہو کر چھپ جاؤ اور پھر عمر میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھنا چاہیے کہ انہوں کی محبت کا کیسا مزا ہے، شاید یہاں ہی اسے وہ سب کچھ مل جائے جس کی تلاش میں اتنا صہلکی کہ کوئی کوچہ نا آشنا نہ رہا۔

یہ بھائی، بہن! اس نے انہیں بھونسنے کی کیوں کوشش کی تھی! ایک ہی شکم میں سب تسکین پائی، ایک ہی گھر میں بڑھ چھ پلے جیسے ایک ہی پیر کی بہت سی تیلیاں! مگر جب ڈال سے ٹوٹ کر ایک تیلی گری تو زمانے کی ہوا اسے کتنی حور ڈاڑا سے گئی! لڑھکے لڑھکے جب تنہا تھے تو اس نے پھر ایک کر شاخ پکڑ لی۔ عادت ہمیں رہی تھی تا اس لیے بڑا زور لگانا پڑا، کندھے پہنچ گئے، مگر واپس ماں کی گود میں کتنا سکون ملا۔ نیند سی آگئی!۔

ہیں؟ ساری دنیا تو اس کے گھر میں موجود تھی! اسی ایک نامہ دان میں کچھ دلائلیں جیسے گویے بھوکا، کچھ جیشی نر، اور کسی میں منگولی خون کی کرط واسطے تو کسی میں ایرانیوں جیسا نیکہا پن۔ اور یہ سب چار پانچ عورتوں کی محنت کی کمائی تھی۔ اگر جرمنی کی طرح ہندوستان کو بھی مصفی خون کی ضرورت محسوس ہو تو خالص رسی مال لکھا رہ



جائے گا؟ یہی جتنی تل پر سفیدی۔ یا شاید اتنا بھی نہیں۔ اریوں کا حصہ، ابرائیوں کا حصہ اور پھر افغانی، منگولی اور عربی خون۔ اور پھر یہ جو تازہ و تازہ ولایتی خون سامان جنگ کے ساتھ ساتھ لال کنڑوں میں بھر بھر کر آ رہا ہے یہ؟ مہندوستانی مٹی ہندوؤں کو نگل لیتی ہے۔ ان ادوسے پیلے رشتہ داروں سے اُس نے مذہبی عقیدت کے ساتھ جھٹ کر محبت کرنی شروع کر دی۔ اس نے کبھی بچوں کو چومنا تھا اس لیے پہلے پہلے سخت البائیاں آئیں اور جی گھرایا۔ کیا ناک مقوک میں ہنسر سے ہوئے نامکمل انسان! ان سے تو کہتے بدرجہا بہتر۔

اگر خوال کی ماری پتی دوبارہ پڑ میں ٹکنے کی ضد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر سے بہار لوٹ آئے؟ اگر ابھو اچھل طشتری سے بھاگ کر ڈال میں ٹکنا چاہے تو کیا وہ کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ مرغیاں ہی اگر اپنی مال کے پوٹے کے نیچے گھسنے کی کوشش کریں تو کیا سما سکتی ہیں؟ ٹکے ٹکے اس کے شانے ٹوٹنے لگے۔ جتنی جتنی گرفت مضبوط کی ہاتھ پھسلے گئے اور جلد ہی اُسے معانم ہو گیا کہ پسیدہ خرچ کر کے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ جنسی بھوک مٹائی جاسکتی ہے، پیٹ ناک تک بھر جاسکتا ہے۔ مگر ماتا کسی داموں نہیں ملتی۔ کسی کے نیچے کو۔ اپنانے کی کوشش ایسی ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کو آدم میں مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کرے۔ کو بے ٹھوگیں مارتے ہیں سوا لگ، الٹی مور موقع پا کر شامت بلا دیتے ہیں ناجائز بچے کی مال۔ پھر ماں تو ہے۔ ورنہ اگر گولہ پھول لگائے تو کیا ہو؟

سب سے پہلے اُس نے بڑے چاچے سے بڑی بہن کی کچی پر دستب شفت پھیرنا شروع کیا۔ ماں بننے کے بعد شاید وہ کھجیلنے کی تیز بھی خود بخود آ جاتی ہے مگر شمن کو تو اُسے ٹھیک کام آ گیا۔ میں میں کچی دن اور رات روتی۔ جی چاہتا اس جاندار ریڈیو کی ایک بار ہی ایسی کل مر دڑے کہ سدا سے لیے چپ ہو جائے۔ گھٹے لٹا کر نیچے کو تھپکتا بھی ایک فنی ہے۔ ایسی مشین جیسی رفتار ہو کہ سر جھٹکانا کھائے صرف بھو متا رہے اور پھر ساتھ ساتھ منہ مالو کی مدد سے انتہا سے زیادہ عجیب و غریب بے معنی آوازیں

نکالی جائیں تاکہ بچے کو بیک وقت انسان مرغی اور چرخے کی گود میں سونے کا مزا آجائے۔ بخوڑی سی سانس منہ میں جمع کر کے لفظ درے، پر چھوڑ دی جائے ایسے کہ ایک بھوار کی صورت میں درے، ڈھلتے ہوئے سکوں کی طرح دوڑتے چلتے جائیں۔ پھر نالو سے زبان لگا کر انگریزی کے لفظ کیوں کو بار بار ایک خاص تناؤ سے نکالا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی کنپٹیوں پر تصکیکیاں بھی لگائی جائیں۔ اگر یہ تمام حربے بے کار ثابت ہوں تو دو چار آدمیوں کی مدد سے قریب رکھی ہوئی اشیاء کو ہلا کر جھنجھوڑ کر جتنی بھی آوازیں مہیا ہو سکیں مع اوپر دی ہوئی ترکیب کے ایک شوڑ قیامت کی صورت میں بچے کے دماغ پر نازل کی جائیں۔ اگر تصکیکیاں باقاعدہ ہیں، گھٹنے کی رفتار سانس کے مقرر کردہ اصول کی پروری کر رہی ہے تو انشاء اللہ بچہ سو جائے گا اور اس طرح سے سویا ہوا بچہ عموماً جانتے میں بھی دماغی طور پر سوتا رہے گا۔

بچے کو صحیح و سالم دلپس کر کے اُسے یک گیرہ اطمینان ہوا۔ پہلے کو بچی عارضی تھی اگر خدا نخواستہ کہیں خود اس کے وجود سے مستقل طور پر بھڑے پھنسی یا کانگن کی طرح پھوٹ نکلی ہوتی تو کیا حال ہوتا؟ کچھ تعجب نہیں جو اس ہندوستان میں اس کثرت سے بچے مرتے ہیں۔ خود اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر حکے سے وہ بچی کی رضائی اتار کر کھڑکی کھول دے صبح تک نہ بویا اور پھر شام تک جھگڑا ختم، چین سے بیٹھ بھیل کر سوئے۔ خود ان بچوں کی مائیں آنے والے جی کی خبر سنتے ہی پالس ٹرپس کی دایوں سے راز و نیاز شروع کر دیتیں۔ مرض تو نہ جانا لٹی نئی نئی لبتیں لگ جاتیں اور جب وہ نیاجی جنم لیتا تو بھی ہر ممکن کوشش اسے ختم کرنے کی کرتیں مگر آخر کوماں ہوئیں نا! مارنا بھی پالبتیں تو نہ مارا جاتا۔ جو بچی نوزد کی حالت شروع ہوتی مانتا ہے قابو کر دیتی، جاتی ہوئی درج والپس گھسیٹ لائی جاتی۔ سادی ٹر گھسٹنے کے لیے۔ جب پہلی بچی کی ہیبت ذرا ختم ہوئی تو اس نے پھر ایک بچے کی سرسرتی شروع کی۔ یہ بد قسمتی سے ذرا کم رو تھا، صحت خراب تھی اور گندگی سے خاص افس رکھتا

تھا۔ بہت دوا داروں کی مگر جلد امراض اُس کے جسم میں جڑا پکڑ چکے تھے۔ کوئی یہی ایسا مرض ہو گا جو دائمی طور پر اس پر قابض نہ ہو چکا ہو۔ ویسے مرنے ورنے کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔

مجبوراً منجھوٹی کی چینی کی گڑ یا جیسی نیچی کے نام ذرہ پڑا۔ برطانی تیار لوں سے کپڑے بنے اور اس کے شمن نے سنجیدگی سے گود لینے کے مسئلے کو سوچا۔ جاتے وقت منجھوٹی ایسا روٹی جیسے وہ بچی کو زندہ دفن کر چلی۔ ہزاروں نصیحتیں، "مارنا مت، تمہارا غصہ بہت تیز ہے!" وہ کہہ گئی۔ اللہ کی شان ایہ وہی منجھوٹی تھی جس نے ذرا سی عمر سے اُسے انا سے لے کر بالاس تھا۔ یقیناً وہ منجھوٹی کی بد ذات نیچی سے تو ہزار گنا بہتر ہو گی، جیسی تو پل بھی گئی پراسے تو دودن پالنا دو بھر ہو گیا۔

اب لی خبر کوڑوں اور سوروں نے۔ وہ چوچیں دھاڑ دھاڑ کر جھائیں کہ مزا آگیا۔ نیچی بھی سانپ کے منہ کی چھو ندر بن گئی، نہ اگلے بنے نہ گلے۔

"چہ چہ... اے ہے اتنی سی جان کو ماں۔ پھر ڈالیا... تو بہ یہ

"اے ہے پر اے بچوں پر کیا چو بچلا؟ ایسا بھی ظلم نہیں چاہیے؟ جتنی زبانیں

اتنی بکواس۔ جلتی اور اس امید میں سر جھکا لیتی کہ شاید لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔

وہ طعنے بھی برداشت کر لیتی کیونکہ نیچی غضب کی پیاری تھی مگر رات کو ظالم نے

وہ ستم ڈھایا کہ جاڑوں کی رات میں ادلا برف پانی سے نہلانا پڑا۔ دوسرے دن

نمونہ اور دو چار دن میں نیچی ختم۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیچی اُسے شرمندہ کرنے کو شرط لگا کر مر گئی۔ رنج کو شرم اور

غصے نے دبا لیا۔ جی چاہا کائنات وہ دن واپس لوٹ آئے جب منجھوٹی اسے پال رہی

تھی۔ کیا کیا ظلم جتنا کہتی تھی۔ اگر اُسے معلوم ہوتا تو منجھوٹی کے منہ پر طمانچہ مارنے ہی کو

مرجاتی۔ دودن بعد منجھوٹی بیٹھتی کا لکھ لکھنے آتی تھی۔

ایسی ایسی باتیں سننا پڑیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ منجھوٹی نے سارا الزام

اس پر مقوی دیا۔ بس نہ تھا جو وہ اُسے قتل عمد کے جرم میں گرفتار کر دیتی۔ شمن کے

بس میں مبتلا تو وہ ایسی ایسی بس بچیاں جن کو منجھو کے منہ پر بیچ مارتی۔ تو بہ! اتنا چھوڑا نہ سمجھتی تھی منجھو کو۔ اس کا دل رکھنے کو روکنے کی بھی کوشش کی۔ بچی کو سارے سے نئے کپڑے خیرات کو دیے اور دھوم دھام سے پھول چالیسواں کیا، گویا بچی نہیں گن ہوں کی پوٹ مری تھی جس کی بخشش دشوار تھی۔

اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے سمجھاتے وقت صاف کہہ دیا کہ یہی بچی منجھو کو اٹھلی پکڑ کر سیدھی جنت میں لے جائے گی۔ یہ معصوم بچہ سمجھتی ہی نہیں بلکہ زبردست سفارشی بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ جو بچہ شمن نے پھول چالیسویں پر روپیہ بہا یا سب منجھو کے ترشہ خانہ میں جمع ہو گیا۔ پھر بچی منجھو کلچہ پھاڑ بھاڑ کر روتی رہی۔ ایک سر پھر اندری بیچ جٹان کے ہاٹ سینے سے چپک کر پھلنے پھولنے کی اس لگا بیٹھا۔ لاکھوں موجدیں آئیں کہ بہالے جا میں مگر جٹانوں سے سر پھاڑ کر لوٹ گئیں۔ پھر ایک دن وہ بیچ بھی پتھر بن گیا۔ پروفیسر کا خط آیا: یہاں لڑکیاں اتنی فیاض ہیں کہ شاید ہی فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم بطور بھان یا در ہے فقط بھان! آنا چاہو تو مکان کافی وسیع ہے۔

پتھر بن جانے والا بیچ اس مقبور کے بے جیا جھاڑ سے بدرجہا غنیمت ہے جو گھن بن کر سوسائٹی کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ وہ انسانی بھیڑ یا جو کرسیاں توڑنے کا کرایہ ہزار روپیہ وصول کر رہا ہے دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہا ہے؟ شمن نے جواب دیا: ”بھان! نوازی کا شکریہ۔ اگر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھا جائے گا۔“

وقت چھپر پھاڑ کر نہیں آ پڑے گا، تمہیں خود لانا پڑے گا ورنہ یاد رہے یہ وقت آنے میں تو دیر کرتا ہے جانے میں ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہیں کہنا پڑے!

جب کشتی ثابت و سالک تھی، ساحل کی تناس کی تھی!

اب ایسی شکت کشتی پر ساحل کی تناس کون کرے؟

اس عرصے میں اُس نے ایک اور بچے کو اپنا ناچا پامگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انسان

یکسانیت سے کیوں اتنا جاتا ہے۔ جتنی اُس نے پرورش کی یہی اندازہ ہو کہ اُس کی حیثیت بالکل اس زمین جیسی تھی جس کی چھاتی پر چرچر کر رہا ایک اپنا پیٹ بھر لیتا مگر پھر اُسے بچر کہہ کر چھوڑ جاتا۔ یوں تو یہ بچہ بالکل سیدھا سادا تھا مگر باوجود کوششوں کے اس نے اپنی ماں کی آغچل سے محبت نہ چھوڑا۔ شمعن سے اپنی خاطر کر داکہ وہ سیدھا ماں کے کلیجے سے لگ بیٹھتا۔

”پرایا... پرایا“ اس کے کانوں میں بار بار گرم سلاخوں کی طرح گھسنے لگا۔ ایک بار ہی اُس نے جھٹکا مار کر ساری بندہ شوں کو توڑ ڈالا۔ کوئی نہیں اُس کا اور اُسے ضرورت بھی کس کی ہے؟ وہ خود کیا ناکافی ہے؟

دوسرے دن شام کی گاڑی سے اس بکھرے ہوئے خود کو سمیٹ کر روانہ ہو گئی کہاں؟ وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ اُس نے بالکل نہ سوچا۔ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں وہ جہاں چلے جا سکتی ہے۔ اور کیوں نہ جائے؟ مانا کہ کوئی منزل نہیں، یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیوں ہو کوئی منزل؟ ان بادلوں کی بھی تو کوئی منزل نہیں، جہاں اور جہاں جی چاہا بغیر روگرام بنائے چل نکلتے ہیں۔ جہاں جی چاہا برس گئے، جی چاہا تو بھگے کو محکوم دیا اور جی نہ چاہا تو پیاسوں کو ترسائے نکل گئے۔ ان آندھیوں کا بھی تو کوئی گھر نہیں۔ ادھر کا کوڑا اور گھسیٹ لے جانا، سنسان غاروں میں چپخیں مار مار کر دھکے چٹانوں پر سر پھوڑنا، دریا کی تھچل مچوں سے الجھنا اور یوں ہی اُٹھتے گرتے رہنا۔ لطف بھی تو ہے اس خانہ بدوشی میں۔ شاید کبھی کہیں ساحل مل جائے اور یہ بھٹکی ہوئی ٹاپا پار لگ جائے۔ جو نہ لگی تو بھی کیا ہے؟ کچھ ہرج ہے اسی طرح بہتے چلے جانے میں؟ نہ تپوانہ بادبان اور نہ ناخدا کا احسان!

اگرہ!

وہ اُتر پڑی۔ نہ جانے کیوں جی چاہا تاراج محل کو دیکھے۔ شاید عشق و محبت کی اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ کیا لڑکھتے، بیوی کی محبت میں کچھ بنا کر پھوڑ گئے۔ کتنا مقدس رشتہ ہے یہ بھی۔ مگر ایسی ہی یادگار کوئی دنیا والوں

کی محبت میں نہیں بنا دیتا۔ جب کہ لاکھوں ہزاروں سڑک کے پتھروں پر سر رکھ کر زندگی گزارتے ہیں، شہنشاہ اور ملکہ کی روضہ میں کیوں کر چین سے بیٹھ جاسکتا ہے؟ مرنے کے سائبان تلے سو سکتی ہیں؟ باقی عمارت میں چمکا ڈالیں اور اٹھ لیتے ہیں۔ مرنے میں ان کے۔ ان المودوں سے تو کوئی ٹیکس بھی نہیں وصول کرتا! بس یہاں تو مردوں اور چمکا ڈالوں کے ہی ٹھاٹھ ہیں۔ اگر سکھانا منظور ہو تو ایسے گرم کردہ دو سرے جنم میں چمکا ڈال دیا تو کسے روپ میں آنا ملے۔ یہی مکتی کا بلند ترین درجہ ہے۔ ہمیشہ سنا کرتی تھی کہ چاندنی رات میں تاج سج سج اندر کی پیشانی پر چمکا دینا ہو، ایک دم دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن دن ہی میں اس کے اس عظیم الشان لاش کو دیکھ کر روٹنے لگے ٹکڑے ہو گئے۔ شام ہوتے ہی شوقین مزاج کو لے کھڑوں میں داد و تحسین دینے کا موجود رہے۔ سستے مال سے آراستہ دھوڑیں، جن کے چہرے مفید پاؤں کی اخراط سے بھول میں دبائی ہوئی شکر قندی کی طرح مٹا لے ہو رہے تھے، اور اس حشر عیش میں بھٹنوں کا کردار ادا کرنے کے لائق بھی نہ تھیں۔

یہ مردے کے سینے پر بیٹھ کر جینے میں ان لوگوں کو خاص لطف کیوں آتا ہے؟ کیا کشش ہے ان قبرستانوں میں جو زندگی کی ہر حسین انگریزائی ان کے سر پر توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید جذبہ انتقام کچھ نسکین پا جاتا ہے، تم۔ یہ اپنی ناموری کے لیے صدیوں کا خون ان عمارتوں کی بنیادوں میں نچوڑ دیا۔ اور ہم؟ کسی نعل کے کمرے سے نہیں بچھکتے۔ کاش انتقام سیدھے راستے پر چل سکتا، اور یوں نہ ٹھکاتا۔

لاہور

اُس کا اور بھی جی گھبرا یا۔ اگر اسے اختیار حاصل ہوتا تو شاید اس سے زیادہ دلچسپ بنایا جاسکتا تھا۔ نورجہاں کے مقبرے کی عرصے سے دھوم مچی تھی مگر اُسے یہ دیکھ کر ہنسی آگئی کہ وہاں بھی، گدھوں کو ہی سکون نصیب تھا۔

نورجہاں! دل کی گہرائیوں میں ایک عورت کی لڑتے دوسری عورت کے دل میں کچھ کھٹک سی پیدا کر دیتی ہے۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو نورجہاں سیکم کی ہستی پر

یوں چھا گئی! اور کون جانے اسے شیرانگن سے زیادہ عشق تھا یا جہانگیر سے! یا پہلے شیرانگن سے اور پھر جہانگیر سے! اور ہو سکتا ہے ایک ہی وقت میں دونوں سے رہا ہو۔ عورت کے دل میں محبت کی جدا جدا کوٹھڑیاں ہیں۔ کسی میں مانتا کی، کسی میں شوہر کی محبت اور کسی میں عاشق کی!

اور پھر اس نے خود اپنے دل میں جو بانک کر دیکھنا چاہا۔ یہ اس کی کوٹھڑیوں میں کیا ٹھنسا ہوا تھا؟ دھندلے اور بادل کے سوا کچھ نہ سوچا۔ کاش وہ ان اچھے ہوئے ڈروں کو سلجھا کر الگ الگ پیناں بنا کر رکھ سکتی۔ عاشق، محبوب اور دشمن۔ سب بھی لکے چہرے دھندلے ہو چکے تھے۔ فیمل لے کر صرف ضروری نقشب گہرے کر دیتی اور باقی دقت کے گھسوں سے آپ ہی مٹ جاتے۔

دہلی!

اسے ہر چیز میاں اور بد نظر آئی۔ ٹوٹے مکان بنا جانے والوں کو کھڑے کوس رہتے ہیں۔ سرطانی ہوئی موریوں جو کسی کی ملکیت نہیں۔ بھوکے کتے، سڑک کے بد نصیب بیٹے، نہ جانے کس کی فرمانبرداری میں کس کی رکھوائی کر رہے ہیں۔ بے چارے دیواروں پر پھیلے ہوئے گھناؤنے امراض کے علاج جو لپکا لپکا کر لینے والوں کی بدوائی کی داد دے رہے ہیں مگر اس کی سوتیلی بہن نئی دہلی؟ صاف، ستوری، اجاڑ، منساں! معلوم نہ تھا بے چمکا دڑیں یا رخصت ہوتی ہیں۔ بالکل جدید تاج محل کا نمونہ۔ کبھی بہت اور نئے آقا آئیں گے تو اسے الی کے ابدی مالکوں کو دمپ کرنے استعان بنائیں گے۔

مگر یہ قطب مینار اتنی بلند مگر کتنی بیکار! یہ اکیلا پاگل سادہ وازہ اسی کے کیا معنی؟ یہ کیوں محبوت کی طرح ہاتھ پھیلائے کس کے لیے آغوش دیکھے ہوئے ہے؟ کہاں؟ کہاں؟ وہ کہاں جائے؟ اس بھول بھلیاں میں راستہ کیوں نہیں ملتا؟ جی چاہا پروردہ چار کر باہر نکل جائے۔ پرسکون خلا میں کچھ نہیں ہوگا اور کتنا ہوگا۔ روپیہ ختم ہو چلا تھا۔ واپس جا کر کہیں نوکری تلاش کر لینا مشکل کام نہ تھا۔

لوگوں کو؟ وہ کس سے پہچھے! ایلیا اُسے ایک دم یاد آگئی۔ یقیناً اُس نے اپنی مکیوں کا جواب پالیا ہوگا۔ وہ اُسے ضرور تسکین پہنچائے گی۔ وہ سیدھی بانٹی پور روانہ ہوگئی۔ ایلیا کو دیکھ کر اُسے رشک ہوا۔ وہ کتنی سنبھل سی تھی۔ وہ مسلسل تھکان کے آثار مٹ چکے تھے اور بڑی مستعد اور حسیت نظر آ رہی تھی۔ تھا ہی کیا ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لیے سوائے تنہا اور نہ گورنے والی مٹھیں گھڑلیوں کے۔ پھر بھی ایلیا فوش تھی۔ اپنے حبابوں وہ رات کی بیوہ کی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ سسرال میں کا شور۔ سب اس ایک جان کے وجود سے مالا اور کھو گیا۔

پروفیسر ناٹھن اب بھی اُس پر مہربان تھے۔ شام ہوتے ہی آجاتے اور رات بگٹے تک کپ شپ رہتی۔ کتابوں کے اس کیرٹے کو اتنا زیادہ دل دیکھ کر وہ متحیر رہ جاتی۔ اُس کے ساتھ اور بھی چند پروفیسر آجاتے۔

”ان سے ملو شمن، روٹی ٹیڈی“ ایلیا نے اُسے ایک طرف بلا کر کہا اور شمن نے دیکھا وہ ایک چھٹے سے سر اور شرتی بالوں والے گورے سے ہاتھ ملا رہی۔ جسے اُس نے محبوبہ اُسی تعارف کا جواب دیا۔ اُسے ایلیا کا یہ طریقہ قطعاً پسند نہ آیا۔ ٹیلر کو وہ اس قدر عزت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی گویا کوئی معجزہ کیونکہ وہ انہیں ہنگامہ ان گھر میں پدھارے ہیں۔ اُسے ہندوستانیوں سے ان کی نفرت تھی جو ان سفید چڑی والوں کے ذرا سے منہ لگانے سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنا نہیں جانتے کہ یہ لوگ جو ہم سے ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ واپس اپنے ملک جا کر لوگوں کو جبرست زدہ کریں کہ وہ ہم دونوں کے اتنے قریب پہنچ کر مطالعہ کرتے ہیں۔ پرنس ہی ہم نے انہیں کاٹا اور نہ ہماری سیاسی لیے ان کی سفیدی کو گد لا کیا۔ ہماری تصویریں دکھائیں محے کہ یہ ہیں وہ جنگلی بندر خچیں ان کی تہذیب کی بولنے کی طرح سے پہننا سیکھا دیتے ہیں۔ اوھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شمن کچھ اُداس ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کی مگر پھر دلی الجھن میں لگ گئی۔ اتنا کہ وہ کتابوں کی الماری میں لگی کہ نہیں لوگ اُسے بالکل احمق نہ سمجھیں۔



”ضرور پڑھو... لا جواب ہے“ اُس نے مڑ کر دیکھا، ٹیکر اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا جو شمن کے ہاتھ میں تھی۔  
 ”شکریہ!“ اُس نے بے توجہی سے کتاب رکھ دی اور دوسری اٹھالی۔  
 ”ایک بات...“ ٹیکر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، ”میں انگریز نہیں آئرش ہوں“

سفید رنگ کا پر آدمی انگریزی ہو سکتا ہے۔ اس رنگ کی کچھ ایسی ہیڈیت بیٹھی ہوئی ہے کہ دوبارہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے اُسے ابھٹک گئیں، گھوڑوں اور سفید انسانوں کی کبھی پہچان نہ مل سکی۔ سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ گو بہت سے لوگ دانتوں، کھردن اور چال سے نسل پہچان لیتے ہیں پر نہ جانے کیسے؟  
 ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”اُدھ میں خوب جانتا ہوں“ اُس نے شرارت سے اپنی بے پلکوں والی آنکھ ماری کہ بڑی آسانی سے شمن اسے اقلیم جرم میں پکڑوا سکتی تھی۔ ہر قسم لوگ سفید چڑا دیکھ کر ہی بدظن ہو جاتے ہو اور اس میں گتہارا افسوس نہیں؟  
 ”بدشمتی ہمارا!“ جل کر شمن پھر کتابوں کی طرف جھک گئی۔

”میرے پاس کچھ تازہ ترین کتابیں ہیں۔ اگر شوق ہے تو...“ شمن کو بے اعتبار سے دیکھتا پا کر وہ کچھ کھسیانہ سا ہو گیا، ”معاف کرنا اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو۔ کہتے ہیں عورت کو سلام بھی کرو تو گالی سمجھتی ہے... مگر میں سمجھا تھا تم ایلما کی دوست ہو... شاید تم بھی اسی کی طرح...“

اتنے میں ایلما نے چائے کے لیے پکار لیا۔

”اُدھ سے تم ٹیکر سے نہیں ملیں شمن...“

”ہم مل چکے!“ ٹیکر نے معجزی صورت بنا کر کہا۔

”اُدھ نہیں...“ شمن یہ جملہ نرم کے بہت شوقین ہیں۔ لڑائی میں شریک ہونے

پہلے... کیا لکھا کرتے تھے ٹیڈر؟

”مائٹریس تھے اخباروں کے“ پروفیسر ناخن کوبے۔

”ربڑا لائق آدمی ہے اور... ہاں بھئی اُسٹھو سینیا نہیں ملے گا پھر“ ایلمانے بیوقوفوں

کی طرح سب کو گڑبڑاانا شروع کیا۔

فلم رڈی ہی نہیں انتہا سے زیادہ پھر تھا۔ چنا گورے جنگلیوں کینچ میں داد طلب بہادری، سخاوت اور انسانیت کے جوہر دکھانے سے تھے۔ ٹیڈر چند سیٹیں چھوڑ کر بیٹھا تھا مگر کئی دفعہ جب شتم نے اُس کی طرف دیکھا تو اُسے بھی اپنی طرف دیکھتا پایا اور کئی بار بے ساختہ دونوں کو سنہسی آگئی۔

”اب بھی میرے اعمال نامے میں لکھ لیا۔“ کھیل کے ختم ہونے پر ٹیڈر نے مارن مارن صورت بنا کر کہا اور شتم نے زور سے سنس دیا۔

رات کو ایلمانے شتم کی بے انتہا تعریف کی۔

”تم بھول رہی ہو مگر یہ سفید چمڑی وارے کیا ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو یہ دنیا کے مارے دھتکارے یودی، پولش اور نہ جانے کون کون صرف اپنی چمڑی کے بل کوپے پر یہاں آکر بیٹھنے لگے۔ آج کل تو جسے دیکھو شیر کی کھال اوڑھے شیر بنا پھر تا ہے۔ یہاں تو جو ہمارا بن کر آتا ہے آقا بن بیٹھتا ہے۔“

”کچھ اس میں ہمارا بھی قصور ہے۔ ذرا بازار میں جا کر دیکھو ہزاروں فقیر بھانگے اور دکاندار صاحب، دسہ کار، کھد کردوڑ پڑتے ہیں۔“

”وہ بیچارے کیا جانیں کون ہیں یہ۔ چاہے وہ انھیں کی طرح کبھڑے، جلا ہوں مگر معلوم تو صاحب ہوتے ہیں اور رہتے بھی ٹھٹھاٹے ہیں۔ ہم سے تو ہمارا مہمان ہی اچھے۔ ہم خود بھوکوں مر رہے ہیں مگر یہ دیکھ لو میزبانی میں فرق نہیں آتا جب انہیں تیز سے رہنا نہیں آتا تو پھر دھکا مار کر نکال دینے کو کیوں سچی نہ چاہے؟“

”اور یہ بھی منظم ہی ہیں ٹیڈر کے مارے۔“

”ٹیڈر کے منظم بھی ہمارے نظام ہیں۔ ذرا سوچو ہمیں ان سے کیا سہار دی ہو سکتا

ہے! ہم بیکتر سے بچ کر کہاں جاویں؟ ہمیں تو کوئی اپنی زمین پر قدم بھی نہ دھرنے دے گا۔ مگر اہلیا اُدھکھ چلی تھی۔ نہ جانے اس کو کیا ہونا جارا تھا۔ کالج کی وہ جو شیلی اہلیا مریچکی تھی اور اب یہ ماریچکی اہلیا ہر عجوبہ دہی کے آگے سر جھکانے لگی تھی۔

صبح اٹھ کر اہلیانے کہا کہ لو کر کر کے کر شہر سے جنس لے آئے کیونکہ اُسے کچھ حرارت معلوم ہوتی تھی۔ اناج کی قلت نے بُری طرح حیران کر رکھا تھا اور جبکہ تو راشننگ مہوگی تھی مگر اس حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ روز بروز اناج اپنی مرضی سے ہٹکا ہونا جارا تھا۔ گھر میں جتنا پہلے گئی کا خرچ تھا اس سے چوگنا تو صرف گہنوں پر صرف ہو جاتا تھا۔ اور گھی کا تو کیا پوچھنا، گھاس کا گھی بھی انمول ہوا جارا تھا۔

”بھیلو،“ کسی نے پکارا۔ دشمن نے مرط کر دیا تو ٹیلر اپنی چندھی آنکھوں میں جاذبیت پیا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خفک گیا بولی اس رنگتے ہوئے رست ہندوستان سے۔ سوچا لاؤ کوئی مصیبت ہی مول لوں“ وہ شرارت سے مسکرایا اور دشمن کو بھی سنہی آگئی۔

”ارے مجھے سخت ناامیدی ہو رہی ہے؟“

”کیوں؟“

”میں سمجھتا تھا کہ ج کہ برس پڑو گی۔ خیر فال اچھی رہی اس لیے دوسری ترکیب چلنا پڑے گی؟“

”وہ کیا؟“

”کہ چلو میرے ساتھ چائے پیو“

”مگر میں سامان خریدنے آئی ہوں“

”چلو پہلے سامان خریدیں پھر لو کہ چلتا کریں گے“

ہر دوکان پر ٹیلر کو دیکھ کر دکانداروں نے چو گئے دھم کرنے لگے۔ چاروں طرف سے وہ بے چارے کی کوشش کو اُسے رخصت کرنا پڑا۔

”تم سامنے ہٹو میں پیٹرو میں سامان خرید کر آتی ہوں“

”کیوں؟“ وہ بگڑا۔

”تمہاری مہر جو دگی سے بھاؤ بگڑا ہے کیا رہے ہیں؟“

”ارے وہ کیسے؟ اچھا اب میں کچھ لہروں کا بھی نہیں“

”وہ تم کچھ بھی کر دو۔ تم بھی تو شاہی خاندان سے جو اس لیے...“

”میں کیوں جو شاہی خاندان سے بہشت؟“

”یہاں واسے ہر سفید جھڑی والے کو بادشاہ سلامت کا بھائی بھتیجہ ہی سمجھتے

ہیں۔ انکساری ہمارے گھٹی میں پڑ چکی ہے اور تم جہلتے ہو یہ گھٹی قریب سو سال سے ہیں

کون پلار ہا ہے“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ٹیٹر جا کر پوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو کر انتہا کر کے  
نکا شمن خوب بھاؤ تاکر کے سامان خیر بد کی تو کاٹری کر ایہ کسے روانہ ہو گئی ٹیلر بالکل  
اُس کے ذہن سے اتر گیا لیکن جونہی وہ گھر پہنچی اُسے فوراً یاد آیا اور جلدی سے سامان  
اتر داکر اُس نے اسی گاڑی میں واپس بھاگنا متنا سب سمجھا۔ جونہی گاڑی بھاگک  
میں داخل ہوتی ہوئی دوسری گاڑی سے قریب قریب ہم آغوش ہو گئی گاڑیاں ایک  
دوسرے کو خوبصورت رشتوں سے نوازنے لگی۔ دیکھنے کے لیے سر باہر نکالا تو تیار کو  
اُترنا دیکھ کر سُن سے رہ گئی۔

”میں بالکل بھول گئی“ اُس نے لجاجت سے کہا، ”سامان کی گرا بر میں۔“

”یہ میری عزت افزائی ہے“ ٹیٹر نے طنز پر ادب جھک کر کہا، ”مجھے پتہ

نہ تھا کہ ایک زندہ انسان سے تمہیں بلدی، دھنیا اور چاول زیادہ دلچسپ

معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تمہارا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی مگر میں داد دیتا ہوں

کہ تم ناچار چیزوں کو بڑی خوش اسلوبی سے طال دیتی ہو“ وہ مڑ کر چلا۔

”مگر... شمن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ پھر لوٹا۔“

”کس گاڑی میں چلو گی؟ اپنی میں یا یہ جو میں لایا ہوں؟“ اُس نے بالکل ایلے

پوچھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

جب گاڑی کافی دور نکل گئی تو ٹیکہ ایک دم ہٹنے لگا۔

”اؤ فو... یہ لوکیاں“

”تم دل ہی دل میں ہم ہندوستانی لوکیوں کو جنگلی، غیر مذہب اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہو... مگر...“

”مگر ہندوستان پر کیا موقوف ہے، دنیا بھر کی لوکیاں ایسی ہی جیٹھی ہوتی ہیں۔ وہ شرارت سے مسکرایا، تم سمجھتی ہو گی ہماری لوکیاں ادھر بلا یا ادھر دوڑیں۔“  
”کم از کم ہندوستانیوں کا تو یہی تجربہ ہے۔ دیکھ لو یہاں تک بندھی چلی آتی ہیں۔“  
”وغلط، بالکل غلط۔ جو ہندوستانی کہتے ہیں وہ ایسی دلیسی لوکیوں سے ملتے ہوئے گئے۔ وہاں کی اچھی تعلیم یافتہ لوکیاں بڑی خشک ہوتی ہیں۔ اور یہ نگلی بھوک کی فقریاں کہاں نہیں گزرتیں؟“

”تو وہاں بھی لوگ شکے بھوکے ہیں؟“ شمن نے بن کر قطعہ دیا۔

”کیوں نہیں۔ تم سمجھتی ہو وہاں سب لارڈ اور برین ہی رہتے ہیں۔ تم جو مٹھی بھر انگریز بکھیتی ہو یہ تو ہندوستان کی قسمت سے ایسے نظر آتے ہیں اور نہ حیرت تک دنیا میں شیطان موجود ہیں لوگ شکے بھی رہیں گے اور بھوکے بھی۔“  
”اس حد تک؟“ گزرتی ہوئی گاڑی میں سے شمن نے مرجھائے ہوئے سرطانڈے

فقریوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”نہیں اس حد تک تو نہیں“ ٹیکر نے پھر بری لی، ”ہندوستان آنے سے پہلے

نہ جالے کیا کیا سوچا کرتا تھا...“

”یہی کہ لبس نواب راجہ سونے پیرے سے مرصع ہاتھی...“

”بالکل یہ تو نہیں پہاں خیال تھا اتنے دن کی حکومت میں ان لوگوں نے

کچھ تو کیا ہو گا۔ مگر یہاں آنے سے کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک آدھ کتاب ہندوستان

کے متعلق پڑھی تھی۔ پھر بھی یہ دیکھنے کی امید نہ تھی۔“

”اور اب یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد سارا الزام ہمارے ہی سر پر پانا۔“

”سارا تو نہیں... کچھ ضرور....“

”لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ بھی ہمارے سر منڈھنے کا...“

”... یہ تم لوگوں کی میں نے عجیب خصلت دیکھی ہے کہ تم اپنے آپ کو ضرورت

سے زیادہ بے گناہ اور غیر ذمہ دار ظاہر کرنے میں فخر سمجھتے ہو۔ آخر انسان ہو، حیوان تو نہیں“

”حیوانوں کے ہاتھوں مجبور تو ہیں“

”اور جیسے مہندوستانیوں میں ایسے حیوان نہیں“

”ہیں، انھیں کے پٹھو“

”تو یہ کہو یہاں کے اور وہاں کے حیوانوں کے جتنے نے ایک دوسرے کی مدد سے ملک کا یہ حال بنا رکھا ہے۔ مگر سچ بتانا، اپنی ذات سے تم نے اب تک اس جتنے کو توڑنے کی کیا کوشش کی ہے، کون سی قربانی کی ہے؟“

”قربانی کرنے والوں کی گت دیکھی تم نے؟ کیا حال کیا گیا ان کا!“

اور واقعہ بالکل تازہ تھا۔ ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈکٹوں میں پورے زور و خروش سے رونا ہوئیں۔ سفید قوم کو کھلا دھکم، مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے، نہیں مانگتے تم اور نہ بسیں جلاؤ الیں گے، ریل کی پٹریاں اکھڑ دیں گے، یہ تمہارے مہیٹ اور مائیالی جلا دیں گے۔ مگر سفید باؤشا اس بغاوت کے زکام کو بجائے گوکہ بارود کے لاطھیوں سے ہی راہِ راست پرے آئی۔

چوہے دان کا پٹ کھلا اور بالائی غائب، دو چار ہی دن میں بے سری نوج کو حاکمیت کے ہاتھ نے روند کر صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ اہنسا بھی اتنی بے ضرر نہ تھی جتنی یہ بغاوت ثابت ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا چند نا سمجھ بچے چل گئے تھے کہ ہم تو چاند لیں گے۔ ایسے بچوں کو تو بس دو طرح سے درست کیا جا سکتا ہے، یا تو بچی کا چاند دے دو۔ مگر یہ بچے

برطسے جیٹیا رہیں صاف پتی کو پہچان گئے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ لگاؤ ایک تھپڑ اور کہہ دو جب آبا بازا سے آئیں گے تب چاند ملے گا۔

مگر کون جانے جب آبا بازا سے آئیں تو جتنکے ہوئے ہوں یا ایک سرے سے چاند کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔

”اتنا سلیقہ نہیں اٹھیں کہ چاند سچی مچ کا دیدیا جائے۔ پھاڑ پھوڑ کر الگ کر دیں گے، آپس میں بھائی بھائی جھگڑیں گے، نوچ گھسٹ کر پھینک دیں گے۔ ہمارے پاس سیف میں رکھا ہے چاند حفاظت سے، جب بڑے ہو جاؤ گے تب ملے گا۔“

مگر کب بڑے ہوں گے؟ یہ تو آیا ہی جانیں۔ کتنے ہی بڑے ہو جاؤ اطمینان دلاؤ مگر ماں باپ کے دل میں تو وہ کل کے بچے ہی رہیں گے۔ اور پھر جانے آبا بازا سے ملیں گے یا وہیں دھرے رہ جائیں گے؟ ہٹلر تو کبھی اڑا رہا ہے، پالے پر پالا مارتا جا رہا ہے، کون جانے چاند بھی دی مارے جائے!

”ہاں... اور تاریخ ہمیشہ ان کی اس حرکت پر لعنت بھیجے گی۔“ ٹیکر نے سنجیدگی سے کہا۔

”مگر مورخ بھی تو یہ خود ہی ہیں، ہم تو وہی پڑھیں گے جو آج تک پڑھتے آئے ہیں۔ یعنی ان کی عقل مندیاں اور اپنی بے وقوفیاں۔ ہر زمانے میں آٹھ کھول کر انہی کی شان میں قصیدے پڑھتے شروع کیے۔“

”مگر اس مرتبہ امریکہ جو موجود ہے۔“

”امریکہ کب موجود نہ تھا؟ مگر وہیں تک جہاں تک ایک ڈالر کے دس بننے کی امید ہے۔ روٹی کا بیوپار نہیں جنگ کا سہی۔ اب ان کے گن اور گانے بڑیں گے۔ گرتوں کو سنبھالنا، ہارتوں کو جتنا مارو، مارو رول کو طاقت بخشنا انہی کا کام ہے۔ اب ہماری پتی ہوئی سرکار کے سر پر اٹھیں نہ لاسٹہ کھا۔“

”نہیں ایسا نہ ہو گا۔ ہم ہیں سے بہت سے نہ معلوم کن منالطولی میں مبتلا رہے، اب ہماری بھی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی کچھ ہو ہی جائے گا۔ ہم میں سے کئی کے چند ہیں جو ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں، ان میں سے نہ جانے کتنے تو آپس جا کر بھیل بھال جائیں گے، شاید چند ایسے بھی ہوں جو کچھ یاد رکھیں۔“

”کہیں کپلنگ کی طرح یا دنہ فرما نہ لگیں۔ یہ زمانہ کپلنگ نہیں پیدا کر سکتا۔  
تم دیکھنا اس جنگ میں انسانیت نئی روشنی سے کرب پیدا ہوئی۔ اسے ہم کہاں نکل  
آئے؟ گاڑی والے؟“

”باتوں باتوں میں تہہ بھی نہ چلا اور گاڑی کافی دور نکل گئی۔ گاڑی والا بھی کچھ  
متحیرانہ دو مختلف عناصر کو دیکھ کر کھوسا گیا تھا۔ دونوں نے اتر کر ایک  
ہوٹل میں جانے پی۔“

”ایلیا کے بعد میں دوسری ہندوستانی لڑکی سے ملا ہوں: دیکھو نا امید  
نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے اتنا پرہیز کیا جاتا ہے۔“

”اس میں سہارا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں تو ہمارے لڑکوں کو قیمتی  
سمجھتی ہیں کیونکہ شوہر کی حیثیت سے وہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں وہ  
اپنے ہی رنگ میں پسند کر رہا آسانی زندگی گزار سکتی ہیں۔“

”تو کیا ہندوستانی لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں؟“ وہ چاہیں تو یورپین لڑکوں  
کو ہندوستانی بنا سکتی ہیں۔ اسے اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے  
دکھانے کی طاقت پوشیدہ ہے، وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے۔  
”یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ اونچی نسل کو بیٹے دے  
دیتے ہیں مگر لیجئے ہمیں تاکہ دعبہ نہ آجائے۔“

”مہشت... بالکل پرانی باتیں۔ تم سوچتی ہو گی ایسا، میں تو بڑی خوشی سے  
ہندوستانی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔“  
”قول سے فصل مشکل ہے۔“

”مگر یقین دلاتا ہوں۔“ رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی لہذا لوٹ آئے دونوں۔  
”شمن جب ہنسی تو ایلیا دیکھ کر مسکرا اٹھی۔  
”بڑی گاڑھی چمن رہی ہے۔۔۔“

”صاحب لوگ جو ہوئے نا۔ سمجھتے ہیں اس طرح ہماری عزت افزائی ہوتی ہے۔“



کہاں ہم خاک کے ذرے اور کہاں وہ آفتابِ عالم تاب !  
”بیلر ایسا نہیں“

”اجی سب ایک ہی مل کے نکلے میرے میں“

”تیرے پھر کیوں گئی تھیں اس کے ساتھ“

”یہ دکھانے کہ ہم اتنے جاہل نہیں جتنا تمہارا رے بیوپاریوں نے بنا رکھا ہے۔“

ایلیا جی اکتا گیا، ابھی میرے لیے بھی کوئی کام ڈھونڈ دو۔“

”فوج کے دفتر میں...“

”بھئی یہ فوج دوج سے تیرے مجھے معاف رکھو۔ مجھے اس دوسروں کی جنگ لڑنے

سے کیا دلچسپی؟“

”کیا مطلب ہے؟ کیا چٹپے کو آجانے دو گی؟“

”میری بلا سے چٹپے آئیں یا چندھے۔“

”وہ لوٹ مار کریں گے کہ توبہ بھلی۔“

”اور یہ کیا کم لوٹ رہے ہیں۔ دوسرے لوٹیں گے انھیں جن کے پاس کچھ ہے،

اور جو آپ ہی مر رہے ہوں انہیں وہ کیا ماریں گے؟ ان ننگے بھڑکے کسانوں کا نہ

کسی نے اب تک کچھ بگاڑا اور نہ کوئی بگاڑ سکتا ہے۔ اچھا ہے یہ دولت مند لیں تو یہ

”ارے بھائی اپنے دولت مندوں کو خود لوٹو ایک بات بھی ہے، دوسروں

سے لٹوانے میں کیا عقلمندی ہے؟“

”خود نہیں طاقت تو دوسروں کی مدد سے بھی۔“

”ارے کہیں بندر نے جلیبیوں میں بٹوارہ کیا ہے؟ دیکھ لو رہی ہو یہ باہر کی

مرد کا نتیجہ اتنا ریخ گواہ ہے کہ جس کی مدد مانگی وہی ظلم ہی بیٹھا۔ اب تو جب ہی کچھ ہو گا

جب ہم خود کریں گے۔

”تم دلی کے چادر بہت کم لائیں۔“ ایلیا نے ایک دم سیاست کے میدان

گھر کی چادر دیواری میں جھلا ننگ لگائی۔

”طے ہی نہیں۔“

”لاٹونسے تہیں دکان نہیں بتائی۔ ایک بنیائے پروفیسر کا جان پہچان، وہ  
وے دیتا ہے جتنے بھی مانگو۔ یہ سوٹے چاول سے تو کھن آتی ہے۔“  
مگر یہ کھن آنے والے چاول بھی بازار سے اڑ کر نہ جالے کہاں روپوش ہوئے  
لگے۔ کچھ ایسا مرض پھیلا کہ اندر ہی اندر چاول چاٹ گیا۔ کپھوں کو بھی کھن لگ  
گیا۔ کھن بھی ایسا ویسا نہیں بھینسا کھن!

”ارے اٹھو نا۔“ ایسا لے جھوڑ کر جگایا۔ روز تو وہ اسے دن چڑھے  
تک سونے دیتی تھی۔

”کیوں؟“ ایسا نے کڑوٹ بدل لی۔

”ارے وہ تمہارا صاحب بہادر کھڑا ہے۔“

”کون صاحب بہادر؟“

”ارے نبوت، وہی ٹیکر، اٹھو نا۔“

”لعنت، تمہارا بھوکا صاحب؟“

”دیکھنا ہے۔“ ایسا چھیرانے کو منسی۔

”کیا؟“ شمن اٹھٹا بیٹھی۔

”کچھ نہیں۔ تو پھر اٹھتی کیوں نہیں؟“

”چڑیل!“ شمن نے تکیہ کھینچ کر مارا۔

پروفیسر کو بھی لے لیا اور چاروں مل کر ٹیلی کی لائی ہوئی ٹیکس میس روانہ ہو گئے۔

پکنک کا ارادہ تھا۔

”ہم لوگ تو عموماً مقبروں میں پکنک مناتے ہیں۔“ شمن نے کہا۔

”یا خدا، یہ کیوں؟“ ٹیکر حیرت سے بولا۔

”تاکہ برگت ملتی رہے۔“

”بھئی ہمیں لا برٹری میں ضروری کام ہے، تم اور ٹیکر چلے جاؤ۔“ پروفیسر اور

ایسا شاید گھر ہی سے کوئی سازش رکھے آئے تھے۔  
 ”تو میں بھی ساتھ چلوں“ پروفیسر کو خاموش اور ایلما کو بے توجہی سے دوسری  
 طرف دیکھتے پا کر اُس نے جلدی سے بات پلٹی۔ ”میں گھر چلی جائوں گی مجھے ذرا  
 کام بھی ہے۔ کپڑے وغیرہ ٹھیک کرنا ہیں۔“

”واقعی؟“ جب پروفیسر اور ایلما اچلے گئے تو ٹیلر نے پوچھا  
 ”کیا؟“

”کہ تمہیں گھر جانا ہے اور بہت ضروری کام ہے؟“  
 ”ہاں۔ کیا کچھ اعتراض ہے؟“ شمن نے بھی اُلٹا قہر جواب دیا۔  
 ”بہت سخت، کیونکہ...“  
 ”کیا؟“

”میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی۔“

”ابھی کھانے کا وقت دور ہے۔“

”کیا عہد اجواب ہے؟“ وہ براہِ مان گیا۔ شمن کو سنسی آگئی۔  
 ”ہمارے یہاں ان باتوں کو ابھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تمہارے  
 ساتھ گھومتے دیکھ کر لوگ نہ جالے کیا کہیں گے۔“

”چھوڑو، ان لوگوں کو... اگر تم جیسی لڑکیاں ہی لوگوں سے ڈرتی رہیں گی  
 تو پھر مل چکی آزادی تم لوگوں کی؟“

”رگیا اسی طرح گھوم پھر کر تو تم نے آزادی جیتا ہے۔“

”یقیناً... جتنے ملک ان لوگوں کی، کی ہدایت سے پاک ہیں صوب آزاد ہیں۔“  
 ”بے شک نہ چاہو تو سب ہی کچھ کہہ سکتے ہو، آزاد ہونا یہ۔“

”بھوڑو اس آزادی کے جھگڑے کو اور مغوڑی دیو کے لیے میری رخت قومیت  
 کو بھول کر میری کوئی بات سننے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ ذرا  
 کسے ذرا اس نفرت کو بھول جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برسوں سے چل رہی

ہے۔ مورچے پر لڑنے والے سپاہی تک ایک بار سب کچھ بھول کر آپس میں انسانوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اتنا سوچو ایک پردہ سی انسان اپنوں سے دور تمہاری ہمان نرازی کا طلب گار ہے۔

”کی تو تھی ایک دفعہ تمہارے ہی بھائی بندوں کی ہمانداری... بیٹے بن کر گئے

اور...“

”چچہ... بڑی خراب زبان ہے تمہاری!“ وہ خوش مزاجی سے ہنسا۔

”دوسرے حربے بیکار پر طے رہنے سے ساری تیزی اسی دھار رکھنے میں صرف

ہوگی۔ وہ مثل مٹی ہے کسی کے ہاتھ چلیں اور کسی کی جیب!“

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی میٹری۔ کرایہ چھ روپے ہوا تھا مگر ٹیکس نے دس روپے دے

دیے۔ اُس نے جب ریزگاری کے لیے لاچار رہی سے جیبیں ٹٹولیں تو ٹیکس نے ہاتھ کے

اشارے سے منع کر دیا اور چلنے لگا۔ ڈرائیور نے جھک کر ایک سلام دیا اور دشمن کی

غصے سے بھری نظروں کو دیکھ کر صرف مسکراتے پر اکتفا کی۔ گویا کہتا ہے: ”اگر تمہیں بھانجی

مارنے کو! ہونا کھوئی۔ روزانہ اتنی میہوں کو لاتا ہوں وہ کچھ بھی نہیں سوچتیں!“

”یہی تو ہے وہ چال جس کی بدولت تم لوگ یہاں حکومت کر رہے ہو!“ اُس

نے ٹیکس سے کہا۔

”یا خدا، کیا ہوا؟“

”پر تم نے چار روپے بخشش دے کر اُس کی روح تک خرید لی۔“

”ارے! مگر میں نے قطعی اس خیال سے روپیہ نہیں دیا۔ بلکہ مجھے معلوم تھا وہ

زیادہ سے زیادہ دو روپے نوٹ میں سے واپس کرتا باقی کے لیے کہہ دیتا ہیں ہے اور

یہ بھی جانتا ہے کہ میں کہاں نوٹ بھنانے دوڑتا پھروں گا۔ میں نے کہا جہاں دو دو ہاں

چار۔ صرف ہی کیا ہے ہمارے روپے کا؟ کس کے لیے کہا میں؟“

”عیش اڑانے کے لیے؟ جس کے لیے تم لوگ بنے ہو؟“

”یہی ہوتے ہیں ہمارے عیش۔ کچھ تانگوں پر کچھ موٹر پر اسی طرح روپیہ اڑ جاتا

ہے اس کے طعنے کی پروا نہ کر کے ٹیکر نے خود سے کہا۔  
 کھانا کچھ سونا رہا۔ ٹیکر بڑا احساس اور خاموش سا ہو گیا۔ شمن کو بڑی خوشی ہوئی۔  
 کبھرت غریب کرنے کی کوشش میں اسے یہاں لایا ہے۔ ہول سے وہ بید صاف ہے  
 گھر پہنچا گیا۔ ایسا رات گئے۔ جب وہ سو گئی تب آنی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جب وہ ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا ٹیکر بیٹھا ایسا کو  
 انی الیم دکھا رہا ہے۔ معمولی صاحب سلامت ہو گئی۔ حسب ایسا دیکھ چکی تو اس نے الیم  
 شمن کو کپڑا دی اور خود جائے لانے چل دی۔

معلوم ہوتا تھا الیم نہیں کوزے میں شہر کے شہر بھر دیے ہیں۔  
 ”ہم الیم!“ اس کے دماغ میں گونجا۔ کتنا لطف آئے یہ کھلنے ذرہ ذرہ ہو  
 کر اڑ جاؤں۔ پر ہندوستان کا تو یہ ہم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کچی مٹی کا سینہ چیر کر کیا لطف  
 لیا جاسکتا ہے! وہ تو انیس گرم گرم ناولوں کی طرح نگل جائے گی۔ پر یہ عظیم الشان سر  
 بنک عمارتیں کیوں نہ لرزیں مہوں کے خوف سے؟

”تم ان عمارتوں کے لیے خود لڑ رہے ہو پر ہمیں بھی بارود کی جگہ بھونک ہے ہو“  
 اس نے انتہائی نرمی سے انداز سے کہا کہ ٹیکر جو بڑا شوق نگاہوں سے قصور یوں کو دیکھ  
 رہا تھا، کھپتا ہو گیا اور اس کا منہ آگڑ گیا۔

”ایں؟“ شمن کو اپنی کم ظرفی پر شرم آگئی ”کتنی عجیب انسان ہو! میں تو تمہیں اپنے  
 کیمرے کی چالاکیاں دکھا رہا ہوں اور تم سیاست کو لے بیٹھیں۔۔۔“ وہ روٹھ کر کھڑکی  
 میں جبا کھڑا ہوا۔

”سچ کہا تھا میرے ایک ہندوستانی دوست نے کہ اگر مغرب مشرق سے دوستانہ  
 معاملہ کرنا چاہے تو وہ اسے زنا سمجھ کر پرے جھٹک دے گا۔“ وہ آہستہ سے مڑا کر بولا۔  
 ”کل سے میں برابر تمہاری جلی کٹی باتوں کو ٹانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تو بے ہے۔  
 کیا تم سب ہندوستانی اسی ذہنیت کے مالک ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہارا مرض  
 لاعلاج ہے۔ ہر بار تم ہاتھ مار کر دو اگر دیتے ہو اور پھر واپس چائے ہو۔“

”یہ کرپس کی دواپنے سے تو بہتر ہے ہم بیاری ہیں!“  
 ”مگر یہاں کرپس کہاں ہے۔ تم سے سیاست کوئی بیوقوف، پونپیر رہا ہے۔ تم  
 سمجھتی ہو کہ تمہیں سیاست سے لگاؤ ہے، اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو، قطعی نہیں۔  
 سیاست کو تم بالکل نہیں سمجھتی۔ بس دوسروں پر الزام دے کر خود کو نکھانا۔ یہ  
 کہاں کا انصاف ہے۔ مانا کہ انگریز تمہیں بھڑکانا ہے، آپس میں لڑاؤ ہے میں سوچ  
 تم کیوں اتنے اتحق ہو جو لڑ پڑتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے ابھی سو دو سو سال تمہیں  
 اور غلامی کی زنجیریں گھسیٹنا پڑیں گی۔ بیوقوف ہے وہ حکومت جو تمہیں آزاد  
 کر دے، دشمن ہے وہ تمہاری، کیونکہ تم آزاد رہنے کے قابل نہیں۔ اپنی حفاظت  
 کرنا تمہیں نہ آیا ہے نہ کبھی آئے گا۔ تاریخ کے صفحے الٹا اور مجھے دکھاؤ کہ کہاں کس  
 موقع پر تم نے ایک دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ آج اگر یہ چلے جاؤ تو دوسرے آجائیں  
 گے۔ سنئے سرے سے ہاتھ پھیلا کر گھڑا ہوا پرٹ سے گا۔“

”ایسا ملا بھی بہت ہے جو چھپیں لینے کی دھمکی دیتے ہو۔“  
 ”اے بھئی میرے بس میں ہوتا تو کیا کچھ نہ کچھ دے دینا۔“ ٹیکر نے بات کا رخ  
 بدل کر شرارت سے کہا۔

”بس دیکھ لیا۔ تم سب ایک ہی پتھیلی کے چٹے تھے ہو۔ وہ آزادی بھی دیکھی  
 جو امریکہ نے نیگرو کو دے رکھی ہے۔“

”میں بتاؤں ایک ترکیب، تم سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ، یہ کیل نہیں کہ  
 سنی سنائی ٹرانس پر یقین کر کے میاں میں کود پڑو۔ سخت مرطالعہ کی ضرورت ہے  
 اور میں شرط بتا رہی ہوں دنیا کی کوئی عورت سنجیدگی سے مرطالعہ کر ہی نہیں سکتی۔“

”وہ اور میری رائے میں عورت سے بڑا سیاست دان کوئی نہیں۔ وہ جو گھر میں  
 حکومت کر سکتی ہے ملک میں بھی راج کر سکتی ہے۔ تمہارے خیال میں تمہارے لسانی  
 حربے، جن کی بدولت عورتیں مردوں کی کامی شخصیت یہاں تک کہ تحیل تک کو  
 غضب کر لیتی ہیں، کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے؟“

د غلط، بالکل غلط۔ کوئی عورت ہماری کمائی زبردستی نہیں چھین سکتی ہم جیسے جی چاہتا ہے خود خرچ کرتے ہیں۔ وہی شخصیت تو وہ عورت کی عقل سے بالا کرتے ہیں۔ ہاں تخیل کی ملکہ وہ ضرور ہے مگر صرف ہماری دماغی عیاشی کے لیے۔“

دربارے لطیف مغالطہ ہیں۔ اچھا ہے آپ لوگ انہیں میں مبتلا ہیں۔ جب ہی تو کمال ہے کہ بیوقوف بنے انسان اور اپنے آپ کو عقلمند سمجھتا رہے سیاست سے ٹپٹ کر گھٹا کرنے زندگی کے رومانی دائرے میں قدم رکھ دیا۔

”کہا تو میں نے جہاں تک دل کی حکومت کا پھیلاؤ ہے تمہارا ہی ڈونگا جتنا ہے“ ٹیکر نے ایسے واضح طور پر دشمن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سنس پڑی۔

”اور دل کی سلطنت کا پھیلاؤ چادر کی وسعت کو دیکھ کر محمد دیکھا جاتا ہے یا مشرق مغرب...“

”دل کی حکومت سمجھنے کی پابند نہیں۔ اُس کے لیے مشرق بھی اتنا ہی حسین اور روشن ہے جتنا مغرب،“ ٹیکر کی آنکھوں کی شرارت بڑھی اور دشمن نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں اتنی بندھی نہیں اور بھوہل کی جگہ بھی خاصے گھنے بال ہیں۔

”اتنے میں اہلیا چائے لے کر آگئی۔ آج وہ کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ اُسے بار بار کسی کے انتظار میں خاموش ہو کر بیروں کی چاب سنبھلنے دیکھ کر ٹیکر نے چھوڑا۔“

”دراحمق ہے یہ“ ٹیکر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”دکون؟“ اہلیا چونک پڑی۔

”پروڈیوسر!“

”ایلیا جھینپ گئی۔ دشمن نے دیکھا کہ یہ رنگیں نسوانی جذبہ اُس کے چہرے کو زری اور شیرینی سے متور بنا گیا۔ وہ کرخت اور خشک ایلیا کو باسوم ہمار کی آواز سے شگفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُس کی باغیانہ آنکھیں ایک اطمینان بھری امید میں ڈوبی ہوئی پہلے سے زیادہ بڑھی اور جاندار معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے پھونک مار کر ان پر سے برسوں کی پڑی ہونے لگا دیا ہو۔ اتنے میں پروڈیوسر لمبے لمبے دنگ

بھرتے آن پہنچے۔ اُن کی زرد پیشانی بڑھلے ہوئے تیشے کی طرح چمک رہی تھی۔  
 ”ہم لوگ دہلی جا رہے ہیں“ انہوں نے بچوں کی طرح کہا۔  
 ”مبارک ہو“ ٹیڑھے نے جوش سے پروفیسر کا ہاتھ تھپکا۔  
 ”ایں؟“ شمن بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

پھر ایلیمانے اُسے بتایا کہ آخر کو پروفیسر نے اُسے اُس تاریک بل سے کھینچ ہی نکالا جس میں وہ خوفزدہ ہو کر جا چھپی تھی۔ اُن کی دستاں بھل رہی تھی۔ اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پریشانیوں کا تھکا ہوا سا بوجھ اُن کے کاندھوں تک پھیلا دے۔ پروفیسر ابتدائی تعلیم پر توجہ کر رہے تھے۔ انہیں ویسے بھی اپنی سیکم کو عمل میں لانے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ ویسے اگر کوئی کہتا کہ اُن کی نجی زندگی میں ایلیمانے کا وجود دکرا ماثبات ہو سکتا تھا تو یہ بات مشکل سے یقین آتی۔ پروفیسر کے عجیب لکڑیلو انسان تھا۔ خود وہ اپنے وجود میں کہیں نمایاں نظر نہ آتا تھا۔ شاید وہ اُن کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے ایلیمانے کو مفید سمجھتا ہو جو اُسے اپنے جسم سے زیادہ عزیز تھیں۔ یہ ایلیمانے کا کہنا تھا۔

”میں عرصہ سے تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہوں“ پروفیسر نے حرف اُتاری بات کو بار بار دہرایا، ”اور یہ ضرورت اسی طرح محسوس ہوتی رہے گی جب تک کہ اُسے پورا نہ کیا جائے گا۔“

”ہیں اُس کے اطمینان اور سکون سے مقور اُسا حیرت اپنے لیے چرالوں کی اور وہ مجھے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوگا“ ایلیمانے کہا۔

شمن کے جانے کے سوال کو ایلیمانے نے ایک سر سے سے مناسبت نہیں۔  
 ”تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں“ وہ مزہ بنا کر بولی۔

”نہیں مجھے یہ کیسے کہہ سکتی ہو... مگر...“

”تو اتنے دن گھر کی دیکھ بھال تمہارے پیہر دا“ ایلیمانے بات کاٹ کر کہا۔  
 ”ذرا اور سچی کو دن دن بمبارش مت کیلنے دینا، اور اُس پاس کے غنڈوں کو جمع



سنہ کرنے پائے۔ پچھلی دفعہ میں ایک دن کو گئی، رات کو لوٹی تو جو سنے خانہ بنا ہوا تھا گھر...، ایلکے بات کو سنے سمجھا۔

”مگر ایسا آخر مجھے جانتا ہے ہی؟ وہ ڈری کہ ایسا منزل کا نشان نہ پوچھ بیٹھے۔“

”تو پندرہ دن میں گھس نہیں جاؤ گی؟“

”مجھے نوکری کے لیے بھی تو کوشش کرنا ہے؟“

”ہاں ہاں کر لینا۔ ذرا پہلے چل کر سامان تو درست کر وادو؟“  
 ”پر و فیس کہہ رہا تھا کہ...“ کڑھ سے رکھتے رکھتے ایسا ایک دم کچھ کہتے کہتے ٹرک

گئی۔

”کیا؟ کوہنا، بن کیوں رہی ہو؟“

”ادھو شرم آرہی ہے۔“

”مشت، میری بات غلطی ہے۔ وہ تو ٹیکہ کو کہہ رہا تھا... شتمن کے کان کھڑے

ہوئے۔“

”کیا؟“

”کہ... کہ... اچھا آدمی ہے ٹیکہ۔ بے نا؟ مجھے تو وہ انگریز لگتا ہی نہیں...“

”دیاں... وہ آؤش ہے... بگڑیہ کیسے کہہ لگتا نہیں؟“

”اُس کی باتوں سے۔ شتمن اگر ہم ایسے انگریز دل سے بھی ملیں تو اُن سے نفرت

نہ کر سکیں۔“

”ایسے سے تہا، اکیا مطلب؟“

”ایسے سے میرا مطلب اچھا ٹیکہ ہے۔“

”برطانی گدھی ہو...“

”اوہ، بنو ست۔ تم خود سمجھتی ہو کہ وہ اور سفید چٹری والوں سے مختلف ہے؟“

”مختلف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ خصلت بیت اُن کی جبلت پر اثر نہیں ڈالتی بہت

سے سانپ کاٹتے نہیں مگر کھل جاتے ہیں۔ وہ ہے تو پھر بھی سانپ۔“

”ارے تو نگل ہی گیا آخر“ ایسا بڑے زور سے ہنسی۔

”دپاگل ہو گئی نا۔ ارے چل دے مجھے کیا نگلے گا۔“

”مگر تو اسے ضرور نگل گئی۔ پرونیسیر کہہ رہا تھا کہ....“

”لعنت تیرے پرونیسیر پر کہ... کہ... اس کے سوا کچھ نہیں کہتا... وہ۔“

”نہیں جیسے کچھ نہیں معاذم؟ ہنہ، تجھ سے سببی ہو۔ ڈرائنگ روم میں وہ کوئی  
چپکے چپکے قیول نہیں رہا تھا۔“

”ارے وہ تو مذاق کر رہا تھا۔“

”میں اُسے تین سال سے جانتی ہوں۔ وہ ایسے مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ عجیب  
انسان ہے۔ جیڑھی اس میں بات ہی کیا ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس میں گناہ کون سا  
ہے۔“

”گناہ کیوں ہوتا۔ سچ بتانا ایسا کیا تمہیں پسند ہے وہ؟“

”بیلر؟ حد سے زیادہ۔“

”ٹیلر کی خصوصیت سے بات نہیں کر رہی ہوں، دراصل مجھے تو اس سفید چوڑی  
سے ہی محبت آتی ہے۔“

”سفید چوڑی میں اگر سرخ دل ہو تو؟“

”ہو کرے۔ وہ ہم کالوں کے مذاق سے بہت مختلف ہے۔“

”وہ اتنا بندر جیسا تو سفید ہے بھی نہیں۔ ہمارے یہاں اُس سے کہیں گورے آدمی  
ہوتے ہیں مگر اُن سے ہمیں گھٹن نہیں آتی پھر آخر اس میں کیا بات ہے؟“

”خیالات۔ ہمارے دل نے ان سب یورپ والوں کو بھیت بنا کر نشت۔“

شرع کر دی ہے۔ ذرا بند کر والو صندوق، کپڑے بہت مٹھن گئے۔“

دولوں لٹ کر صندوق بند کرنے لگیں۔ ایسا بڑے جوش و خروش سے سا ان بازو

رہی تھی۔ آزاد چوڑیا کی طرح ڈھیمی آواز میں کوئی ٹپکا ٹپکا راگ گنگنانے لگتی اور پھر کسی

سوچ میں ڈوب جاتی۔ شاید ماضی بار بار اُسے کچھ کے دینے کے لیے ابھرتا تھا جسے

وہ اپنی قوت ارادی سے دور جھٹک بھٹکتی۔

جسے ہی ٹیڑھی ٹیکر کی کارٹرک سے کراں پہنچا۔ مزدوروں کی طرح سامان بھڑاڑا۔ جب چائے پینے بیٹھا تو اُس نے بتایا کہ دو روز بعد وہ بھی روانہ ہونے والا ہے۔ وہ کچھ غمگین تھا لیکن اُس سے زیادہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شمن نے بھی یہ بات سنی کہ نہیں۔

”سنا شمن، ٹیکر بھی جا رہے ہیں، ایلیا نے شمن کو ہاتھ دیکھ کر نہایت عقیدے پرن سے کہا۔

”اہو... چہ برٹا افسوس ہے، شمن نے برٹے تپا کے سے کہا۔

”مہربانی سے اس قدر صدمہ لوگوں کو نہ پہنچاؤ ایلیا، ٹیکر نے طعن سے کہا اور شمن بھی تکلف سے مسکرا دی۔

”بھئی دیر نہ ہو جائے، پر دفسیر برٹے سے برٹے پیائے کے گھونٹ پینے لگے۔

”اچھا خدا حافظ۔ شاید پھر ہم نہ مل سکیں، ٹیکر نے برٹے سے تکلف سے کہا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”وہ نہایت ٹیکر، ایلیا نے جمل کر کہا۔

”مگنیم پرسوں جا رہے تھے، اس نے مصافحہ کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور برٹا کی معصومیت سے نمکدانی پیش کر دی۔

”شکریہ...“ اُس نے باگڑ کر ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

”ہاں میں سمجھی تم نے نمک مال لگا“

”زخموں پر نمک... خوب... بھئی واہ...“ پر دفسیر نے قہقہہ لگایا۔

”واقعی تم میں کسی نمک کی ضرورت کی ہے۔ بد مذاق ہو ٹیکر، ایلیا نے اسے ہنسنے دیا۔

”اُس کا کندھا ہلا کر کہا۔

ایلیا کی کارٹری روانہ ہو گئی تو ٹیکر نہایت خاموش موڑ چلا تار مارا۔ معلوم ہوتا تھا وہ برٹا کی تنہا ہی سے اُسے گھر پہنچانا چاہتا ہے مگر موڑ کی رفتار ضرورت سے زیادہ ہلکی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”پونا۔“ مزدوڑے موڑے جواب دیا۔

”اچھی جگہ ہے؟“

”بہت، جنتِ ارضی“ ٹیلر نے جمل کر کہا۔

”بہت خوش نصیب ہو۔“

”شکریہ!“

”کیا پڑا دل ختم ہو گیا؟“ شمن نے موڑ کی سستی کو ٹوکا اور ایک دم سے ٹیلر نے اسپیل انٹی براہِ جاری کہ معلوم ہو ا موڑ الٹ گئی۔

”آخر مطلب کیا ہے؟“ شمن نے زبردستی غصے ہوئے کی کوشش کی۔

”یہ کہ ہم انسان نہیں... پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ پینڈ بیرونیوں کی خود غرضی اور کاری لے پوری قوم کے منہ پر کالک ل دی اور اس حد تک کہ اب کوئی کوشش اُسے نہیں مٹا سکتی۔“

”کچھ تو ان بیرونیوں نے ایسا دماغی دکھ پہنچایا ہے بس نے اس حد کو پہنچا دیا۔“

”مانتا ہوں... مگر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”دودھ کا جلا چا چھ کو بھونک بھونک کر پیتا ہے؟“ شمن نے بے مشکل اُسے سمجھایا۔

”تو کیا واقعی تمہارے دل سے میرے لیے نفرت نہیں مٹ سکتی۔“ ٹیلر نے بڑی

زری سے کہا۔

”نفرت تو نہیں ہے مجھے۔“ شمن نے جیسے خود کو بتایا۔

”تو پھر تم صرف مجھے جلا نا چاہتی ہو؟“ وہ مسکرا دیا، ”جی چاہتا ہے اسی بات

پر موڑ لٹاؤ دل کسی پر پڑے۔“ اُس نے موڑ کی رفتار دھیمی کر دی۔

”ہمارے دل دگنے ہوئے ہیں۔“

”مخصوصاً اس اگست کے واقعے کے بعد۔“ ٹیلر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

”تم بھی یہ سوچتے ہو کہ یہ سب فساد کانگریس نے کروائے...“

”ہاں، اور کانگریس قابل مبارکباد ہے، شمع پھر بے اعتباری سے بجڑی، اتنے مجبور اور سینے گروہ سے اتنا بے حوش افکار انیس مجرہ سامعہ میں ہوتا ہے۔ لاکھیاں بھی تو پوری نہیں...“

”تو تمہارے خیال میں یہ بیوقوفی نہ تھی۔“

”آزادی سے محبت رکھنا اگر بیوقوفی ہے تو اس کے پانے کے لئے عہد و عہد کرنا مہیا بیوقوفی ہے۔“

”مگر حواقت تو تھی۔ اس طرح ادوہم پچا دینے اور بے موت مرنے سے آزادی نہیں ملا کرتی۔“ وہ اس سے جواب مانگنا چاہتی تھی۔

”آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اسے رام کرنا ہے تو ایسی ایسی لاکھوں قربانیاں کرنی ہوں گی۔ جو کچھ ان میں پھرے جو شیلے بچوں نے کیا وہ واقعی بہت معمولی نظر آتا ہے کیونکہ جو کچھ ہوا ہے ترقی سے اور بدانتظامی سے ہوا۔ اگر یہی قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا حقوڑا بہت حصہ ضرور مانگ آجاتا۔“

”مگر یہ گاندھی جیسے لیڈر بھلا ہمیں جنگ آزادی میں کیا رہنمائی کریں گے؟ امنسا! امنسا کہیں امنسا سے بھی ملک عینتہ گئے ہیں۔“ وہ خود اپنی مخالفت کر رہی تھی۔

”گاندھی نہیں اگر اس وقت چنگیز خاں بھی ہوتا، ایسے کہ ہاتھ میں تھکا نہیں، تو وہ کیا کر لیتا؟ دیکھا نہیں تم نے، کچھ نہ کر کے پر تو یہ سزا ملی اور کہیں ہاتھ بھی ہلا دیتے تو صاف انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔“

”مہنتہ ہیں بھی کس کام کے یہ لیڈر! کچھ کیا ہے انہوں نے آج تک؟ بلا سے، رجا میں تو سچے لیڈر پیدا ہوں۔“

”لیڈر انڈیا پھوڑ کر نہیں نکل آتے۔ اگرچہ تمہارے یہ لیڈر کچھ نہیں کر رہے مگر پھر بھی ان کی خاموش ضد عوام کے جی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہے۔ آزادی کی خواہش نہیں مری گوجیل میں جانے سے بہت کچھ عوام پر سے ان کا بھروسہ اٹھ گیا۔ بہت سے ناامید ہو کر منکر ہو گئے، چوڑ کر گارڈ بیٹھے مگر پھر بھی ایک زبان آئے۔“

”کاجب وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ریڈر فضول نہیں بلکہ مجبور تھے۔“  
”تو پھر یہ جیل میں کئے ہی کیوں؟ کیا قوم کی خدمت کی؟“ شمن نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”بہت بڑی خدمت۔ جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے ڈرامے کے ذریعے دکھا دیا۔“

”ایں؟“ شمن نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔

”کہ ظالم جب عند پر آجاتے ہیں تو وہ کیا نہیں کرتے۔ وہ نفرت جواں کے اس فعل سے اس وقت عوام سے دل میں پیدا ہو گئی ہے اسے کوئی مہربانی، کوئی رعایت، در نہیں کر سکتی۔ اگر اس وقت حکومت تھا اسے اوپر یہ منظم نہ کرتی تو ہم اس کے ضرور گن گاتے رہتے اور آزادی کی وہ گن جو آنے والی پورے دل کو لگے گی وہ ایک ایسی چیز ہوگی کہ... اسے ہم کہہ کر نکل آئے؟ پھر وہ کار موڑنے دو...“  
”ٹیکر نے اسے گھر پر اتار دیا اور ظالم کو آنے کا وعدہ دے کر بیٹھا گیا۔ ابھی دھوپ کافی تھی جو میرے نے آکر کہا کہ وہ آگیا۔“

”اسے اتنی جلدی؟“ وہ ہلکے سنبھلا کر پراسے پیٹتے ہوئے تھا۔ آنکھوں سے معذوم ہوتا تھا کہ بخار ہے۔“ بخار ہے کیا؟“

”شاید یہاں ہر وقت بخار کا ہی لطف آتا رہتا ہے۔ چلو جلدی چلو کچھ دیکھیں گے۔ اور وہ... وہ لگا ایسا سرخ بوندا“ اس نے ابروؤں کے نیچے میں انگلی رنک کر کہا۔  
”اچھا بندی؟“

”ہاں ہاں! اس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔“

”کیوں؟“  
”آپنی لگتی ہے۔“ اس کی سرخ تھکی ہوئی آنکھیں سینے میں بالکل غائب ہو گئیں اور دانستہ جھک اٹھی۔

”بجائے کچر جانے کے وہ ہٹل میں بیٹھے کافی پیتے رہے۔ ٹیکر نے بتایا کہ اس کی

منیگر جسے چھوڑنے دقت اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، اُسے ایک محنت بھول گئی۔  
 ”اُس نے میرے خطوں کا جواب بھی دینا بند کر دیا،“ اُس نے افسردگی سے کہا،  
 ”ہم یہاں میدان جنگ میں وطن سے دُور ایک ان کی یاد میں زندگی کی گھڑی گزارتے  
 ہیں اور وہ چھوٹ موٹ کو بھی ہمارا دل رکھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔“  
 ”کوئی گھڑی، کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب وہ ہمارے خیالوں سے دور رہتی  
 ہوں مگر... یہ بے وفاء عیش کی متوالیاں ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتیں،“ شمن خاموش  
 سنتی رہی۔

”تمہیں اب بھی اس لڑکی سے محبت ہے“ اُس نے نرمی سے پوچھا۔  
 ”محبت ایک طرف نہیں ہوتی، یوں تو مجھے لفظ لڑکی سے ہی شدید محبت ہے۔“  
 وہ پھر زارت سے مسکرایا، ”گزشتہ چند سالوں نے اور بھی کمزور بنا دیا ہے...“  
 گھنٹوں بکواس کر کے جی ذرا ہلکا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بچپن اور اپنی ماں کی باتیں بتاتا  
 رہا۔ اُسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور بہن کو پیار بھی تھا۔ مگر بچپن میں لطف  
 آتا تھا۔ وہ بہت شیریں مگر پیاری تھی۔ ہزاروں لڑکے لگا کر کھتے اور لڑکے بدھو  
 سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ کا جینتو تھا۔  
 دوسرے دن ٹیلیویشن پر آ گیا کہ شمن کو اُسے گھنٹہ بھر ٹھاسے رکھنا پڑا۔ ہمارا دھوکہ  
 جب وہ باہر نکلی تو وہ لان پر چاسے کی کشتی کے قریب ایٹا ہوا تھا۔  
 ”میں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ کل صبح جاؤ ہوں۔“  
 ”خدا حافظ!“ شمن نے جواب دیا۔  
 ”ارہ... بس نہیں اتنا ہی کہہ رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، ”یہ بھی پوچھنے کی تکلیف  
 گوارا نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں۔“ وہ کہہ نہیں تو رہ سہا ہی تھی۔  
 ”مجھے رسم دراہ بڑھانے کی ضرورت ہے۔“  
 ”ہوں ٹھیک کہتی ہوں۔“ وہ گھاس پر ماتھا ٹیک کر، دُاسی سے بولا۔  
 ”رات کو سائیکل پر چلیں۔“

”رات کو بھئی مجھے رات سے ڈر لگتا ہے، اُسے بڑا مانتے دیکھ کر جلدی سے بول۔  
 ”اگر تمہیں شام کو فرصت ہو تو چلو گھوم آئیں۔“  
 ”سنو، باورچی سے کوئی مرہ سے دار کھانا منگواؤ، گرمی نے زبان بھی تو سن کر دی ہے۔“

”مرچیں کھا دی گئے۔“

”ہاں، اُس نے سر ملا یا اور زور سے آنکھیں پتیلیوں سے پھینچنے لگا۔

”کیا سوئے نہیں رات بھر؟“

”نہیں، وہ روٹھ کر بولا، ”نہ جانے کیا ہو گیا ہے، میں مانتا ہوں کہ تم مجھے پسند ہو لیکن... میں اسے محبت نہیں بلکہ کوئی سخت بے رحم اور تکلیف دہ مرض کہوں گا؟“  
 ”معلوم ہوتا ہے لوگ گئی؟“ سنن بات طے کرنے کو زور سے منسی۔

”کیا ایسی کوئی بیماری ہے ہندو نشان میں جس میں شدید ترین محبت و بال جان بن جائے؟“

”ہاں، لو کی طرح یہاں عشق کی لوبھی چلتی ہے۔ مگر آج کل نہیں۔ وہ برسات کے دنوں میں جب کالی گھٹائیں گھر کر آتی ہیں، کوٹلیں کو کتی ہیں اور پیسے شور مچاتے ہیں۔“  
 ”تو پھر مجھے خزاں کا کوئی مرض لگ گیا ہو گا؟“

”ہو سکتا ہے۔ کافی خطرناک مرض ہے۔ تم بھوتوں میں یقین کرتے ہو؟“  
 ”ہیں؟ مہشت! تم بھی نہیں کہیں مگر یہاں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں فرب بھوت رہتے ہیں۔ تم نے وہ مرگھٹ دیکھا ہے، وہاں کھوئے ہوئے انسانوں کی دھوپ صدیوں سے ٹھیک رہی ہیں۔ ہڈیوں کے ڈھیر رات کو جاگ اُٹھتے ہیں اور ہر کرنے جانے والے کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔“

”کسی کا روپ بھر کرنا، مثلاً تمہارے روپ میں!“

”ہاں۔“ دونوں منہس پڑے۔

”اگر میں تم سے شادی کے لیے کہوں تو؟“



”تو؟ تو... ارے تم نے جو ابھی مرچوں دار کھانا منگو انہ کو کہا تھا... منگو اڈل؟“  
”اُس نے چائنا مذاق اڑائے۔“

”میں سوچتا ہوں ہم اور تم مل کر انسانیت کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں“ اُس  
نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”مگر اُس کے لیے شادی ضروری ہے،“ اُسے بنیادہ ہونا پڑا۔

”اِس ہجے نہیں معلوم، مگر نہ جانے کیوں میرا خیال ہے کہ دلیسے ہم دونوں ساتھ  
نہیں رہ سکتے۔ ہمیں مجھ سے محبت نہیں، کیوں؟“

”جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ میں ہندوستانی ہوں اور یہاں کے موسم کی عادی  
ہوں، مجھے تو بھی نہیں ملے گی۔“

”بکومت، تم محبت نہیں کر سکتیں کیونکہ میں سفید ہوں۔“

”ہمارے ملک میں تم سے بھی زیادہ سفید انسان ہیں، ہم اُن سے بھی محبت کرتے  
ہیں اور شادی بھی۔“

”تو اگر مجھے شادی کر دو تو بعد میں محبت کر سکوں گی؟ میرا مطلب ہے اگر کوشش کرو تو؟“  
”مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا نہیں آتی۔“

”تم میں اتنی سمجھت ہے کہ مجھ سے شادی کر لو؟“  
”کہہ نہیں سکتی۔“

اتنے میں باورچی پھکیاں اور چٹنی لیکر آگیا۔ ٹیبلٹ نے ڈھیر ڈھیر سی چٹنی لٹکا کر تیزی  
سے کھانا شروع کیں۔ مارے مرچوں کے ناک آنکھ سے پانی بہ نکلا اور منہ کے گوشے  
کی طرح لال مغبوب کا ہو گیا۔

”تمہارے سوال کا جواب مل گیا؟“

”اِس؟“ وہ بچوں کی طرح ناک پونچھ کر بولا۔

”یہ مرچیں کیا کہتی ہیں؟“

”کہتی ہیں... کہ تم... تم بیوقوف ہو تم شرم“ اُس نے پہلی دفعہ اُس کا نام لیا، وہ

بھی بجا کر۔

”اتنا بڑا بوا کھلتے ڈرتی ہو رہا، اس نے طعن سے پوچھا۔  
”جو آ!“ شمن کا دل نا معلوم مسرت سے چڑھا، ”زندگی کا لطف اُدپنے اُدپنے  
داؤں لگانے میں ہے۔ اُس نے جیسے خواب میں دہرایا۔

”سمت ہے اتنی۔“ وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”سمت تو کچھ ایسی ہنگامی چیز نہیں مگر تم یہ سسٹہ کیوں لگا رہے ہو؟“

”میرے لیے یہ سسٹہ نہیں۔ تجھے ہندوستان سے لگا دے۔ حُمت زخمی دیکھ کر میرا  
دل دکھ رہا ہے۔ مجھے وہ دنیا کا ایک محض نظر آ رہا ہے۔ اُسی دنیا کا ایک ٹکڑا جو میری

سیمہ“

”زندگی کی طرف سے تمہارا رویہ بھی صرف شاعرانہ ہے۔ تم جانتے ہو یہ سسٹہ ہے  
مگر اس کے پیچھے کا خوف ابھی سے تمہارے خون کی حرکت تیز کیے دے رہا ہے۔ اس  
خوف میں بڑی لذت ہے، مگر تمہیں اس لذت کا چپ کا کہاں سے پڑا؟ شمن نہ جانے  
کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دورانِ آباد کے کیمپ میں جو اس نے خونی وعدہ کیا تھا۔ اُس  
کی لذت اب تک اُس کے دماغ میں محفوظ تھی۔

”تم میری فکر نہ کرو۔“

”میں نہ کروں گی تم خود ہی کہہ لو گے، تم پچھتاؤ گے۔“

”میں؟“

”ہاں... اور ابھی یہاں سے جا کر تم اپنی ہر بات کو یاد کر کے شرمندہ ہو گے۔ یہ

نقشہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔“

”کیسا نقشہ؟“

”خود فریبی کا نقشہ، کہ یہ تم عجیب و غریب بات کہنے جا رہے ہو میں ہندوستانی

تم...“

”چپ رہو۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دنیا کو نہیں لانا چاہتا۔ ایک

خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں۔ میری ماں بڑی اچھی ہیں، وہ بہت خوش ہوں گی۔ وہ ایک دم چمک کر بولا، ”ہم سماعت سماعت سارے یورپ کا سفر کریں گے۔۔۔ اے۔۔۔ کتنا لطف آئے گا۔ یہ کجخت لڑائی ختم ہو جائے گی، یہی پھر سے اپنی پرٹھائی شروع کر دوں گا۔ تم بھی وہاں کوئی ڈگری لے لینا۔ پھر ہم دونوں مینڈوستان آکر۔۔۔“

”اے بڑے تیز ہوا باز ہو، دم بھر کی سیر کر کے لوٹ بھی آئے۔“  
شمن زور سے منہی اور ٹیلہ بھی کھلکھلا اٹھا۔

”چلو ذرا باہر چلیں نا، اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹا۔ دوتھے بچوں کی طرح وہ تھپتھپاتے دیوانوں جیسی باتیں کرتے دوتھک نکل گئے۔“

”تم ہاں کہہ دو اور ہم اپنی جنت میں۔۔۔“ دور سے ایک لاری گزری اور دھول کے پھٹکے اُس کے منہ سے ہوئے حلق کو گھونٹ گئے۔ بات ادا دھوری چھوڑ کر وہ شمن کے کندھے کا سہارا لے کر گھاسنے لگا۔ مسافر اس عجیب و غریب بینکڑ آنکھوں میں جذب کرنے کے لیے لاری میں سے ٹھک ٹھک کر بھانجنے لگے۔

”دیکھا تم نے؟“ شمن نے تلخی سے کہا۔

”میں ان کتوں کی پروا نہیں کر سکتا، میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔“ وہ بھی جھلکا کر بولا۔  
”مگر میں نہیں تو وہ سارے تھپتھپ جو بھڑکی دیر قبل مشکہ فوں کی طرح دل میں بھڑک رہے تھے ایک لمحہ مر جاتے، جیسے کسی نے بٹن دبا کر بجلی غائب کر دی۔ وہ خاموش پلنگ پر پاؤں ٹھکا کر بیٹھ گئی۔ بار بار اُس کے شانے میں کوئی چیز جھپتی جیسے کوئی رگ چڑھ گئی ہو۔“

”یہ کیا سو رہا ہے؟ کسی نے پوچھا۔

”اتہا!“ اس نے سہم کر جواب دیا۔

”کوئی راستہ؟“

”ناممکن۔“ حنف بھی بھٹک رہے ہیں۔“

”علاج؟“

”کوئی نہیں!“

”دعا؟“

”میکار!“

جلدی سے اُس نے ایچی میں دو ساڑیاں ڈالیں۔ کوئی تو گاڑی جا رہی ہو گی کہیں،  
دینکے کسی کونے میں، بس یہاں سے دور۔ سامان پھر اتار رہے گا۔ ویسے ہے ہی کیا سامان  
خانہ بدوشوں کا؟

”کیا حماقت ہے؟ ایسا بھی کیا خوف؟ ہشت، کیا نکل جائے گا وہ نہیں؟ کہہ  
دو صاف صاف دل اور رات کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

اُس نے ایچی دھڑکی، دینکے الیمیا کی کتابیں درست کرتی رہی، پھر لیٹ کر سو  
گئی۔ جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ بیرے نے اکر کہا ٹیکر آیا ہے، جلدی سے  
ساڑھی لپیٹ کر باہر آگئی۔  
”کیا ہے رونی؟“

”ادھر... ادھر آ جاؤ...“ وہ ہما ہوا اور پریشان تھا۔ پھر بہت لمبا اور زرد  
سورہا تھا۔ بار بار سرگریٹ جھاڑنے کے بہانے وہ ہاتھوں کی لڑزش کو چھپا رہا تھا۔ برساتی  
سے نکل کر دونوں گھاس پر پہنچ گئے۔

”میں... میں سوچتا ہوں میں نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔“

”کیا بات ہے؟“

”یہی... یہی...“ وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

”رونی گھبراٹے کی کیا بات ہے۔ میں تجھے نہیں اور نہ ہی تم منتھے ہو۔ ہم یہ شادی کیوں  
کر رہے تھے؟ ہر طرف اس لیے کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ دنیا میں کر سکتے ہیں۔ اس میں  
محبت کو دخل نہیں۔“

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔“

”میں... میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی اور اب تو میں نے اس فضول مسئلے پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا“ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ٹیکر غور سے اُس کا منہ تکتا رہا۔

”میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گا“ اُس نے شمن کا ہاتھ مہمردی سے دبایا۔

”وہ سکھا دو گے؟“ وہ زور سے سنسی۔ اُس کی آواز میں تلخی اور خوف کے ملے جلے سانس بچ اُٹھے، ”محبت سکھائی نہیں جاتی، یہ ایک احساس ہے جو پیدا ہوتا ہے، پر دان چرٹھتا ہے اور... وہ چھوڑ دے اس قصے کو... تو دیکھو کوئی ایسی حماقت کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔“

”حماقت کیوں کہتی ہو؟“

”یاد ہے وہ لاری — جو ہمارے پاس سے گزری تو لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم بند رہیں مگر انسان بننے کی جرات کر رہے ہوں“

”مگر میں تو ان کی پروا نہیں کرتا“ ذہ دانت پس کر چیا۔

”تو تم غلطی کرتے ہو، قدرت سے جنگ کرتے ہو۔“

”مگر یہ ایسی ان ہونی بات تو نہیں۔ ہزاروں سفید لڑکیاں ہندوستان میں مست کی زندگی گزار چکی ہیں اور گزار رہی ہیں، کیا وجہ کہ میں اور تم خوش نہ رہیں؟“

”لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اپنا رب کچھ چھوڑ کر ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو خواہ اُسے کتنا بھی نیچے اُترنا پڑے وہ وہیں اپنا گھر بنا بیٹھتی ہے مگر مرد؟ مرد بڑا نازک مزاج ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر حیرا کر مچل جاتا ہے۔“

”مگر...“

”ہم تم ملے... زندگی کے تجربات میں عظیم الشان... اضافہ ہو گیا۔ سنو تم کل ہی واپس لوٹ جاؤ۔ ارے ہاں، میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہاں جا رہے ہو؟“

”واپس لوٹنا...“

”صبح گاڑی جاتی ہے، میں تمہیں خدا حافظ کہنے پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو۔ دیکھو ہماری

دوستی ختم نہ ہوگی۔ اس نے ٹیکہ کو سر سے پکڑ کر گہری سانس بھرتے دیکھ کر سہارا دیا۔  
 ”سہاری دوستی برطانی کا آمد ثابت ہوگی۔ تجھے ہی نہیں پورے منہر وستان کو تم  
 جیسے دوست مل جائیں تو بھاگ کھل جائیں۔“  
 ”تو صبح آؤ گی؟ اسٹیشن پر؟“ شب بخیر کہنے سے پہلے اس کے التجا کی۔  
 ”ضروری۔“

سمجھا بھگا کروالیں لوٹی تو معلوم ہوا سر پر لدا ہوا بھاری بوجھ پھینک آئی شور و س  
 جی ایک بار رسی کے دھوکے میں سانپ کو پکڑ کر بیسوا کے مکان پر پہنچ گئے رستے پر کیا  
 دنیا میں ایسے ہی جیسے موجود ہیں جو ہمیں اس حد تک اندھا بنا سکتے ہیں۔  
 ہلکی بھینکی غبار سے کی طرح مگن وہ پلنگہ پر جا پڑی۔ جیسے کسی نے بال دیر پر سکے  
 جھکڑے سے آزاد کر دیا مگر نیند نہ آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبار سے یہ کی ڈوری جڑ  
 سے ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ دور خلا میں اڑتا چلا۔ کدھر؟ کہاں؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی  
 کہ کوئی رخ کا اندازہ لگا سکے۔

ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اُٹھے۔ رنگ سے نہ چمکے بس برس ہی نکلے۔ نہ جلنے  
 کب کے ٹھٹھے ہوئے پرنا لے بہہ نکلے تکیے میں منہ گھونٹ کر وہ پھینکول میں لی ہوئی آسمان  
 کو جذب کرتی رہی۔ اسے نہیں یاد تھا نہ کب روٹی تھی اور آج جیسے پہلی بار ضبط کا  
 چٹیل بند ایک ننھی سی چوڑ سے پھٹ پڑا۔ اس کا روال روال بلک بلک کر سمسیاں  
 بھر لے لگا۔ تنہا بدم غنودگی نے سر پر پانچ پیرا اور آہیں گہری سانسوں میں ڈوب گئی۔  
 صبح اس کی آنکھ جیسے سات کے آٹھ بجے کھلی۔ ایک اطمینان بخش دھچکے سے اسے  
 یاد آیا کہ ٹیکہ جا رہا ہوگا۔ ریل کا جن اسے پہنچا رہی سے دور تر گھٹیلے جا رہا ہے۔ نہ دم  
 بدم بڑھ رہا ہے اور کچھ می دن میں یہ اتنا لامتناہی ہو جائے گا کہ ناپے نہ شے گا۔  
 رات کو محل جانے والی تھی کو ملا مت کرتی وہ اٹھی۔ نیم گرم پانی سے غسل کیا۔ تنک  
 ہوئے کندھے پہنچ کر اس نے رنجی سہی سستی کو بھی جھٹک دیا۔ بڑا لمبی شیز بھوک تک  
 رہی تھی۔ رات وہ کھانا بھی نہ کھول گئی۔ باورچی نے نہ جانے کیا کہا تھا اور پتہ نہیں

اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ تو بکہیں بیرے نے اس کی سبکیاں نہ سن لی ہوں۔ ناشتے کے بعد وہ دیر تک ٹیڑھی لڑکری میں سے چلیخوڑے اور بسکٹ سے ٹکڑے چن چن کر کھاتی رہی۔ اسی لڑکری میں سے کل اُس نے اور ٹیکہ لے لیا پر ٹیڑھی نہ ناشتہ کیا تھا۔ لگتا لا پر د تھا ٹیڈا کا ترنگ تھا تو اور پر کا بٹن نکال کر اُس نے چنوں کی پڑیا میں گرا دیا تھا۔ بچے کا حصہ کدھر گیا۔ دو انگلیوں کے برے سے بٹن کو پکڑ سے وہ پھرتی رہی اور پھر اُسے اپنے بڑے کی تنگی سی جیب میں ڈال دیا۔

آج وہ کیا کیسے جو یہ لبا چوڑا دن کٹے؟ معلوم ہوتا تھا ہندوستان کی زمین ہی ختم ہو گئی۔ اور یہ بھی کیا اس کھنڈ میں؟ تو پھر کیا کیا جلسے؟ خیر اس برقت تو بزار کا ایک کچھ بُرا نہ رہے گا۔

کرے میں تار لگاتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے کبھی چھوٹ پر پی اٹیکر کا مصوبت مع اپنی تمام دونی کے دلوار سے سہارا لیے کھڑا تھا۔  
”تم چھوٹ بول گئیں اسٹیشن پر نہیں آئیں“ اُس نے روٹھے ہوئے انداز میں غصہ کر کہا۔

”ہیں؟ تو اس لیے تم نہیں گئے؟“  
اُس نے نیم رو مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔  
”وگرنہ...“

”رعبت ہے اس اگر اور ٹکڑیاں“ وہ زور سے بھونکا۔  
کرے میں اطمینان سے ٹیڈا کے تیار کیا کہ وہ صبح چھ بجے سے اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ شش کا جی دکھ گیا۔

”چہاے، مع تمام اسباب کے؟“  
”نہیں“ وہ شرارت سے مسکرایا اور شش کے بگڑنے پر زور سے چٹایا، ”مجھے مدد ملے تھا تم ہندوستانی بڑے دھوکے باز ہوتے ہو اور تم ضرور“ کہہ دو گی اس لیے سامان لا کر لے جانا...“ وہ زور سے ہنسا۔

”دیجھو روئی“

”جیب رہو۔ کچھ نہیں دیکھتا میں۔ تم عورتاں نہیں پتھر سو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں پتھر بھی... پتھر بھی تم مجھ لکچر دیے جا رہی ہو۔ بس سوچو کی تمہاری نصیحت۔ اور ہاں، تمہیں یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اب میں پونا واپس قطعی نہیں جاناؤں گا۔“

”تو میں جا رہی ہوں شام کو“

”جلو... کہہ دیجئے گی گاڑی اسے“ وہ مسرت سے بولا۔

”چلو سے کیا مطلب گویا آپ کبھی... دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟“

”دماغ سلامت سوتا تو کہنا ہی کیا تھا۔ کچھ کھانے کو منگا دو۔“

”کھانے کے کمرے میں چلو“

”نہیں ہم تو یہیں کیا ایسے گئے“ اس نے لیٹر ریٹ کر کہا۔

”ٹیکسی یا پتھر وہ تھل والا پروگرام۔ ساٹھ کل؟“ اس نے ناشتر ختم کر کے کہا۔

”تمہارا سر؟“

”میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔“ ٹیکس نے آہستہ سے اپنا تھکا ہوا سر اس کے گھٹنے پر

ٹکا دیا۔

”نیند کم آئی“

”آئی ہی نہیں بالکل“ اس نے سر بالکل گود میں سرکا دیا۔

”اسپرولائیڈ“ اس نے آہستہ سے اس کے بھروسے کے رنگ کے بالوں کو چھوڑا۔

”دین اور تین چھ اور تین نو گویاں کھائی“ ٹیکس نے معصومیت اس کے کمرے

ہاتھ ڈال دیا۔

”دن آٹھیں میچے جیب چاپ گزرتے چلے گئے۔ ایکس نے بہت ملامت کی کہ

اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی، رجسٹری کا دفتر کوئی نامعلوم جگہ تو نہ تھی۔

گیارہ بجے جیب وہ سول میز کے دفتر سے نکلے نو سڑکیں کانی بھری ہوئی تھیں۔

ٹیکس بار بار مسکرا رہا تھا مگر وہ وحشیانہ مسرت جو دفتر کی میز پر سے سر اٹھاتے وقت



بجلی کی طرح اُس کی آنکھوں میں کوندی تھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ اُس کا انداز گفتگو نہایت نرم اور بیارفتا اور چہرے پر شاندار فتح کے احساس کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شملی کچھ ششدر کچھ پر اگندہ تیز تیز باتیں کر کے اُن اجنبی آوازوں کو نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی چوٹ بن کر پڑ رہی تھی۔  
 ”غلط سب غلط۔ آگ اور پانی بھی بغلیں نہیں ہو سکتے۔ کوئی بار بار سرگوشیاں

کر کے یاد دل رہا تھا۔

ننگے میں چہرے کے درختوں کے درمیان چپے ہوئے چھوٹے سے جنگلے میں شمن نے نیا منہ کا ہی شب کا لباس پہنا تو ایسا معلوم ہوا کسی نے اُسے برف کے تو دے میں دفن کر دیا۔ باہر کے کمرے میں ٹیکر بیٹھا دیر تک ضروری خط لکھتا رہا اور وہ صندوق میں سے کپڑے نکال کر جھانے لگی۔

زور زور سے کھانسنے اور منہ دھونے کی آوازوں نے اُسے بتایا کہ ٹیکر غسل خانے میں ہے۔ باہر خشک ہوا میں سوکھی چادروں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں۔ نامعلوم خریف و ہراس فضا میں تیر رہا تھا۔ خاموشی موت کی طرح ادا اس تھی۔ معدوم ہوتا ہوا کائنات کسی بھیانک سانحے سے لرز کر ایک دم چنپ چاپ رہ گئی تھی۔ دو بلال آگے پیچھے دوڑتی ہوئی گھبراہٹ سے باہر کود گئیں۔ خزاں رسیدہ پتیاں مردہ چڑیلوں کی طرح پڑ پڑ رہی تھیں۔

”کھڑکی بند کر دو۔“ اس نے لہجہ جوت سے ٹیکر سے کہا۔ بڑ بڑا کر نہ جانے وہ کیا بولا اور جھنجھکی لگا دی۔ جب وہ مڑا تو شمن نے دیکھا وہ بہت پیسے پونے تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا، جیسے کما غدا کا ٹکڑا جو بارش میں پڑے پڑے دھلے کپے رنگ ہو گیا ہو۔

(۴۲)

وہ جاگ پڑی مگر آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑی رہی۔ دور کہیں بہت سے

گنگرودوں کی بھنگا رہا کو جاندار بنائے ہوئے تھی۔ یہ گنگرود چڑیاں بجا رہی تھیں۔ لے  
نال سُرچیں چیں بھی ملا کر بھیرویں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سر کو مل تھے۔ نیم  
خوابیدہ احساسات کو جمع کرنے کے لیے اُس نے جاننے کی کوشش کی۔ جسم کو آہستہ سے  
سمیٹا اور پھر پھیلا دیا۔ پیٹے کھولنے چاہے مگر نہ کھلے، جیسے سورج اُس کی آنکھوں میں  
گھور رہا ہو۔ ایک دم اُسے کچھ یاد آیا۔ دماغ میں سوئی سی جیھی اور بجالا بن گئی۔ آنکھیں  
بزدل چڑیلوں کی طرح بچی بچی کھل گئیں۔ کرہ خالی تھا!  
وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں تھا ہی کیا؟ رات جہاں ٹیڈر کے کوڑے ٹانگے  
تھے وہاں صرف ایک ٹنگی سی سُرخ ٹانگی ٹانگی ہوئی پچانسی لگے ملزم کی طرح بھول رہی  
تھی۔ جوتوں کی قطاریں جو اُس نے اپنے ہاتھ سے سیدھی کی تھیں غائب۔ صرف ایک میلا  
موندہ کرنے میں بڑا منہ چڑا رہا تھا۔

خاموش اور مفلوج وہ اس میلے موزے کو گسورتی رہی جو بڑھتے بڑھتے ایک  
ٹیڈی بے پہاڑ کی طرح پھول گیا۔ ہوا کے خاموش جھونکے سے ٹانگی گزشت کے لہرے  
کی طرح پھسل کر زمین پر آ رہی۔ جلدی جلدی اُس نے سر میں گھستے ہوئے مچروں دبا رہے  
دھوئیں کے دونوں ہاتھوں سے پرے ٹیڈیا یا اونچے کرے میں کھڑی ہو گئی۔  
”کیا وہ گیا؟“ درو دیوار قہقہے مار کر چخ اٹھے۔

”تو پھر؟ اب؟ اب کیا ہو؟“ اُس نے لجاجت سے جواب مانگا۔  
”وہ گیا، تم بھی جاؤ۔ کوڑی بھی تو نہیں تمہارے پاس۔ ابھی مالک مکان حیب  
سنے کا کہہ رہے گئیں اور وہ گیا تو وہ تمہیں کوئی بیسوا سمجھے گا جنہیں یہ سفید چڑی داہے  
آئے دن چند سکوں کے عوض لاتے ہیں۔ دھکے مار کر نکال دے گا۔“  
”تو پھر؟ اب کیا کرنا چاہیے؟“

”بھاگو! جتنی طاقت تمہارے پیروں میں ہے وہ سب ایک بار لگا دو اور بھاگو  
دیاں باغ کے کمرے میں جو باؤلی ہے، وہی جس میں کل آتے وقت تم دونوں نے جھانکا  
تھا کہ دیکھیں یہ دن رات کا ملاپ کیسا نظر آتا ہے پانی کے آئینہ میں؟ تم تیرے گادروں

اور مکڑیوں کی غارتگری دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ بدلتو ہے اُس میں اور ان جانے کیڑے مکوڑے بھی، مگر راستہ بڑا سیدھا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی کمر کے لیے اس سے سیدھا راستہ نہیں ہے۔

سرکڑا کر اکیڑا دل بیٹھ گئی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دہاں مگر نہ اُٹھنے کی ہبک نہ مہندی کا رنگ، ایک چوڑی بھی تو نہیں کھائی تھی۔ اس کا سہما ہوا دماغ اور جھجکا۔ یہ بیاہ ہے یا رانڈا پا؟ لڑکھڑاتی ہوئی وہ باہر بھاگی۔ برآمدے میں بہت سے ہاتھوں نے اُسے لپک لیا۔ بہت سے نہیں صرف وہی تو تھے۔ مگر کتنے سکون بخش اور محافظ! اور ٹیکہ کا بھوت کتنا سُرخ اور تازہ دم ہو رہا تھا۔

”تم اُٹھ آئی۔“ اُسے بیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے وہ برآمدے کے نیچے کود گیا۔ ”میں نے کہا تمہیں کیوں جگاؤں؟“ اُس نے نیچے سے اُس کی کمر دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ ”تمہیں ایک چیز... ہیں؟“

”روٹی!“ اُس نے طنزاً ان کے نیچے سے نکل کر لمبی سانس کھینچی۔ ”کیا ہوا؟“ اُس نے نرمی سے نیچے اتار کر اُسے ایسے دیکھا تو یادہ کوئی چینی کا کھلونا ہے جس کے ٹوٹا جائے کا خدشہ ہو۔

”کچھ نہیں...“ وہ آنسو پی کر منہ لگی۔ ”دُری ہوئی دھڑکن سے بھری ہوئی مصنوعی منہسی۔“

”روٹی... تمہارے جوتے اور کپڑے کہاں گئے؟“ چائے پیتے وقت اُس نے رُک رُک کر پوچھا۔

”جوتے؟ کپڑے؟ کیا کر دگی؟ ابھی میں تمہیں اس جھگڑے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ نو!“ اُس نے بہت سا مکھن لگا کر توس دیا۔

”یہ نہیں پوچھا تھا۔“

”کیا بات ہے تم؟“ اُس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

”آ... کچھ نہیں... میں ابھی... تو تمہاری سب چیزیں غائب تو...“

”تو؟“ ٹیلر اور سفید ہو گیا، ”تم سمجھیں....“  
 ”تو میں سمجھی... میں کہ چور لے گئے“ اُس نے بچوں کی طرح بہانہ بنایا۔  
 ”دھوٹ... مجھ سے جھوٹ مت لہو۔“ ٹیلر کا منہ اتر گیا، ”میں سمجھتا ہوں“  
 ”دھاک سمجھتے ہو؟“

”اگر یہ حال نہ ہا تمہاری بے اعتباری کا... تو....“

”مشقت... بہت عقلمند بنیتے ہو....“

”ہاں، تم سمجھیں میں چلا گیا تمہیں چھوڑ کر؟“

”بہت سمجھ۔ اتنی سمجھ ہوئی تو شادی کیوں کرتے۔ صبح بتاؤ کہاں گئے کپڑے؟  
 واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔“ اُس نے ایسے بات بٹٹی کہ ٹیلر سیدھا ہو گیا۔

”بیرا برش کرنے کو لے گیا ہے۔ دیکھو مہی میں نے شادی اپنے لیے کی ہے نہ کہ ان  
 بکھت جوتوں کے لیے۔ صبح صبح میری تو بات بھی نہ پوچھی اور جوتوں پر نثار ہوئی جا رہی ہے،  
 ”اچھا کہیں چلے گئے گھومنے؟“

”نہیں، بس یہیں تمہارے پاس۔“ وہ اُس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا۔

پورا مہینہ چٹکیوں میں سوئے جا گئے، نینتے لڑتے گزر گیا۔ دن بھر آجڑے  
 ہوئے بارغ کے منساں کو لوں میں سر سے سر جوڑ کر کیٹیں اور بائرن کے اشعار اور  
 عمر خیام کی رباعیاں پڑھی جاتیں۔ ٹیلر کی آواز بہت نرم اور مہجاری تھی۔ دھیمی آواز  
 میں محبت بھرے نغمے اور پھر طرقتی ہوئی نظمیں سنایا کرتا۔

وہ کیا سوچا کرتی تھی اور کیا نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز عام طور پر گندہ دمن  
 رہتے ہیں۔ دانتوں کی صفائی کے لیے نزاروں دوا میں ایجا دکرنے کے بند بھی اُس  
 کی نظر سے کوئی جھیلے سفید دانتوں والا انگریز نہ گزرا۔ ان کے سیاہی مائل زرد دانت  
 دیکھ کر ہمیشہ دانتوں کے کھڑے ہونے لگتے۔ ٹیلر کے دانت سفید نہ تھے مگر بالکل مہوار  
 اور ہجاری سے پاک تھے۔

”سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تمہاری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا تمہارے

نیلگوں سفید دانت تھے۔ وہ شمن سے کہتا۔ دانتوں کا رنگ بدلنا ممکن نہ تھا مگر وہ ضرورت سے زیادہ اُن کی صفائی میں منہمک رہتا۔ اخروٹ کی چھال چاکر وہ شمن کے دانتوں سے مقابلہ کرنے لگتا اور شکست کھا کر بچوں کی طرح بگڑا اٹھتا اور اُداس ہو کر کہتا :

”میں یہ دانت اکھڑا کر دوسرے لگواؤں گا۔“

”تم ہندوستانی نہ جانے کس ٹی سے بنائے گئے ہو کہ ہم لوگ دواؤں سے بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔“ وہ اُس کے سالو سے رنگ کو دیکھ کر کہتا، ”اس رنگ میں کتنی کشش ہے، آنکھیں چھپکنے لگتی ہیں“ وہ نیم باز آنکھیں بنا لیتا۔ اُسے پاؤں اور رنگ سے بہت نفرت تھی۔

”اس سے جلد کی حساس ملائیت چھپ جاتی ہے۔“

”میں تو خوشبو کے لیے لگاتی ہوں۔“

”اوہ... خوشبو! اس جلد کی خوشبو سے بھی نشہ آدے کوئی خوشبو ہے! اگر ایسا

ہے تو اسے تیز کر کے لیے شراب چھڑک دے۔“

جی چاہتا ہے۔ زندگی کی لمباں لاٹنا ہی ہو جائے۔ یہی چھپ کے بلے درخت ہوں، اخروٹ کی چھالوں ہو اور ٹیڑھی کی لفظوں میں الجھ کر کھوئے ہیں زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ بلے معنی قہقہے، گہری نیلہ ہیں، بڑھی ہوئی مہجور۔ اور کیا چاہیے تھا۔

ٹیکر روز بروز بدلتا جا رہا تھا۔ شمن سمجھتی تھی کہ اس اجڑ گوار کو ہندوستانی رنگ میں رنگنا قطعی ناممکن نہ ہی مگر دشوار ضرور ہے مگر وہ تو خود بڑی تیزی سے ہندوستان کی آب و ہوا، خوراک اور طرز رہائش کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ یہ مزد بھی کتنے سہل ہوتے ہیں، جو زندگی انہیں دینا چاہو دیدو۔ اس معاملے میں نہ ان کا بلکہ اختلاف آڑے آتا ہے نہ قومی۔ جس آغوش میں گئے آنکھیں بند کر کے مڑا لیا۔ اب جو چاہو کرو۔ دن رات ایک ہی لباس پہنے سستی کا اشتہار بنا پڑا رہتا۔ ٹیکر کو ناہیوں

جاتا۔ وہ تو ڈاڑھی چھوڑ کر تینا مگر شمع نے شدت سے مخالفت کی لہذا مجبوراً شید کر لیا۔ پانی سے گھبراہٹ ہوئی، خوب مرجھوں دار سالن کا کر تین چار گھنٹے دوپہر کو سوتا۔ بڑی مشکل سے شام کو اٹھتا۔ باہر جانے کے لیے ہزاروں بہانے بنائے لگتا اور جو شخص زبردستی گھسیٹ لے جاتی تو وہ بالکل سانس اور غیر دلچسپ راہوں میں گم ہو کر وہاں قدرت کی رعنائیوں کی تعریف کر رہے بیٹھ جاتا۔ اس نے چپکے سے دو ہفتے کی چھٹی اور منگالی شمس نیچے لیچھا تو بہانے کر رہے لگا، اس کی چھٹی واجب ہے۔

دعوت زدہ ہو کر شمس نے دیکھا کہ وہ ایک سچا یہ معہ بنتا جا رہا ہے زیادہ تر اذیتنا رہتا ہے مگر جو نہی جا کر رہے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور پھر جلد ہی اس میں کن تار کی ہیں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ رات گئے تک خاموش بیٹھا رہتا۔ اگر شمس کچھ بات بھی کرتی تو یہوں نالی کر کے نالی دیتا۔ لمبی لمبی جہا ہیاں لیکر آنکھیں بند کر بیٹھا۔

”میں لوگ کا عمل سیکھ رہا ہوں یہ وہ مذاق کرتا۔“

”لوگ کا عمل؟“

”ہاں، مزیدانی حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔“

”دماغ خراب ہو رہا ہے؟“ وہ بگڑ جاتی۔

”یہ دنیا فانی ہے“ مذاق حد سے گزر جاتا اور وہ روٹھ جاتی تو بچوں جیسی حرکتیں

کر کے خفا تہہ پہن تو نہ ناموں سے چکا کرتا جس پر وہ اور برا مانتی اور اٹھ کر باہر چلی جاتی۔

جب تنہا گھوم پھر کر آتی تو اسے کبھی پر اسی طرح سوایا پانی۔

اس کی توجہ اور محبت بھی عجیب تر ہوئی گئی۔ شدت میں تصنع کی طاوٹ معلوم

ہوتی۔ وہ جتنا خاموش رہتا اتنا ہی پر جو ش اظہار محبت ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا

کسی چیز کو دور حبشک کر وہ سجا کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف اور

اکتاہٹ اسے غلط حال کر دیتی اور وہ جھلاہٹ بھری محبت شمس کو خارج کر کھٹکے لگتی۔

ایک دن بڑی زبردستی سے وہ اسے آبادی کی طرف گھسیٹ لے گئی۔ مقوری

دیر کد اُس کی نیند دور ہو گئی۔ بالکل پرانے ٹیکر کی طرح کافی پی کر تھپتھپا لگا تا رہا مگر جو بھی ہنسی ختم ہوئی ایک عجیب قسم کی جھجک اس کی حرکات میں معلوم ہوئی جیسے وہ رستیاں ترڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو، روشنی سے آنکھیں چندھائی جاتی ہوں۔

محقوظی دیر میں وجہ معلوم ہو گئی۔ لوگ چپ چاپ بیٹھے اس آنکھ سے جوڑے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ پیرا اپنا فرض قبول اُن کے قریب کسی بہانے سے کھڑا رہ جاتا۔ کچھ سڑپیر ریز گاڑی لیتے ہوئے گاہک کا حساب کتاب کرکے نظر آتا اور دو چار پرچی سوکھی ماری میں تو کھلم کھلا ناراض بیٹھی تھیں۔

”نہ جانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟ اُس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“

”یہی کہ... نہ جانے میں کوئی ہوں... اور تم... اوہ... سوچنے دو... آؤ۔“ وہ شمن کے چہرے پر رنگ آتا دیکھ کر طماننے لگا۔

”والپس چلو! شمن نے درستی سے کہا۔

”کیوں؟ ارے واہ!“

”میں کہتی ہوں والپس چلو۔“

”مگر...“ وہ کچھ جھینپا ہوا سا اُس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ راستے بھر

خاموشی رہی۔

”ہم ان سے ڈرتے ہیں، کیا ان کا دیا کھاتے ہیں۔“ وہ مارنے غصے کے لرزے لگا، ”جابل، کیئے!“ وہ بڑی بڑی گالیاں بکنے لگا۔ آخر لوگ اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں؟ آخر ان سے تو ایک ہی بیج کا پھل، کیا چھوڑا کیا بڑا، کیا کالا کیا سفید۔ مگر کون سمجھاتا۔ کاش وہ اس شادی کے پیچھے چھپا ہوا شاندار مقصد موڑے موڑے حریفوں میں لکھ کر اپنی پشت پر طمانک لیتے تاکہ یہ کوڑ مغزیوں میں آجھڑا انھوں سے تو نہ گھورتے یہ بیرحم آنکھیں جو معلوم ہوتا ہے بیٹھ میں سوراخ کر کے دل پر گھسی جاتی ہیں۔

”ان کا کوئی قصور نہیں، عجائبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے“ شمن کا دل بیٹھنے لگا۔

”مگر انہیں کیا مطلب ہے؟ یہ کیوں مرے جلتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں ان لوگوں کی سفیدی کو۔ دل کی سیسا ہی تو کوئی دیکھے۔“  
”وہ مجھے کیوں بازاری عورت سمجھتے ہیں؟“

”میں... میں گوئی بارہوں گا ان حرامزادوں کے... جیسے ان کی سفید تپلیاں تو بس دیو یاں ہیں۔“ شمن نے اس کے دل کی بات کہہ دی اس لیے اُس کا غصہ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا۔ پھر وہ شمن سے لڑ پڑا گویا وہی ان سب کو بڑا کائی تھی۔  
”تو تھجکتی کیوں ہو؟“ وہ چیخا۔

”میں کہاں تھجکتی ہوں۔“  
”اور کیا تم گور کر انہیں اور شیر بنا دیتی ہو؟ اپنا الزام وہ شمن پر مقبوضا چاڑھتا تھا۔“  
”مگر میں ان کیلینی حرکتوں کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے تو میں خود ان کے منہ پر ہتھوکہ دوں گا۔“ اس نے اس زور سے چنگھاڑ کر کہا کہ ہر لحاظ اس کی ذہنی کوفت کا آئینہ دار بن گیا۔ گو وہ منہ سے بکتارا مگر اُس کا چہرہ اُترا بیٹھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں مانتا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ شمن کو سہا ہوا دیکھ کر جی دیکر گیا اور وہ اُسے سمجھانے لگا۔

اس ذہنی کوفت کو اُس نے شراب اور زبردستی کی محبت میں ڈبونا شروع کیا، مگر اس طرح وہ اکیلا فرار پا جاتا، شمن اس کے رویہ سے عاجز آجاتی۔ اکتا دیے والا شمن مصنوعی اور فضول معلوم ہوتا۔ اپنے ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے وہ اس مدہوشی کے پاس کیونکر پہنچ سکتی۔

”پونا کب چلو گے؟“ اس نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

”رہیں۔“ اس نے اپنے پوشیدہ خوف کو اور تھپکانا چاہا، ”تمہیں چھوڑ کر میں کیسے کام کر سکوں گا؟“

”مجھے چھوڑنے کو کون کہتا ہے؟“ شمن نے جبر پر ذہنت برداشت کر کے کہا۔

”ہاں... مگر وہاں ٹاپوئی پر مجھ سے نہ جایا جائے گا۔“



”پھر کیا ارادہ ہے؟ اسی طرح مٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے کیا؟“  
 ”اگر تمہاری آغوش میں مٹ بھی جاؤں تو...“  
 ”بکو اس مت کرو تو... تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“  
 ”دھوکا... کون کبھت دھوکا دے رہا ہے؟ مہنہ! وہ مجرمانہ انداز میں  
 نظریں پچا کر کہنے لگا۔

”تم مجھے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو تم...“  
 پچھتا رہے ہو۔“

”غلط... غلط... یہ سراسر ہتھان ہے!“ اس کی تیزی اور جھلاہٹ نے  
 بات کو اور بچتہ اور یقینی بنا دیا۔

”میں تمہاری ہر بات سہہ سکتی ہوں مگر تو نے یہ جھوٹ مجھ میں برداشت کرنے  
 کی طاقت نہیں۔ اگر تم صاف کہہ دیتے کہ تم مجھے ساتھ لے جانے میں ذلت محسوس  
 کرتے ہو تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔“

”میں... میں تمہارے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا یہ بات طے ہے اور یہ کیسے کہتی ہو  
 کہ مجھے تمہیں ساتھ لے جاتے ذلت محسوس ہوگی۔“

”اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اس چنگر سے جو طے کو نہ چھو کہ جب لوگ مسکرا اٹھتے  
 ہیں، اٹھ پچا کر اشارے کرتے ہیں تو بلا میرے کہ تم...“

”تو پھر تو تم بھی جھوٹ بولتی ہو گی تو ظاہر تو یہ کرتی ہو کہ نہ تو تم نے کچھ دیکھا اور  
 نہ سمجھا۔“

”ہر... یہ میں اس لیے کرتی ہوں کہ... میں...“ وہ کچھ نہ بتا سکی۔

”تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو۔ تم خوب سمجھتی ہو کہ میرے ہم وطن مجھے تنفر سے  
 بھرتی مہم زدگی کے ساتھ دیکھتے ہیں گویا تم ایک بیماری ہو جو میری حماقت سے میرے  
 سر منڈھ دی گئی اور تمہارے بھائی بند سمجھتے ہیں کہ تمہارے پہلو میں ایک انسان  
 نہیں ان کی ساری قوم کی شخصیت پر ایک موتی سی گالی ہے۔“

”لوگ مجھے کیونہ سمجھتے ہیں...“

”شتم... مگر تم مجھ سے کیوں لڑا رہی ہو۔ گویا اس میں میرا کوئی مقصور ہے۔ تم جانتی ہو میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”ہوں، یہ جو تم پستی کی طرف گرتے جا رہے ہو یہ بھی صرف میری خاطر۔ تم نیچے اتر کر میرے برابر بیٹھا جاتے ہو۔ تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میرے برابر آنے کے لیے تمہیں اٹھنے کی نہیں بلکہ گرنے کی ضرورت ہے؟“

”یہ تمہارا وہم ہے۔“

”نہیں یہ میرا وہم نہیں، میں دیکھ رہی ہوں تم اس دوری اور فرق کو مٹانے کے لیے خود مٹے جا رہے ہو۔“

”تمہاری محبت کی خاطر سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر...“

”مگر یہ محبت کیسی جو تمہیں میٹ رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ کیا ہے تمہیں محبت ہو یا نہ ہو مگر اتنا یقین ہے کہ مجھے اٹھا کر اپنے برابر کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ تم سفید انسانوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجے تک بچا کر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے لہذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو۔“

”تمہارے وہم سیدھی بات کو بھی بھڑکتا بنا کر بکھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت...“

”ہندوستانی ہے، کہہ دو“ لہجے میں انتہائی تلخی پیدا کر کے کہا۔

”جہ جہ، اتنا احساس کمتری، اتن ہندوستانیہ کو توہین سمجھتی ہو۔ یقیناً مانو شتم

میں نے جو کچھ کیا انجان ہوتے ہوئے کیا۔“

”لیکن یہ یہ کیا تم تھا کہ کیا، آخر قدرت کو اس کے ہر شعبہ زندگی سے خواہ مخواہ

کا بے کیوں ہو گیا تھا؟ تلخیاں بڑھتی ہیں پھر دوب جاتیں مگر ہر جہ کا ایک داغ تھپڑ مارتا۔

محبت اور انسانیت ہر وقت میدان میں ڈٹے نہیں رہ سکتے۔ ویسے دونوں کا جی

بھی اکتا گیا تھا۔ محبت لیچرٹ معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک دوسرے کے وجود سے گہرا میٹ

ہونے لگی۔ مہی مون ہی میں ایک دوسرے کی جدائی کے سینے ترسانے لگے اور یہ  
 جھوٹے موٹے جھوٹے اُس نفرت کو بڑھاتے گئے جو دونوں کے لاشعور میں حصول  
 میر جی محقق مگر وقتی طور پر دبی ہوئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی بے دخلی پر حیرت زدہ ہیں۔ بچپنا نے میں خود داری کو  
 ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لہذا اسکول قلب کا یہ نسخہ بھی ٹھکرا یا ہو رہا ہے۔ یقیناً ٹیلر پر  
 تو کسی قسم کا کوئی سوداوی مرض قابو کیے ہوئے تھا ورنہ وہ اس قدر آسانی سے یہ  
 ڈراما نہ کھیل جاتا۔ اُس پر سے مریچوں اور شراب نے دھار رکھ دی۔ جھنجھلا کر وہ احساس  
 شکست سے بچنا چاہتا۔

بہت ضبط کرنے مگر ذرا سی ٹھیس سے پکا مچھوڑا مچھوٹا نکلتا اور دونوں کو  
 اپنی خوبیاں اور دوسرے کے عیب نظر آنے لگتے۔ وہی طعنہ جو انہیں لوگوں کی آنکھوں  
 میں نظر آتے تھے الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے پر پہنچنے لگے۔ شکل و صورت کی وہی  
 خوبیاں جو کبھی دیرانہ ناگہی ٹھیس آنکھ میں شہتہ بن کر ٹھٹھکنے لگیں۔ ٹیلر کے بال بے جا  
 اور مد رنگ نظر آتے، آنکھیں غائب معلوم ہوتیں اور جلد کے گوشت جیسی لگتی۔ اُدھر  
 ٹیلر کو اُس کے بیاہ بال اور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہونے لگیں۔

خدا خدا کر کے مہی مون کا مسیبت بھرانہ منتم ہوا اور مجبوراً یوناروانہ ہونا  
 پڑا۔ ٹیلر کا خوف تازہ ہو گیا گویا وہ نہایت چر خطر اور جگہی محاذ پر جا رہا ہے۔ شمن اسے  
 ٹھیس کرتی اور سارا غصہ اور نفرت لاوے کی طرح سینے میں جمع کر لیتی جو غول میا بانی  
 کی طرح دلی دماغ میں پھیل چلائے رکھتا۔

امیٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور  
 کمپارٹ منٹ میں بھی اگر کوئی انورسہ دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب  
 رشتے میں منسلک تصور نہ کرنا۔ وہ ایک دوسرے سے بے توجہ اپنی تنہائی ظاہر کرنے  
 میں کوشاں تھے۔ کوئی نہ دیکھتا ہوتا جب بھی احساس بننے غصے ہونے کو تیار رہتے۔  
 آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ پس منظر کے ہی منتقلی تو کانا مچھوڑی نہیں بھر رہی تھی۔

غیروں کی طرح ڈانٹنگ کار میں کھانا کھایا۔ بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سُرخ ہو گئے اور شیشی نے میرے کی ناقذانہ نظروں کا بڑی مشکل سے مقابلہ کیا۔ دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑ کے بے تنکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

کبھی بھولے سے وہ بے تکلفی سے کوئی دلچسپ بات ایک دوسرے سے کہتے تو فوراً ڈر کر ارد گرد دیکھنے لگتے کہ لوگوں کی حیرت کا کیا حال ہے۔ اس بہادری اور جسوش سے قائم کیے ہوئے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپانا پرارہا تھا۔ جب ٹیلر کا سر ہوتے میں تھکے سے ڈھلک کر مڑ گیا تو شیشی کی ہمت انہ پر بڑی کہ اس نے چھپن مگر کو سیدھا کر دے، گواہ سے خوف تھا کہ کہیں بیمار سکا گردن نہ رہ جائے۔ وہ معمولی سا خیال جو بڑوں کے پیرائے میاں بیوی میں بھی تھوڑا بہت لہو جاتا ہے، یہی ایک دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جاتا، اس کے اظہار کا حق بھی چھپن چکا تھا اور وہ ابھی دواہن دو لہا تھے۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بیٹھا کھلے بندوں نکتے بچوں جیسے اخلاص کر رہا تھا۔ اگر ایسی اُس کی جگہ سفید قوم کی لوطی ہوتی تو سر پرانا اپنے سیاہ مٹھ بٹ میاں کو چٹا چٹ چومنے کا حق رکھتی تھی، بلکہ فخر یہ کہتی کہ ”لو دیکھو میرے روپنی حسن کی طاقتیں، کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتا ہے، اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپنی بارش سے کھل کر فخر یہ کہتا کہ ”دیکھو تم ہم کو کالاجتے ہو مگر یاد نہیں کہ شیشی جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں اُن کی متوالی تھیں۔۔۔“ مگر وہ حقیر تھی۔

اور اس کا جی چاہا کہ سب کے منہ پر تھوک دے اور اسی وقت سب کے سامنے جھبک کر ٹیلر کے دھتے ہرے سے کراہام سے رکھ دے، اُس کی بیشائی پر کچھ سے ہوئے شرتی بالوں کی لیشی نرمی کو انگلیوں میں جذب ہونا محسوس کر لے، اس کی پاک کا جو ایک بال ٹوٹ کر پوٹے پر چبک گیا ہے، جیسے سونے کا باریک ساتار، وہ اسے انگلی سے ہٹا دیتی تو کتنا اچھا ہوتا کہ کہیں آنکھ کھلے تو اندر نہ جا پڑے۔ ویسے ہی کیا کم کو پیے پڑ چکے ہیں، ہوا اس نے غسٹلانی میں آنکھیں مسل مسل کر نکالے کتنا اس کا جی چاہا کہ سارہ صبح کا پلو تہہ کر کے منہ کی بھاسپے گرمی پہنچائے مگر اُسے یہ تجویز ٹیلر کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑی

کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ذلت کو برداشت کرنے سے پہلے مرجانا بہتر سمجھے گا۔  
اور یہ وہی ٹیکہ تھا جو ضدی نیچے کی طرح روز آں کھڑا ہوتا تھا۔ دشمن کے پیچھے ہٹکاری  
کی طرح اس نے دروازے پر دھڑا دیکر حاصل کیا تھا اور پھر اپنے کو دنیا کا خوش قسمت  
ترین انسان سمجھتا تھا۔ یہ وہی انسان تھا جو اس کے گھٹنے پر سر رکھا کر تیل ماوانے کے لیے مصر  
پوتا تھا۔ پیڑوں کی جڑوں سے کشتی رکا کر جب پھانسیں لگا لیتا تو شمشے کی خنک شاموں کو بجلی  
کے سامنے وہ سوئی سے اٹھیں کالا کرتی اور اس وقت وہ ضرورت سے زیادہ شریر بن جاتا،  
ہر پھانسی کو ایہ وصول کر کے نکلاتا اور دوسرے دو جان بوجھ کر نہی پھانسیں لگا لیتا۔ لیکن اگر  
اس وقت سبکے سامنے وہ اس کا سر جھک بھی دیتی تو وہ اسے ذلت کے مڑی جاتا۔ اور  
وہ خود؟ اسے اپنے آپ پر کچھ کم رحم نہ آتا۔

وہ پہلے سوچا کرتی تھی کہ بھلا کیا جانیں یہ انگریز کہ عشق و محبت کیا چیز ہے۔ ہلو وہیں  
کے بندے نہ شرم چیا بھلا رومان کیا سلامت رہنا ہو گا ان میں؟ کتنی سوخت، کچھ درکاٹ  
مطلبی محبت ہوگی لیکن رونی بالکل مختلف تھا۔ وہ ہر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مذاق  
کو سمجھ جاتا اور اس میں وہ ساری حافیتیں موج بہتیں جھپٹیں وہ بچپن سے عشق و محبت  
والہ تھے جتنی تھی۔ وہ بلا مذاق نہ تھا۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے بچپن کے قصے سن کر ملتے  
دنیا کے دو مختلف ٹکڑوں پر رہنے والے ایک ہی جیسا بچپن اور جراتی گزار چکے تھے۔ وہی  
تھوڑی بھڑائی شرارتیں اور مزاحیں، معصوم دلچسپیاں اور ایک ہی جیسے کھیل۔

اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ پھر دور دور ہو جاتے اور ایک دوسرے کے  
سامنے سے بھاگتے۔ تھوڑی دیر میں کپیار ٹنٹ خالی ہو گیا تو بجائے قریب آنے کے وہ  
ایک دوسرے کو بزدل اور بے اصولا ثابت کرنے لگے اور وہ نرم گرم جذبات جو  
تھوڑی دیر قبل شمشے کے دل میں جنم سے رہے تھے کھلا کر ختم ہو گئے۔

پہلے پہلے تو لوگوں  
کی حیرت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پاس پڑوس کی متعجب آنکھوں کے تیر سہنے کے لیے گھنٹے  
کی کھال کا تھوہ بکتر پہننا پڑی۔ جو سناٹا توہ لینے آتا۔ اور کچھ نہیں تو بیکار کے سودا بیچنے

زانے ہی جان بوجھ کر ناک لگاتے نہ دیکھتے چلے آتے۔ ٹیلے کے دور دراز کے ملنے والے  
انکے دوست اور دوستوں کے دوست آنکھیں پھاڑے مبارکباد دینے دڑے آتے۔  
ان کی آمد اور تمیزاں بڑھاہاتی۔ وہ لوگ بڑے ہندب طریقوں سے اس عجیب و غریب  
سانحے کا ذکر اول سے آخر تک سنا چاہتے۔ ان کے چہرے تجسس سے پریشان ہو جاتے  
اور عقلیں پرانگندہ ایسے ہوا تو کیسے ہوا؟

جتنے منہ اتنی باتیں پرانے گھاگ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی آوارہ عورت  
تھی۔ نووارد اسے کسی ریاست کی مہارانی سمجھتے۔ چند ایسے ہی تھے جو کچھ فیصلہ نہ کر سکتے  
مگر دونوں کو خدائی الذہن ضرور سمجھتے۔ انتہا ہو گئی کہ ٹیلے کے انسر نے اس کو بلا کر اس واقعے  
کو سیاسی نقطہ نگاہ سے عجیب حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آقاؤں کی  
قدیم روایتوں کو بھیس لگانے کی ترکیب کی تھی۔ جواب دہی کرتے کرتے ٹیلے تنک سی نہیں  
کیا بلکہ خود اپنے اوپر جو اعتماد تھا کھو بیٹھا۔ یہ بات ہمیں تک نہ رہی بلکہ ڈاک کے  
پر دہل پڑی ہوئی امریکہ میں میکر کی بیوہ مائیکل نے سچ سچ سمجھی۔ وہ کم عقل اور گھڑنہ تھی مگر  
پھر بھی مفصل خط مانگا تھا۔ ٹیلے اس بھی چراغ پا ہو گیا۔

”مگر اس میں ایسی کیا بڑا ماننے کی بات ہے، اس نے بڑھیا کی حمایت کی۔  
”کچھ نہیں۔ تم اس کی حمایت صرف میری ضد میں کر رہی ہو۔ میں اسے منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔  
اگر وہ مجھے اب تک بچے سمجھے ہوئے ہے تو یہ اس کی بھول ہے۔ ٹیلے کا غصہ ناک پر دھرا  
رہنے لگا تھا۔ وہ اب بالکل جاگ اٹھا تھا اور شریاب بھی نشہ نہ لاسکتی تھی۔ وہ غموں  
میں جیسے اور پارٹی سے جان چرانا۔ یا تو اسے کوئی مرض آن دیا تا یا مجبوراً دشمن کو ایک  
آدھ بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک دوسرے سے اور بھی اکتانے لگے۔ زیادہ  
وقت ایک دوسرے کو طعنہ دینے اور اپنے حال پر رحم کھانے میں صرف ہوتا۔ دونوں  
اس مصیبت کا الزام اپنے اوپر سے اٹھا کر دوسرے کے منہ منڈھنا چاہتے تھے۔ بہت  
جلد زندگی خوفناک حد تک بارہن کر رہ گئی۔ اگر وہ سب سے کسی کے یہاں چلے بھی  
جاتے تو کھما پھر کر ان کے بے تحاشے عشق کا ذکر نکل آتا۔

”ایک بار سہارے ایک رشتے کے چچانے ایک ریڈ انڈین سے شادی کر لی تھی۔ برطی ماؤ فائوڈنیک ہفتی نہیں اپنی زبان کے گیت اور خون ناک جنگلوں کے قصے سنایا کرتی تھی۔“ وہ برطے جوش سے کہتے۔

”ہندوستان سے دوستی برطہالے کا یہی طریقہ ہے کہ کاسے اور گورے کا امتیاز اٹھا دیا جائے۔“ وہ برطے فرزند بن کر کہتے۔ مگر ان کی یہ سخاوت دونوں کو ابھی دکھائی پائی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے اصلی معنی یہ ہوئے کہ مشرق اور مغرب کو ملانے کی کوشش اتنی ہی مشکل اور لمبی و دور ہے جتنی سیاہ کو سفید بنانے کی آرزو۔

ہر ملاقات کے بعد نئی ملاقات کا خیال بھیانک بکر خون خشک کرنے لگا کئی دن تک دلوں پر مردنی چھائی رہی جو آپس کی تلخیوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی۔ الگ الگ دوستوں کا حلقہ بنایا تاکہ ایک دوسرے کی موجودگی جو سوال دلوں میں پیدا کرتی ہے اُس کی گنجائش ہی نہ رہے۔ مگر لوگوں سے نجات کہاں تھی! لاکھ لکھ لاکھ تھے کہ سب حماقت عبت کے زبردست ہاتھوں سے مجبور ہو کر کی گئی، اب بھی بہت خوش ہیں اور قطعی نہیں پھٹتے، ہر مخالفت کو تیار ہیں، مگر اس طرح مستعدی سے تیار ہونا ہی صاف ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش میں خود کو ڈال دیا ہے۔

اور اور اور چا پانی پٹاخوں نے بری طرح فضا کو مکد کر رکھا تھا۔ ہم تو خیر جہاں گھر رہتے تھے مگر جو انسان اُن سے بچنے کے لیے مہاگ رہے تھے اُن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ جیسے گھٹکا سن کر بدحواس بھیڑیں چاروں طرف بھاگنا شروع کر دیتی ہیں اور بجائے محفوظ ہونے کے خود خطرہ بن جاتی ہیں۔ یہ گھبرائے ہوئے کم عقل جانور ایک شہر سے مہاگ کر دوسرے شہر میں پناہ لینے دوڑ پڑے۔ اونے پونے سامان بیچ کر ریلوں پر حملہ کر دیا۔ ممبئی کے لوگ کلکتہ اور کلکتہ کے ممبئی۔ اس کو بھی کسے دلاں۔ اس کو بھی میں بدل کر یہ سمجھ لیا کہ اب گھن نہیں لگ سکتا۔ حادثوں سے جتنی جانیں گئیں اتنی شاید سال بھر کی لگاتار مہاری۔ سبھی نہ جانتیں۔ گھپ اندھیرا سڑکوں ہی پر نہیں عقلوں پر بھی چھا گیا، مگر یہ کیا ہوا؟ یہ ڈھال پر سے اترتے اترتے روڑے پر سے پیر پھسل گیا؟ برف کے

بے جان سفید مٹی نے چاروں طرف سے ہاتھ پھیلا کر ٹیکر کی بڑھتی ہوئی جرات کو آغوش میں بھینچ لیا۔ ہڈیاں تک جما کر رکھ دیں۔ مومیں اٹھ کر چڑھتی ہیں اور سفید چٹالوں سے سرھپو کر لوٹ آتی ہیں۔ اوپر سے برف کے بیٹوں کی دیدہ دلیریاں الاماں پہنچے مٹنے مٹنے ایک دم لوٹ پڑے، جیسے چالاک کبڈی باز اپنے پاسے میں دوڑ تک دوڑا لائے۔ پھر جو ٹپا یا ہے تو چین ملا کر می چھوڑا۔ تمام دنیا کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ہارنے اور بچے بھاگتے ہوئے بھی سلجھل کر ٹپکے سرخ ستارہ خون میں لت پت مگر سانس یہ ہوئے نکل آیا۔ وہ روہنیوں میں ختم ہونے والا مٹیوں بندھا لیکر جاتی و چونہ ہو گیا۔

”ہم جانتے تھے آخر میں فتح ہماری ہی ہوگی“ ٹیکر نے اخبار رکھ کر غور سے کہا۔  
 ”تمہاری؟ یعنی یہ فتح تمہاری رہی اور وہ شکستیں جن کا مزہ شاید اب تک وہاں پر ہو گا، وہ کس کے حصے میں لگا دیں؟“ شمع نے چڑ کر کہا۔  
 ”ایں؟ مار اور جیت تو ہوا ہی کرتی ہے۔۔۔“

”اچھا تو کبھی مار بھی ہوئی ہے؟ منہ سے تو یہی کہتے رہے کہ جیت رہے ہیں۔ وہ بہادری سے بچھے مٹنا کچھ تم ہی لوگوں کو صحت ہے۔ تم میں تو کیا دم تھا کہ ٹیکر جیسے جن سے دپتے۔ یہ ہندوستانی بھیڑیں اس دیوتا کے کلیجے کی آگ کیا بجھا سکتیں؟“  
 ”تم پالیٹکس نہیں سمجھتیں۔۔ اتحادی۔۔۔“

”جب تک مارنے کا خوف ہے اتحادی بنے ہوئے ہو۔ آدھ سارا اتحاد چوڑ ہے میں ڈال کر حصے لینے دوڑ پڑو گے اور پھر نہ دیکھو گے بھائی نہ بھتیجا بس سرکارِ عالمیہ رہ جائیں گے اور ان کے چیلے چانٹے؟“  
 ”اچھے ایسا نہ ہو گا“

”اجی خصلتیں بھی کہیں بدلی ہیں۔ جرمنی ختم ہوئے پھر روس کی باری رکھی ہے۔ آج روس کے گن گائے جارہے ہیں کل تک اُسے انسانیت کا دشمن کہتے تھے۔ آج چائنا کی محبت میں فدا کے میں پیار سے ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں کئی تک یہی چینی جو نظام و حشی



اور بد معاش تھے۔ سو اے ڈاکوؤں کے منہ چلیے کسے کبھی کوئی دوسرا عہدہ نہ ملا، آج ہی چینی اتحادیوں کی فہرست میں گنے جا رہے ہیں۔ جاپان کے منظم کا غل چار کھا ہے اور اپنے فعل انسانیت کی حفاظت بنا کر پیش کیے جا رہے، مگر یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ظالم خود اپنے ہاتھ سے اپنا کلا لٹکھڑکھڑا لیتا ہے۔

”دھیک دھیک ہے ظلم تو ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان ہی میں نامدہ ہے۔ غور سے دیکھو تو باوجود ظالم کے ہندوستان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور موٹا جا رہا ہے۔“  
 ”یہ جو چند کروڑ انسان انگریزی بولنے لگے ہیں اسی کو تم ترقی کہتے ہو گے۔ کاش اسی طرح تمہیں ملٹری جرنی سکھا کر مقدس انسان بناسکتا۔“  
 ”اسے ذاتی لڑائی کیوں بنا رہی ہو؟“ بیکر چڑ گیا۔

”کیونکہ یہ ہماری ذات سے وابستہ ہے۔“

”سکون چاہتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا ہو گا۔“

”میں سب کچھ برداشت کروں گی مگر اپنے ملک کو ان سفید چڑی والوں کی اڑی تلے مسلتا دیکھ کر ضرور میرے دل سے خون ٹپکے گا، میرا دل روئے گا، آنکھیں روئیں گی اور روح ہمیشہ روتی رہے گی۔ یہ نہ سمجھو یہ بھول ٹھنڈی پڑ گئی ہے تو چنگا ریاں بھی بچھ گئیں۔ کبھی تو زمانے کی ہوا رخ بدل کر چلے گی پھر انتقام۔۔۔“

”مگر تم سے تو رہی ہو۔ اپنی ساری قوم کا دبا ہوا جذبہ انتقام تم میرے ہی سر پر ختم کر دو گی؟ گرنیو ٹھیک پڑا تلخ تر نہ ہو تا گیا۔“

”اور تم؟ میری قوم کو داغی مالی اور جسمانی طور پر پسینے کے بعد اب اس کی رنج پر حملہ کر رہے ہو۔ خیر اب ملک تو اقتصادی اور سیاسی دنیا کے مالک تھے اب مجھ جیسی لڑکے عورتوں نے اپنی آخری دولت بھی منہا۔ ہی جوتیوں میں ڈال دی۔“

”مگر میں کونسا خوش ہوں؟ مجھے بھی تو خوب انعام ملا۔ میری قوم میرے منہ پر مٹھو کتی ہی ہے، تمہارے وجود کی سزا مجھے ان کی پٹکار کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے۔ سڑے ہوئے انگلی کے پورے کی طرح انہوں نے مجھے کاٹ کر جسم سے درھینک دیلے۔“

”اور... اوجھے؟ زندگی بھی اتنی کمینی نہیں سمجھی۔ باقی جتنی میں اپنی قوم کی نظروں میں  
ہو گئی ہوں۔ میں نے اُن کے پُر غرور سر کو تمہاری ٹھکڑوں میں ڈال دیا۔ وہ میری پرچہ نہیں تھی  
اپنی شریف عورتوں کے اور پرچہ ناگوار نہ کریں گے۔“

”مگر اس میں یہ کیا قصور ہے۔ تم بچہ تو نہیں بنیں۔ تمہارے کعبت ملک کی غلیظ آب و  
ہوا اور خود تمہاری سیاہ کشش نے میرے دماغ کو مفلوج کر دیا۔ میں نے بہت برداشت کیا لیکن  
اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مجھ پر ضبط نہیں رہتا۔ لیکن کوئی علاج بھی تو نظر نہیں آتا۔ میں اس راہ  
پر گم ہو گیا ہوں جیسے لوٹنے بھی نہیں دیتی۔“

”یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل چکے ہیں؟ تم جو میری جوتی پر ناک رکھتے تھے، میں نے  
تمہاری چابیوں کو سچ بھریا، تم پر چھوڑ دیا۔ اب بالہ تمہارے برف کے تودے جیسے وجود  
میں انسانیت کو پالنے کی کوشش کی اور اسی حماقت کی سزا میں گت رہی ہوں۔ مگر معلوم ہو گیا  
کہ تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ لا کو حیل چرطہ کو حقیقت تم ہیٹوں کی کا را دا خاش کر کے  
رہے کی۔ خونخوار درندے، جھوٹے اور قریبی کہیں گے۔“  
”تہا موش، بد قیڑ!“

”مہندہ بد قیڑ؟ چچہ کو پچہ را در عبدان کو حیوان کہنا بد قیڑی نہیں۔ اسٹ گونی ہے تم جیسے  
قیڑے...“

”میں کتنا ہوں خیریت، اسی میں ہے کہ جیسا کہ چچہ، رونی کی زبان مار گئی اور خستے سے  
بے کھیں دیکھ اٹھیں۔ اس کی شکل گھناؤنی ہو گئی۔“

”اوہو، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے عہد شکنے میں ڈرجاؤں کی پچاٹے کچھ ہوں تمہارے  
فریب کا حال ضرور سولوں کی۔ اس طرح دھوکا دے کر، شعلے کی طرح بغیر کا ہوا چہرہ اور  
بھی سیاہ پڑ گیا۔ پوری طاقت چوڑا پچلا، باغی لٹنی اور خسار کو پچلتا ہوا دشمن کو زمین پر گر گیا۔  
”بندر کا تیار نہ نا۔ ہر چا گیا۔ دشمن نے ایک آہ بھی نہ بھری۔ وہ بروی احتیاط سے سنبھل کر  
کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔“

وہ کیا کرے؟ اب کیا کرے؟

بھڑو، اتنا مت سوچو۔ ذرا بیڑو، تم نے۔ گناہ کیا ہے، تو خیارہ چھلکتے سے اتنی منت ڈرو۔  
 ہتھویر کا بیڑی سینگ کرانگور توڑنے کی امید نہ کرو، بیڑو، سر کا پلے وہ کئی گھنٹہ روتی رہی۔ ٹیکر  
 رات گئے ٹیکے میں دھت تھا۔ اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر بی وہ کانپ  
 اٹھی اور جلدی سے کندھی لگا کر پانگ پر گر گئی۔ ٹیکر تو پانگ پر گرتے ہی سو گیا مگر وہ آنکھیں  
 بھیڑے صبح تک کھڑکی سے کالی بھیانک رات کو گھورتی رہی۔ سوچتے سوچتے کینیاں سن  
 ہو گئیں، دماغ دکھ گیا۔ پر وہ کیا سوچ رہی تھی! سوائے شدید غم کے کوئی دوسرا احساس زندہ  
 بھی تو نہیں رہا تھا۔ جسم خشک کر لپکا پھوٹا ہو گیا۔ کاش کسی غیبی جراح کا مشتاق ہاتھ اس ٹپکن  
 کو ٹھنڈا کر سکتا۔

صبح اُس نے چائے کی پیالی بستر پر پڑے پڑے حلقے سے نیچے اتار لی۔ ٹیکر کے جانے  
 کے بعد وہ اُٹھی۔ آج وہ بہت خوش وضع کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اُس نے بیٹی بھی  
 بجائی تھی جس کی ہر نان سے سرت ٹپک رہی تھی۔ دیر ہو کر اُس نے فون سے بیچ کو منع کر دیا اور سید  
 دیس کو رس چلا گیا۔ وہاں سے خوب ہار کر دوری کر رات گئے لوٹا۔ بیرے کو مارتے مارتے چھوڑا۔  
 یہ ایک نئی ادا تھی اُس کا دور یہ نوکریوں سے عام سفید لوگوں سے بہت مختلف رہا تھا۔ وہ اُن  
 سے بہت نرمی سے بولتا اور عموماً مذاق کیا کرتا تھا۔ آج وہ بیڑھی میڑھی عین میں انگریزی  
 اُردو میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

وہ دن اسی طرح آٹھ بجلی ہوئی رہی۔ اگر بھروسے سے سامنا ہو جاتا تو نفرت سے منہ موڑ  
 کر دور ہٹ جاتے۔ ٹیکر لڑا ہر بیڑا بہادر بن رہا تھا مگر شمن کو یہ دیکھ کر بیڑی ممت ہوئی کہ  
 وہ بھول بھول کر سر تن کام کر لیا میں ڈوب رہا تھا، بار بار چریزیں پٹخ دیتا۔ اور لو کر دل پر  
 تھلاتا۔ وہ کبھی تھی تو بید بھی کچھ تو بھگت رہا تھا!

شمن کھڑی ہوئی کسی بیٹی تھی، جیسے وہ کسی مضبوط پل پر دوڑتے دوڑتے ایک دم ٹھٹک  
 گئی۔ آگے تھتے اکھڑے ہوئے تھے اور نیچے لائن ہی لہریاں اور برجیم جھانپیں۔ شبیڑی  
 سے اُس کی آنکھوں کے گرد بھروسے حلقے پڑ گئے تھے، کپڑے میڈے ہو گئے تھے مگر وہ بے خبر  
 نہ جلنے کیا سوچنے کی کوشش کیے جا رہی تھی۔ جو کچھ اُس نے کیا تھا اُس کی سزا وہ تھا بھگتنا

چاہتی تھی۔ ویسے اُس نے اپنی کئی سیل کو اس بے وقوفی کی خبر بھی نہ دی تھی۔ ہمدردی وصول کرتے کرتے اکتانہ تھی اور خطوں میں بھی اس کی موجودگی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے گھر والوں کو بیشک خبر مل گئی تھی مگر وہ بھی سناٹے میں خاموش ہو گئے تھے۔

جب تم ہی اتنی مضبوط ہو تو ہم کون ؟، اُن کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرح وہ لوگ اُس کی طرف سے عرصہ پہلے تھا نا اُمید ہو چکے تھے اور کوئی بھی خبر نہیں میسر نہ کر سکتی تھی۔ اگر انہیں اس انجام کی خبر ملتی تو بھی شاید کچھ دیا وہ متاثر نہ ہو سکتے۔ گویا وہ پہلے ہی سے اس انجام کی پرچھائیاں دیکھ چکے ہوں۔

روپے کی اُس نے کبھی پروا نہ کی اور کب اُسے معلوم ہوا کہ اگر پاس روپیہ ہی ہوتا تو زندگی اتنی گھٹی ہوئی نہ نظر آتی۔ گو اُسے نوکری آسانی سے مل سکتی تھی، کوئی معمولی سی پڑھانے کی نوکری۔ دنیا سے دور بوسیدہ کتابیں، بدشوق لڑکیاں اور لاتنا ہی اکیلا پن۔ وہ اس آخری ہیرو سے بہت ہی خائف ہو چکی تھی مگر اس دم گھوٹنے والی عمدا میں گرتے ہوئے لرزہ چڑھتا تھا لیکن اب کیا ہو گا؟ سوچتے سوچتے سر کی رگیں سوچ گئیں مگر کوئی دھنلی سی شاعری بھی روشنی کی نہ ملی۔

”شم۔۔۔ شم۔۔۔“ روتی کی آواز گھبراہٹ اور خوشی سے کمزور سی تھی۔  
 ”کہاں ہو شم ڈیر۔۔۔“ وہ گیلری میں بے تحاشا دوڑ رہا تھا، ”شم!“ اُس نے دروازے  
 پی سے اُسے چیخ کر پکارا، ”یہ۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ ممی۔۔۔ پیاری مم کا خط۔“ جلدی سے وہ آکر  
 پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شمن نے چڑ کر پیریمیٹ لیے۔

”دیر دیکھو۔۔۔ خورا دیکھو کیا لکھا ہے۔ میں اپنی پیاری بیٹی کے لیے اپنے بیاہ کا بیروچ اور  
 لاکٹ بھیج رہی ہوں، اصل ہیروں کا ہے۔ میرے باپ کو ہیروں سے عشق تھا۔ اچھا سنو،  
 میں خود اپنے ہاتھوں سے اگر پہناتی تو۔۔۔ اوہ ہم۔۔۔“ وہ شمن کی گود میں سر رکھ کر  
 تہمتوں میں ملے ہوئے آنسو بہانے لگا۔

”مئی میرا ہے میرا۔۔۔ شم۔۔۔“  
 اور پھر نہ جانے کیسے ملاپ ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے تختے جھپٹ گئے اور ایک باپ پھر

زندگی کی گاڑی دندنانے لگی۔ ٹیلر نے اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں اور کوسا، سالانہ کام اپنے سر سے لیا، بالکل تنہا ساروئی بن گیا اور سوائے ممی اور شمع کے اس کے منہ سے دوسری بات نہ نکلتی تھی۔ رات کو دونوں نے لارل اور مارٹوی کا ایک بدبذاتی سے بھرا ہوا فلم دیکھ کر بچوں کی طرح تالیاں بجا لیں۔ باوجود سختی سے منع کرنے کے وہ بے دھڑک اُسے سبکے سامنے چوتے جا رہا تھا۔ لوگوں کی تجسس سے چھٹی ہوئی نگاہوں کا جواب وہ گستاخ قہقروں سے دے رہا تھا۔ آج دُنیائیں بس تین انسان تھے: دو یہ بگڑے سے دل اور ایک محبت کرنے والی ماں جو ہزاروں کوس دور امریکہ میں تھیں انہیں اپنی آغوش میں یہے چوم رہی تھی۔ شاید اُسے معلوم بھی نہ ہو گا کہ اُس نے عزیز الوطن بیٹے اور غیر قوم کی بیٹی کو اپنے کتنے قریب کھینچ لیا تھا۔ دونوں کے دل سفید بالوں والی محصوم صورت بڑھیا کے خیال سے ناچ رہے تھے۔ وہ اب دنیا میں کیلے نہیں تھے ایک تیسری جان اُن کی زندگی میں آگئی تھی۔ آج ان کا بھی ایک راز دار پیدا ہو گیا تھا جس نے نصیحت کو بھول کر رنگ اور قومیت پر لکچر دیے بغیر انہیں پیار بھر کر مبارک باد دی تھی۔ اُس کی بہو ایک عورت تھی جسے اُس کے چہیتے بیٹے نے چنا تھا۔ اسکے علاوہ اُس نے کچھ بھی تو نہ سوچا۔ اور ضرورت بھی کب تھی کچھ ستور بچار کرنے کی! آج تک اس بیٹے نے کون سی غلطی کی ہمیشہ اس کی دستانے پر عمل کیا اور کامیاب جو اے بن کر اسے نجات دے کے یہے مبتلا پر جان رکھ کر وطن سے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے اس انجان غریب الوطن سے پیار کیا ہو گا، ضرورتاً بل محبت ہو گی، خواہ کتنی ہی کالی ہو من کی ضرور گوری ہو گی بس وہ اسی لیے اپنے خاندانی زیور اس کے سر دکر رہی تھی!

”نہ جانے روئی نے اُسے کیا لکھا ہو گا۔ آخر ماں ہے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئی۔ اور یہ سوتل کر اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ بدگمانی نے سر اٹھایا۔ تو یہ ماں بھی بیٹے کی طرح مکار

تھی! اُف یہ سفید چھڑی!

مگر جب روئی خراٹے لینے لگا تو مہربانے کا وہیما لیمپ جلا کر اُس نے خط دوبارہ پڑھا۔ اکیبار، دوبارہ اور آنسو نہ روک سکی۔ دوز بچھڑی ہوئی ماں کا آنسوؤں میں بھینکا ہوا خط: دنیا کے کسی جھگڑے کا اس میں ذکر نہ تھا۔ نہ اس خون آشام جنگ کا نہ قومی خد

کا۔ نہ آفتوں سے ڈرایا نہ کھانہ کہیں محبت دلائی تھی۔ جیسے دنیا میں آدمی میری چیز کا وجود نہیں، ایک ماں ہے اور اُس کا اکلوتا بیٹا۔ ماں ایک چیز اور وہ ان کی کبھی نہ مٹنے والی محبت، ایک دوسرے پر بچا اعتماد اور اس کو اپنی بہن جیسے ہر سطر میں لکھ لیا پار اور دعائیں بھیجی تھیں۔ بغیر کچھ عذاب وہ محبت کا ہمیشہ قیمت جزا نہ اس پر لیا جیٹھی تھی۔ کہتا فراخ تھا اس ماں کا دل جسے شہسوی اپنے پروردگار سے ملتی جلتی تھی۔ بڑھیا ابھی بیڑھی تھی۔ بالکل اپنی معلوم مہور ہی تھی، بلکہ اپنوں سے بھی زیادہ۔

وہ پارسل بھی دوسرے دن آگیا۔ اگر شمع نہ درکتی تو وہ پولیس کے دفتر میں ہی چہرہ بھارت کرکول ڈالتا۔ اُس میں ماں کی ایک تصویر بھی تھی۔ بیڑھی ڈھالے کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھی اخبار پر لہو رہی تھی۔ نظریں اُپر کیے اپنے دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی ایک ایک ٹکس میں ماتا کا خزانہ پوشیدہ تھا۔ وہ جھپکتی مہرئی آنکھیں ہجرت کی بجائی ہوئی عین وہ کسی ادبچے خاندان کی عورت نہ تھی۔ بیوگی کے بعد اس نے اپنی سادہ توہر اپنے بچے کی پرورش کی جہد دل کر دی تھی۔ اس کے گزشتہ جسم اور انجھری ہرئی چہرے کا ہڈیوں سے سخت سختی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اُس کی عمر کلر کی اور ٹاپک کر کے بیٹی تھی اور اب آخری عمر میں علاوہ اور جھپٹی موٹی جنگ کی بخشی ہوئی فکروں کے بیٹے کی جھڈائی بھی جان کو آزار بن کر لگ گئی تھی، آخر کیرل بھیج دیا اُس نے اپنے اکلوتے کو جنگ کی جھٹی میں پھینک جانے کے لیے؟ کیا بڑھیا کو اس بیٹے سے بھی کوئی چیز زیادہ پیاری تھی جس کی خاطر وہ ساری عمر گمائی کا مائل لگا بیٹھی تھی!

ایک بڑا سا آنسو خط پر پکا اور کاغذ کا پٹا تھا۔ دور دراز بڑی ہوئی دوا جھٹی عورتیں ایک دوسرے سے بغلیگر ہو گئیں۔ روتی سوتے میں میندر سے ٹھکی ہوئی کرکٹیں سے رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ لہزاں تھے اور آنکھوں کے کونے پھیکے ہوئے تھے۔

تو ان برف کے نو دو دل میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے ان کے سینوں میں بھی دل ہیں اور ان کے سینے میں بھی حسرتیں اور میں اُچھکی یہ اشارہ اور قربانی صرف مشرقی عورت کا ورثہ ہے یہ مغربی موم کی پتیاں کیا جا میں محبت کیا چیز ہوتی ہے، خصوصاً اولاد کی محبت۔

نسبت بڑی بد معاش ہوتی ہیں۔ بوڑھی جو جاتی ہیں پر سوس نہیں جاتی۔ جانور ہوتی ہیں؛ کسی ملک کسی قوم کا ہو گلے میں لعنت کا طوق بن کر چھٹا گئیں۔ اول تو بچے پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں اور اگر بد قسمت روحیں ان ہی پکلیں تو کتوں سے بدتر گت بناتی ہیں۔

مگر شمن نے یہ سب کچھ کہاں سے دیکھ لیا! نہ ہی وہ کبھی ان کے ملک میں گئی اور نہ ہی ہندوستان میں آئے ہوئے یا شند سے ملک اور قوم کے صفحہ نمائندے کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔ تو ہمیں کس نے بتائیں یہ ساری باتیں، یہی باتیں فولادی دیواریں بنی انسانوں کے بیچ میں اڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی آئینہ انہیں بگھلا سکتی ہے! کیا یہ لاکھوں کروڑوں سفید اور کالے انسانوں کا خون انہیں گھلا سکتا ہے!

ساس، ساس کے نام پر اسے منی آگئی، بچپن سے اس نے مکھنی ساسوں کے قصے سُن رکھے تھے۔ ہر بڑی گلی چڑ کو اس کی ساس کا سر یا کلیجہ بنایا جاتا تھا۔ مگر اسے خواب میں بھی کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ اسے ایسی مہولی گڑ یا جیسی ساس ملے گی۔ کاش اس کا مسرہ بھی زندہ ہو جاتا۔ کٹس کے ناولوں جیسا؛ اگر دن ہلتی، منہ میں پائپ دبائے، باغبانی میں دھت بڈھا! کون کہتا ہے وہ کھو گئی! اساتے ہی سیدھی اور روشن سڑک کہکشاں کی طرح جھنگڑا رہی ہے۔ ایک دو، نہیں تین کھلونوں جیسے ننھے ننھے انسان آگے قدم بڑھاتے چلے جا رہے ہیں؛ رونی وہ خود اور ماں!

صبح خط دوبارہ پرٹھا گیا۔ ساتھ ساتھ ہزاروں لمبے چوڑے قصے یاد آگئے۔ ٹیڈ نے چھٹی منانے کی رائے دی مگر شمن کے اصرار پر بادل نامنوا سنتہ جبراً دفتر گیا۔ جاتے وقت ٹیڈ نے تاکید کر دی کہ فلم اور بہت سا کاغذ خط لکھنے کے لیے تیار رہے، آتے ہی لکھائی شروع ہو جائے گی۔ دوپہر کے کھانے پر نشامی کہا بوں اور دی کی خاص فرمائش کی۔ یہ مزدور دھٹ جاتے ہیں تو کھانے سے پہلے روٹھے ہیں۔

شام کو خط لکھا گیا۔ دو لفظ لکھ کر وہ ستوج میں پرٹ گیا۔ پیاری ماں... نہیں۔ کاغذ بھینک دیا۔ بہت پیاری ماں، سب سے پیاری! اب؟ آگے کیا لکھے؟ جیسے آگے کچھ کہنا ہی نہ ہو، ان تین لفظوں میں دنیا سما گئی۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خط لکھا

لی۔ ٹیکر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ نصف سے زیادہ خط شمن کے بارے میں تھا۔  
جیسے بادل چھٹ گئے۔ اب باہر جانے آئے میں کوئی خطرہ نہیں۔ ماں چھتری پھیلا  
کر کھڑی ہو گئی، بوند نہیں پڑ سکتی۔ زندگی مزے سے چھکولے کھاتی گزرنے لگی، جیسے  
رہوٹاڑ کاٹری کنکر پل سڑک پٹھکتی چل جا رہی ہو۔ شکر رنجیاں آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر  
چھٹکے پر دور ہو جاتے مگر پھر سڑکرا جاتے، رول مل جاتے۔ قہقہوں میں آنسو سولہ جاتیں تو  
کبھی آنسوؤں میں منہسی ڈوب جاتے۔ دنیا بھی عجائبات کی عادی ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ  
ڈھٹائی پر انداز آئیں۔ اب سڑک پر گردن موڑ کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہے تو  
انہیں نہیں دکھائی دیتا۔ جلسوں پارٹیوں میں بھی جاتے اور کوئی متوجہ نہ ہوتا۔ لوگوں کو ایک  
بار مشرق اور مغرب کے مل جانے کا گمان ہونے لگا۔ ان کی شادی ضرب الشل بن گئی، حوالے  
دیے جانے لگے۔

گھر سے بار بار تقاضا ہو رہا تھا کہ آجاؤ چاہے دو چار ہی دن کو آؤ، اور اس کا بھی  
جی چاہ رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی خون کی کشش مجبور کیے دیتی تھی۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر  
ایسی وحشت ہوئی کہ نیند اڑ گئی۔ یہاں کے لوگ تو عادی ہو چکے تھے پر یہ اب نئے پہاڑ  
کیسے کھودے جاویں گے اور پھر ان چٹانوں کو مہوار کرنے کے لیے جس مانتھا پھوڑی  
کی ضرورت تھی وہ کس سے چھیلی جائے گی! بڑی بوڑھیوں کے گلے کیسے سنے جائیں گے؟  
سبب کی سب ٹیکر کی ماں نہیں بن سکتیں۔ بہن بھائی، چچے پچیاں کیا کہیں گے!  
انہیں کون سمجھائے گا۔ چڑیا بگھر ہی چلے جاتے ہیں تو جانور بول کھلا اٹھتے ہیں۔ بھلا یہ  
خوگیر کی بھرتی کیا نہ دند بچائے گی۔ تو وہ نہیں جاسکتی۔

وقت بدل جانے سے زیادہ فرصت بھی کم معلوم ہونے لگی۔ ادھر جنگ کی آگ لپکی  
اُدھر وقت کی رفتار میں بھی کوک بھردی گئی۔ ہر وقت یہی معلوم ہوتا کھٹے، منٹ، ریسکینڈ  
ماحتوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔ پیلائی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ آٹے ہوئے مال کی بھی  
دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس کے علاوہ جب ایک لڑکھری میں دوسرے رکھے ہوں تو آبائی  
حق کے بل بوتے پر ٹکراتے ہیں، سینما ہی ایسی چیز رہ گئی تھی جہاں بغیر ایک دوسرے



سے اکتائے ہوئے وقت کاٹا جاسکتا تھا۔ شمن بیکاری سے اور بھی اکتا گئی۔ آٹھ کوئی کہ  
پرٹھنا اور پرٹھانا، کچھ نہ کچھ زندگی کا معرّف رہا اور اب یہ حال کہ دن گزر جاتا تو  
رات دو بھر ہو جاتی۔ ٹیڈر تو تنکا ماندہ آکر منے سے سو جاتا اور وہ بڑی جاگا کرتی۔  
دن کو لازمی طور پر بلیڈ آجاتی اور یہ لمبی لمبی راتیں اور تنکا دینے والی تنہائی اس کا دماغ  
ہلا ڈالتی۔ ٹیڈر کا وجود تو نر کے برابر ہوتا۔ دن کو وہ کام میں رہتا اور رات کو نیند میں اور  
شمن اس کی دنیا سے نکل چکی، باوجود سامنے رہنے کے تنہا ہی رہتی، وہ جیسے وہ اس کی

بیوی نہیں پڑوسن ہے جس سے بوقتِ ضرورت بات کر لی ورنہ نہیں  
مگر سنہیا میں بھی حج ہو جاتی۔ ”گر بیٹ ڈکٹسٹر“ پر کچھ ذاتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا  
”یہ بزدلی اور کچھ راہیں ہے۔ ذاتی تو ہر ایک کا بنایا جاسکتا ہے“ ٹیڈر جو بغیر  
سوچے سمجھے رہا تھا اس فلسفے پر چڑ گیا۔

”دار سے مائیں کیف پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ نازی کہا ہیں۔ شیطان ہیں پورے۔“  
اس نے بڑے وقوف سے کہا۔

”کچھ زیادہ فرق تو نہیں نازیوں میں اور ان کے بھائی ہندو میں۔ شیطان نے  
نئے عذاب بھر کر جنم لیتا ہے۔“

”مگر اتنا کوئی نہیں“

”ہنہ۔ جلد تم کیوں کہو گے؟ ان کے چیلے جو بھڑے، شاہی پاسبان جو ہوتے  
”ہم... میں... ہم لوگ بڑا نیری راج کی حفاظت ہیں ہرگز نہیں لڑا رہے

ہیں۔“

”دکھو انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہو۔ منہ، چوٹی ملی جلیبیوں کی رکھولی  
کرنے چلی ہے۔ نو سو چوہے تو پورے ہو گئے اب حج باقی رہ گیا ہے۔ کیا کہنے ہیں“  
”لیکن اس مرتبہ انصاف ہو گا۔“

”کیوں نہیں۔ ٹیڈر ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا۔“  
”مگر یہی میں تو لیا نہیں، میرے ملک نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔“

”تم لیڈرول کا ساتھ دو گے تو ضرور لیڈرے کہلاؤ گے۔ برلے انسانیت کے پہرے  
دار بنے ہو، ذرا ہندوستانیوں کو بھی انسان سمجھ کر دیکھو۔“  
”کون کہتا ہے ہم ہندوستانیوں کو انسان نہیں سمجھتے۔“

”تو پھر ان چالیس کروڑ انسانوں کو نازیوں کی چکی میں پستا دیکھ کر تمہارے کان پر  
جوں کیوں نہیں رشتی؟ فرانس کو تم بچائے دوڑے، پولینڈ کی موت پر چھپائی کوٹ کوٹ  
کر دوڑے، برطانیہ کے ہاتھ سے دو تین سوئے کی چڑیاں جاپانیوں نے گھسیں لیں تو کھیسے مسل  
گئے مگر یہ کیسی انسانیت ہے جس میں سفید چمڑی ہی میں نظر آتی ہے۔“  
”کیوں، ہم چین کے لیے بھی لڑ رہے ہیں۔“

”جیسا لڑ رہے ہو وہ خوب معلوم ہے۔ روس کی بھی تو مدد کر رہے ہو۔ دوسرا  
محاذ کیسے قائم ہو رہا ہے۔ پر نہ جانے کیا بات ہے کہ کبھی ہی نہیں ملتی۔ سو جانتے ہیں یہ  
دوسرا محاذ کب لگے گا، جب جرمنی پسے لگے گا اور روس ٹھک جائے گا۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب سینا بھی تمہارے ساتھ دیکھنا عاقت ہے۔  
طے ہوا کہ فلم بنی بند۔ مگر یہ عہد زیادہ دن قائم نہ رہا اور فرمائش ٹیکر سی کی طرف سے شروع  
ہوئی۔ یہ طے پایا کہ اگر ایک انگریزی فلم دیکھا جائے تو دوسرا ہندوستانی۔ بالکل کھرا  
سودا۔ یہ نہیں کہ وہاں سے تو دنیا بھر کا گڑا اسمیٹ کر ہندوستانیوں کے سر پہنی جائے اور  
یہاں کی ایک تصویر بھی نہ دیکھی جائے۔ خیر حکومت کے آگے میں نہیں تو گھر میں تو بچے کا اپنا قانون  
ٹیکر راضی ہو گیا۔ وہ آسان ہندوستانی بخوبی سمجھ لیتا تھا۔

مگر دو ایک اسٹنٹ کچر تو جھیل گیا پھر توبہ حال نہو گیا کہ دو ریلیں دیکھیں اور خفقان  
اٹھا۔ ”یہی فلم تو پچھلے ہفتہ دیکھا تھا۔“ وہ ضد کرتا۔  
”کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی ہفتے تو بن کر آیا ہے؟“ شمن لڑتی۔

”نہیں جی یہی تھا۔ وہ چنڈ سا عاشق، کیا میں اسے پہچانتا نہیں۔ جنگلوں میں گا تا  
پھر رہا تھا۔ پھر وہ چٹپٹی سی بیروین گر پڑی تھی تو... چلو چلو یہ تو وہی ہے، کوئی دوسرا  
انگریزی فلم دیکھیں۔“

اب شمن کا پارہ چڑھ جاتا۔ یوں تو ہر فلم میں یہی ہوتا ہے۔ ہیرو جنگل ہی میں گاتا ہے۔ ہیرو دین کرتی ہے تو اسے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ مگر ٹیکر تو اسے بیان پوچھ کر جلا نا چاہتا تھا۔ جو فلم اچھا بھی ہوتا تو وہ پورے وقت سوتا رہتا اور شمن جلی بھنی منہ سجائے بیٹھی ضد سے دیکھا کرتی اور جان پوچھ کر انگریزی کے اچھے فلم میں عاجز بن جاتی۔ غرض کوئی بھی فلم ہو دونوں کا مزہ کر کے رہتا۔

”یہ تمہارے یہاں ہر کیکر کڑکاتا ہے یا روتا ہے“

”اور تمہارے یہاں سوائے کھٹی کھٹی کے اور کیا ہوتا ہے“ وہ بحث کرتی۔

”یہ کرنا چاہیے کہ امریکن فلموں کی نقل اتاریں“

”ہنہ، رپڑ سے امریکن فلم، گندے، غلیظ، سوائے ننگے پن کے اور بے بھی کیا، گو

اسے معلوم تھا کہ عام طور پر جو ہندوستانی فلم ذرا بہتر ہوتے ہیں ان میں یہی چالاکی استعمال کی جاتی ہے، مگر وہ غبی رسی۔

”الاجواب ہوتے ہیں۔ تمہارے فلموں میں تو کچھ ہوتا ہی نہیں“

”یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے نہ کہ فلموں کا۔ تم ہم لوگوں کی زندگی کا فلسفہ ہی نہیں

سمجھتے۔ تم لوگ تو بس جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو فلم دیکھتے ہو“

”اول تو تمہارے جذبات ہم کے گوسے نہیں کہ ٹھیس لگی اور تھک سے اڑ گئے، دوسرے

اس میں مضائقہ ہی کیا ہے“

”نلیاں اور بڑھتیس بجائیں عام موضوع سے ہٹ کر گھر کی چار دیواری میں آن

جھتیں، بچی باتیں بھوٹ نکلتیں اور ایک سرے سے سینما سے بائیکاٹ کرنا پڑتا۔ مگر

ریڈیو ہی جان کو روگ کی طرح لگ گیا۔ ان دونوں کو تو پس کسی بہانے کی تلاش رہتی تھی مگر

ہندوستانی گانا سننے ہی پاگل ہونے لگتا۔ اس کی ضد میں شمن نے پچے راگ سیکھنے کے

ایسے ماسٹر کر لیا۔ وقت بھی کٹ جاتا اور جنگ کا مواد بھی مہیا ہو جاتا۔ وہ ڈھونڈ

ڈھونڈ کر استاد دول کے راگ سلتی، بہرمان پر تھوم اٹھتی، ہر ٹکڑی پر گزرتی جاتی اور انکاروں

میں کھو جاتی۔ مگر جو نہی ٹیکر اتنا وہ کھٹ سے لندن جا پہنچتا۔

”یہ ہے اصل نغمہ! وہ جو جو کم کر کہتا۔  
 ”ہنہ، جیسے پٹا پٹا کتا رو رہا ہے“ وہ جل کر کہتی۔  
 ”جیسی تو کہتا ہوں سمجھنا سیکھو، کان پیدا کرو“  
 ”نہ ہنہ و ستانی کا ناکھنے لگو تو یہ کائیں کائیں سنو بھی نہیں“  
 ”ہنہ و ستانی کا ناکسی عقل والے دماغ میں تو سما نہیں سکتا“  
 اس پر بات بڑھ جاتی۔

”تم میرے ملک کی ہر چیز کو حقیر سمجھ کر مجھ سے دور کرنا چاہتے ہو“  
 ”میرے ساتھ تو تمہیں میرے ہی رنگ میں رنگنا پڑے گا۔“  
 ”کوئی ضروری نہیں کہ جب میں تمہیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتی تو  
 تم میرے اوپر جبر کر دو“

”تم جانتی ہو کہ تیار از رنگ پھیکا ہے۔ تمہارے مرد زیادہ عقلمند ہیں۔ وہ یورپین لڑکی  
 سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا پینا، رہنا سہنا، بول چال سب  
 میں سلیقہ آجاتا ہے۔“

”ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امیریل ازم کو مچھلانے کی چال ہے کہ اپنی لڑکیاں الٹو تو  
 کو مچھلانے کے لیے لگا دی ہیں۔ اسی طرح آنگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے۔ ان کا لباس پہن کر  
 ان کی زبان منہ میں لے کر، ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چول کر نے کی  
 سکتا رہ جاتا ہے۔ نیچے اور ہر میں معاق ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولادیں یا تو اپنے درغلے حسن  
 کے بل بوتے پر پیشہ چلا لیتی ہیں یا آئے دن اسے دسے ٹامیوں کی جوتیاں چاٹتی پھرتی ہیں۔ ایک  
 طریقہ مقولہ ہی ہے میٹھے کا۔ بول جذب کر کے کبھی تو فنا کیا جاسکتا ہے۔“

”تو بھی تم ہی مجھے اپنے نظام میں جذب کر لو، گو کچھ میں رہنے کی عادت ذرا مشکل ہے۔  
 پڑے گی۔“

”مگر...“

”مگر اصل بات یہ ہے کہ... خیر جانتے دو۔“

”کہو۔ میں کوئی پتہ نہیں جو تم چٹاؤ اور زوروں“  
 ”یہ کہ پیر میں طرزِ رہائش بہت بلند ہے اور تمہیں یقین ہے کہ وہ جذب ہونے کے  
 لائق ہے اس لیے تم جان بوجھ کر بجائے اور پر اٹھنے کی بجائے کیسے گھسیٹ سکتی ہو تم لوگ  
 دلی سے پور میں معاشرت کے مدارج ہو۔“  
 ”بڑے حسین مناظر ہیں۔“

جھک جھک ہوتی مگر ششِ دل میں فردِ زنا دم ہوتی۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی  
 اتنی بڑی مخالفت ہونے ہوئے بھی انجان طور پر اسی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی۔ وہ میز پر چھری  
 کا ٹکڑا سے کھانا کھاتی، بریڈ پر سوئی اور چھوٹے چھوٹے قوارعد پر عمل بھی کرتی۔ یہ اس نے  
 کبھی سوچا بھی نہیں۔ اس ندامت نے خدا کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی۔  
 معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی۔ بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے  
 غزادہ اور کینا پہننا شروع کیا مگر ٹیڈ نے محسوس بھی نہ کیا۔ اسے غزادہ بے انتہا پسند آیا، بالکل  
 اس کے مطابق معلوم ہوتا تھا۔

تو کو یا جس چیز میں اسے اپنی معاشرت کی جھاک نظر آتی تھی وہ ابھی اور قابلِ پسند  
 تھی! اتنا روشن خیال ہونے ہوئے بھی وہ انجان طور پر کس قدر کوتاہ بین تھا۔ جہاں  
 تک ہوش و ہوا اس کا ذکر تھا وہ وسیع نظر تھا مگر یہ لاشعور کی پاسبانی اس کی طاقت سے  
 باہر تھی۔ یہ حدود کی کمی ہوئی کانی آسانی سے نہیں کھرچی جاسکتی تھی۔ یہ حال ہے ان  
 روشن خیالوں کا تو کوتاہ نظر دلوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ کتنا بھی چاہیں احساسِ برتری  
 دماغ سے نہیں نکل سکتا۔ انسانیت ہمہ گیر برابری کو مانتی ہے نہ دماغ میں جو چور بٹھاتا ہے  
 کہ کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا ہے۔ پانچ انگلیاں یکساں نہیں۔ انہیں کیچڑ تان کر یا کاٹ چھانٹ  
 سے برابر کر دے، ہاتھ بد وضع اور بھونڈا ہو جائے گا۔ دنیا کی شو بھانسی اور پنجے سے قائم ہے  
 اس معاملے میں روشن خیالی خام خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی؟

اور گھر میں ایک عجیب کشمکش شروع ہو گئی، جیسے گاما اور زلسکو جیسے ہوئے ہیں۔ وہ  
 اپنی طرف کھینچتا ہے یہ اپنی طرف۔ کبھی یہ دائروں کا کرچہ کرتے ہوئے گھومتے ہوئے پلٹا مار جاتا

ہے۔ ساتھ ساتھ ذہنی رس کشی بھی بڑھتی گئی۔ کیسے پار گئے گی یہ دو انجنوں کی کشی جس میں دونوں انجن مخالف سمت کو دوڑ رہے ہیں؟ کبھی دو انچ مشرق کی طرف بہتی ہے تو کبھی دو انچ مغرب کی سمت۔ نتیجہ وہی انجناؤں کا ٹکڑا اور کوفت۔ اس پر سے طوفان تلا کھڑا ہے، موجیں منہ بھاڑ بھاڑ کر دوڑ رہی ہیں اور ناخدا نے جنم ہی نہیں لیا۔

زندگی سے تھکی ماری ٹھٹھکی ہوئی دور چل گئی۔ آج ہی ٹیکر سے چھ ہوئی تھی۔ زخم تازہ تازہ تھے۔ یاد کہ میں بیچ پر ذرا دیر کو سستا نا چاہا۔ مگر جیسے سانپ نے چٹک لیا۔ یہ بیچ آخر بیچ کیوں، چوتروہ کیوں نہیں۔ یہ سارے نوٹس، سارے اعلانات، یہ انگریزی میں کیوں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذرہ ذرہ ہانکوں کی دست دراز یوں سے کچلا۔ میوہ میلے کچیلے بقیوں کی وضع کے تپان، مہدی ملی فراکیں، ٹوٹے ہوئے پائے والی کرسیاں اور کھرچی ہوئی میزیں۔ ان درندوں کے خونی پنجوں کے نشان چسپے چسپے پر کندے ہوئے ہیں۔ کیسے بھرس گئے یہ گھاؤ؟

اس کا جی چاہا بیچ کو ایک مٹھو کر لگائے اور زمین پر لوٹ لگا دے۔ یہ سپر ملی انم کے ٹپے۔ کاش کوئی غیبی ہاتھ ان گندگیوں کو چین کر ملک سے دور سمندر میں سمونک دنیا اور اس کے ساتھ ساتھ متوازی سفید برص کے داغوں کو بھی دھو ڈالنا جو سیاہی اور گرتی سے تپ کر کوڑھ کے زخم بن گئے ہیں، جن کی عفونت نے انسانیت کا دم گھونٹ رکھا ہے۔ ”ادب، اسلام، علیکم۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! کبھی جانی پہچانی ہی آواز نہ پھلوسے پکا اور وہ چوٹا لگا پڑا۔

”ارے... تم... آپ“ وہ حیرت زدہ ہو کر پردہ فیسر کے بغیر سے ہوسے چیلے گئے پھانے کی کوشش کر لے لگی۔ پہلے تو وہ اپنے کی سائنس معلوم ہوئی کہ کہاں وہ تک سک سے درست پھیل پھیلے پروفیسر اور کہاں یہ ڈھیلے ڈھالے کھڑے میں غرق بد وضع شاعر نما لیکن انتہائی غیر شاعرانہ انسان۔

”مگر آپ تو چلے گئے تھے؟“

”ہاں اور ابھی گیا۔ تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟ تم تو ایسے چمکیں

جیسے میں کوئی مردہ ہوں جو کفن مچا کر آن کھڑا ہوا۔“  
 ”کچھ نہیں، اصل میں یوں ایسا کیلئے کی امید تو نہ تھی۔ مگر یہ...“  
 ”کہو کہو...“ وہ خوش مزاجی سے مسکرایا۔  
 ”کچھ نہیں، جانے بھی دیجیے۔ اتنے دن بعد میں اور پھر وہی جنگ شروع کر دی۔“  
 کہیے چیزیت تو رہی“

”لو چھو مت، خود دیکھنے کی کوشش کرو۔“  
 ”بس اب دیکھیے مجھے الزام نہ دیجیے گا۔ آپ ہی چھوڑ رہے ہیں، کوئی بات منہ  
 سے نکل گئی، تو تفتنا اٹھیں گے۔“  
 ”آنا تو ایک بار۔ اب وہ نازک مزاجیاں نہ رہیں۔“ پروفیسر نے ٹھنڈی سانس  
 بھری۔

”معلوم ہوتا ہے کسی سے عشق ہو گیا۔“  
 ”ایسا ویسا عشق! شاید قسم کا۔“  
 ”مبارک ہو، مگر یہ ہو، کیسے؟“  
 ”عشق ہونے میں بھی کیا کوئی بل مل سکتے ہیں؟“  
 ”مگر معاف کیجیے گا یہ ڈھونگ تو کچھ قوم پرستوں کا سار چایا ہے۔“ اس نے سر  
 سے پیر تکہ نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

”معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ پروفیسر چپکے سے بولا۔  
 ”مگر یہ بات کیا ہوئی! کم از کم آپ سے تو یہ امید نہ تھی۔“  
 ”کیا امید... یہ ڈھونگ رچانے کی...“  
 ”جی... یہ بات ہی، یہ کالیں... اور یہ لٹکا... کمال کر دیا آپ نے تو۔ تب تو  
 آپ کمپنٹسٹ بھی ہو گئے ہوں گے۔“  
 ”لازمی طور پر۔“ پروفیسر اب بھی مسکرا رہا تھا۔  
 ”وہ تیرہ سو کی نوکر ہی۔“

”وہ چھن گئی“

”وجہ؟ آپ تو...“

”سخنت نالائق نکلا جی تو یہ روپ دھار لیا“ پروفیسر کی آواز میں طنز کی تلخی نہ  
 چھپ سکی۔ شمن نے بے اعتنائی سے پروفیسر کو ٹھکرا دیا وہ کیا پینتیر سے چل رہا تھا۔  
 اسے اس شخص پر ہنسنہ تھا۔ دم غیر میں الوندا دیتا اور تپہ بھی نہ چلتا۔ پر آج تو وہ خود  
 بھلا میگت بنا بیٹھا تھا۔

”کچھ آپ بتی بھی تو سناؤ۔ ماں بھی شادی کی مبارکباد تو دینا بھول ہی گیا۔“  
 ”جی ماں۔ آخر کہ ایک کارندہ“ پالس می لیا۔ جینگ کا زمانہ ہے، ہر چیز منگی ہو  
 رہی ہے۔“

”میرا ہی جوتا میرے ہی سر۔ لیکن مجھے تم سے بھی امید تھی، نیرا زمانہ جانا۔ دراصل  
 شادی بیاہ کے معاملے میں نیری راستے کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ مگر تمہیں تو شادی  
 صرف اس لیے تو نہیں کر ڈالی کہ تمہیں ذرا عجیب و غریب پٹنے کا شوق ہے۔ سندر، سندر  
 بیچ میں نہ لو۔ اگر اس وجہ سے کی ہوتی تو تم خوش اور اس قدر مطمئن نہ نظر آتیں۔“  
 ”میں خوش نظر آتی ہوں؟“ وہ کھو کھی آواز میں نہی۔

”کم از کم صورت اور صحت تو یہی کہتی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو... یہ بتاؤ کچھ  
 کرتی بھی ہو یا کام چھوڑ دیا۔“

”بہت دن ہوئے چھوڑ دیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ بھولی... آپ تو دھام،  
 کر رہے ہوں گے، پروفیسر مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا۔

”اب تو آپ سرکاری کیونٹ میں، اب تو راج ہونگے۔“

”کیوں نہیں۔“

”قومی جنگ کا ناجی کام جاری ہوگا۔“

”برطانیہ تیزی سے۔“

”بھئی مرے ہیں اب لوگوں کے ایک بیچارے وہ کیونٹ تھے جو چوہوں کی طرح



بلوں میں چھپتے پھرتے تھے، پانچ گلی کتوں کی طرح دوڑائے جاتے تھے، ایک آپ ہیں کہ...  
 ”مڑے سے والے اسے کے ساتھ ڈنڑاڑ رہے ہیں... موڑ میں... گھوڑا لگاڑی...  
 لکی کیا ہے ہم لوگوں کو۔“ شمشیں نے پھر طنز کی کڑواہٹ پر منہ بنایا مگر پروفیسر کی مکار دھنسی  
 سوئی آنکھوں اور بے معنی مسکراہٹ نے گڑبڑ کر رکھ دیا۔

”اچھا تو وہ آپ کی محبوبہ کون ہیں“

”سے ایک بنگال کی حسینہ“

”بنگال کی“

”ہاں۔ نہیں نہیں معلوم۔ اسے بنگال ہی میں تو میرا تقریر ہوا تھا۔ بس وہیں ایک  
 کافرہ کے تیر نظر کا گھائل...“ شمشیں گھبرا کر دوڑ پڑ گئی۔ پروفیسر کی آنکھیں بھیانک طور  
 پر سکڑ گئیں۔ اُن میں عجیب نامعلوم سا خوف چھا گیا، جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کو نیم  
 بیداری میں دہرا رہا ہو۔ اس کا جسم پیپ سے نصف بھی نہیں رہا تھا۔ چہرے پر عمر کے  
 آثار اچانک برس پڑے تھے اس لیے سن ہو گیا تھا۔ بال کتنے سفید ہو گئے تھے، جیسے  
 وہ بچہ چکی جھاڑ کی جلا آ رہا ہو۔ وہ چلا گئی۔

”مردی بڑھ گئی ہے۔ گھر چلیں گے یا دیر ہونے کا ڈر ہے“ اُس نے بیچ پر سے

اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”چلیں؟“ پروفیسر نے جاگ کر جواب دیا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ بیکر تو شاید دیر سے آئے“

”تلی تھپاڑ سے کالا آدمی دیکھ کر!“

”مگر تم تو سرکاری کالے ہو“

”بھٹا... کیوں؟“ وہ خوش مذاقی سے منہا۔

گھر پہنچے تو وہ دینک گھوم پھر کر مکان دیکھتا رہا۔ کھالے پر اُس نے ہو کے زدہ

ہو کر ایک دم اوائے ننگنا شروع کیے، مگر پھر ٹھٹھک گیا، جیسے ایک دم الجائی نے

گلا دلہن لیا ہو، اور پھر ننگنا شروع کر دیا۔

”دورا ہا منہ بگڑ گیا ہے مرغین کھانے کھاتے بہ وہ پھر بے معنی طور پر مسکرایا۔  
کھانا کھاتے ہی وہ روانہ ہو گیا، جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔  
”پھر آؤں گا۔ اب تو گھر دیکھ لیا ہے۔“ فرنی خوب تھی؟ وہ اٹلی سیدھی باتیں کرتا رہا۔  
اس کے جانے کے بعد شمن چپ چاپ اداس بیٹھی رہی۔ روس بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ قلعی  
متاثر نہ ہوئی۔ سب ڈھونگ۔ بجلا بھگت کہیں کے۔ انسانیت کے سکے بن کر چلے ہیں  
سحابتی۔ کہیں۔۔۔ رہی بھی انسانیت کو بھی نہ ٹپ کر جائیں۔

”رعب جمانے آیا ہڈگا میرے اوپر۔ وہ کوئی اور ہوں گی جو ان پتہ کندلوں پر ریچھ  
جاتی ہوں گی۔ غبن دین کیا ہو گا کبھت نے جو نکالا گیا تو اپنی سبھی کا پر وہ ڈھانکنے کو  
لال جھنڈے کی آڑ میں آن دگا۔ کچھ ایسی حوریں تو ہوتی بھی نہیں یہ بنگا نہیں۔ سوائے  
آنکھیں کے اور ہوتا ہی کیا ہے! مگر یہ دو لکے کے شاعر آہنی پر مرتے ہیں۔ لیکن، بنگال  
میں تو قحط پڑا ہے!“

اور یہ کون سی نئی بات ہے قحط پڑا۔ یا ہریالی ہو ہوہ کی انگ تو ویسے ہی اجڑ  
رہی ہے۔ رونی تنکا یا راجپوت چڑا تا میو آ یا اور سو گیا۔ اور کوئی دن ہوتا آ وہ کوئی بات  
نکال کر اس بنگال کے قحط کا مقوڑا سا بدلہ تو اس کا خون جلا کر لیتی، مگر پرفیسر نے جیسے  
اُس کی روح تک کو کھیل دیا ہو۔

جلی جھٹی بیٹھی تھی کہ بریس نے پرفیسر کے آنے کی اطلاع دی۔ جی چاہا کہ وہ  
دھکے مار کر نکال دو، مگر پھر سوچا دو چار چٹکیاں تو کبھت کی ڈھیسٹا بونٹیوں میں لپیٹی  
جائیں، چنانچہ بلا لیا۔

پرفیسر کو دیکھ کر وہ پھر چونکی۔ یا خدا یہ دنیا ہے یا مدار ہی کا ڈھیلہ۔ مرغی کا پر ڈالو  
کہو تر کا بچہ نکال دیا۔

”میرے بالوں کو دیکھ رہی ہو، بہت کاٹ دیے کبھت ناٹی نے۔ میں نیسے کہا تھا  
فرا اچھے کاٹ دینا، اُس نے گدی کی کھرچ ڈالی۔“ اس نے گردن سہلا کر کہا اور شمن کے  
منہ پر ٹھانچہ سالکا۔ گویا کہتا ہے تم سمجھتی تھیں مجھے ڈھول ناسوں کی ضرورت ہے،

وہ ایسے مجھ میں کچھ دم ختم نہیں۔ یہ لو میں نے یہ ہتھیار بھی پھینک دیے۔ اب آجیاؤ میدان میں۔“

”میں تیار سے پاس ایک غزنہ سے آیا ہوں۔ تنہائی سے اکتا جاتی ہوگی؟ شتمی کے کان مٹتا کئے اور وہ بھی سمجھ گیا اس لیے جلدی سے بولا: ”اتنی حساس نہ بنو۔ ذرا غور سے سو۔ مذاق کو چھوڑو۔ یاں پہلے میری اس دن کی کہو اس کو معاف کر دو، میں مذاق کر رہا تھا، مگر معلوم ہوا تم بڑی بد مذاقی ہو گئی ہو۔ وہ تنہا ہی قیافہ شناسی کیا ہوئی یا صرف بنا کرتی تھیں؟ دو لفظوں میں میری داستان شن لو یقین نہ آئے تو کوئی پروا انہیں۔ ہمارے تعلقات نجی باتوں پر نہیں بگڑنا چاہئیں۔ میں کلکتے بھیجا گیا تھا۔ وناں کیا کچھ دیکھا اور کیسے دیکھا یہ نہ پوچھو اور نہ ہی کوئی بیان کر سکتا ہے۔ مجھ توں میں یقین تو نہیں کرتا مگر کوئی ہے اسدیب جو ٹیڑھا گیا اور مجھے اسلئے ادرے کر بھاگنا پڑا۔ آہم برسر مطلب ہمارے یہاں کچھ کلرکوں کی کمی آگئی ہے۔ بہت معمولی کام ہے۔ ہفتے میں دو تین روز کام دیکھنا۔ دفتر کا کام نہیں۔ وہ تو ہم نے انتظام کر لیا ہے، بلکہ... اگر تم تیار ہو تو خیر ورنہ...“

”کیا کام ہے؟“  
”جی تو جانتا ہے کہہ دوں...“ وہ شرارت سے مسکرا دیا۔  
”کیسے۔ کیسے نا۔“

”رہنے دو، کہنے سننے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے۔ مینو: کام یہ ہے کہ ہم نے چند منظر مقرر کیے ہیں جہاں ہمارے آدمی جا کر اناج بیٹے وقت انتظام کرتے ہیں۔“  
”کیسا اناج؟“ لیکن وہ جھینپ گئی۔ اُسے وہ لمبی لمبی قطاریں بھڑوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹکریں مارتی ہوئی اناج کی دوکان کے سامنے کھڑی یاد آ گئیں۔

”ایسا مشکل کام نہیں۔ بس عورتوں کو ایک قطار میں سیدھا رکھنا اور یہ دیکھنا کہ منظر میں خواہ مخواہ تنگ تو نہیں کرتے۔ اناج کے منظر کم ہیں اس لیے بھیڑنا قابل بیان ہوتی ہے۔“

”سنبھال لے کر کیا ہوا مگر...“

”کیا تم اپنی اس مگر کو دو چار مہینے کے لیے سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں ہیں کوئی بھاگ نہیں جاؤں گا۔ جانتا ہوں تمہارے دل میں ہزاروں لاکھوں سوال کھیل رہے ہیں مگر یہ وقت ان سوالوں کو حل کرنے کا نہیں“

”بے سمجھے بوجھے کوئی کام...“

”نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ آؤں تو ذرا سا مطالعہ کرو، ذرا خبر دے میں دلچسپی تو خود بخود سارے جواب مل جائیں گے۔ اور ویسے اگر میں تم سے بحث کرنے بیٹھا تو حرج جانتا ہوں کہ مار جاؤں گا“

”تو آپ کھوکھلی بنیادوں کے برتنے پر بحث کریں گے۔ بنیادیں کھوکھلی تو نظام بھی کھوکھلا“

”وہ دیکھو میں مار گیا۔ کہتا ہوں تم سے کمبیز لٹوں، کام نہیں خدا ترسی سمجھ کر کرو۔ اگر جی چاہے تو، ورنہ زبردستی نہیں“

پروفیسر نے ہتھیار ڈال کر جو سبتہ گردہ کی پالیسی پکڑ لی اس پر شمن جھنجھلائی تو بہت مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے قائل کرے۔ غنیم بحث پر ہی تیار نہیں ورنہ دولفظوں میں پرچے اڑ جائیں۔

”کیا ہے ذرا مشغلہ ہی مانتا آجائے گا۔ جواب دہنا کہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکالوں“ میں آؤں گی“

”تو میں کل ہی تمہارے پاس ہفتے بھر کا پروگرام بھیج دیا گا“ اور دوسرے دن وہ آٹھ بجے روانہ ہو گئی۔ ابھی اناج بانٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے مگر ہجوم کا یہ حال تھا جیسے کسی برائے دیوتا کے درشن کا جہاد لگا ہوا ہے۔ نوح، کھسوٹ، دھکم دھکا۔ بس نہیں جو ایک دوسرے سے ٹوٹل جائیں جو نہی مندر کے پتہ کھلے خلقت طوفان کے ریلے کی طرح ٹوٹ پڑی۔ ”مٹو مٹو...“ چھپے مٹو، پولیس نے کورڈا گھا کر جاتریوں کو پیچھے دھکیلنا چاہا۔ مگر توبہ کیجیے۔ ان دیوتا کی کشش ایوں کوڑوں سے کمزور کیا جاسکتا تو پھر مشکل ہی کیا تھی۔ یہ پھر کتے ہوئے بھوکے خود اپنے ہاتھوں سے جسم

کی کھال اُدھیر لیتے۔ بدن دیکھو تو ایسے سوکھے جیسے گھسے ہوئے کیرے میں کھچپوں کا  
ڈھیر لپیٹ دیا ہو مگر سوس و گن پہلوؤں جیسی۔ چاول کا دانہ دیکھتے ہی جسم میں تھوکت  
جاگ اُٹھتے ہیں۔ وہی کھچیاں جو سٹ کھٹنے سے پہلے ٹیڑھے سے بھی زیادہ بے جان ہو  
رہی تھیں۔ بجلی کی سرعت سے چمک اُٹھتی ہیں۔ اور پھر زبانیں تو خدا کی پناہ اتیل نہیں ملتا  
تو اس تیزی سے جلتی ہیں۔ اگر دو چار چپٹے نو اسے چھو جاتے تو نہ جانے کہاں پہنچتیں۔  
اور پھر یہ زبانیں عورتوں کی قطار میں چل رہی تھیں۔

برطانوی مشکلوں سے ان بے کل کیروں کو قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش جاری  
تھی۔ اگلے حصے کا انتظام شمع کے ہاتھ آیا۔ گویا قدرے سکون تھا کیونکہ اناج قریب  
تھا کہ پچھلے حصے میں باوجود آئین چار لڑکیوں کی جدوجہد کے اودھم برپا تھی۔ ڈیڑھ دو  
فرلانگ لمبی لکیر بالکل زیرِ لیے سانپ کی طرح دم ٹنچ ٹنچ کر تھلا رہی تھی۔

یہ عورتیں تھیں یا بھوک کی کیتاں! صنفِ نازک اس طرح بدحواسی سے اچھل کودیا  
تو جی برا ہو ہی جائے گا۔ شمع نے کئی بار انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر شاید وہ زبان  
میں نہ سمجھتی تھیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ جنگلی زبان میں چیخ برپاں۔ دھوپ تیز تھی، معلوم  
ہوتا تھا سورج سے گیلی گیلی مچھل برس رہی ہے، کوئی پھلی ہوئی داکھ جسم پر لوٹ رہا  
ہے۔ اور پھر ان گنواروں کی کھٹی کھٹی سرطانہ۔ سر جھٹکا گیا۔

سب سے اگلی عورت سخت لڑا کا مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے دکاندار سے  
کیا چیخ چیخ لگا رکھی تھی اور کھسکنے کا نام نہیں لیتی تھی کبھی بریڑتی تھی کبھی سر ہاتھ سے کوٹنے لگتی  
تھی۔ جمعدار جی کا منہ بڑھ گیا اور وہ روتی بسورتی گھسیٹا کر دوڑھینکی گئی۔ کچھ  
اناج کی برائی کر رہی تھی۔ بازار میں دو بیکر کا تھا تو یہاں ساڑھے تین سیر بھر بھی پائے  
پائے بند نہ ہوتی تھی۔ لیکن سب سے پہلی عورت کا مرض منقہ ہی معلوم ہوتا تھا کیونکہ جو  
آگے بڑھی اڑ کے رہ گئی اور دو چار کو منہ ٹروں سے مہٹانے کے بعد قطار میں نذرِ لعل لاسکی  
خبر دوڑ گئی کہ مال گھنا ہوا ہے۔

اتنے میں اس نے دیکھا پرہیز سیر میں کہنیاں چلاتا تیرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک بار

اُس نے شمن کو دیکھا مگر آگے بڑھ گیا۔ آگے پہنچ کر اُس نے ہاتھ چلا چلا کر دوکاندار سے بالکل ایسے لڑنا شروع کیا جیسے وہ عالم فاضل پروفیسر نہیں بلکہ قطار والیوں کا کوئی بھائی بند ہے۔ زبان بھی تو وہ کوئی نئی بول رہا تھا جس میں گجراتی، مرہٹی، اردو اور انگریزی الجھی ہوئی تھی ماس کا پیر اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نئے بیج و باب کھاتے شروع کیے اور کندلی مار کر ایک بار ہی دکان میں گھسنے کی کوشش کی۔ ڈھیل شمن کے محاذ پر ہوئی۔ وہ پروفیسر کی طرف متوجہ ہوئی اور ملوہ ہو گیا، باڑ کھڑکی۔ آہیں اور سبکیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بھوکے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی بوٹیاں تو چپنے لگے، زبانیں پھٹ پھٹانے لگیں۔

بچے حصہ کا انتظام کرنے والے آگے دوڑے۔ پروفیسر بھی دکاندار سے نپٹ کر موقع پر آ گیا۔

”ابھی ملے گا اناج۔ یہ بوریان غلطی سے آگئی تھیں۔ جھوٹا صبر کرو بہنو“ اس نے چیخ چیخ کر آگے پیچھے لیکن شروع کیا مگر معلوم ہوتا تھا صبر بھی جنگ کے ساتھ کیلی کیلا کہ خاک ہو گیا تھا۔ انہیں جینیں بن گئیں۔ نہ جانے کیا ہوتا، مگر معلوم ہوا کہ اناج آگیا اور پھر لنگہ جاری ہو گیا۔

ٹیکسی میں بٹھاتے وقت پروفیسر نے شرمندہ ہو کر اس کی ٹیکسی جارجٹ کی سڑی کو دیکھا جو قریب کی موڑی میں ڈوب کر مر رہے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہی تھی۔ ”آج تو تم تماشا دیکھنے آئی تھیں مگر مجھے یقین ہے بدھ کے دل جب آؤ گی تو اصل لطف آئے گا۔ آؤ گی نا۔ دو دن آرام کر لو“

”کوشش کروں گی یہ اس نے اپنے دھتے ہوئے کندھے تکیے پر لگاتے ہوئے کہا۔ سڑی کا لقمہ اٹھوا کر نا پڑ لی پر ریٹا اور اُسے پھریری آگئی۔

(۴۵۹)

کام غیر دلچسپ تھا اور تکلیف دہ بھی۔ لیکن اتنا تو ہو گیا کہ مقررہ شام کی تھکی ہوئی

خاموشی ٹوٹ گئی۔ ٹیلر بڑی دلچسپی سے ان معرکوں کا حال سنتا۔ آئے دن نیا ڈراما دیکھنے  
میر آتا۔ انسانوں کی ایسی ایسی فاش کمزوریاں دکھ کر کبھی تو جی جل اٹھتا۔ آخر ہندو تسانیوں  
کو ترتیب سے کیوں اس قدر نفرت ہے! ہر کام میں بس گود بڑ بھرتا ہے۔  
”انہیں سدھانا مشکل ہے“ ٹیلر نے سب کچھ سن کر کہا۔

”جاہل ہیں نا بچا پڑے“ شمن رسایت سے بولی۔

”یاں اور دوسرے کچھ ہے یہی ان کی خصالت ہے“

”بھوک کے آگے کیا یاد رہے“ شمن نے ذرا غصہ دکھا کر کہے کہا۔

”مگر اناج تو برابر مل رہا ہے۔ دراصل یہ لوگ، جوتے ہی بے اصول ہیں“

”خاک مل رہا ہے اناج۔ سارا چھینو نہ لگا ہو اچا دل اور گھنا ہو گیہوں“

”مگر ہم نے پنجاب سے تازہ گیہوں منگوایا ہے“

”منگوایا ہوگا مگر ملتا تو نہیں۔ وہ تازہ گیہوں تو کیا کھیتوں میں جب سڑ جائے

گا تب نکالا جائے گا۔“

”یہ تو بڑی مصیبت ہے۔“

”اور کیا۔ بھر سرکار سنتی بھی تو نہیں“

”سرکار کیا کر سکتی ہے جب اڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہوں۔“

”یہ ڈاکو بھی سرکار کے ہی مٹھو میں۔ ہر سال انسان کشی کے سلسلے میں خطا بابت ملنے

ہیں ان کو۔“

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں ہی سرکار ہوں۔“

”سرکار کے حمایتی تو ہو۔“

”یوں تو تم بھی سرکار کی حمایتی بن گئیں۔ راشن اسکیم میں کام کرتی ہو جو سرکار ہی ہے۔“

شمن ذرا اس جرح سے الجھتا رہ گیا۔

”تو اس میں عیب ہی کیا ہے“ ٹیلر صلح کے انداز میں بولا، ”تم بالکل بچوں کی سی

ہاتھ کرتی ہو۔“

”میں سرکاری ہتھکنڈے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں“ اُس نے اُداس ہو کر کہا۔  
ٹیکر آج اُسے منانے پر تھلا ہوا تھا۔

”صبر کرو، وہ وقت بھی آجائے گا“

”کون سا وقت؟“

”جب تم ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہو سکو گی۔ نہ جانے تم لوگ اس قدر کم محبت کیوں  
ہو۔ ذرا سی بات پر ناامید ہو جاتے ہو۔ ہمارے ملک کی تاریخ پر پڑھ کر سبھی تم نے کوئی سبق  
نہ حاصل کیا۔ یہ احساس شکست کب دور ہو گا تمہارے۔ دلوں سے!“

”شکست کھا کر بھی محسوس نہ کریں۔ یہ اچھا ظلم ہے۔“

”شکست کھا کر اگر دو گنے چوٹ سے آگے بڑھو تو احساس خود بخود زائل ہو جائے  
گا۔ اگر صرف رونے سے کام چل جائے تو شاید کبھی کا قصہ ختم ہو جائے۔ ہندوستان  
میں کتنی آنکھیں ہیں جو دن رات خشک آنسو نہیں بہا تیں۔ آج ٹیکر میں کھویا ہوا انسان  
واپس لوٹ رہا تھا۔ گھر کے تھکڑوں نے انہیں کس قدر حیوان بنا دیا تھا! دلوں طرف  
مورچہ بندی شروع ہو گئی تھی اور اس آپس کی جنگ نے دنیا بھر میں پھرتی ہوئی آہ کو  
ماند بنا رکھا تھا۔ اپنے گرو پیروں کے آگے انسانیت کے کلیجے میں رستا ہوا گھاؤ نظر انداز  
کر دیا تھا۔“

وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھی۔ لوٹ کر اُس نے جیسے بالکل انجان پنے میں ٹیکر  
کے سنہرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔ کتنا نرم گرم احساس تھا۔ گلے میں اُلٹی ہوئی گرہ  
دکھنے لگی۔

”رونی! وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور نہ ہی ٹیکر نے کہنے دیا۔“

”مئی کا خط“ ٹیکر نے اُسے جاگتا پا کر ڈاک اٹھا کر دے دی۔ ”ذرا دیکھنا بڑی بی

نے کیا کیا لکھو مارا ہے سمجھتی ہیں میں اتنا کہ وہی دھڑلے اور بچاؤ دنی ہوں جسے پورے وقت  
نگرانی کی ضرورت ہے۔“

رونی چلا گیا تو وہ لیٹی خط پڑھتی رہی۔ ماں نے مکھا کہ کیا کیا کھانے ٹیکر کو پسند ہیں ام



کن چیزوں سے نفرت ہے۔ وہ رومال بہت کھوتا ہے اور یہ عجیب ایک بیوی کے لیے دبا لیا جان ہے۔ اس کے موزے بھی بہت پٹختے ہیں۔ اگر روز رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے پردھلا کر میکیم پاؤڈر چھڑک دیا جائے تو...

اما مواد ماغ نیند میں لپٹا دھانوں کے ہرے بھرے خواب دکھینا رہا۔ سالولی سالولی مٹی کے گداز سینے پر دھانوں کے ننھے ننھے ہنرے، دانے گنگر ڈول کی طرح ٹپکے کچھوس مٹی کب تک ضد کیے منہ موڑے رہتی۔ ان کی آن میں سورج کی ٹوکیلی کہوں نے انہیں گدگدا کر زندگی کی ریت پیدا کر دی۔ وہ پہلا پانی چھل چھل ناچتا ان میں جذب ہو گیا۔ دیکھیے ہرے بھرے دھان شرابیوں کی طرح تھوٹے ہوئے۔

اب کشمکش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ نیا دھان آگیا اٹھٹی پھٹی آنکھیں شکم سیری کی نیند میں نشلی ہو جائیں گی۔ نیا دھان آگیا اب سکتے ہوئے بنگال کے حلق میں لمبی اورت ٹپکے گا۔ نیا دھان آگیا اب قحط ختم! خالی مٹھیوں میں یہ نیا دھان سونے کے ٹکڑے بن جائیں گے۔ خالی ڈھنڈا رخصتہ اندھ بھی دولت سے مالا مال ہو جائیگا۔ کروٹ لیتے ہیں اس کی گردن ڈھلک کر ٹیکر کے سینے پر ٹپک گئی۔

آنکھ کھل تو ٹیکر کی ناچتی ہوئی سیٹی کان میں گونجی۔ وہ آیتنے پر جھکا ہوا سیٹھی ریزر سے گال کفرج رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں سچے نیلم کے ٹکڑوں کی طرح جھک گارہی تھیں اور شتمن کو وہ کانچ کی نیلی گولیاں یاد آگئیں جنہیں بچپن میں اُس نے کدّان کے ساتھ مل کر کیا دیوں میں بوندیا تھا۔ وہ ایک دم مسکرا پڑی۔

شتمن کو زور سے ہنسی آگئی۔ یہ مائیں اتنی بیوقوف کیوں ہوتی ہیں۔ سب کی سب ایک ہی جیسی۔ لیکن ٹھیک مٹی کہتی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے شتمن نے ٹیکر کے کپڑوں کی مرمت نہیں کی۔ بٹن ٹوٹ گئے ہیں، کالر ٹکڑے ہو گئے ہیں، موزوں کی پچاس جوڑیاں ہوں گی مگر سب کی اڑیاں اور پنچے غائب۔ دیزلک بیٹھی وہ کپڑوں سے کھینتی رہی۔

چاہتی تھی کہ کسی طرح کام سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پروفسر سے ہی تھوڑا سا بچا

کہ اسی بہانے مصیبت سے جان چھوڑے۔ اب اُسے بڑی تنگی ہو جاتی تھی اور موسم بھی ناگوار ہوتا جا رہا تھا۔ منٹے میں دو گئے بجائے تین دفعہ جانا پڑا کیونکہ میریے کی وجہ سے مددگاروں میں اور کمی آگئی تھی۔ اور کام بھی کیا گویا بندر سندھانے پٹریٹھی میں ساکول میں ہمیشہ وہ اعلیٰ اجتماعتوں کو پٹریٹھی لایا کرتی تھی۔ بدعتیز بھی پٹریٹھی آئے کبھی نہ سہکتے پٹریٹھی۔ لیکن ان عورتوں کو قطار میں کو پٹریٹھی لایا سہانے سے تو بکریوں کو پٹریٹھی لایا سہانے تھا۔ کھوپڑیاں ہی نہ تھیں۔ بس ساری قومیں سہٹ کر دھان کے دانے سیٹنے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ خیر و چاروں کی بات ہوتی تو کچھ نہ تھا، مگر یہاں تو مہینوں کا سلسلہ تھا۔ بے وقت کے مہمان سب ہی کو کھاتے ہیں۔ مگر یہ و فیئر کو اتنا دیکھ کر تو جی ہی لوٹ گیا۔ کبخت بھوکا تو آیا ہی ہو گا۔ چائے پر دو وقت کے کھانے کا انتظام کر لے گا۔ بہر حال خوش آمدید کہنا پڑا۔

”نہیں چائے پینے کی فرصت نہیں شیلارہ گئی تھی، اُسے بھی آج ایک سو چار بج رہا ہے۔“ چڑھ آیا۔ عورتوں کا معاملہ ہے، ورنہ دیسے تو کام چل رہا ہے۔ وہ کچھ مجبوراً اور شرمندہ سا ہاتھ ملتے ہوئے بولا: ”ایک تم مسلمان ہو جو اس کام میں دلچسپی لے رہی ہو۔ سنا ہے پردہ چھوڑ دیا ہے مسلمانوں نے بھی، مگر شاید صرف جلسوں پارٹیوں کے لیے چھوڑا ہے۔“

”مگر جب لڑکیاں موجود ہیں تو پھر منہ نہ مسلم کا سوال کیوں اٹھاتے ہیں؟“  
 ”یہ نہیں۔ کوتاہ نظر ہوں۔ اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے کہ... خیر تو تم آؤ گی؟“

”کیا خیال آ جاتا ہے؟ کیا اب راشننگ میں بھی پاکستان قائم کرنے کا ارادہ ہے؟“  
 اُس نے سوئی چھوڑ دی۔

”مہر بخت!“

”بات نہ ملیے۔ یہ آپ کے کون سے لینن یا اسٹالین نے بتایا ہے کہ حقہ بھرے کر دیے گئے تو ساری بلائیں دور ہو جائیں گی؟“

”مگر...“

”ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تو تم لوگوں نے یہ چال چلی یہ  
”تم سمجھتی ہو کہ پاکستان دے دیا تو ہندو مسلم فساد ہوں گے۔ میری بات بھی تو سنو۔  
کون دے رہا ہے پاکستان؟ ہے کس کے پاس کچھ دینے کو؟“  
”آپ ہی لوگ برا رہے ہیں“

”جی ہاں۔ ہماری جیب میں رکھا ہوا ہے پاکستان کہ مانگے کوئی اور ہم دے دیں“  
”مگر آپ ان کے مطالبے تو مانتے ہیں“

”مانتے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کا ایک گروہ کسی خاص قسم کی حکومت  
پسند کرتا ہے تو ہمیں کیا سنی کہ انکار کریں؟ ہمیں ان کے بہت سے مطالبات سے اختلاف  
ہے لیکن اس کا یہ مطالبہ تو نہیں کہ سرے سے پاکستان کا مطالبہ ہی ماننے سے انکار کر دیں۔  
ہم فیصلہ کرنے والے کون؟“

”مگر مذہبی طور پر چاہ کر...“  
”کہہ تو دیا اختلاف ضرور ہیں۔ اُن کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف پاکستان کا مسئلہ  
درپیش ہے“

”اور اگر سکھستان، عیسائستان اور بدھستان کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہو؟“  
”تو اس پر بھی غور کیا جائے گا۔ کسی مسئلہ پر خواہ وہ کیسا ہی فضول ہو غور نہ کرنا۔“  
”مگر مقصد کیا ہے اس طرح کی تفتیش اوقات سے؟“  
”مقصد صرف ایک ہے۔ اتحاد“

”جتنے کس قدر گھسا ہوا لفظ ہے۔ کانوں کو بھی تو متاثر نہیں کرتا؟“  
”ہاں گھسا تو بہت گیا ہے مگر تراشا نہیں گیا۔ ابھی شیشے کا دھندلا سا ٹکڑا ہے،  
مگر میں نے کہا تو کہ پھر کر لینا بحث“  
”بہ خوب ہے۔ آپ تو دلائل سے گھبراتے ہیں۔ انسان کی قوتِ تمحیل کو مغلوب  
کیجیے دیتے ہیں“

”اب میں کیسے ہر منکر کو دلائل سے فائل کرتا پھروں۔ تم ہی سوچو اگر دو چار بھی تم جیسے فدی پٹے پرٹ جائیں تو اپنی زندگی تو ان ہی کو فائل کرتے کرتے ہی گذر جائے خیر یہ بھی کر لیتے، مگر ذرا دیکھو تو کسی افراتفری پڑ رہی ہے۔ جو بنگال میں ہو گیا کیا چاہتی ہو یہاں بھی ہو جانے دیں؟ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اپنا قیمتی وقت یوں برباد کرتا۔ خیر اگر تمہیں فرصت نہیں تو۔۔۔“

”چائے تو پیجیے۔ زیادہ دیر نہ لگے گی“ اُس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

”اب دیکھو اگر تجھے اتحاد و منظور نہ ہوتا تو تمہیں خوشامدیں کروانے کی ہمت نہ ہوتی“ چائے کے گھونٹ لیکر پردیس مسکرایا، ”کسی قیمت پر بھی ہم ملاپ کر کے رہیں گے۔ گو ایسا کرنا آسان نہیں۔ دونوں ہی طرف سے جوتے پڑ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ہماری ڈھٹائی کو؟“ وہ زور سے ہنسا۔

”راجا اب چلے۔۔۔ تو ذرا جلدی آنا صبح۔۔۔“ بغیر کچھ کھائے پیے وہ تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ شمن نے دیکھا کہ اُس کے بال پھوگڈی پر شاعروں کی طرح بڑھ آئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔ شمن کو دنس پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور بیل بھی یہی کہتا تھا۔ تیرہنیں دل سے باغی ہو رہی تھیں۔ وہ عموماً کڑا جاتا۔ مگر یہ پارٹی افسروں کی طرف سے تھی اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی انہیں کے سر تھی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے شمن کو بخار بھی آگیا اور اس کا جھکڑا تولیوں حل ہو گیا۔ کچلے کچلے دلوں سے صحت ویسے ہی خواہ مخواہ گرتی جا رہی تھی، اور سے یہ بخار اور پیٹریلر کی لاہر و امصر فیت۔ پردیس سے بھی غرض سے آتا تھا۔ جب بخار آیا وہ رسم پوری کرنے کو ایک دو منٹ کے لیے آتا اور بھاگ جاتا۔ شاید دوسری لڑکیاں بھی رو بہ صحت ہو رہی تھیں اور شمن کی اشد ضرورت نہ رہی تھی! چرطی ہوئی بیٹھی تھی۔ آگے ہی دو لشریاں اور ایک پیالی پھینک چکی تھی کہ ٹیلر جاق چوبند ٹائی آتا تانہ و زور سے پیرٹھپٹا آن پہنچا۔

”ادھو، بڑے تر مال اُڑا رہی ہو؟“ اُس نے مسکرا کر کہا اور شمن کا جی چاہا کشتی اُس کی تنہو تھی پرینچ مارے صبح سے ایک نواہ حلق سے نہیں اُترا اور یہ سمجھ رہا ہے وہ دن بھر جواہی کرتی ہے۔ ”مئی کا خط پڑھا؟ پاگل ہو گئی ہیں“ وہ شرماٹے ہوئے انداز سے مسکرایا، ”بیکار کی چیں چیں نہ جانے ان عورتوں کو کیا اچھی لگتی ہے مشقت، فصول، مگر شمن نے خط نہیں اٹھایا، خاموش چائے میں گچھ چلاتی رہی۔ نہ جانے کیا کیا رہا ہے۔

”بیکار تھا جنجال جی گھبراتا ہے میرا بچوں سے“

”وہ نہ، ایک حماقت ہو گئی اب دوسری...“

”ایں؟“ وہ کچھ کھسیا کر چڑھ گیا۔

”اور کیا جو ہم نے بویا ہے ہم ہی بھگتیں اور بے گناہوں کے ملتے پڑیہا دھیر کیوں تقویٰ جانیں؟“

”ممی... اُن کی خواہش ہے... کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شدت احساس سے کان سُرخ ہو گئے۔“

”وہی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں۔ وہ خود خلاف ہوں گی۔“

”کون ممی؟ اسے تو بے کردہ دیوانی ہیں وہ بچوں کی۔ تمام ادھر ادھر کے بچوں کو چٹائے رکھتی ہیں۔“

”تو اب بھی ادھر ادھر کے بچے موجود ہیں، شوق سے چٹائیں۔“

”ہوں۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”آدھا تیر آدھا بلیو منہ“ اُس نے انتہائی مکاری سے کہا اور خون پھر سیر کے کانوں کی طرف دڑا۔

”ہم نے سخت شگلی کی۔“ ٹیلر نے بھی ہوئی آواز میں بولا۔

”حد سے زیادہ بڑی حماقت۔“

”کیسے بھگتی جائے گی یہ دوزخ۔“

”کیا ضرورت ہے کہ بھگتی ہی جائے۔ اگر نہ کھا لیا جائے تو تم کیوں نہ کر دی جائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ دوزندگیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں۔“

”کبھی ہندوستانی سے کہیں تو وہ مزہ چکھا دیتا اس وقت۔“ ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔

”شاید۔“

”اور پھر تمہیں اعتراض بھی نہ ہوتا۔“

”شاید۔“

”کس قدر نیچ ہو تم؟ اس کے منہ میں جھاگ آگئی پھر ذبح کر ڈالنا چاہیے اس قسم کی حیوان عورتوں کو۔“

”کیا اچھے تم سے گفتی نفرت ہے۔“

”ہنہ۔ اور جیسے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔“

”تم... تم بیڑا سے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو... کاش ایک بار کوئی تمہارا کلا گھونٹ کر مجھے آزاد کرے۔“

”اور تمہیں کیوں نہ مسل ڈالے! چونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں

بہنوں کو تو دیکھو... ہنہ... بد معاش زمانے بھر کی۔“

”چپ کبھت... بگلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے تصور سے نااطھ جوڑا...“  
 ”اور تم... بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت، سطرے ہوئے دانت، زبردست کہیں کے“  
 ”تو پھر کسی بھیل چار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی باجیا ہو تو کل جاؤ یہاں سے“  
 ”بھیل چار تم سے لاکھ درجے بہتر ہے نامی کہیں کے“ وہ اٹھ کر جانے لگی۔

مذاق مذاق میں شمس تبیا چکی تھی کہ نامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج نہیں  
 بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ ٹیکر اس کے منہ سے اتنی نیچی گالی سنکر کانپ اٹھا۔ مقوڑی دیر  
 وہ ساکت دجلے جس دحرکت بٹھار ہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ گئی جیسے کسی نے بھکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔  
 شمس نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازے بند کر دیے۔ وہ خنچ خنچ کر گالیاں بکھارنا شمس نے اُسے کبھی اتنا  
 غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل اپنا معلوم ہوتا تھا، جیسے ضبط کی لگام تڑا کر غصہ دماغ پر پھٹ پڑا ہو۔  
 شمس پر لٹکائے پلنگ پڑی تھی تصور کھڑکنا پائی۔ اتنی بات بڑھ گئی، نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔  
 رات بھر میسر کے پیروں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ وہ زخمی چیتے کی طرح تیز تیز قدموں سے  
 چلتا رہا۔ بار بار الماری کھول کر کچھ اندر دیکھنے کی آواز آتی مگر وہ بھی جلدی نما موش ہو گئی کیونکہ ایک  
 بوتل آنے جانے والوں کے لیے رکھی تھی۔ عاذنا ٹیکر نہیں پتیا تھا۔

ادھر پھر سکیروں کی آواز آئی، جیسے کوئی دم گھوسٹ کر دونا ضبط کر رہا ہو۔ شمس کا ہی بل گیا۔  
 وہ رو رہا تھا ایلر۔ شاٹ، تداؤد، جوان مرد ایک عورت کے مارے ہوئے دھولوں پر سکیاں مبر رہا تھا۔  
 اسکا جی چاہا جا کر... مگر وہ لڑا اٹھی۔ وہ نیلی نیلی کالج کی گولیوں جیسی آنکھیں، وہ تمنا یا ہوا چیرہ!  
 دوسرے دن سچ بی اٹھ کر نوکرنے تیار کیا کہ وہ اچانک سامان تیار کر دے کہ وہاں روانہ ہو گیا۔  
 کوئی ٹرک کال بھی کی تھی۔ شمس کا جنازہ بھی نہ اُترا اور کزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

پورا مہینہ گزر گیا اور ٹیکر کو نہ ہی کوئی خط آیا نہ خیر خبر۔ اس نے ادھر ادھر ٹھکانوں کے کچھ معلوم  
 کر لیا کہ شمس کی مگر تپ نہ چل سکا۔ وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گیا ہو گا جس میں شاید رازدار کی جھڈا شامل ہو گا۔  
 دہشتے اور طعیر کا نام و نشان نہیں۔ صرف سرکاری طور پر اس کی تنخواہ تو شمس کو مل گئی۔

فدا اسی چنگاری کو نیکی جھل جھل کر اُس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دم بھر میں سب کچھ بھسک سے اڑ گیا۔  
 بس ٹیکر اکیلا واپس آ رہا ہے۔ پھر پھر تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی۔ وہ آجائے پھر تو... بن جھنگا۔  
 سب کچھ بن جائیگا۔ کھڑا رہنے کو یہ نہیں ہو گئے کہ مرمت نہ ہو سکے۔

تو زیادہ نہیں لیں ایک بار... آخری بار... آخری موقع؟ وہ نہ جانے کس سے اور کیا مانگتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔ وہ کام پر بھی چلی جاتی مگر جی کھویا سار تھا۔ اُس نے ٹیلر کے سار سے کپڑے نکلوا کر دھوپ دی۔ مکر۔ درمی باقی تھی اس لیے دور بیٹھی ہدایات دیتی رہی۔ برش خود کیا اور گولیاں ڈالکر کینا کر دیے۔ دن میں کئی بار احساس تنہائی خوف بن کر چھایا اور وہ خاموش آنسو بہا یا کی۔

اور دن گزرتے اُس کا کوئی نہیں دنیا میں۔ وہ سب کو کھو چکی۔ ایک ایک کر کے سار کے ڈر سے زہرے دانتوں سے کتر ڈالے مگر امید کا آخری تار سلامت تھا گو بار بار لرزتا کہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔

اُس کی نیند بالکل اچاٹ ہو گئی تھی۔ سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ رات بھر ہی معلوم ہوتا۔ وہ گلیا راستہ ٹیلر کی موٹر آکر رُک کی۔ وہ اُترا۔۔۔ اب نیٹے پر چڑھ لے رہے۔ سیڑھیاں طے کر چکا۔ اب دروازے پر آ رہے۔ مگر نہیں، سارا حساب گڑبڑ معلوم ہونے لگتا۔ نہیں بجلا اتنی جلدی مڑتے کیسے اُترا ہو گا! اُمنہ سے کہنا اور بات ہے نعل کے سزد ہونے میں تو وقت لگتا ہے۔۔۔ وہ کھٹ سے اُس نے موٹر کا دروازہ بند کیا۔۔۔ اب۔۔۔ چلا۔۔۔ سیڑھیوں پر چڑھا۔۔۔ صاف جو تلوں کی چاپ سائی دے بنی۔ مگر یہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ختم نہ ہو سکتی۔ دس بارہ سیڑھیاں نہرا چارپوں میں بھی طے نہ ہو پاتیں۔۔۔ اور پھر اسے معلوم ہونے لگا جسے وہ پیر کی چاپ سمجھتی تھی وہ نل کی لونڈی ٹپ میں گزر رہی تھیں ٹپ ٹپ۔۔۔ متواتر یہ لونڈی انسانی قدموں کی طرح چلتی معلوم ہوتی ہیں جھنجھلا کر وہ اٹھتی اور نل کو خوب روکر مبرا کر دیتی تاکہ گلا کھٹ جائے کجخت کا۔

دامنی خلیج بڑھتا گیا۔ کھانے کی اکیل میز پر ایک نوالہ بھی اُس کے حلق سے نارتا۔ زبان پکائی لگ گئی تھی مگر چیز کڑوی، بدمزہ، بساندی اور چھچھلاندی معلوم ہوتی۔ تھک گئی تھی وہ ان کھاؤں سے، میز کرسی سے، نرم نرم صوفوں سے جی چاہتا ایک بار بھی سب کچھ دور چٹک کر کھڑی ہو جائے آخر تھا کیا ان اُچھتوں میں؟ اس پھپکی کیسی زندگی سے تو یقیناً موت زیادہ چٹپٹی ہوگی۔

شامی کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں سڑا فدی غلا طلت کا پہاڑ بن کر پھیل گیا۔ بیرے کی نظروں سے اُبھائی جاتی ہوئی وہ جلدی سے اپنے کمرے پر چلی گئی۔ یہ کباب ٹیلر کو کس قدر پسند تھے۔ دیکھ کر نل نکل جاتا تھا۔ لیکن اب یہ نہ کیسے لگے جب تک ٹیلر نہ آجائے۔ درز یونہی لگے میں اب کائی بن کر بیٹھتا رہیں گے۔ یہ ذرا سی بات اتنی لمبی کیوں ہو گئی کتنی بار تو اسے اوجھڑا چھوڑ دیا گیا مگر بھیجی سخت میں اس کی کھیل یوں لکھی تھی۔ مانا کہ وہ ایک دوسرے سے اکتا جاتے تھے مگر کوئی نئی بات ہے۔ اللہ لوگ بھی تو لڑتے بھڑتے ہیں۔ مگر یوں زندگی کی مدانی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل نہیں گڑ پڑتی۔ ایک تیار سے مائے تو بہ۔ کتنا ارمان بھرا خواب تھا! مگر وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ تو معافی تو کیا اگر وہ

صرف ایک معمولی سے اثاثے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو ٹیلر رائے خطی ہو جاتا۔ اتنا غنیمت تھا پر جہاں آنسوؤں کی چمک دھیمی اور غل کی آنکھیں چندھیا بیٹیں، اُن کی معافیوں حصے میں آتیں۔

اور کیا حرج ہے جو مال کی بھی بات مان لی جیلے ایر وہی تو مال تھی جس نے دو ریٹھے بیٹھے جیسے بٹن واکر دو مختلف طاقتوں کو کھینچ کر ملا دیا تھا۔ نف ہے اس کی اوقات پر کہ وہ اس کی نفی کی آمد نہ پوری کر سکی بغیر وقت اتنی دور میں بھاگتا ہے، اب بھی تلافی کی جا سکتی ہے۔

لیکن ایک بھیانک لیکن نے اُس کے جمع ہونے ہوئے خیالات کو بکیرنا شروع کیا۔ سرکاری طور پر اُسے معلوم ہوا کہ ٹیلر بھی پندرہ بیس دن نہ آ سکے گا۔ جی کرنا کر کے چایا اُسے خط لکھے مگر نہ کھفت قلم بڑا عجوبہ اُلہ ہے، اس کے پاس وہ طاقتیں کہاں جو ایک روٹے کو منالے کیلئے استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ پروفیسر کا فون آیا کہ فوراً ڈیجی ٹورڈ اُٹھنا تھا مگر کرنے کو کچھ نہ تھا پکار دن آؤ گئے نازنا قیامت سے کم نہ تھا۔ راشننگ کے دفتر پر چھوٹی چھوٹی مہا بھارت چھڑی نظر آتی تھی۔ چند بے پر کی خبروں نے اُڑ کر بھوکوں کے پیٹوں کی آگ اور بھڑکادی تھی۔ بنگال کی بھوک ہیبت بن کر سہا رہی تھی۔ لوگ انانج پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ رہا سہا مہر بھی مفسد ہو چکا تھا۔ انسانیت کو اتنا نیچا دکھ کر جی تھنھلا اُٹھنا۔ آخر اتنی کانٹوں بھری زندگی اتنی پیاری کیوں گئی؟ آخر وہ سرے ملکوں میں بھی تو بھوک ہے پر اتنی اندھی اور بے جیا نہیں۔ اگر ذرا مہر سے مر یا جائے تو کیا حرج ہے۔

دھوپ تیز ہونے لگی۔ مہر بھائے ہوئے زرد چہرے نیل جیسے چھپے سینے سے دھک اُٹھے جیسے لاشوں پر زہری روشنی پھیل گئی۔ آنکھیں زیادہ خشک اور بے رونق ہو گئیں۔ تنگی ہوئی ٹانگیں بٹوں پیش کے بوجھ سے لہنے لگیں۔ مجمع ہنڈیا کی طرح کھدلا اٹھا۔ بعض کے ہیکلے شمن کے جیسے کو گھونٹے لگے۔ دو طرفہ ہنڈی کی کہانی شور پر تاشے باجھے کا سماں باندھتی گور گئیں۔ پول پول ہزاروں موٹریں شمن کے کانوں میں گھسنے لگیں۔ لڑو لڑو اکڑا کر اُس نے پان داسے کی دکان کا سہارا لیا۔

چونا ہ سادہ؟ دسی؟ بائی... جینیل پارسی؟ پان داسے نے جلدی جلدی کتھے چرنے کی کلپوں کو بجایا۔ پھیر کے گھتے تاش کی گڈیوں کی طرح بکھرے سٹے ہوا میں ہارے۔ پیر کے نیچے سے پھیر ملی پانی کی پیکوں سے لٹھڑی ہوئی زمین کتاب کے ورق کی طرح پھیر پھیر کر منہ پر آن چکی اور کپس آگ بچانے کا انجن ٹن ٹن کرنا خاموشی میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھل تو اُسے اپنے آپ کو ایک نئے کرے میں پایا۔ گھونٹا ہوا داغ پھیلا ہوا معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے پاس ہی پروفیسر کا ہوا برف توڑا تھا۔ ددین اور نانا تھ چہرے سرخ و سرخ تھے۔



و ایسی حالت میں باہر نہیں نکلتا چاہیے ڈاکٹر نے ربو کی نلیکیوں والا آلتہ کرتے ہوئے کہا۔  
 درحالت کسی حالت پہ مگر شاید یہ طوا کر اپنی کہنے میں جو مزہ پاتے ہیں وہ مرلین کی سننے میں  
 نہیں پاتے۔ ڈاکٹر نے مٹی جوڑی فرست، احتیاطوں اور دواؤں کی سنادی۔ دوائیں طاقت کی دوائیں! وہ!  
 مارے حیرت کے وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ بچہ تو نہیں تھی مگر پریشانیوں میں وہ کتنا کچھ سہولی ہوئی مٹی اس  
 عظیم الشان انکشاف نے جیسے بھلنے بجائے اسے ایک دم پکڑ لیا۔ پروفیسر کچھ حیل، کچھ مجرم سا کھڑا تھا۔  
 وہ اٹھی تو ایسے سہارا دینے دوڑا تو یادہ نازک سا کالنج کا گلاس ہے اور بچہ نیک مانتے سے ٹوٹ جائے گی۔  
 وہ کھینچ کر تیز تیز جلتی باٹریجی میں آن بیٹھی۔

موٹر کی تیز روانے اسے جگا دیا چونک کر اس نے پھر بری لی اور ایک دم اس کا دماغ بھی موٹر  
 کیساتھ بھلنے لگا جی چاہا زور زور سے ہنسنے یا پھر زور زور سے رسنے مگر وہ ڈایٹورم کی وجہ سے جھینپ گئی۔  
 "جلدی... جلدی" اس نے ڈایٹور کوٹ کا پس نہ تھا جو وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن کی موٹر کی  
 طاقت میں شامل کر دیتی۔ آج اس کا جسم اکیدم ہلکا ہو کر اڑ جانے پر تیار ہوا تھا۔ بار بار آنکھوں میں بے معنی  
 آنسو پھیلے آسے تھے۔ سامنے ایسے میں اس کی شکل کتنی مردہ اور اجڑی ہوئی نظر آئی، مگر کچھ پروا نہیں جس  
 اور بد صورتی کی ان پر کر اس نئی جہت کے سامنے ماند پر چلے تھے۔ بد صورتی تھی تب بھی... تب بھی اس  
 کا دل ایک دم کتنا حسین ہو رہا تھا۔ وہاں صرف ایک تجتر سانپا تھا۔ "رونی... رونی ٹیلر... کہاں ہو  
 تم مجھے معافی مانگو... بے رحم کہیں کے؟" اس کا کھلا کھٹ گیا۔

وہ ٹرانٹ تباہ کی روٹی کو آنے دو تو ذرا۔ اپنی بد نصیبی، کاسا رازم اس پر تعویذ دیگی اور  
 پھر روٹی اسے اتنا ہوش کب رہے گا کہ ہرمان کے جنگلی کہیں کا خود غرض وحشی اچلا گیا اتنے دن  
 کیلیے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ آج کل سینٹ دوائیں کہیں ملتی ہیں۔ کیلشیم انجکشن لانا جوئے شیر لانے سے  
 کم نہ ہو گا۔ اور اس وقت یہ لا پردائی... مگر پھر اسے روٹی پر پیار آ گیا۔ اتنی دور ہو کر وہ کہیں بالکل ہی فرتھا۔  
 اور ماں اچہ رہے و توف پیاری سی ماں۔ نہ کھاتا تھا "تم لوگ گھر ناہیں۔" اوئی سامان میں سب  
 خود تیار کروں گی؟ شہر۔ دیوانی بڑی بی مارے ارمانوں کے مری جا رہی ہیں سمجھتی ہیں جیسے ان میں  
 تسہل ہی بہت سلیقہ پالنے کا۔ لاڈ میں بگاڑ کر ناس مار دیں گی۔ روٹی سے بھی بدتر، ضدی اور  
 مزہ جو عا بنا دیں گی مادر پھر بڑی بی میں دم کہاں ہو گا۔ جو رات برات ہو انک جلتے!

کتنی ہیں آئیں گی۔ مگر یہ بد نصیب جنگ بھی دم سے جیتی جیتنے کی فر صلت ملے جب ہی تو نہ  
 جانے کتنوں کو کیا بل رہا ہے ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ وہ سوچتی رہی اس خون میں کتنی

ہوئی دنیا کا خیال کر کے دل گیا۔ کاش یہ جنگ جیت کر ختم ہو جاتی۔ خدا کسی کو اس قیامت کے دنوں میں جہنم نہ دے۔ کون بچا ہوا ہے؟ اور کب تک؟ نہ جانے کس وقت آگ برسنے لگے۔ پریشانی ہو کر وہ اپنے لیے چوڑے کنبے کو بچانے کی فکر میں پڑ گئی۔

اے... اور کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ روشنیاں دھڑ دھڑ چلنے لگی ہیں بیشکوں پر سے کالے کاغذ لٹے۔ تہ خانہ قبر بنا پڑا ہے۔ مانا کہ خطرہ قریب نہیں مگر چیل بھینا ماننے سے پہلے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دم میں مباری ہونے والی ہے۔ اسٹور میں بھی تو کچھ نہیں۔ روتی کے پائپ کو تمباکو نہ ملا تو وہ سر کھا جائے گا۔ پاگل آدمی پھیرا!

اور جو وہ روتی کو کچھ نہ بتائے تو؟ مزہ آجائے۔ ایک دم مارے حیرت کے پاگل ہی تو ہو جائے گا۔ اور جو ابھی سے معلوم ہو گیا تو جینا دو بھر کر دیا، جہاں کھالے گا: "یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اُسے اکیدم سنہی گئی۔ کبسی اترائی ہوئی باتیں سوچنے لگی تھی وہ بھلا آج کل ہم کہاں؟

وہ بھاگی مگر اجاڑے میں داخل ہو کر واقعی اس پر دم چھٹ پڑا۔ طرزی کی بھوری گاڑی برساتی میں کھڑی تھی۔ تیرے نابھہ پر "رونی... رونی... بھانپتی ہوئی بیڑھوں پر چڑھنے لگی۔ ساڑھی پر پیرلیٹی اور وہ ہم کر دک گئی۔ "رونی! اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ دور دھکیل کر کھولا۔ "رونی!"

"گڈ ایننگ میڈم! ایک کلف گئے ہوئے فوجی نے اسلام کیا۔

"رونی!" اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

"مسٹر ٹیکرڈز لیریہ ہوائی جہاز محاذ پر روانہ ہو گئے، یہ خط! اُس نے ادب خط بڑھایا اور جلدی سے سلام بھارتا ہوا لوٹ گیا۔

ہاتھ میں خط لیے وہ پھیری ہوئی سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوا میں ہوائی جہازوں کے ہزاروں لاکھوں پر ہشیروں کی طرح غنائے جیتنے چھاڑتے ہم لاکھوں کی تعداد میں برس پڑاے جیٹھلی گرنے کا کو کو سن کر گئی۔

"رونی... رونی... اسکی مٹکی ہوئی روح کراہتی ہوئی موسوم سے دھبے کے تقاب میں ڈوب گئی۔

رونی سادے احتیارات سوئپ کر جنگی محاذ پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ آزاد تھی! جسم نکلی ہوئی روح کی طرح آزاد! لاوارث اور کھوئی ہوئی۔

"تم نہیں گئے رونی... رونی یہ نہیں ہو سکتا۔ ظالم اب تم کہیں نہیں بھاگ کر جاسکتے۔" اُس نے بڑے وثوق سے پکارا، گویا وہ اُسے قید کر چکی ہو۔ "سنگر رونی... مگر وہ کسی کو نہ سنا سکی اور

ٹیڑھی لکیر ۴۷

گھنگھور گھٹائیں زور شور سے گھر کر منڈلائیں۔

”ٹیڑھی ٹیڑھی...“ اُس نے منہ زور طوفان کو لبِ اجبت سے چکارا۔ ”سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ٹیڑھی اتنا زور نہ لگاؤ ورنہ پتہ ہی ہونی ڈوریاں چٹ جائیں گی۔“ ”تم گئے رونی؟“ اُس نے گھٹے ہوئے کلیجے کو زور لگا کر پکارا مگر آہ بھی نہ نکلی اور پھر اکیدم نئی جان نے اُس کی پکار سُنی۔ زندگی کی پہلی پھریری لہروں کی طرح مخترائی ہوئی اُس کے جسم میں تیر گئی۔ دو تہی ہوئی طاقتیں تاریکیوں سے اُبلنے لگیں۔ تہی ہوئی رگیں آپ ہی آپ لچک کر ڈھیل پڑ گئیں!

آنکھوں کی وحشت آنسوؤں سے دھل کر بہ نکلی۔ سسکیاں منہسی کے فوارے بن گئیں اور ہم باری کا بھینک احساس دور جھٹک کر وہ بوسیدہ بے کے ڈبیر کے نیچے سے رنگ آئی... اکیلی! اریک میں جمی ہوئی اُونی کپڑے بننے کی شوقین، اُنی، ہوائی اُردو ہوں کے پرول پر موت کے دہانے کی طرف اُڑتا رونی، وہ خود... اور... اس کے اپنے وجود سے استعد رقیب ایک نئی جان! اتنی لمبی چوڑی برادری میں وہ اکیلی کہاں ہے؟ مانا کہ بہت دور ہیں وہ ایک دوسرے سے، ہزار میل میل کا سفر حائل ہے مگر اس رقت اسے ایسا معام ہوا جیسے اُس کی سادی دنیا سمٹ کر خود اُس کی ہستی میں سما گئی۔ آج اس کیسی کی تنہائی میں بھی کتنی چہل پہل تھی۔ اس بے سرو میں بھی کتنی سلجھی ہوئی سجادت تھی آج وہ کتنی مختصر مگر خوش تھی! اس سے قبل اُس نے اپنے اچھوٹا گدوڑا، اتنا بہادر، اتنا پریشان، مگر اتنا مطمئن کبھی نہ محسوس کیا تھا اور دنیا کتنی حسین ہو گئی! زندگی کتنی عزیز!

اور رونی؟

اُس کا جی مسل گیا۔ خالی ہاتھ، اکیلا رونی! اُس کی منہسی پر اسے ترس آ گیا۔ جیسے کسی رئیسِ اعظم کو اپنے محل کی کمرا کی کسی تلاشِ فیض کو ناداری کی سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر رحم آنے لگے! وہ ہلک کہیں کی، اس نئی دولت سے مالا مال مہنتی کو طعنہ دیا، ”ایک ہرجائی لیڑھے کو بھی ٹو

لیا!“

نیشیلے قدم اٹھاتی، جیسے اُس کے ٹخنوں پر لقرئی گھنگھروں کے گچھے آن بندھے ہوں، وہ ہلک کی طرف مرطی اور نہایت احتیاط سے اپنا تھکا ہوا سر تکیے پر ٹکا دیا!